سلطانہ مہر

سخنور

حصہ دوئم

تذکرہ شعراء و شاعرات

ڈاکٹر جمیل جالبی

تقریظ

سُلطانہ مہر تجربہ کار اور کہنہ مشق صحافی ہیں۔ برسوں روزنامہ "جنگ" کراچی سے وابستہ رہیں۔ اس کے بعد اپنا ماہنامہ "روپ" کے نام سے نکالا جو بہت مقبول ہوا۔ سُلطانہ مہر کے بارے میں یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ جو کام بھی کرتی ہیں سلیقے سے کرتی ہیں۔ صحافی ہونے کے علاوہ وہ شاعر بھی ہیں، ناول نگار بھی، تنقید نگار بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی۔ اب تک اُن کے چار ناول شائع ہو چکے ہیں "داغِ دل" (۱۹۶۲ء) "تاجور" (۱۹۶۶ء) "ایک کرن اُجالے کی" (۱۹۶۹ء) اور "جب بسنت رُت آئی" ساتھ ہی اُن کی کہانیوں کے تین مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ بند سیپیاں" (۱۹۶۷ء)، "دھوپ اور سائبان" (۱۹۸۰ء) اور "دل کی آبرو ریزی" (۱۹۸۸ء)۔ سلطانہ مہر مقبول صحافی اور ادیب ہیں اور ان کا قلم مختلف جہتوں میں سفر کرتا ہے۔ نقد و نظر پر توجہ دی تو چار تالیف چھپ کر سامنے آئیں: "اقبال: دورِ جدید کی آواز" (۱۹۷۷ء) "آج کی شاعرات" (۱۹۷۴ء) "ساحر کا فن اور شخصیت" (۱۹۸۹ء) اور "سخنور" (۱۹۷۹ء) ان میں سے آخر الذکر کتاب علمی و ادبی حلقوں میں بہت مقبول ہوئی۔ یہ وہی سلسلہ تھا جو برسوں اخبار جنگ میں ہفتہ وار چھپتا رہا جس میں ہم عصر شعراء کے حالاتِ زندگی اور ان کا کلام "تذکرے" کے انداز میں پیش کیا جاتا تھا۔ کتابی صورت میں شائع ہو کر اس کی حیثیت ایک ایسے تذکرے کی ہو گئی جس میں ایسے شعراء کے حالات و کلام محفوظ ہو گئے جو کسی دوسری جگہ مشکل سے ملیں گے اور یہی اس کی بنیادی اہمیت ہے۔ اب سلطانہ مہر نے "سخن ور" کی دوسری جِلد مرتب کی ہے جس میں وہ شعراء شامل ہیں جو پہلی جِلد میں شامل نہ ہو سکے تھے یا پھر وہ جو بیرونِ پاکستان بستے ہیں۔ یہ کام بھی...... انھوں نے احتیاط، اہتمام اور سلیقے سے کیا ہے اور اسی لئے کارآمد اور مُفید ہے۔ "سخن ور" جلد دوم کی اشاعت پر میں سلطانہ مہر کو دِلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ خُدا انھیں صحت مند اور سلامت رکھے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی

"حرف معتبر"

سلطانہ مہر کا شعری مجموعہ

آپ کے مطالعہ کے لئے جس کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ:

"سلطانہ مہر نے شاعری کے دلدادگان کو اپنی شخصیت اور اپنے دور کے جن لوگوں اور مسائل سے آگاہ کیا ہے وہ سماجی سائنسدانوں کے لئے بھی لائق توجہ ہیں اور اردو کے نقادوں کے لئے خاص طور پر ان نقاروں کے لئے جو اردو شاعرات پر نسائیت (FEMINISM) کی چھاپ دیکھنا چاہتے ہیں۔" **ڈاکٹر محمد علی صدیقی**

"میں نے ان کا کلام جب پہلی بار سنا تو اس وقت محسوس کیا تھا کہ اس کی روش میں بڑے امکانات پوشیدہ ہیں جو اب رفتہ رفتہ کھل رہے ہیں۔ اس وقت کچھ لوگ اس بات پر بھی چونکے تھے کہ سلطانہ کی گھریلو زبان اردو نہیں کچھ اور یعنی گجراتی ہے۔" **ڈاکٹر شان الحق حقی**

"سلطانہ مہر نے بعض ایسی نظمیں لکھی ہیں جو اپنے موضوع کے اعتبار سے بھی اہم اور معنوی وسعتیں رکھتی ہیں۔ مثلاً ان کی نظم (پاسپورٹ) انسانی تقسیم پر ایک منفرد نظم ہے۔ تقسیم تو مذاہب نے بھی کی ہے اور رنگ و نسل کے امتیازات نے بھی مگر "پاسپورٹ" ان دونوں کو نظرانداز کر کے ایک نئے طرز تقسیم پر مہر تصدیق ثبت کر دیتا ہے۔" **حمایت علی شاعر**

چار رنگوں میں سرورق۔ خوبصورت طباعت۔
قیمت دو سو روپے یا دس امریکی ڈالر۔
منگوانے کا پتہ: مہر بک فاؤنڈیشن E,3844 Foothill Blvd .PASADENA CA91107 U.S.A

BIO -DATA

خاندانی نام: فاطمہ
قلمی نام: سلطانہ مہر
مقام پیدائش: بمبئی
تعلیم: ایم۔ اے (صحافت) کراچی یونیورسٹی
پہلا افسانہ: ۲۶ ستمبر ۱۹۵۳ء میں
روزنامہ انقلاب بمبئی میں شائع ہوا۔
پیشہ: صحافت
مدیرہ اعلیٰ ماہنامہ "روپ" کراچی
۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۰ تک
۱۹۶۵ء سے ۱۹۶۷ء سے روزنامہ انجام کراچی
۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۹ء روزنامہ جنگ کراچی
تصانیف: "داغ دل" (ناول ۱۹۶۲ء)
"تاجور" (ناول ۱۹۶۶ء)
"ایک کرن اجالے کی" (ناول ۱۹۶۹ء)
"جب بسنت رت آئی" (ناول ۱۹۷۲ء)
"آج کی شاعرات" (تذکرہ ۱۹۷۴ء)
"بندیپیاں" (افسانے ۱۹۷۶ء)
"اقبال دور جدید کی آواز" (۱۹۷۷ء)
"سخن ور" (تذکرہ شعراء ۱۹۷۹ء)
"دھوپ اور سائبان" (افسانے ۱۹۸۰ء)
"دل کی آبروریزی" (افسانے ۱۹۸۸ء)
"ساحر کا فن اور شخصیت" تالیف ۱۹۸۹ء
سخن ور حصہ دوم: بیرون پاکستان بسنے والے
شعراء و شاعرات کا تذکرہ۔ ۱۹۹۶ء
زیر تصنیف: سخن ور حصہ سوم۔
پاکستانی شعراء و شاعرات کا تذکرہ
گفتنی: نثر نگاروں کا تذکرہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سخنور

حصہ دوم

بیرونِ پاکستان بسنے والے شعراء اور شاعرات کا تذکرہ

مصنفہ: سلطانہ مہر

مہر بک فاؤنڈیشن

لاس اینجلس ریاستہائے متحدہ امریکہ

MEHER BOOK FOUNDATION

20873 E. WALNUT CANYON ROAD
WALNUT, CALIFORNIA 91789
PHONE: (909) 444-0065
FAX: (909) 444-0077

U.S.A.

مصنف : سلطانہ مہر

سرورق : آذر زوبی

طباعت : یونائیٹڈ ڈائریز اینڈ کلینڈرز، کراچی

کمپوزنگ : کمپیکٹ سروسز

تعداد : گیارہ سو

قیمت : ۴۰۰ روپے (پاکستان)

20 $ (امریکن ڈالر)

سال اشاعت : ۱۹۹۶ء

ناشر

مہربک فاؤنڈیشن

۳۸۴۴ ای۔ فٹ ہل بلیورڈ پیسیڈینا

کیلیفورنیا۔ ۹۱۱۰۷

متحدہ ریاست ہائے امریکہ

MEHER BOOK FOUNDATION
(T) (818) 564-2840
(F) (818) 564-2842
3844 E.Foot Hill Blvd
PASADENA CA 91107-U.S.A.

فہرست

تاریخِ طبع سخنور جلد دوم

راغب! یہ تذکرہ شعرا کا ہے بے مثال
اس کا بدیل، عصرِ رواں میں کوئی نہیں

سلطانہ مہر کی ہے یہ کاوش، بلا شبہ
انگشتری میں تذکروں کی، بے بہا نگیں

پہلی ہی جلد اس کی تھی، سرمایۂ ادب
اور دوسری تو جلد ہے، بہتر ز اوّلیں

سلطانہ مہر، شاعرۂ نامور تریں
لیکن ہے ان کی نثر، نہایت ہی دل نشیں

امریکہ میں ہے ان کا کئی سال سے قیام
غافل نہیں ہیں، خدمتِ اردو سے یہ کہیں

دو ڈاکٹر ہیں نورِ نظر، اور تیسرا
انجنئر ہے، اور اقامت بھی ہے وہیں

امریکہ ہی میں ان کے گزرتے ہیں روز و شب
یہ روز و شب ہیں، راحت و آرام کے امیں

لوس اینجلس کے اہلِ ادب کو ہے ان پہ ناز
خدمات ان کی، نازشِ اردو ہیں بالیقیں

ہوں گے سب اہلِ علم "سخنور" سے فیضیاب
رنگِ "صد آفتاب" ہے، یہ تُرّہ جبیں

تاریخِ طبع تذکرے کی ہے بفضلہ
"سلطانہ مہر، مہرِ سخنور، صد آفریں"

۱۹۹۶ء

افتخار نسیم
شکاگو

راغب مرادآبادی
۲۶ ویں اپریل سنہ ۹۶ء

انتساب

میری محبت کا مرکز اور محور میرے بچے سہیل سعید، فریال سہیل، ریحان سعید، گل رخ ریحان، وقار سعید اور عظمیٰ وقار کے ساتھ ان تمام بچوں کے نام...... اس دعا کے ساتھ کہ وہ پردیس میں رہنے کے باوجود اپنی زبان اور اپنی ثقافت سے ہمیشہ جڑے رہیں۔

سلطانہ مہر

سلطانہ مہرؔ
سخن شناسی کی بے تاب لہر

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

شاعری کے حوالے سے اردو ادب کی تاریخ میں خواتین کی شرکت اگرچہ شروع ہی سے رہی ہے لیکن پدری معاشرے کا دباؤ' مشرق پر کچھ اس انداز کا رہا ہے کہ خواتین کو بحیثیت شاعرہ پوری طرح ابھر کر سامنے آنے کا موقع نہیں ملا۔ ہرچند کہ شاعرات کے متعدد تذکرے انیسویں صدی میں لکھے گئے اور شاعرات کی تعداد بھی سینکڑوں میں ظاہر کی گئی لیکن کسی ایک شاعرہ کو بھی میدان سخن میں مردوں کی ہم سرو حریف بن کر نمایاں ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔ لائق سے لائق شاعرہ کو کبھی کسی کمہ کر' کبھی طوائف کا نام دے کر' کبھی شاعر کے بجائے متشاعر ٹھہرا کر اور کبھی کسی مرد شاعر کی خوشہ چین و پروردہ قرار دے کر اسے کم رتبہ و بے توقیر ثابت کیا گیا۔

انیسویں صدی کے اختتام تک یہی صورت رہی البتہ بیسویں صدی کے نصف اول میں جدید تعلیم اور قومی تحریکوں کے زیر اثر چند خواتین اپنے معاشرے کی منحوس بندشوں کو توڑ کر آگے بڑھیں۔ سب سے پہلے ایک معتبر و انقلابی شاعرہ کی حیثیت سے ز' خ' ش (زاہدہ خاتون شیروانی) سامنے آئیں' پھر ادا جعفری نے قدم جمایا' فکشن کے حوالے سے اول اول حجاب اسماعیل اور بعد ازاں رشید جہاں و ممتاز شیریں کے نام اخبارات و رسائل میں نمودار ہوئے۔ ان میں ممتاز شیریں نے سخن شناسی و تنقید میں بھی اپنا نقش بٹھایا۔

بیسویں صدی کے نصف دوم آغاز کے پہلے یعنی ۱۹۵۰ء سے خواتین اہل قلم نے ایک بڑے قافلے کی صورت اختیار کر لی اور اس نے اردو شاعری اردو افسانہ' ناول تحقیق اور تنقید سب کو اپنے حصار میں لے لیا۔ سلطانہ مہر دراصل اسی اولین قافلے کی شریک سفر ہیں۔ اس لئے کہ ان کا پہلا افسانہ ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا۔ پھر وہ نظم و غزل کی طرف رجوع ہوئیں اور جلد ہی انھوں نے

صحافت و ادارت، ناول و افسانہ اور سخن شناسی و سخن وری سب میں ایسی مشق و مہارت حاصل کر لی کہ اردو کی جملہ اصناف شعر و ادب کے حوالے سے ان کا نام اور کام منظر عام پر آنے لگا۔ "روزنامہ جنگ کراچی" اور "انجام" جیسے موقر اخبارات میں وہ کالم لکھنے لگیں۔ یکے بعد دیگرے اردو کو متعدد ناول اور افسانوں کے مجموعے دیئے۔ ساتھ ہی ساتھ ادب کی مبصر و مہتمم کی حیثیت میں بھی ممتاز ہو گئیں۔ چنانچہ ۱۹۸۰ء میں انہوں نے ماہنامہ "روپ" کو سنوارنے بنانے کی ذمہ داری قبول کی اور خود کو ایک بلند پایہ مدیر ثابت کر دکھایا، روپ پورے دس سال تک اردو ادب کے افق پر پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں رہا اور سلطانہ مہر کی تخلیقی و تنظیمی صلاحیتوں کا اعتراف کراتا رہا۔ پھر نہ جانے کراچی کو کس کی نظر کھا گئی کہ اس شہر کا ادبی رنگ روپ اچانک ماند پڑنے لگا۔ لکھنے والوں اور سوچنے والوں کے دل ڈوبنے لگے، میکدہ شعر و ادب کے بلا نوش تلچھٹ کو ترسنے لگے اور واماندگی شوق نے پناہیں تلاش کرنی شروع کر دی۔ کراچی کے اس افسردہ روپ کو دیکھنے کی سلطانہ مہر میں تاب نہ رہی اور وہ بھی بعض اوروں کی طرح اپنے خون جگر سے سیراب و شاداب کئے ہوئے "روپ" کو چھوڑ کر کراچی سے باہر چلی گئیں اور زیر لب اس نوع کے اشعار گنگناتی رہیں کہ

تھا جوش و خروش اتفاقی ساقی
اب زندہ دلی کہاں ہے باقی ساقی
میخانے کا رنگ روپ بدلا ایسا
میکش میکش رہا، نہ ساقی ساقی

لیکن صہبائے ادب کی چاشنی عجیب ہوتی ہے، حالات کیسے ہی نامساعد ہو جائیں چھٹتی نہیں ہے، منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔ سلطانہ مہر کراچی سے باہر تو چلی گئیں لیکن ان کے مشاغل ادبی میں کمی نہیں آئی، بلکہ وہ پہلے سے بھی زیادہ فعال ہو گئیں۔ کراچی میں رہ کر انہوں نے "سخن ور" کے نام سے اردو کو ایک ایسی کتاب دی تھی جو ماضی کے پس منظر کے ساتھ ہم عصر شعر و ادب اور ان کے نمائندوں کو آئینہ دکھاتی تھی۔ نتیجتاً" ان کی یہ کتاب بہت جلد حوالے کی چیز بن گئی اور اس کا شمار معاصر ادب کی مختصر لیکن معتبر شعری و ادبی تاریخ میں ہونے لگا۔ اس کتاب کے ذریعے پاکستانی ادب کی خوشبو اور مٹھاس، پاکستان سے باہر دور دور تک پہنچی اور دنیا کے ہر گوشے کے اردو خواں طبقے نے اس سے حسب توفیق لطف اٹھایا اور استفادہ کیا۔ پھر سخن ور کی یہی تتلی یعنی سلطانہ مہر، جہان ادب کے باغات کے سفر پر نکلی، طرح طرح کے پھولوں پر بیٹھی، ان کے رس، رنگ اور خوشبو سے اپنے ذہن و روح کو شاداب و سیراب کرتی رہی اور آخر کار ان کے آمیزے

سے "سخن ور حصہ دوم" کے عنوان سے شعر و ادب کا نیا گلدستہ بنا لائی یہی تازہ گلدستہ اس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے۔

یہ گلدستہ بھی اگرچہ بنیادی طور پر پاکستان نژاد ہے اور پاکستان کی آوارہ و پروارہ کلیوں اور پھولوں ہی کے رنگ اور خوشبو سے منور و معتبر ہے لیکن اس کا رنگ و ذائقہ و خوشبو "سخن ور حصہ اول" سے بہت مختلف ہے۔ ایسا ہونا بھی چاہیے تھا اس لئے کہ اس میں شامل شعراء و شاعرات ایک مدت سے پاکستان سے باہر ہیں۔ یورپ' مشرق وسطیٰ' برطانیہ' امریکہ' کینیڈا اور نہ جانے کہاں کہاں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے حسی تجربے' ذہنی رویے' جذباتی لہریں' مشاہداتی منظرنامے' مطالعاتی افق اور اظہاری اسالیب' پاکستان کے مختلف علاقوں میں بسنے والے شاعروں اور ادیبوں سے بہت مختلف ہیں۔ اتنے مختلف' اتنے نئے اور اتنے فکر انگیز ہیں کہ ہم میں سے بہت سے لوگ ان تخلیقات سے پورا لطف بھی نہیں اٹھا سکتے۔ ظلم یہ ہے کہ جو لوگ لطف نہیں اٹھا سکتے وہ اپنی ذہنی کم مائیگی کا اعتراف کرنے کے بجائے' بیرون ملک قلمکاروں کی' کاوشوں کو زبان و اسلوب کے اعتبار سے کھردری اور فکر و نظر کے لحاظ سے بے معنی قرار دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو نئے اسالیب اور جدید حسی تجربوں سے روشناس کرانا آسان نہیں ہے ان کے بارے میں غالب کے لفظوں میں صرف یہ کہہ سکتے ہیں کہ۔

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو
مئے و نغمہ کو یہ اندوہ ربا کہتے ہیں

ورنہ سچ بات یہ ہے کہ اردو کے جو شاعر و ادیب اس وقت پاکستان سے باہر ہیں' ان میں سے بیشتر بہت اچھا شعر کہہ رہے ہیں اور بہت اچھا لکھ رہے ہیں ان کی سوچ اور ان کی تحریروں میں اپنی ثقافت و تہذیب سے جڑے رہنے اور مشرقیت کو اپنی شناخت بنا کے رکھنے کے عناصر بھی ہیں اور ان عناصر کو عالمی ادب کے افق پر اجاگر رکھنے کی وہ کاوشیں بھی ہیں جو پاکستان اور پورے مشرق کے لئے فال نیک کی حیثیت رکھتی ہیں۔ فال نیک اس معنی میں کہ ان کی فکری جدوجہد اور ان کی تخلیقی امنگیں' ہر قسم کی تنگ نظری و عصبیت سے عموماً پاک ہیں اور اپنی تہذیب و ثقافت کو فکر و نظر کے عالمی افق پر جگ مگ جگ مگ کرتے ہوئے دیکھنے اور دکھانے کے متمنی ہیں۔ سلطانہ مہران کی انہی تمناؤں کو "سخن ور حصہ دوم" کے نام سے منظرعام پر لا رہی ہیں اور اردو کے رشتے سے پاکستان کو دور دراز کے ملکوں سے جوڑے رکھنے کی کوشش و سرجوشی میں مگن ہیں۔ اللہ سلطانہ مہر کو ہمیشہ خوش رکھے اور ان کے قلم کو زیادہ سے زیادہ معتبر و باوقار بنائے۔ (آمین)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

حرفِ چند

مشفق خواجہ

(۱)

۱۹۷۹ء میں سلطانہ مہر کا تذکرہ شعرائے پاکستان "سخنور" کے نام سے شائع ہوا تھا تو میں نے اس کا دیباچہ لکھا تھا۔ اور اب ان کے نئے تذکرے پر کچھ لکھنے کا مرحلہ درپیش ہے تو احساس ہوا کہ پہلے دیباچے کی بہت سی باتیں دہرائے بغیر بات نہیں بنے گی۔ لہٰذا مناسب نظر آیا کہ پہلے "سخنور" کا دیباچہ نقل کردیا جائے۔ باقی باتیں اس کے بعد ہوں گی۔

(۲)

پرانے زمانے کے صاحبانِ ذوق اور ادب دوستوں میں سے ہر ایک کے پاس ایک بیاض ہوتی تھی۔ کوئی اچھا شعر سنا لکھ لیا۔ کوئی کام کی بات کان میں پڑی، اسے درج کرلیا۔ کھانسی سے لے کر لاعلاج بیماریوں تک کے طبی نسخے جمع کرلئے۔ گھر کے بچوں کی پیدائش، افرادِ خاندان، دوست احباب اور معززینِ شہر کی تاریخ ہائے وفات مع مادہ ہائے تاریخ محفوظ کرلیں۔ غرض ان بیاضوں میں دنیا بھر کی ہر وہ چیز مل جاتی تھی جو کہیں اور نہیں مل سکتی تھی۔ ان بیاضوں میں شعروں کے جمع کرنے پر خاص توجہ دی جاتی تھی۔ کسی کے جی میں آیا تو شاعر کا نام بھی لکھ دیا، ورنہ بلا نام ہی سہی۔ کچھ لوگوں نے شاعروں کے نام کے ساتھ ان

کے حالات میں ایک آدھ جملہ بھی لکھ دیا۔ بس یہیں سے ہماری پرانی تذکرہ نویسی کا آغاز ہوگیا۔ "نکات الشعراء" (میر) سے لے کر "سخن شعراء" (نساخ) تک درجنوں تذکرے لکھے گئے، اور یہی ہماری ادبی تاریخ کی بنیاد ہیں۔ ان تذکروں میں ہزار خامیاں سہی، لیکن یہی ایک خوبی کیا کم ہے کہ ہم اپنے بے شمار شاعروں سے انہیں تذکروں کے ذریعے واقف ہیں۔

اللہ بھلا کرے مالک رام صاحب کا جو گزشتہ دس بارہ برس سے ہر مرنے والے ادیب کی سوانح عمری لکھ دیتے ہیں۔ اب تک وہ کوئی پونے دو سو ادیبوں اور شاعروں کے مختصر حالات زندگی لکھ کر "تذکرۂ معاصرین" کے نام سے تین جلدوں میں شائع کرچکے ہیں۔ حالات کے تلاش کرنے میں انہیں بے شمار دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ مرحوم ادیبوں کے رشتہ داروں، دوستوں اور جاننے والوں کو بار بار خط لکھتے ہیں۔ اخباروں میں شائع ہونے والی خبریں جمع کرتے ہیں تب کہیں جاکر بات بنتی ہے۔

شاعروں ادیبوں کے مرنے کے بعد ان کے حالات جمع کرنے کا خیال تو سبھی کو آتا ہے لیکن معلوم نہیں اس نیک کام کے لئے کسی کے مرنے کا انتظار کیوں کیا جاتا ہے۔ اگر کسی کے جیتے جی اس کے حالات لکھ دیئے جائیں اور اس سلسلے میں صاحب سوانح کی مدد بھی حاصل کرلی جائے تو سوانحی تحریر معتبر و مستند ہوسکتی ہے۔

آج سے بارہ سال قبل سلطانہ مہر نے روزنامہ "جنگ کراچی" میں "آج کا شاعر" کے عنوان سے ایک سلسلہ مضامین شروع کیا تھا۔ یہ کوئی دو سال جاری رہا اور اس کے تحت بیسیوں شعراء کے حالات زندگی شائع ہوئے۔ ان مضامین کے ساتھ ہر شاعر کا انتخاب کلام، تصویر اور عکس تحریر بھی شائع کیا جاتا تھا۔

یہ سلسلہ بہت مقبول ہوا لیکن اس کی یہی مقبولیت اس کے خاتمے کا سبب بھی بنی۔ بہت سے ایسے شاعر جن کے حالات فوری طور پر اس سلسلے میں شامل نہیں کئے جاسکتے تھے۔ ان کی فرمائشوں نے سلطانہ مہر کو اتنا پریشان کیا کہ انہوں نے عافیت اسی میں دیکھی کہ یہ سلسلہ ہی ختم کردیا۔ کاش ایسا نہ ہوتا۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہتا تو اردو کے سوانحی ادب میں قابل قدر اضافہ ہوتا۔

اخباروں میں جو چیزیں چھپتی ہیں، ان سے مستقل طور پر استفادہ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اخبار کی زندگی ایک دن کی ہوتی ہے۔ دوسرے دن کسی کو یاد بھی نہیں رہتا کہ کل اخبار میں کیا چھپا تھا۔ ایسے کتنے لوگ ہوں گے جنہوں نے اس مفید سلسلہ مضامین کے تراشے محفوظ کرلئے ہوں۔ اس قسم کی تحریروں کو کتابی صورت میں محفوظ کرنا ضروری ہوتا ہے۔

ہوئے۔

بیسویں صدی میں لے دے کے ایک ہی تذکرہ "خم خانہ جاوید" لکھا گیا اور وہ بھی مکمل نہیں ہو سکا۔ اب یہ حال ہے کہ ہم اپنے شاعروں ادیبوں کے بارے میں بنیادی معلومات حاصل کرنا چاہیں تو کوئی ایسی بات نہیں ملتی۔ جو ہماری رہنمائی کر سکے۔ خدا بھلا سلطانہ مہر نے بہت اچھا کیا کہ وہ اپنے مضامین کو کتابی صورت میں شائع کر رہی ہیں۔ "آج کی شاعرات" وہ ۱۹۷۴ء میں شائع کر چکی ہیں۔ اب شاعروں کے بارے میں مضامین "سخنور" کے نام سے شائع ہو رہے ہیں۔ پہلی جلد میں ساٹھ شاعروں کے حالات ہیں۔ دوسری جلد بھی عنقریب شائع ہو گی۔

آئندہ اوراق میں آپ کو شعراء کے جو حالات ملیں گے، ان کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ سلطانہ مہر نے ہر شاعر سے ملاقات کر کے اس کے حالات معلوم کئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض سوانحی خاکوں میں آپ بیتی کا رنگ نمایاں ہے۔ سلطانہ مہر نے ہر شاعر کے بارے میں بنیادی معلومات ہی جمع نہیں کیں بلکہ بعض مضامین پر ان کی آراء کو بھی اس طرح محفوظ کر دیا ہے کہ ہر شاعر کے ذہنی رجحانات اور ادبی نقطہ نظر سے بھی آگاہی ہو جاتی ہے۔

اس کتاب میں متعدد ایسے شعراء کے حالات شامل ہیں جن کے بارے میں اب تک بہت کم لکھا گیا ہے۔ اور بعض شاعر تو ایسے بھی ہیں جن سے متعلق سوانحی معلومات صرف اسی کتاب میں ملتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ صورتحال اس کتاب کی اہمیت و افادیت میں بہت اضافہ کرتی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب سراج الدین ظفر، سید محمد جعفری، تحسین سروردی اور بعض دوسرے شعراء کا انتقال ہوا تھا تو دہلی سے جناب مالک رام نے ان مرحومین کے حالات طلب کئے تھے۔ ان کے بارے میں سلطانہ مہر کے مضامین کے سوا کچھ نہیں ملا تھا۔ اور یہی میں نے مالک رام صاحب کو بھیج دیئے تھے۔ ان مضامین سے انہوں نے اپنی کتاب "تذکرۂ معاصرین" میں خاصا استفادہ کیا ہے۔

کتاب کا یہ پہلا حصہ جو آپ کے پیش نظر ہے۔ اس کے مضامین اسی صورت میں شائع نہیں ہو رہے۔ جس صورت میں یہ اخبار میں چھپے تھے۔ مصنفہ نے تقریباً سبھی مضامین میں مفید اضافے کئے ہیں اور بہت سے ایسے امور کا اضافہ کیا ہے جن کا تعلق ان مضامین کی اخباری اشاعت کے بعد کے زمانے سے ہے۔ کتاب میں چند مضامین ایسے بھی شامل کئے گئے ہیں جو کسی وجہ سے اخبار میں شائع نہیں ہو سکے تھے۔

سلطانہ مہر اردو کی نامور صحافی ہیں۔ وہ "جنگ" کے صفحہ خواتین کی انچارج ہیں لیکن

ان کی اصل حیثیت افسانہ نگار اور ناول نویس کی ہے۔ ان کے چار ناول اور افسانوں کا ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ ان کا ناول "جب بسنت رت آئی" اپنی نوعیت کی منفرد ادبی تخلیق ہے۔ اردو میں پہلی مرتبہ اس ناول کے ذریعے بمبئی کے بوہری اور میمن برادری کی معاشرت کی عکاسی کی گئی ہے۔ سلطانہ مہر کے افسانوں کے مجموعے "بند سپیاں" میں جو بیباکی اور جرات اظہار ملتی ہے' وہ اپنی مثال آپ ہے۔ انہوں نے اردو افسانے کو کوئی زندہ رہنے والے کردار دیئے ہیں۔ ان کرداروں کے ذریعے انہوں نے ہمارے معاشرے کے بعض خاص پہلوؤں کی جو تصویر کشی کی ہے وہ کچھ انہیں کا حصہ ہے۔ افسانہ نگار کی حیثیت سے سلطانہ مہر کی کامیابی کی گواہی عصمت چغتائی اور احمد ندیم قاسمی نے بھی دی ہے۔

سلطانہ مہر کا تعلق بمبئی کے ایک میمن گھرانے سے ہے۔ ان کی مادری زبان گجراتی ہے۔ اردو انہوں نے اپنے شوق اور محبت سے سیکھی ہے۔ معاملہ جب شوق کا ہو تو محنت رائیگاں نہیں جاتی۔ سلطانہ مہر کی قد آور ادبی شخصیت' اسی کاروبار شوق کی روشن مثال ہے۔

مجھے یقین ہے کہ زیر نظر کتاب ادبی حلقوں میں مقبول ہوگی اور کیا تعجب کہ اس مقبولیت کو دیکھ کر سلطانہ مہر اپنے اخبار میں اس سلسلے کو دوبارہ جاری کر دیں۔

(۳)

سلطانہ مہر کو اگر ایک بے قرار روح کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ انہیں ہر وقت کچھ نہ کچھ کرنے کی دھن سوار رہتی ہے۔ چند برس پہلے تک وہ "روپ" نام کا ایک ذاتی رسالہ نکال رہی تھیں جو اچھا خاصا مقبول تھا۔ مگر نہ جانے انہیں کیا سوجھی کہ امریکہ جا بسیں۔ یہ ان کی دوسری ہجرت تھی۔ پہلی ہجرت وہ تھی جب وہ مجبوراً ترک وطن کر کے بمبئی سے پاکستان آئی تھیں' مگر دوسری ہجرت میں حالات کی کسی مجبوری کو دخل نہیں تھا۔ یہ روح کی بے قراری کا معاملہ تھا۔ وہاں جا کر انہوں نے ایک نئی دنیا آباد کر لی مگر اس نئی دنیا میں بھی کام وہی کرتی رہیں جن سے پرانی دنیا آباد تھی۔ شاعری اور افسانہ نگاری کو نئے ماحول نے نئے نئے موضوعات دیئے اور ماضی' حال اور مستقبل کیساتھ آنکھ مچولی کا ایسا سلسلہ شروع ہو گیا کہ انہوں نے بیک وقت ان تینوں زمانوں میں زندگی کرنے کا ہنر سیکھ لیا۔ جب انسان اپنے حال کو ماضی کی خوشگوار یادوں سے معطر کرتا ہے تو آنے والا کل بھی اسی خوشبو میں بسا ہوا طلوع ہوتا ہے اور یوں تینوں زمانے لمحہ موجود میں ڈھل جاتے ہیں۔ سلطانہ مہر نے مریکہ میں جو شاعری کی ہے' وہ اسی لمحہ موجود کی شاعری ہے۔ اس شاعری کا بنیادی موضوع

"فاصلہ" ہے۔ یہ فاصلہ کہیں وقت کی وجہ سے پیدا ہوا ہے اور کہیں زمین کی وجہ سے۔ اسی ضمن میں دو تہذیبوں کا درمیانی فاصلہ بھی جسے بعد بعید کہا جا سکتا ہے، سلطانہ مہر کے لئے تشویش کا باعث بنتا ہے۔ ان کی نظم "دیکھو کب آتے ہیں رفوگر" اسی صورتحال کی ترجمان ہے۔ سلطانہ مہر نے امریکہ میں قیام کے دوران جو افسانے لکھے ہیں، وہ بھی اسی "فاصلے" کے ترجمان ہیں جو دونوں ہجرتوں میں سے کسی ایک کے پیدا کردہ مسائل کے گرد گھومتے ہیں۔

سلطانہ مہر نے امریکہ میں بھی شاعروں کے بارے میں لکھنے کا شغل جاری رکھا۔ اب کے انہوں نے اردو کے ان شاعروں کو موضوع بنایا جو پاکستان سے باہر تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اردو ادب صرف برصغیر کی زبان نہیں رہی۔ یہ رابطے کی ایک بین الاقوامی زبان بن چکی ہے۔ اردو بولنے والے دنیا کے مختلف خطوں میں جا بسے تو ان کی زبان بھی خوشبو کی طرح چار سو پھیل گئی۔ آج دنیا کا شاید ہی کوئی ملک ایسا ہوگا جہاں اردو بولنے والے موجود نہ ہوں۔ جہاں اردو بولنے والے ہوں گے، وہاں شاعری بھی ضرور ہوگی کہ ہماری تہذیب دراصل شعر و سخن کی بلکہ غزل کی تہذیب ہے۔

پاک و ہند سے باہر رہنے والے اردو شاعروں کے بارے میں کم از کم چار کتابیں میرے علم میں ہیں۔ پہلی کتاب "تذکرہ شعرائے حجاز" ہے جو ۱۹۶۹ء میں شائع ہوئی اور جسے مولانا امداد صابری نے لکھا ہے۔ دوسری کتاب بھی انہی کی ہے۔ "جنوبی افریقہ کے اردو شاعر" جو ۱۹۷۸ء میں چھپی تھی۔ ۱۹۸۱ء میں باقی احمد پوری کی کتاب "دھوپ کے شاعر" شائع ہوئی جس میں کویت کے اردو شاعروں کا تذکرہ ہے۔ ۱۹۹۳ء میں "مشرق وسطیٰ میں اردو" کے نام سے سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، سلطنت عمان، قطر، کویت اور بحرین کے اردو شاعروں کا تذکرہ شائع ہوا۔ یہ کتاب سید قمر حیدر قمر اور ان کے تین ساتھیوں نے مشترکہ طور پر مرتب کی تھی۔

یہ سب کتابیں، جیسا کہ ان کے ناموں سے ظاہر ہے، مختلف علاقوں کے شاعروں کے بارے میں ہیں۔ اب تک کوئی ایسی کتاب نہیں لکھی گئی جس میں دنیا کے تمام خطوں کے شعرائے اردو کا ذکر ہو۔ سلطانہ مہر نے اس کمی کو نہایت عمدگی سے پورا کیا ہے۔ زیر نظر کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا شاید ہی کوئی ملک ہوگا جہاں اردو کے شاعر موجود نہ ہوں۔ ظاہر ہے کہ سلطانہ مہر کو اس کا دعویٰ نہیں ہے کہ اس کتاب میں انہوں نے دنیا بھر کے اردو شاعروں کا احاطہ کر لیا ہے، اور ایسا دعویٰ کیا بھی نہیں جا سکتا، تاہم انہوں نے

شاعروں کی ایک خاصی تعداد کے کوائف اس کتاب میں جمع کر دیئے ہیں' اور جن میں سے بعض شاعر ایسے ہیں جن کا ذکر کسی دوسری جگہ نہیں ملتا۔

سلطانہ مہر نے پاکستانی ہونے کے ناتے' یعنی ہندوستان میں مقیم شاعروں کو بھی غیر ملکوں میں آباد شعراء میں شامل کر لیا ہے اور چند ہندوستانی شاعروں کے حالات بھی کتاب میں درج کئے ہیں۔ میرے خیال میں انہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ ہندوستان کے شاعروں کو ان شاعروں کی صف میں لا بٹھانا ٹھیک نہیں جو انگلستان' جرمنی' امریکہ' کینیڈا اور مشرق وسطٰی میں قیام پذیر ہیں۔ ہندوستان تو تمام دنیا میں اردو شاعری کے بہنے والے دریاؤں کا منبع ہے اور ایک الگ کتاب کا نہیں' کئی کتابوں کا موضوع بن سکتا ہے۔ بہرحال ہندوستان میں مقیم جن چند شاعروں کے حالات اس کتاب میں ملتے ہیں انہیں سلطانہ مہر کی علمی کشادہ دستی کا فیضان سمجھنا چاہئے۔

سلطانہ مہر نے یہ تذکرہ مرتب کرنے کے لئے ایک جامع سوالنامہ تیار کیا جو شعراء کو بھیجا گیا اور ان کے جوابات کی روشنی میں حالات مرتب کئے گئے۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اس تذکرے میں شعراء کے مستند حالات ہیں۔ لیکن بات صرف اتنی ہی نہیں ہے' جن شعراء سے موصوفہ ذاتی طور پر واقف ہیں ان کے بارے میں انہوں اپنے ذاتی تاثرات اور مشاہدات بھی بیان کر دیئے ہیں' اس طرح شاعروں کے تعارف ناموں میں کہیں کہیں شخصی خاکے کی بھی شان پیدا ہو گئی ہے۔

مجھے امید ہے کہ آئندہ جب کبھی اردو کی عالمی سطح پر پذیرائی کی تاریخ لکھی جائے گی تو سلطانہ مہر کی یہ کتاب بنیادی ماخذ کے طور پر استعمال کی جائے گی۔

مشفق خواجہ

۱۶۔۶۔۱۹۹۶ء

گہر ہونے تک.....

سلطانہ مہر

سخن ور (حصہ اول) کے انٹرویوز لینا میرے لئے اتنا مشکل نہ رہا تھا کیونکہ شعراء سے دوبدو ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ میں سوالات پوچھتی تھی جوابات ملتے تھے۔ سوال سے سوال پیدا بھی ہوتے تھے۔ میں نوٹس لیتی تھی کیونکہ اس زمانے میں ٹیپ ریکارڈر عام نہ ہونے کی وجہ سے مہنگے بھی تھے اور میرا بجٹ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر میں لکھتی تیز تھی اس لئے دشواری محسوس نہیں ہوتی تھی۔

"سخن ور" (حصہ دوم) کی نوعیت مختلف تھی۔ میں نے سوالات ترتیب دیئے اور اپنی سوانح یا اعمال نامہ (Bio-Data) کے ساتھ شعراء وشاعرات کو روانہ کردیئے تاکہ انہیں یہ یقین دہانی ہوجائے کہ کسی نوآموز نے شوقیہ یا تفریحاً" یہ مشغلہ نہیں اپنایا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس سلسلے کا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا گیا۔ میرے کام میں تیزی آتی چلی گئی۔

"سخن ور" (حصہ دوم) کا سوالنامہ بیس سوالات پر مشتمل تھا۔ کئی لوگوں نے خاصی وضاحت سے جواب دیئے جنہیں پڑھ کر لکھنے والوں کی سوچ اور فکر کے کئی زاویے سامنے آئے کئی مشورے بھی ملے ہیں۔ خاص کر آج کے نقاد کے رویے کے سلسلے میں اور اردو

زبان کے مستقبل کے حوالے سے۔ میرے مرتب کردہ سوالات اور ان کے جوابات پر مبنی تعارف پڑھنے کے بعد یہ احساس بھی ملتا ہے کہ یہ تعارف اس رواں صدی کی کہانی سناتے ہیں۔ ہجرتوں کی کہانیاں، جنھوں نے اردو نثر و شاعری کو متاثر کیا۔ تبدیلی سوچ کی کہانیاں جو اردو ادب پر اثرانداز ہوئیں۔ سخن ور میں ان شعراء و ادیب سے آپ متعارف ہو رہے ہیں جنھوں نے حالات کا پنجہ مروڑا۔ اور ان سے بھی جو حالات کی چکی میں پس گئے مگر سرنگوں نہ ہوئے۔ ان سب کی کہانیاں ان سوالات کے پس پردہ ہیں۔ سخن ور شعراء کا تعارف ہی نہیں ان کے اپنے عہد کی تاریخ بھی ہے۔

کچھ لوگوں نے بیس سوالات کو طویل قرار دیا چنانچہ میں نے لکھ دیا کہ جتنے سوالات کے آپ مناسب جانیں جواب لکھ دیں۔ چنانچہ آپ ایسے انٹرویوز بھی پڑھیں گے جن میں صرف ایک دو سوالات کے جواب دیئے گئے ہیں۔ میں نے تمام انٹرویوز کو سلیقے سے آراستہ کیا ہے لیکن شعراء کے جواب میں اپنی طرف سے کمی بیشی نہیں کی۔ بیشک طوالت سے گریز کیا ہے۔ اسی طرح ان کا کلام بھی آپ کی خدمت میں جوں کا توں پیش کیا ہے۔ آپ سے بھی تھوڑی سی رعایت کی طالب ہوں کیونکہ یہ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی کہ پاک و ہند میں رہنے والوں کو کتابوں، ریڈیو، ٹی وی، مشاعروں اور محفلوں سے رہنمائی و اکتساب کے جو مواقع حاصل ہوئے ہیں بیرون ملک رہنے والوں کو یہ تمام سہولتیں میسر نہیں۔ چنانچہ وہ بلاشبہ بہت سی رعایتوں کے مستحق ہیں۔

میں چاہتی تھی کہ چھ ماہ میں یہ کام ختم کردوں لیکن کچھ مہربانوں کے بے توجہی سے تاخیر ہوئی اور ایسی تاخیر کہ میرا کراچی جانے کا پروگرام طول پکڑ تا گیا۔ اس اثناء میں کراچی میں مقیم میری امی ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔ یہ صدمہ کچھ کم ہوا تو میں پھر اپنے کام میں لگ گئی۔ کچھ لوگوں نے سوالنامہ کھو دیا۔ انہیں دوبارہ بھیجا۔ کچھ کی مصروفیات جواب دینے میں مانع رہیں۔ کچھ نے نامکمل تعارف بھیجا یعنی میرے کسی سوال کا جواب ندارد۔ صرف ان پر لکھے گئے مضامین کی فوٹو کاپی معہ کلام و تصاویر منسلک تھی۔ میں نے انہیں شامل نہیں کیا۔ سوالات کے جواب بہرحال ضروری تھے۔ چنانچہ احباب کا تعاون اب سخن ور حصہ دوم کی شکل میں آپ کے سامنے حاضر ہے۔

میں شکر گزار ہوں جناب یونس دہلوی اور ادریس دہلوی کی کہ ان کے ماہنامہ "شمع دہلی" (ہندوستان) سے مجھے شعراء و شاعرات کے پتے ملے۔ انگلینڈ کی سحر مہدی اور رحمٰن مہدی کی محبتوں کی شکر گزار ہوں کہ جنھوں نے کئی انٹرویوز معہ تصاویر مجھے بھیجے کیونکہ

رحمٰن مہدی ایک اچھے فوٹوگرافر بھی ہیں اور ایک بہت اچھے ہمدرد انسان بھی۔ کینیڈا کے عابد جعفری، ارشد عثمانی اور تسلیم الٰہی زلفی نے تعاون کیا۔ جرمنی کی نعیمہ ضیاء الدین نے دوستی کا حق نبھایا۔ میری لینڈ امریکہ کی موناشہاب اور ہالینڈ کے محمد اشرف نے بھی بڑی مدد کی۔

کراچی میں جناب ڈاکٹر جمیل جالبی، جناب ڈاکٹر وحید قریشی، جناب ڈاکٹر فرمان فتح پوری، جناب مشفق خواجہ، جناب حمایت علی شاعر اور جناب راغب مراد آبادی نے بڑے خلوص و محبت سے میرا بوجھ بانٹا۔ میں ان تمام صاحبان کی بطور خاص ممنون ہوں کہ ان کے مشوروں، حوصلہ افزائی اور تعاون سے سخن ور حصہ دوم آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

میں جناب آذر زوبی کی بھی شکرگزار ہوں جن کی محبت نے سخن ور اول کے ٹائٹل کو حسن بخشا تھا اور اب سخن ور حصہ دوم کے سرورق کو بھی انہوں نے بنایا، سجایا اور نکھارا۔

میری خواہش ہے کہ میں "سخن ور حصہ سوم" کے کام کا آغاز کروں۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا اور اس کی عنایتیں شامل حال رہیں تو میں حصہ سوم میں ان پاکستانی شعراء و شاعرات کا تعارف کتابی صورت میں یکجا کروں گی جن پر کام نہیں کر سکی ہوں۔

سلطانہ مہر

۱۴جون ۹۶ء کراچی

Sultana Meher
16514 Jersey St
Granada Hills, CA91344 , U.S.A.
Ph: (818) 831 - 0279
Fax: (909) 444 - 0077

اظہار اثر

میں تو افلاک سے آگے کا پرندہ ہوں اثر
بال جبریل بھی شامل ہے مرے شہپر میں

اظہار اثر
۹۶/۴/۱۳

Izhar Asar
Y-5 New Ranjeet Nager
New Delhi 110008. INDIA

اظہار اثر

(دہلی ہندوستان)

آج کل انسان ایک ایسے نئے نظام اقدار اور نظام فکر کی تلاش میں ہے جس سے اس کا ایک بہتر زندگی گزارنے کا خواب پورا ہو سکے۔ آج وہ پھر ایک بار ان بنیادی سوالوں کو دوبارہ اٹھا رہا ہے جو صدیوں پہلے کبھی اٹھائے گئے تھے اور جن کے جواب اس نے حاصل کر لئے تھے جیسے ماہر معاشیات ماہر عمرانیات اور مختلف علوم کے سائنس دان اپنے اپنے میدان میں نئے اور پرانے سوالات کے کچھ اور وسیع جوابات کی تلاش میں ہیں اسی طرح آج کا ادیب اور مفکر بھی اپنے اپنے دائرے میں رہ کر یہ سوالات اٹھا رہے ہیں اور یہ سوال خواہ آج کے ترقی یافتہ سائنسی معاشرہ میں ادب کی اہمیت کے مسئلے پر اٹھایا جائے یا ادب کے سماجی عمل، اس کے اثرات اور اس کے رشتوں کے مسئلے پر اٹھایا جائے۔ سب کچھ اس صدی کے بدلے ہوئے حالات کا نتیجہ ہے۔ آج کے انسان کا شعور تیزی سے بدل رہا ہے۔ ایک کرب اور بے چینی ہے۔ ہر منظر بدلا ہوا ہے اور آج کا انسان اپنی فکر کے اس دباؤ میں ہے کہ اپنے راستے اور منزل کا تعین کرے۔ اظہار اثر بھی انہی میں سے ایک ہیں۔ اظہار کا یہ شعر دیکھیں۔

لہو جلاؤ چراغوں میں روشنی کے لئے
ہمارے دور کا سورج تو شب گزیدہ ہے

اظہار ۵ جولائی ۱۹۲۹ء کو یوپی ہندوستان کے ضلع بجنور کے قصبہ کرت پور میں پیدا ہوئے۔ ان دنوں دہلی میں ہیں۔ ہائی اسکول تک تعلیم حاصل کی۔ ابتدا ہی سے انہیں اپنی پرورش آپ کرنا پڑی۔ انتہائی ذہین اور تخلیقی صلاحیتوں سے مالا مال ہیں۔ ادب کی کوئی صنف ایسی نہیں جس میں

انہوں نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔ ناول' افسانے' ڈرامے' انشائیے' تنقید اور خصوصی طور پر سائنس پر مقبول عام مضامین اور شاعری۔ بنیادی طور پر سائنس کے میدان کے آدمی ہیں لہٰذا شاعری میں بھی انہوں نے کئی تجربے کئے ہیں۔ جیسے ان کی ایک نظم جس کا عنوان ہے "سیاہ سورج"۔ کہتے ہیں۔

کبھی میں بھی تھا اک روشن ستارہ
خلاء کی تیرگی کو بخشتا تھا نور میں نے بھی
مگر اب تو قتیل وقت ہو کر رہ گیا ہوں
مرے اندر اندھیرا بڑھ رہا تھا
میں اپنی روشنی خود پی گیا ہوں

اظہار کو شعر کہنے کے لئے کسی تحریک کی ضرورت نہیں۔ ذہن کے ساتھ کی ضرورت ہے۔ بس میں سفر کر رہے ہیں۔ ذہن آمادہ ہے تو دو تین غزلیں اکٹھی ہو جاتی ہیں اور کبھی مہینوں کوشش کے باوجود ایک شعر نہیں کہہ پاتے۔ اور شاید اسی کا نام "شعور کی رو" ہے۔

اظہار کہتے ہیں "میں کسی مکتبہ فکر سے متاثر نہیں ہوں۔ کسی نظریہ کے تحت شعر نہیں کہتا۔ لیکن یہ ضرور مانتا ہوں کہ اچھا تخلیق کار وہی ہے جس کا فن افادی پہلو لئے ہوئے ہو یعنی قاری کو کچھ دے۔

اظہار کے کلام کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ غزلوں کا مجموعہ "بشارت" اور نظموں کا مجموعہ "لاشریک".. ان کا کہنا ہے کہ لاشریک کی نظمیں ایک تجربہ ہیں۔ اس کی بیشتر نظموں میں سائنسی نظریات استعمال کر کے میں نے شاعری میں سائنس کو سمونے کی کوشش کی ہے۔ اظہار کا دعویٰ ہے کہ کسی بھی زبان کی شاعری میں یہ پہلی کوشش ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے بیشتر رسائل میں ان کا کلام شائع ہو چکا ہے۔ ابلاغ کے قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ادب میں اگر ابلاغ نہیں تو اسے ادب نہیں کہا جا سکتا۔ اسے کوئی اور نام دے دیجئے۔

تنقیدی محفلوں کے حامی ہیں کہ یہ ذہن کو روشنی دیتی ہیں۔ کیوں کہ یہ فنکاروں کی دوستانہ محفلیں ہوتی ہیں لیکن آج کل جو تنقید لکھی جا رہی ہے بیشتر گمراہ کن ہے۔ ایسی تنقید شعر و ادب کی راہیں بھی متعین نہیں کرتی۔ کیوں کہ تخلیق کار کسی نقاد کا محتاج نہیں ہوتا۔ تخلیق کو کسی بے ساکھی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کے نزدیک جانبدار نقادوں کا وجود ادب کے لئے سم قاتل کی حیثیت رکھتا ہے۔

امریکہ اور یورپ میں اردو کی بقاء کے لئے ان کا مشورہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ اردو زبان کے

رسائل اور اخبارات شائع کیے جائیں اور ادبی محفلیں اور مشاعرے کیے جائیں اور بلاامتیاز گروپ شعراء و شاعرات بلائے جائیں۔

اظہار کو اس سے انکار ہے کہ آج زندگی سے بھرپور ادب تعمیر کیا جارہا ہے۔ ایسا ادب جس کی جڑیں اپنی زمین میں دور تک پیوست ہوں۔ لیکن آج کا ادب اپنے عہد کا، آج کی بکھری ہوئی زندگی اور ذہنی تشنگی کا ترجمان ضرور ہے۔ اور اس کی وجہ ان تنقید نگاروں کا رویہ ہے جن کی دوہری پالیسی ان کی اپنی ساکھ تو بنائے ہوئے ہے مگر ادب کو نقصان پہنچا رہی ہے۔ اظہار کا کہنا ہے کہ آج میر اور غالب کی مقابلے کا کوئی شاعر اس پوری صدی میں نہیں پیدا ہوا۔ علامہ اقبال کی شاعری سے اسلامی تبلیغ کا عنصر نکال لیجئے تو کیا رہ جائے گا۔ اس کا فیصلہ قاری خود کر سکتا ہے۔ فیض احمد فیض بہت اچھے شاعر ضرور تھے لیکن عظیم نہیں۔ زیادہ تر شاعر اس لئے بڑے شاعر بن جاتے ہیں کہ ان کا کلام اچھے موسیقار گالیتے ہیں اور عوام موسیقی کی وجہ سے ان کا کلام پسند کرنے لگتے ہیں۔

اظہار ان دنوں اپنا ذاتی ماہنامہ "اظہار ڈائجسٹ" دہلی سے شائع کر رہے ہیں۔

یہ دونوں غزلیں بہت قدیم سر جدید رنگ میں کہی گئی ہیں------ یہ ایک طرح کا تجربہ ہے۔ دونوں غزلوں میں ایک ہی قافیے استعمال کیے گئے ہیں...... (اظہار اثر)

(قدیم)

کیوں نہ ہو مجھ سے یہ بجنت کے تن میں سورج
تیری زلفوں میں ہے شب، گورے بدن میں سورج

گر سرِشام وہ مہ رُخ پہ گلگشت آئے
جاتے جاتے بھی پلٹ آئے چمن میں سورج

چاند تاروں کا تو کیا ذکر ہے اے ماہ جبیں
تیرے آنچل کی ہے ایک ایک کرن میں سورج

آرسی اُس نے جو شرما کے لبوں پہ رکھ لی
میں یہ سمجھا کہ دہکتا ہے دہن میں سورج

عکسِ فن

زیرِ آنچل وہ ترا گورا بدن تھا ظالم
یا شبِ وصل میں آیا تھا گہن میں سورج
وصل کی شب تری چوٹی میں جو بندہ اُلجھا
رات بھر چمکا کیا سانپ کے پھَن میں سورج
قبر میں ہووے نہ تکلیف فرشتوں کو اثر
بعدِ مُردن کوئی رکھ دیجو کفن میں سورج

(جدید)

یوں دہکتا ہے تری یاد کا تَن میں سورج
جیسے بہتا ہو لہو بن کے بدَن میں سورج
کم نگاہی سے زمانے نے انھیں پھول کہا
ورنہ ہم نے تو اگائے تھے چمن میں سورج
رات بھر ہم نے اجالوں کی نگہبانی کی
صبح کو بٹ گیا ایک ایک کرن میں سورج
کیسی یہ پیاس ہے موجوں کی جو بجھتی ہی نہیں
روز اترتا ہے سمندر کے دہن میں سورج
میرے سائے نے مجھے ایسے چھپا رکھا ہے
جس طرح چاند سے آتا ہے گہن میں سورج
ہاتھ میں لے کے عصا تم یدِبیضا تو دکھاؤ
لوگ دیکھیں تو سہی سانپ کے پھن میں سورج
زیست نے داغ جو بخشے ہیں چمکنے دو اثر
مت چھپاؤ ابھی لفظوں کے کفن میں سورج

اختر سعید خان اختر

یہ زندگی ہو تو کیا خاک زندگی کیجے

نفس نفس مرا میزانِ احتساب میں ہے

اختر سعید خاں

Akter Saeed Khan
C/O Mr. Nisar Rahi Advocate
P/44, Teela JamalPura
BHOPAL, 462001 _ INDIA

اختر سعید خان اختر
(بھوپال، ہندوستان)

اردو شاعری میں اختر سعید خاں اختر ایک اہم نام ہے۔ ۲ر اکتوبر ۱۹۲۳ء کے دن بھوپال (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ لاہور، دہلی، علی گڑھ میں تعلیم حاصل کی۔ بی۔اے۔ایل۔ایل۔بی کے بعد بھوپال میں وکالت کی۔ سیاسی سرگرمیوں کے باعث ایک سال تک روپوشی کی صورت میں بمبئی میں رہے۔ ویسے مشاعروں میں شرکت کے سلسلے میں دبئی، شارجہ، ابوظہبی، مکہ مکرمہ، مدینہ اور احباب سے ملنے پاکستان جا چکے ہیں۔ زندگی کے مشاہدات اور تجربات کا نچوڑ ان کی شاعری ہے۔ یہ شعر ملاحظہ ہو۔

نہ جانے لوگ اسے کیا سمجھ کے بھول گئے
وہ ایک درس جو مہر و وفا کے باب میں ہے

انہوں نے جب شعر کہنا شروع کیا اس زمانے میں ایک طرف حالی، اقبال، جوش وغیرہ کی شاعری تھی تو دوسری طرف حسرت، فانی، اصغر، یگانہ اور جگر کی غزل تھی۔ اختر دونوں سے متاثر تھے لیکن غالب رجحان غزل کی طرف تھا اور اس کی جمالیات کے ایک طرح سے اسیر تھے۔ شاعری میں کسی سکہ بند نظریات کے قائل نہیں لیکن اس کے ضرور قائل ہیں کہ شاعری کو خوبصورت انسانی اقدار، صداقت اور سچائی کے حسن سے مزین ہونا چاہیے۔ ان خیالات کو شاعری کا جز بنانا نہیں چاہیے جن سے انسانی اعلیٰ اقدار کو ٹھیس پہنچتی ہو۔

اختر کی تخلیقات ملک کے مختلف رسائل میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ زیادہ تر غزلیں "شاعر" بمبئی اور "افکار" کراچی میں شائع ہوئیں۔ ان کے کلام کے دو مجموعے ابھی تک شائع ہوئے

ہیں۔ پہلا مجموعہ مدھیہ پردیش اردو اکیڈمی نے ۱۹۹۴ء میں شائع کیا جس کا نام "نگاہ" ہے۔ دوسرا مکتبہ جامعہ دہلی نے شائع کیا جس کا نام "طراز دوام" ہے۔ ان کے بارے میں مکتبہ جامعہ کے "کتاب نما" نے ایک خصوصی نمبر کتاب کی شکل میں شائع کیا ہے جس میں ہندوستان کے مقتدر ناقدین، ادباء اور شعراء کے مضامین ہیں۔ کتاب کا نام ہے "شخصیت اور ادبی خدمات۔ اختر سعید خاں"

ابلاغ کے متعلق کہتے ہیں کہ "ادب اور شاعری کے لئے ابلاغ ضروری ہے۔ جہاں تک اسالیب کا تعلق ہے اصولاً تو زبان کو آسان ہونا چاہیے لیکن اگر فکری موضوعات کو اصطلاحات کے بغیر ظاہر نہ کیا جاسکے تو ان کا شعر میں استعمال ایک مجبوری ہے۔ فنکار کی ہنرمندی یہ ہے کہ وہ مشکل اسلوب کو بھی ایسے خوش گوار انداز میں پیش کرے کہ بات دل میں اترتی چلی جائے۔ اور ہاں مجھے اس سے اتفاق نہیں کہ ہماری تنقید ادب و شعر کے لئے نئی راہیں متعین کرتی ہے۔ تخلیق اپنے لئے خود راہ بناتی ہے اور تنقید اس راہ کے کامیاب یا ناکامیاب ہونے کا فیصلہ کرتی ہے۔ اس لئے تخلیق پہلی چیز ہے اور تنقید ثانوی۔ اس سلسلے میں تنقیدی شعری محفلیں صرف اس حد تک ہمارے لئے معاون ثابت ہو سکتی ہیں کہ وہ شعری اور ادبی محاسن اور مصائب کی نشاندہی کر سکتی ہیں۔

آپ کے اگلے سوال کے جواب میں کہوں گا رسائل اب بھی پڑھے جاتے ہیں۔ کتابیں اب بھی چھپ رہی ہیں۔ ادبی اور علمی پروگرام اب بھی ہوتے ہیں اور شاید پہلے سے زیادہ۔ جہاں تک عدم مقبولیت کا تعلق ہے اس کے بارے میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ پچھلے تیس چالیس برس سے جس نوع کی شاعری کی جارہی ہے یا افسانے لکھے جارہے ہیں وہ ہمارے پڑھنے والوں کو اپیل نہیں کرتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اردو پڑھنے والوں کا دائرہ سمٹتا جارہا ہے۔ اور اردو زبان کے ذریعہ جو ذہنی تربیت عام ہوگئی تھی وہ اب بہت کم ہوگئی ہے۔ میرے نزدیک اس مسئلے کا حل صرف دو باتوں پر منحصر ہے۔ پہلی بات 'اردو کی ترویج واشاعت' دوسری بات 'شعروادب کو انسانی زندگی اور ذہن کے قریب تر لانے کی کوششیں۔ امریکہ کے رہنے والوں کی زبان انگریزی ہے۔ اگر وہاں اردو والے رہتے ہیں جو یقیناً ہیں' تو انہیں اس چراغ کو خود جلائے رکھنا ہوگا"۔

آج کی شاعری کا تعلق زندگی سے ہے یا نہیں اس سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ "اردو شاعری پر ہی منحصر نہیں، دنیا کی کسی زبان کی شاعری اور ادب زندگی سے بے تعلق نہیں ہوتی۔ اور اگر وہ بے تعلق ہوتی ہے تو خود اس کی جڑیں خشک ہوجاتی ہیں۔ آج کے لکھنے والے اس بات سے غافل نہیں ہیں کہ ہمارا ادب زندگی سے بھرپور ہو۔ لیکن بدقسمتی سے ادب کا پیرایۂ اظہار زندگی سے

دور دور نظر آتا ہے۔

ہر اچھے ادب اور شعر کی پہچان یہی ہے کہ وہ اس کے وجود کا اقرار اور اس کے عہد کی گواہ ہوتی ہیں لیکن رسمی ادب وشعر اس قول کی ترجمانی نہیں کرتے۔

بڑی شاعری ذات کے حوالے سے بھی کی جا سکتی ہے اور اس وقت بھی جنم لیتی ہے جب شاعری کا نکتہ نظر وسیع تجربات اور مثبت فکر ومطالعہ پر مشتمل ہو۔ سوال صرف ہنرمندی کا ہے۔ اگر بات ذات کے حوالے سے ہنرمندی سے کہی گئی ہے تو وہ اس سے زیادہ بڑی ہے جو وسیع تجربات اور اثباتی فکر ومطالعہ کے پس منظر میں کہی جائے۔ لیکن بے ہنری کے ساتھ۔ جہاں تک عمل کا تعلق ہے دونوں طرح کے نمونے آج بھی اردو شاعری میں نظر آتے ہیں۔ شعراء کا حوالہ دینا ضروری نہیں ہے"۔

اختر کبھی کبھی نثر میں ہلکے پھلکے مضامین لکھ لیتے ہیں۔ جن کا نشانہ کبھی ان کی اپنی ذات ہوتی ہے اور کبھی سماج کا وہ کوبڑ جو ہر جگہ اور ہر ماحول میں نظر آتا ہے۔ کہتے ہیں کہ "رشید احمد صدیقی کا قول اس سلسلے میں حرف آخر ہے۔"

غزل

وہ جس کا ایک ورق، دستِ آفتاب میں ہے
مرا پتہ بھی اسی گم شدہ کتاب میں ہے

نہ جانے لوگ اسے کیا سمجھ کے بھول گئے
وہ ایک دَرس جو مہر و وفا کے باب میں ہے

کبھی تو برسے گی ابرِ بہار کی صورت
وہ پیاس جو ابھی گم موجِ سَراب میں ہے

اٹھائے جاتا ہوں عمرِ رواں کے ناز اختر
مگر سکوں میں ہے لذت نہ اضطراب میں ہے

عکس فن

غزل

سرشکِ خوں سرِ مژگاں کس اہتمام سے ہے
کسی کی شکل جو آنکھوں میں آج شام سے ہے

سیاہیِ شبِ ہجراں ہے دیدنی اس کی
جسے اُمیدِ کرم اک مہِ تمام سے ہے

مجھے وہاں لئے پھرتی ہے تشنگی کہ جہاں
طلوعِ جام کا مطلب شکستِ جام سے ہے

زمین رقص میں ہے آفتاب کی ضَو سے
مرے چمن میں بہاراں ترے خرام سے ہے

کچھ اور بھی ہیں غم ایسے کہ دل میں رکھ لیجئے
مگر وہ غم جسے نسبت تمہارے نام سے ہے

میری بساط سے باہر ہے آرزو تیری
مرا وجود، اسی ذوقِ ناتمام سے ہے

صحیفۂ غمِ دل ہی سہی، سنو تو کبھی
نوائے اخترؔ شوریدہ کس مقام سے ہے

سید حنیف اخگر

باسمہٖ تعالیٰ

نذرِ خلوص

محترمہ سلطانہ مہر صاحبہ کیلئے

پرخلوص دلی دعاؤں کے ساتھ

دعاجو دعاگو

سید محمد حنیف اخگر عفی عنہ

نیو یارک ۲۵ فروری ۱۹۹۶ء

S.M. Hanif Akhger
80-22, 159th St. Jamica, New York, 11432
U.S.A

حنیف اخگر

(نیویارک)

میری لاس اینجلس سے روانگی عید الفطر کے بعد ٹھہری تھی۔ میں نے رمضان شریف میں نیویارک فون کیا تو معلوم ہوا کہ سید حنیف اخگر صاحب اعتکاف میں ہیں۔ پھر میں منتظر رہی۔ گو میں سوالنامہ انہیں یکم اکتوبر ۹۵ء میں بھیج چکی تھی۔ یہ ان کا اصول ہے کہ وہ خط کا جواب فوراً ارسال کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے خط کے جواب میں فرمایا کہ وہ مشاعرے کے انتظامات میں مصروف ہیں۔ اور اب ۲۵ فروری ۹۶ء کو ان کا خط معہ جواب و کتاب کے ملا۔ یقیناً تاخیر سے۔ لیکن ان کی محبت بھری معذرتوں نے ساری کوفت دھوڈالی۔ تو آیئے ان سے جو گفتگو ہوئی ہے اس میں آپ بھی شریک ہوجایئے۔

سید حنیف اخگر نے بتایا کہ وہ ۳ ستمبر ۱۹۲۷ء کو پیدا ہوئے۔ بچپن ملیح آباد اور بھوپال میں گزرا۔ والد محترم قاضی سید محمد شریف اثر اور والدہ محترمہ رضی النساء پڑھے لکھے نیک سیرت عبادت گزار تھے۔ ان دونوں کی محبت آمیز قیادت نے حصول علم کی راہوں پر چلنے اور بہتر مستقبل کی تعمیر کے لئے جدوجہد کا سبق سکھایا۔ دونوں بزرگوں نے اگرچہ کسی کالج یا یونیورسٹی سے کوئی ڈگری حاصل نہیں کی تھی لیکن ان کی اردو' فارسی اور عربی کی بنیادی تعلیم کی بدولت اخگر صاحب نے فیض اٹھایا۔ پھر بھوپال کے سلمانیہ کالج سے انہوں نے منشی فاضل کا کورس کیا۔ مگر والدہ کی علالت کی وجہ سے امتحان نہ دے سکے۔ مارچ ۴۸ء میں انہوں نے ہائی اسکول کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ لیکن اس سے تین ماہ قبل ان کی والدہ کو موت کے ظالم پنجوں نے ان سے جدا کردیا۔ ۲۱ جون ۱۹۵۰ء میں ان کی شادی ہوئی۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۵۰ء میں حنیف اخگر پاکستان آگئے۔

سید حنیف اخگر

۲۴ جنوری ۱۹۵۱ء کے دن گرینڈ لیز بنک لمیٹڈ سے وابستہ ہوئے۔ والدہ مرحومہ کی ہدایت تھی کہ تعلیم کا سلسلہ منقطع نہ کرنا اور ابا میاں کی تاکید بھی چنانچہ نائٹ کالج میں داخلہ لیا اور کراچی کے اردو کالج سے بی۔کام اور پھر ایس ایم لاء کالج سے ایل ایل بی کی ڈگری لی۔ سلسلہ تعلیم جاری رکھتے ہوئے انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے پوسٹ گریجویٹ ڈپلومہ اور ایم بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ ملازمت کے سلسلے میں انہوں نے دنیا کا بڑا حصہ دیکھ ڈالا۔ ایک طویل عرصہ کی جدوجہد نے انہیں ملازمت میں اعلیٰ عہدوں سے نوازا اور سرخروئی سے '۲ مئی ۱۹۸۹ء کو یو این او کی ملازمت سے سبکدوشی حاصل کی۔ ان کی رفیقہ حیات سعیدہ خاتون نے زندگی کے ہر موڑ پر ان کا ساتھ دیا اور یہ ثابت کر دیا کہ ایک خاندان کی کامیابی میں عورت کا ہاتھ اور ساتھ ہو تو منزلیں قریب تر ہو جاتی ہیں۔

حنیف اخگر بچپن سے ہی خوش گلو تھے۔ ان کی امی بچپن میں ان سے محسن کاکوروی اور امیر مینائی کی نعتیں پڑھوا کہ بڑے ذوق و شوق سے سنتی تھیں۔ اور نہ صرف سنتی تھیں بلکہ محو ہو جاتی تھیں۔ ان کی محویت اور جذب کے عالم نے حنیف اخگر کے ذوق شعری کو نکھارا۔ پھر ان کی داد و شاباشی نے ان کا حوصلہ اور بھی بڑھایا۔ لکھنؤ کے امیرالدولہ اسلامی کالج کی ادبی و شعری فضا نے ان کی رہنمائی کی۔ اکثر طرحی مشاعروں میں انہوں نے انعامات لئے۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۷ء کا دور شعر و ادبی سرگرمیوں کا تاریخی دور تھا۔ مسلم لیگ اور تحریک پاکستان کی مہم بڑے زور و شور سے جاری تھی۔ رات دن لکھنؤ کے نوجوان شعراء کی رفاقت حاصل تھی۔ ان کا قیام مستقل نواب راحت سعید خان آف چھتاری کے بنگلے میں تھا جہاں آئے دن شعر و ادب کی محفلیں جمتی تھیں اس وقت لکھنؤ کے نوجوان غزل کہنے والوں میں شاعر لکھنوی کے جدید رنگ تغزل کا بڑا شہرہ تھا۔ گلی کوچوں میں ان کی وہ غزل گونج رہی تھی جس کی ردیف "آنسو" تھی۔ اس کا ایک شعر ملاحظہ ہو۔

کر دیا دل کو ترے درد نے نازک ایسا
سانس بھی لی تو نکل آئے ہمارے آنسو

حنیف اخگر شاعر لکھنوی سے ملنا چاہتے تھے مگر ان کی نازک طبعی کی داستانیں سن کر ان کا حوصلہ نہ پڑا۔ اس زمانے میں چھوٹوں کا بڑوں کو داد دینا اور ان سے بے تکلفی سے پیش آنا خلاف تہذیب سمجھا جاتا تھا اور انہیں تمنا تھی کہ اپنے اشعار ان کے طرز اظہار کی کسوٹی پر پرکھیں۔ یہ تمنا پوری ہوئی ۱۹۶۴ء یا ۱۹۶۵ء میں۔ اور وہ ساری داستانیں غلط ثابت ہوئیں۔ شاعر لکھنوی تو سراپا ناز اور سراپا محبت تھے۔ اس وقت ان کا شمار پاکستان کے ممتاز غزل کہنے والوں میں ہوتا تھا۔

سید حنیف اخگر

نومبر ۱۹۸۷ء میں شاعر لکھنوی نیویارک آئے تو حنیف صاحب کے مجموعہ کلام "چراغاں" کے مسودے کا بغور مطالعہ کر کے پسندیدگی کا اظہار کیا تو ان کی ہمت بندھی۔ پھر "حلقہ فن وادب" شمالی امریکہ کے احباب کے اصرار پر ان کا مجموعہ کلام شائع ہوا یہ پہلا شعری مجموعہ ہے جو اس حلقے کے حوالے سے شائع ہوا۔

شاعر لکھنوی (مرحوم) نے ان کی شاعری پر بڑا نفیس اور فکر آمیز تبصرہ کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ "ان کی (حنیف اخگر کی) ظاہری شکل وشباہت پر بیک نظر مولوی ہونے کا گمان گزرتا ہے لیکن اس ظاہری سطح کے نیچے ایک مومن' زندہ دل اور عاشق پاکباز کے اتحاد کی ایک خوبصورت علامت ہے۔ اور اس حوالے سے کہا جاسکتا ہے کہ ان کے کلام میں عاشقانہ طرحداری تو ہے' مولویانہ ریاکاری نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہئے کہ ان کی فکر میں جمال پرستی تو ہے لذت پرستی نہیں"۔

اور یہ حقیقت بھی ہے۔ محترم شاعر لکھنوی مردم شناس آدمی تھے۔ جنہوں نے محفلوں میں حنیف اخگر صاحب کو دیکھا ہے' وہ جانتے ہیں کہ ان کی شخصیت کتنی باغ وبہار ہے۔ دوستوں کی محفل میں ان کی چست فقرے بازی اور حاضر جوابی قہقہوں کی ایک کیفیت پیدا کردیتی ہے۔ وہ لفظوں کا استعمال بڑے سلیقے سے کرتے ہیں۔ وہ دوستوں کے دوست ہیں لیکن دشمنوں کے دشمن نہیں ہیں۔ یہ سلیقہ انہوں نے ان والدین کی تربیت سے پایا ہے جو خود ایک مثالی کردار کے مالک تھے اور حنیف اخگر ان کی ایک نہایت مطیع اور فرمانبردار اولاد ہیں۔ انہوں نے والدین کی عطا کردہ تہذیب اور طرز معاشرت کے ورثے کی پوری پوری نگہبانی کی ہے۔ اور یہ تہذیب اور فکر ان کی شاعری سے بھی آشکارا ہے۔ ان کی شاعری میں انفرادیت ہے۔ وہ معاشرے کی زبوں حالی سے گھبرا جانے والے لوگوں میں سے نہیں۔ کہتے ہیں۔

قفس کا عیش اذیت اٹھائے کون بھلا
اگر ہوائے چمن سب کو راس آنے لگے

"کیا شاعری کا حالات اور زندگی کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا ضروری ہے؟"
اس سوال کے جواب میں حنیف اخگر کہتے ہیں کہ جو شاعری اپنے وقت کے تقاضوں سے ہم آہنگ نہ ہو وہ وقت کے ساتھ ساتھ خود بخود مسترد ہو جاتی ہے۔ اس ضمن میں ان کا اپنا شعر ملاحظہ ہو۔

اخگر کچھ اور وسعت احساس چاہیے
اس دور میں غزل کے ہیں امکاں نئے نئے

اس دیار غیر میں حنیف اخگر نے اپنی شاعری کے ذریعے تہذیبی جہاد کیا ہے۔ ان کے اشعار میں کیفیت مصنوعی نہیں ہیں نہ رسمی مضامین ہیں۔ ان کا باطن بھی ان کے ظاہر کی طرح سچائیوں کا آئینہ ہے، شعر ملاحظہ ہو۔

دیکھو ہماری سمت کہ زندہ ہیں ہم ابھی
سچائیوں کی آخری پہچان کی طرح

دہلی ہندوستان میں ۱۹۸۸ء میں منعقد ہونے والی اردو عالمی کانفرنس میں انہیں خواجہ میر درد ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ ان کا دوسرا مجموعہ کلام "خیاباں" تکمیل کے آخری مراحل میں ہے۔ حنیف اخگر اپنے بچوں کے اصرار پر اپنی سوانح مرتب کرنے میں مصروف ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں کامیابی عطا کرے۔ آمین

نعت

"مقصد ہر نظر محمدؐ ہیں"
جلوۂ معتبر محمدؐ ہیں

فخر جن و بشر محمدؐ ہیں
محرم بحر و بر محمدؐ ہیں

دافع جہل و شر محمدؐ ہیں
یعنی خیرالبشر محمدؐ ہیں

ہمدم نوحؑ و عیسیٰؑ و موسیٰؑ
خضرؑ کے راہبر محمدؐ ہیں

ان پہ شام و سحر درود اخگر
دل میں آٹھوں پہر محمدؐ ہیں

حنیف اخگر

عکس فن

حمد

مالک کون و مکاں تیرے سوا کوئی نہیں
دو سرا میں صرف تو ہے' دوسرا کوئی نہیں

دل میں شوق حمد رب کی انتہا کوئی نہیں
اس سے بہتر زندگی کی ابتدا کوئی نہیں

ہے زباں پر قل ھواللہ احد اے لاشریک
توہی توہے توہی توہے دوسرا کوئی نہیں

ہر نفس پر سیکڑوں ارماں ہیں مصروف طواف
کعبہ دل میں مگر تیرے سوا کوئی نہیں

ہر دعا شامل ہے اخگر سورۂ الحمد میں
سورۂ الحمد سے بڑھ کر دعا کوئی نہیں

ارشد عثمانی
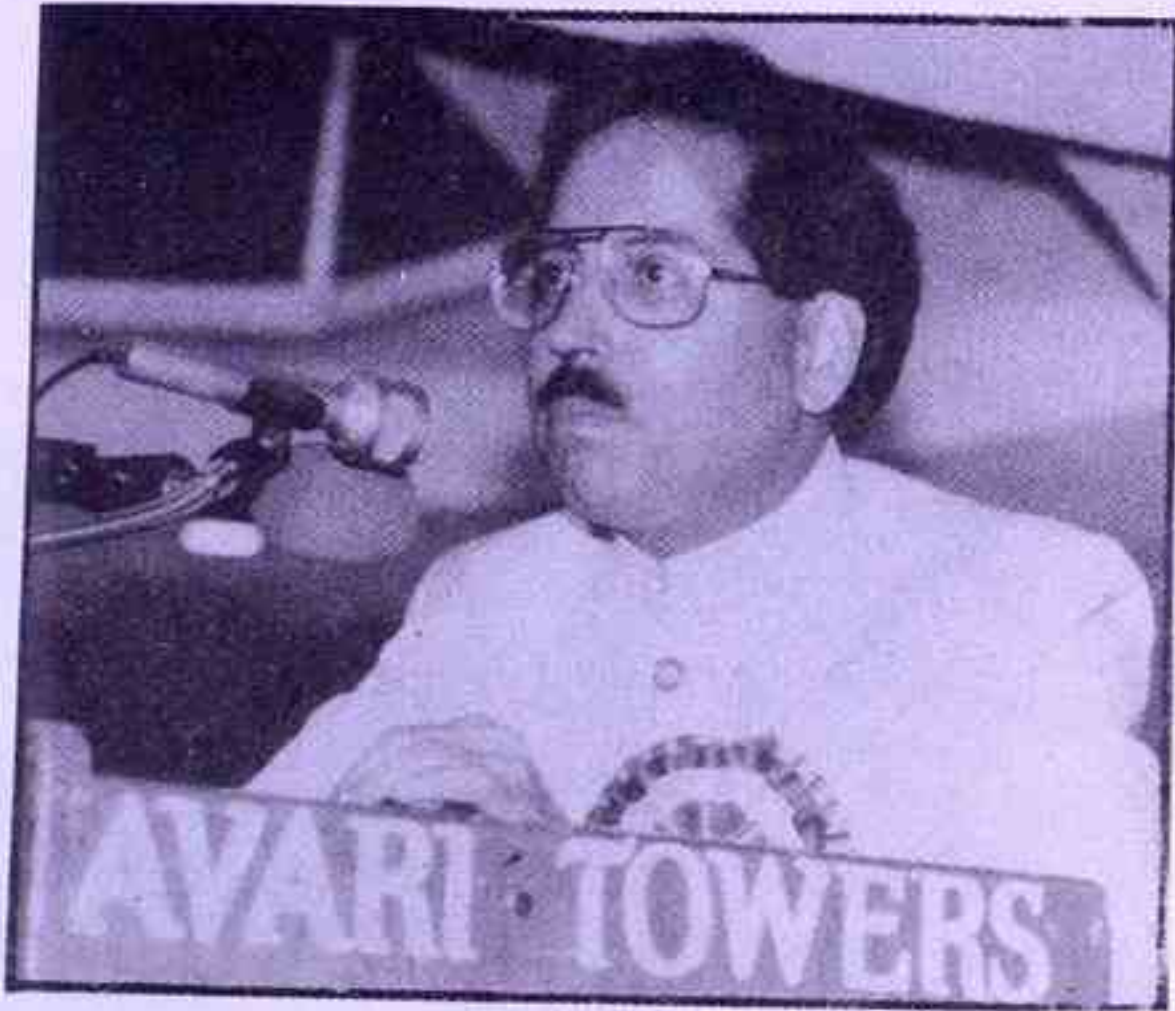
یوں تو تمام شہر ہی ہنس کر ملے مجھے
لیکن سبھی کے ہاتھ میں پتھر ملے مجھے

چہرے سے بے زبان دکھائی دیا تھا وہ
جس کی سخنوری میں سمندر ملے مجھے

ارشد عثمانی
اوٹاوا
یکم نومبر ۱۹۹۵ء

Arshad Usmani
P.O.Box 56130, 407
LAURIER AVE, W- OTTAWA
ONT. KIR 7Z1 - CANADA

ارشد عثمانی

(کینیڈا)

روزنامہ "جنگ" کے حوالے سے تو میں ارشد عثمانی کو جانتی تھی۔ ان کی لکھی رپورٹیں پڑھتی تھی۔ وہ دبئی میں ان دنوں جنگ کی نمائندگی کرتے تھے پھر جب میں نے اپنا ماہنامہ "روپ" شائع کرنا شروع کیا تو ارشد عثمانی کی خدمات حاصل کیں۔ رپورٹوں اور انٹرویوز کے علاوہ "روپ" کے لئے انہوں نے ایک انعامی مقابلہ بھی شروع کیا جو دلچسپی کا حامل تھا۔ یوں ارشد کو جب قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو اندازہ ہوا کہ ارشد کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ وہ ہمہ رنگ ہیں۔ نچلے بیٹھ ہی نہیں سکتے۔ کچھ نہ کچھ کرتے رہنا ان کی فطرت کا خاصہ ہے۔ وہ دبئی میں بھی دھومیں مچاتے تھے اور اب کینیڈا آکر بھی ہنگامے برپا کر رہے ہیں۔ یعنی ٹیلیویژن شو، اسٹیج شو اور مشاعرے۔

والدین کا رکھا ہوا نام ارشد حسین عثمانی ہے۔ اپنے نام کو مختصر کر کے انہوں نے تخلص بھی نام سے لیا۔ یعنی ارشد۔ ۱۹۵۰ء میں کراچی میں پیدا ہوئے۔ اسلامیہ کالج سے بی کام کیا اور اعلیٰ تعلیم کے حصول کا پروگرام بنایا تو ان کے والد تجمل حسین عثمانی مرحوم کے ایک شاگرد جو یونائیٹڈ بینک میں اعلیٰ افسر تھے۔ انہوں نے بینک میں ملازمت کی پیشکش کی۔ ارشد کو یہ پیشکش پرکشش لگی اور گو اس وقت دبئی اردو ادب کے حوالے سے اتنا زرخیز نہ تھا پھر بھی ارشد دبئی برانچ میں ذمہ داریاں سنبھالنے روانہ ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد انگلستان کے برکلیز بینک میں بلایا گیا تو ارشد یو بی ایل چھوڑ کر برکلیز بینک جا پہنچے اور ترقی کرتے ہوئے تھوڑے عرصے میں ہی نائب مدیر کے عہدے پر فائز ہوئے۔

ارشد کے والد عربی اور فارسی کے جید عالم تھے۔ رگوں میں دوڑتے ہوئے ان کے خون نے ارشد کو کم عمری میں ہی اکسا کر شاعری کی دنیا میں پہنچا دیا۔ والد نے کم عمر بیٹے کے جوہر پرکھ کر بھرپور رہنمائی کی۔ ایک طرح سے وہ ارشد کے استاد بھی تھے۔ مشاعرے میں جانے سے قبل ارشد کا کلام دیکھتے۔ اس کی نوک پلک سنوارتے۔ یوں ارشد کو مشاعروں میں پذیرائی ملی تو حوصلے بھی بلند ہوئے لیکن متحدہ عرب امارات میں دوسری مصروفیات کی بناء پر رجحان شاعری سے

رپورٹنگ تک جا پہنچا۔ یوں محترم میر خلیل الرحمٰن مرحوم کی حوصلہ افزائی سے جنگ کے ذریعے ان کی نثری تخلیقات منظر عام پر آئیں۔ اس ضمن میں اشتیاق اظہر صاحب (آج کے سینیٹر) جو اس زمانے میں کراچی میں حکومت پاکستان کے محکمہ اطلاعات میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر تھے ارشد کے مضامین کی اصلاح کرکے پاکستان کے مختلف اخبارات و رسائل میں اشاعت کے لئے بھیج دیتے۔ مرحوم شہاب دہلوی نے بھی خاصا تعاون کیا تھا۔ لہٰذا اس زمانے میں لوگ انہیں شاعر سے زیادہ کمپیئر کی حیثیت سے جانتے تھے کیونکہ ارشد عثمانی نے ثقافتی شو پیش کرنے کی ٹھان لی تھی۔

۱۹۹۱ء میں ارشد عثمانی کا پہلا مجموعہ کلام "محبتوں کا قرض" شائع ہوا۔ اب دوسرا مجموعہ کلام زیر طبع ہے۔ ساتھ ہی میر خلیل الرحمٰن مرحوم پر ایک کتاب "میر کارواں" زیر اشاعت ہے۔

کینیڈا آنے کے بعد ارشد کا ناطہ اردو ادب کے ساتھ ساتھ اردو کے اخبارات سے بھی جڑا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ٹیلی وژن سے بھی اردو کا پروگرام کر رہے ہیں۔ ٹیلی وژن پر ان کا اسٹیج پروگرام "نیلام گھر" پچھلے دو سال سے پیش کیا جارہا ہے اور خاصا مقبول ہے۔ راجرز کیبل جس کے تحت "نیلام گھر" پیش کیا جارہا ہے کینیڈا کا سب سے بڑا ٹیلی وژن نیٹ ورک ہے۔ اس ادارے نے ارشد کو تین اعلیٰ ایوارڈز سے نوازا ہے۔ حکومت کینیڈا نے ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر انہیں "بہترین شہری رضاکار" ایوارڈ اپنی وزیر برائے سٹیزن شپ ایلین زجیا کے ہاتھوں دلوایا۔

اردو کی بقا کے سلسلے میں اظہار خیال کرتے ہوئے ارشد عثمانی نے بتایا کہ نئی نسل میں اردو زبان کو متعارف کرانے اور ان کی اس میں دلچسپی پیدا کرنے کے لئے والدین کو کوشش کرنی چاہئے۔ کیونکہ اگر آج کے بچے جو اردو داں گھرانوں میں پیدا ہونے کے باوجود اردو نہیں جانتے تو یہ کوتاہی ان کے والدین کی ہے جو حقائق سے چشم پوشی کر رہے ہیں جبکہ وہ اس کی سنگینی سے بھی باخبر ہیں کہ ان کی کور ذوقی اور لاپرواہی سے اردو زبان شدید ترین نقصانات سے دوچار ہوگی۔

اس سنگین مسئلے کو حل کرنے کے لئے ارشد نے کہا کہ نئی نسل کو اردو زبان سے آشنا کرنے کے لئے جدید آلات سے مدد لی جائے اردو کے کمپیوٹر، ویڈیو اور ٹیلی وژن کے ذریعہ ادبی پروگرام مشاعروں اور دوسرے ثقافتی پروگراموں کی روداد اور دوسرا دلچسپ لٹریچر انہیں مہیا کیا جائے۔ اردو لکھنا، پڑھنا سکھانے کے لئے قریبی اسلامک سینٹرز میں کلاسیں قائم کی جائیں۔ نئی نسل کو یہ احساس دلانا بھی ہماری ذمہ داری ہے کہ مشرقی روایات اور اردو زبان سے محبت ہی میں ہماری بقا ہے۔ یہ ہمارا قومی ورثہ ہے اور اپنے ورثے کی حفاظت کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔ اردو باقی رہی تو اردو زبان کا ادب بھی باقی رہے گا۔

ارشد عثمانی

عکسِ فن

عقیدت

اپنے ماضی کے اجالوں سے عقیدت ہے مجھے
اپنے بچپن کے کھلونوں سے محبت ہے مجھے

اپنے گھر کے در ودیوار سجانے کے لئے
میں نے محسوس کیا تیری ضرورت ہے مجھے

یہ الگ بات کہ میں خانماں برباد رہا
اپنے آباء کی انا سے تو چاہت ہے مجھے

اس لئے میں نے کسی اور کو چاہا ہی نہیں
بات یہ ہے کہ فقط تجھ سے ہی الفت ہے مجھے

اِس نے تو جاتے ہوئے لوٹ کے دیکھا بھی نہیں
ارشد اِس شہر میں جس شخص سے نسبت ہے مجھے

ارم انصاری

گیا جو سرپرست تھا گھرانے کا
گھر میں اب آٹا ہے نہ چینی ہے

ارم انصاری

خبردار! عدو
ظالمو خمن ۔

Erum Ansari
900 East Blv South, APT I,136
PONTLAC MI, 48341 U.S.A.

ارم انصاری
(مشی گن، امریکہ)

ارم انصاری شعروادب کی دنیا میں ابھی نووارد ہیں لیکن ان کا مطالعہ اور سوچ کی پختگی نے مختصر عرصے میں ہی ان کے لئے راہیں روشن کردی ہیں۔ جدوجہد کے اس سفر کی داستان سناتے ہوئے ارم کہتی ہیں کہ "نووارد ہونے کی حیثیت سے میں یہ قطعی نہیں کہوں گی کہ آج کے ادب میں تازگی نہیں اور لوگ چبائے ہوئے نوالے اگل رہے ہیں لیکن جو میں نے پڑھا ہے اس کے پیش نظر میں یہ تو کہہ سکتی ہوں کہ آج کی شاعری موجودہ عہد کی مکمل ترجمان ہے اور اس کا واضح ثبوت وہ شاعری ہے جو موجودہ دور میں ان مظلوموں کے احساسات کی ترجمان ہے جن پر دنیا کے مختلف خطوں میں جور و ظلم ڈھائے جارہے ہیں۔ یہ شاعری احتجاجی بھی ہے اور آج کے دور کی عکاس بھی۔ آج بہت سے شعراء نے نئی فکر کا دروازہ کھولا ہے اور دور حاضر کے سینئر شعراء کے سفر کو آگے بڑھایا ہے۔ جیسے ان شعراء عزیز حامد مدنی، ماہ طلعت زاہدی، عشرت آفرین، مظہر بخاری، احمد فراز، قاسمی صاحب، حمایت صاحب، محسن احسان اور راسخ عرفان کا نام اس وقت ذہن میں آرہا ہے"۔

ارم کا پورا نام ارم انصاری ہے۔ تخلص ارم۔ بیس سال قبل ۲۰ جنوری کے دن حیدر آباد سندھ (پاکستان) میں پیدا ہوئیں۔ کراچی کے سینٹ جوزف کالج سے بی۔اے کیا۔ ان کے والد صاحب کیڈٹ کالج پشاور میں پروفیسر تھے۔ دادی نے انہیں گود لیا ہوا تھا۔ کچھ سال انہوں نے والدین کے ساتھ گزارے لیکن جب والد ملازمت کے سلسلے میں افریقہ چلے گئے تو ارم دادی اور پھوپھی کے ساتھ کراچی میں ہی رہیں۔ دادی کی وفات کے بعد ان کے والدین کراچی آگئے تو

ارم انہی کے ساتھ رہنے لگیں۔ پھر شادی کے بعد کچھ مہینے انہوں نے شوہر کے ساتھ انگلینڈ میں گزارے۔ پچھلے تین چار سال سے ارم انصاری مشی گن امریکہ میں ہیں۔

شاعری کے ساتھ ساتھ ارم نے نثر کے میدان میں بھی کچھ تجربے کئے۔ افسانے لکھے جو کالج کے جریدے کے علاوہ دیگر رسائل میں بھی شائع ہوئے۔

"ارم شعر کہنے کا ادراک کب ہوا؟" سوال سن کر ارم بولیں۔ "میں یہ تو نہیں کہونگی کہ بچپن ہی سے میں نے اپنی شعر کہنے کی صلاحیت کا ادراک کرلیا تھا۔ یہ انکشاف مجھ پر نویں جماعت میں ہوا جب ایک دن فارغ وقت میں میرا قلم کاغذ پر میرے احساسات کا ترجمان تھا اور ذہن ودل نے اس کا پورا پورا ساتھ دیا۔ وہی ہوا جو مرزا غالب بہت پہلے کہہ گئے تھے کہ۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

یہ آگہی بہت خوش کن تھی' گھر والوں نے بھی بہت حوصلہ افزائی کی۔ میں سمجھتی ہوں کہ ہر شاعر کے سینے میں ایک حساس دل دھڑکتا ہے اور چونکہ حساس انسان ہر بات اور واقعے کو زیادہ گہرائی سے محسوس کرتا ہے چنانچہ یہی حساس طبیعت' جذباتیت اور دوسرے انسانوں کو سمجھ کر اس حقیقت میں خود کو ڈھال لینے کی صلاحیت ہی میری ادب اور شاعری سے وابستگی کے بنیادی محرکات تھے۔ محرک تخلیق اور طرز ادا کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کلام اتنا ہی پر اثر ہوتا ہے جتنا کہ تخلیق کار کا ذہن اس بات کو پیش نظر رکھے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ زندگی میں مجھے ہر طرح کا آرام میسر ہے۔ تباہی' انتشار اور ظلم وستم دیکھتی ہوں تو دل شدت غم سے لہولہان ہوجاتا ہے۔ مسلمانوں کی زبوں حالی' بوسنیا' فلسطین' کشمیر کے مسائل' کراچی کی تباہی وبربادی یہ سب دل کے مسلسل درد کا باعث ہیں اور یہی دکھ اور درد کا جذبہ میرے لئے شعرگوئی کا سب سے بڑا محرک بنتا ہے۔ آج انسانیت پارہ پارہ ہے اور انسان انسان سے نبرد آزما ہے۔

جناب لطف الرحمٰن صاحب کی کتاب "جدیدیت کی جمالیات" کے مطابق آج دنیا میں ہیروشیما کے بم کے مساوی تیرہ لاکھ بم ہیں۔ یعنی اب تک تقریباً تین ٹن ایٹمی دھماکے دنیا کے ہر فرد کا مقدر بن چکے ہیں اور ایٹمی جنگ تو دراصل قتل انسانی کا دوسرا نام ہے۔ یہی خوف اور دکھ میری شاعری کا محرک بن کر میری سوچ کا ترجمان بنتا ہے"۔

ارم نے جب انگریزی میں شاعری کی تو ان کی نظمیں "ڈان" اخبار میں شائع ہوتی تھیں۔ یہ سلسلہ کئی سالوں تک جاری رہا۔ "جنگ" اخبار میں کچھ غزلیں چھپیں۔ بچوں کے رسالے "تعلیم وتربیت" میں کہانیاں شائع ہوئیں اور پھر امریکہ میں "پاکستان لنک" میں کچھ غزلیں اور نظمیں شائع ہوئی ہیں۔ ان کے کلام کا ابھی تک کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے۔

"شاعری میں ابلاغ کیوں ضروری ہے؟" اس سوال کے جواب میں ارم کہتی ہیں کہ "ادب اور شاعری میں ابلاغ کا ایک بہت اہم کردار ہے اور آج کل نئی نسل کو اس طرف راغب کرنے کی ضرورت ہے میں سمجھتی ہوں آسان زبان اور اسلوب بہت کار آمد ثابت ہو سکتا ہے۔ ابلاغ کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہی ذریعہ ہے ادب کے فروغ کا۔"

اگلا سوال تنقید سے متعلق تھا۔ ارم کا جواب ہے کہ ہر اچھا شاعر اپنا نقاد آپ ہوتا ہے اور یہی خوبی اس کے کلام کو عروج بخشتی ہے۔ تنقید بلاشبہ ادب و شاعری کے لئے نئی راہیں متعین کرتی ہیں۔ اس سے کلام کو تقویت اور نکھار حاصل ہوتا ہے اور اس سے وابستہ تنقیدی شعری محفلیں بہت اہم ہیں کیونکہ یہ محفلیں تنقید برائے تنقید نہیں بلکہ تنقید برائے اصلاح ہوتی ہیں۔"

ارم اردو کی بقا کے سلسلے میں مشورہ دیتے ہوئے کہتی ہیں کہ "امریکہ میں اردو ادب کو ماشاء اللہ ریڈیو اور ٹی وی تک رسائی حاصل ہے لیکن نئی پروان چڑھنے والی نسل کے اس سے نابلد ہونے کی بڑی وجہ گھر کا ماحول ہے۔ اگر آپ ایک بچے کی مثال لیں تو گھر میں اگر والدین اس سے اردو میں گفتگو کرتے ہیں تو امریکہ میں تعلیم حاصل کرنے کے باوجود وہ اپنی زبان کو سمجھے گا۔ اس میں دلچسپی لے گا۔ یہ دلچسپی کس حد تک ہو سکتی ہے اس کا تعین بھی بنیادی طور پر گھر کا ماحول ہی کرتا ہے۔ اس کے لئے ہر شہر میں اردو کی تعلیم کا انتظام ہونا چاہیے۔

ارم انصاری

عکسِ فن

غزل

شام کیسی میرے آنگن میں اتر آئی ہے
دل میں ہے یاد تری عالم تنہائی ہے

مجھ کو ہر داغ پہ دل کے یہ گماں ہوتا ہے
جیسے یہ داغ نہیں لالہ صحرائی ہے

تجھ کو میں چاہتی ہوں اور مجھے معلوم ہے یہ
راز کھل جائے تو دونوں ہی کی رسوائی ہے

وہ سمجھتا ہے غزل جس کے لئے کہتی ہوں
مرے اشعار دل آویز میں گہرائی ہے

اپنی کھڑکی سے مجھے دیکھ رہا ہے وہ ارم
کیوں چکاچوند ابھی سے مری بینائی ہے

○

سید اسد اللہ حسینی

تجھے کاش معلوم ہوتا اسد
زمانے میں تجھ سا برا کون ہے

اسد حسینی

Syed A.Hussaini
13414 Bromwich St.
Arleta CA 91331-5614 , U.S.A

سید اسد اللہ حسینی چکر

(لاس اینجلس)

غالب کے ہم نام اسد اللہ حسینی نظم اور نثر دونوں میں دسترس رکھتے ہیں۔ ان کی باتیں دلچسپ اور معلومات افزا ہوتی ہیں۔ آج ان کی کہانی ان کی زبانی سنتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

"سید اسد اللہ حسینی میرا نام ہے۔ میں سنجیدہ شاعری میں اسد اور مزاحیہ یا ظریفانہ شاعری میں چکر تخلص کرتا ہوں۔ حیدر آباد (دکن) کے محلہ چنچل گوڑہ میں ۲۶ فروری ۱۹۲۵ء میں ولادت ہوئی۔ ابتدائی تعلیم میں نے اپنے والد محترم سے گھر ہی میں حاصل کی جس میں اردو، فارسی، گلستان، بوستان، انگریزی، حساب وغیرہ جیسے نصابی مضامین شامل تھے۔ ۱۹۳۸ء میں میٹرک درجہ اول سے پاس کرنے کے بعد عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن سے بی اے (گریجویشن) کی تکمیل کی۔ میں اپنے (ہائی اسکول اور یونیورسٹی کے) تعلیمی دور کو قابل فخر سمجھتا ہوں کہ اس میں مجھے بڑے مشہور اور قابل ترین استادوں، پروفیسروں اور لیکچراروں سے حصول علم کا موقع ملا جو تعلیم وتدریس کو ایک نہایت ذمہ دارانہ اور شریفانہ مصروفیت یا پیشہ خیال کرتے تھے اور اس خیال پر پوری پوری طرح عمل پیرا تھے۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد میں نے محکمہ اغذیہ (فوڈ کارپوریشن) اور دوسری جگہ اعلیٰ عہدوں پر ملازمت کی۔ جب حیدر آبادی حکومت (عثمان علی خاں آصف کالج کی سلطنت) کو مرکزی حکومت ہندوستان میں شامل کرنے کی غرض سے حیدر آباد دکن پر "پولیس ایکشن" یا فوجی کارروائی کی گئی اور حکومت حیدر آباد دکن کو "انڈین یونین" کا ایک حصہ قرار دے دیا گیا تو حیدر آباد کی حکومت کے بے شمار ملازمین (ادنیٰ سے اعلیٰ عہدوں تک) اس سیاسی انقلاب کا (خصوصاً مسلمان) بھیانک طور پر شکار ہوگئے۔ یہ دور حیدر آباد کی تاریخ میں رضاکارانہ دور کے نام سے مشہور ہے اور جس کو قاسم رضوی صاحب (مرحوم) کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے جن کو چند سال جیل میں رکھ کر ان کی خواہش کے مطابق پاکستان بھیج دیا گیا جہاں ان کا چند سال بعد انتقال ہوگیا۔

چونکہ میں ماں باپ کی اکلوتا بیٹا تھا اس لئے والد صاحب نے ترک ملازمت کر کے (جبکہ میں بفضل خدا بر سرِ ملازمت تھا۔ فوراً حیدر آباد دکن (شہر یا بلدہ) واپس ہونے کا حکم لکھ بھیجا اور میں اس حکم کے ملتے ہی ۸ گھنٹے بعد بمبئی سے حیدر آباد جانے والی پہلی ٹرین (جو تقریباً ۱۵ دن بند کردی گئی تھی) میں سوار ہو کر حیدر آباد روانہ ہوگیا۔ اورنگ آباد ریلوے اسٹیشن سے سکندر آباد (شہر حیدر آباد کا مشہور شہر اور فوجی مرکز) تک پہنچنے میں جو مشاہدے اور بھیانک اور روح فرسا مناظر میری آنکھوں نے دیکھے ہیں وہ ایک طویل اور بے حد دکھ بھری داستان ہے جس کو ایک علیحدہ کتابی شکل دی جاسکتی ہے۔ اور جو یہاں بے محل ہے۔ صرف اتنا کہہ سکتا ہوں "اللہ نہ دکھلائے جو دوران سفر دیکھا" (جگر کسی قدر تبدیلی کے ساتھ)

میری ترک ملازمت اور واپسی کے بعد میرے بعض احباب نے ان کے ساتھ پاکستان چلنے کا مشورہ دیا لیکن میں نے اپنے والد محترم کی بے پایاں محبت اور ان کی قربت کے پیش نظر ان کے مشورہ کو صاف طور پر ٹھکرادیا۔ پھر والد صاحب نے خود اپنے محکمہ مال (Revenue Dept) جہاں وہ مددگار معتمد (Asst Sec) تھے۔ اہلکار درجہ سوم (3rd Grade Clerk) کی جائیداد پر میرا تقرر کرادیا۔ یہ ایسی بات تھی جیسے مجھے ایک بلندی سے نیچے پھینک دیا گیا ہو لیکن میں بڑی ہمت اور کشادہ پیشانی سے کام انجام دیتا رہا جو میرے احباب اور رشتہ داروں کے لئے ایک عبرت ناک اور افسوس ناک بات تھی! اس کے باوجود عہدہ داروں کے فرقہ وارانہ اور تعصبانہ جذبات اور خیالات نے مجھے پھر ایک بار بے روزگار بنادیا اور گھر بٹھادیا! اس زمانے میں میری شادی بھی کردی گئی۔ لیکن میرے والد محترم نے پھر کوشش کر کے ملازمت دلانے والے محکمہ (Employment Dept) کے توسط سے مجھے محکمہ زراعت (Agriculture) میں دوبارہ اسی عہدہ (اہلکار درجہ سوم) پر ملازمت دلادی۔ جہاں تین سال بعد مجھے اہلکار درجہ سوم کے عہدہ پر ترقی ملی اور اس کے (۸) آٹھ سال بعد مجھے شعبہ تقررات کا (Supdt Section Officer) منتظم بنادیا گیا۔ اس عہدہ پر میں ماہ ستمبر ۱۹۷۷ء تک کارگزار رہا۔ عین اس وقت جبکہ میرا نام مددگار ناظم کی فہرست میں شریک کرلیا گیا تھا اور بہت قریب میں مجھے اس عہدہ پر ترقی دی جانے والی تھی میں نے ملازمت اور وطن دونوں کو خیرباد کہہ دیا اور اپنے بڑے سالے صاحب (برادر نسبتی) کی کوشش سے اپنی بیوی اور چھ بچوں کے ساتھ کیلیفورنیا (امریکہ) آگیا جہاں میرے برادر نسبتی ۱۴ سال سے مقیم تھے اور جہاں خود میں بھی ۱۷ سال سے مقیم ہوں۔ ویسے بھی ۶۸ء میں والد صاحب کا انتقال ہونے کے بعد ہی میرا دل بیٹھ گیا تھا۔ اپنے خاندان کی کفالت کے لئے میں نے امریکہ میں ملازمت کی۔ شکر

ہے خدا کہ عزت کے ساتھ زندگی گزاری۔ رقم جمع کی۔ مکان خریدا اور پھر ۱۵ مارچ ۹۰ء میں وظیفہ (Pension) پر سبکدوشی حاصل کرکے گوشہ نشینی اختیار کی اور "بیکار مباش کچھ کیا کر" کے مصداق میری مزاحیہ شاعری کا یہیں سے آغاز ہوتا ہے۔ چونکہ میں اردو ادب اور انگریزی ادب کا طالب علم رہا ہوں اس لئے مجھے ادب سے بے حد دلچسپی ہے۔ شاعری کے علاوہ میں چھوٹے چھوٹے مضامین' تنقیدیں اور تبصرے لکھا کرتا تھا جو مقامی رسالوں میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ ۷۳ء میں غالب کا "جذبہ رشک و حسد' کے عنوان کے تحت آل انڈیا ریڈیو حیدر آباد سے میں نے ایک تقریر نشر کی تھی جو بے حد مقبول ہوئی۔ اس وقت امیر احمد خسرو ریڈیو اسٹیشن کے پروگرام ڈائریکٹر تھے۔ شاعری کے تعلق سے مجھے موسیقی سے بھی بہت کم عمری سے لگاؤ رہا جو فنون لطیفہ کی ایک شاخ ہے۔ میری ادبی وابستگی میں وہ سارے محرکات اور اسباب شامل ہیں جو مجھے اسکول اور یونیورسٹی کے ماحول میں حاصل تھے۔ جیسے مضمون نویسی کے مقابلے' تقریری مقابلے' بحث و مباحثہ وغیرہ۔ اب رہا شاعری کا سوال' سو یہ اس وقت اور اس زمانے سے میرے دل و دماغ میں گھر کرنے لگی تھی جب کہ شعر کا مطلب و مفہوم تو بہت دور کی بات تھی۔ مجھے شعر وزن کے ساتھ پڑھنا بھی مشکل سے آتا تھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اور اس کا بڑا محرک خود میرے والد محترم تھے۔ جن کو سعدی" حافظ" غالب' میر' سودا' آتش' انشا' شیفتہ وغیرہ جیسے متقدمین اور متوسطین شاعروں کے بے شمار اشعار یاد تھے اور وہ ہر موقع و محل کے لحاظ سے ان شاعروں کے اشعار ترنم سے سنایا کرتے اور ان کا مطلب و مفہوم بھی سمجھایا کرتے تھے۔ ان کی آواز اور وہ اشعار آج بھی میرے حافظہ اور سماعت میں محفوظ ہیں۔ اور غالب سے میری غیر معمولی وابستگی اسی کا نتیجہ ہے!

شاعری سے وابستگی کا دوسرا محرک میرے اسکول کا ماحول تھا جس میں میرے اساتذہ کی کافی تعداد شاعروں پر مشتمل تھی۔ چنانچہ خود مجھے شعر کہنے کا شوق اس وقت پیدا ہوا جب حضرت فانی بدایونی (مرحوم) میرے اسکول کے ہیڈ ماسٹر بن کر آئے جب میں آٹھویں جماعت کا طالبعلم تھا اور حضرت فانی ہمیں اردو نظم و نثر پڑھایا کرتے تھے۔ میں نے اپنی پہلی غزل جو پانچ شعر پر مشتمل تھی حضرت فانی کے گھر جاکر ان کی خدمت میں بغرض اصلاح پیش کی تھی۔ ضرورت کے لحاظ سے اصلاح کردینے کے بعد غزل واپس کرتے ہوئے مجھ سے فرمایا۔ "اپنی تعلیمی مصروفیات کے ساتھ اس کی مشق جاری رکھو۔ اچھے شاعر بنوگے۔" ان کے یہ الفاظ میرے لئے ایک تازیانہ تھے! میں نے غزلیں لکھنی شروع کیں اور وہ بڑی دلچسپی سے ان کی اصلاح کرتے رہے اور میری حوصلہ افزائی بھی۔ لیکن یونیورسٹی جانے کے بعد اس کوشش میں کمی ہوئی گئی اور بات مشاعروں

میں بکثرت شرکت پر ٹھہر گئی اور پھر ملازمت اور پھر سیاسی انقلاب وغیرہ نے تو اس طرف سے میرا رخ ہی پھیر دیا۔ میں شعر گوئی کی طرف اسی وقت مائل ہوتا ہوں جب میں تنہا ہوتا ہوں اور اپنے ماضی و حال کے مشاہدات، تجربات، حادثات، سانحات، قلبی واردات اور احساسات پر اپنی پوری اور گہری فکر کو مرکوز کر سکوں اور اپنی اختیار تمیزی سے ان متفرق حصوں کو اشعار کی شکل دے سکوں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض ایسے واقعات غیر متوقعہ طور پر واقع یا ظہور پذیر ہوتے ہیں جو ہمارے دل و دماغ پر اتنا گہرا اور دیرپا اثر مرتب کر دیتے ہیں کہ ہم چند ساعتوں یا دنوں تک اسی بارے میں سوچتے رہتے ہیں اور آخر ہمارے قلبی جذبات ان کو نثر یا نظم کی شکل دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اپنی حد تک میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ جو مشاہدات یا تجربات میرے جذبات یا احساسات کو متحرک کر دیں میں ان ہی کو اشعار کی شکل میں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ یہ عشق و عاشقی کی شکل میں یا اصلاحی طعن و طنز کی شکل میں۔

صرف نظریاتی اور تصوراتی شاعری کا یہ زمانہ نہیں۔ ہمارا مکتب خیال ہمارے اطراف و اکناف کے ماحول اور لوگوں یا عوام کے رجحانات سے متاثر ہوتا رہتا ہے اگر ایسا نہ ہو تو ہمارے موجودہ ادبی رجحانات اور شاعرانہ طرز فکر کا ہماری موجودہ یا جدید سوسائٹی اور کلچر میں کوئی مقام ہی نہ ہوگا۔ لوگ اس طرز فکر اور اسلوب بیان سے متاثر ہونے لگے ہیں جو انسانی زندگی کے فطری تقاضوں اور حقیقی پہلوؤں سے قریب ہو اور اس کی حقیقی ترجمانی کرتے ہوں۔ خیالاتی اور نظریاتی راہیں کچھ مسدود ہوتی دکھائی دے رہی ہیں۔

ابھی میرے کلام کا مجموعہ شائع نہیں ہوا۔ بعض احباب کا تقاضہ ہے کہ جو کچھ اور جتنا کچھ کلام اس وقت موجود ہے اس کو کتابی شکل دیدی جائے۔ لیکن اس سے متفق نہیں ہوں۔۔ آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔ میرا کلام یہاں پاکستان لنک' پاکستان ٹوڈے وغیرہ میں شائع ہوتا رہتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں ابلاغ ادب اور شاعری دونوں کے لئے ضروری ہے۔ ورنہ شاعری اور ادبی کاوشیں دونوں بے فیض ہو کر رہ جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ اظہار اور ابلاغ میں چولی دامن والا معاملہ ہے۔

"ادب اور شاعری میں تنقید و تبصرہ کی ضرورت" کے عنوان کے تحت میرا ایک مضمون چند ماہ قبل "لنک" میں شائع ہوا تھا۔ صحت مند ادب (جس میں شاعری بھی داخل ہے) کی پیدائش اور اس کے فروغ کے لئے تنقید و تبصرہ بہت ضروری بلکہ لازمی ہے بشرطیکہ اس کا مقصد عین اصلاح اور صرف اصلاح ہو نہ کہ تنقید برائے تنقید یا اعتراض برائے اعتراض۔ ایسے اصلاحی

سید اسد اللہ حسینی

تبصروں اور تنقیدوں کی ہر زمانے میں ہر ادب کو ضرورت رہی ہے۔ اس کے بغیر ایک صحت مند ادب کا حصول اور ترقی تقریباً ناممکن ہے۔ لیکن ایک صحت مند ادب کی تخلیق اور اس کی ترقی کی ضمانت صرف ایسی تنقیدیں ہوتی ہیں جو ذاتی عناد، بغض وحسد، شخصی مخاصمت، علاقہ واری یا سیاسی رجحانات واحساسات جیسے مذموم جذبات سے پاک وصاف ہو۔

یہ بات بالکل درست ہے کہ ادبی اشاعتوں یا رسائل کی عدم مقبولیت سے نہ صرف نظم بلکہ نثر کو بھی نقصان پہنچ رہا ہے۔ لوگوں میں ادبی تصانیف یا کتابوں کے مطالعہ کا ذوق وشوق بھی انحطاط پذیر ہوگیا ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ آج کل کا مذاقی رجحان اور انقلاب طرز فکر ہے جس کا تعلق ہماری بدلتی ہوئی دنیا اور ہمارے ترقی پذیر ماحول سے ہے جو میں ہم زندگی گزار رہے ہیں۔ لیکن ہمیں ناامید نہیں ہونا چاہئے بلکہ ہم کو بھی اپنی ادبی کوششوں اور اس کی تشہیر کے لئے ایسے راستے اور ذرائع اختیار کرنے چاہیں جو موجودہ رجحانات یا ادبی ذوق وفراق میں ایک سنگم کا مقام رکھتے ہوں۔ تاکہ یہ پیدا شدہ خلیج مسدود ہوجائے۔ ہماری موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لئے اس امریکی ماحول میں اردو زبان کی ترویج وترقی آج کل کا بہت اہم ترین مسئلہ ہے جس کو تقریباً ہر ادیب اور اردو دوست شخص بہت تلخی کے ساتھ محسوس کررہا ہے۔ موجودہ نسل کو اردو زبان سے واقف اور رابطہ رکھنا ہمارا بہت اہم ادبی اور اخلاقی فرض ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ہماری مصروفیات ہم کو اس طرف عملی توجہ دینے کا موقع نہیں دیتی ہیں۔ پھر یہاں کی طرز زندگی بھی کچھ ایسی ہے کہ ہم اس فرض کو بھولتے جارہے ہیں۔ پھر بھی بعض مقامات پر ایسے ادارے اور مدرسے قائم کئے گئے جہاں ہمارے بچوں کو اردو اور عربی تعلیم دی جارہی ہے لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ ہمارے نونہالوں کا زیادہ تر وقت ان مدرسوں یا گھریلو ماحول میں نہیں بلکہ ان مدرسوں میں گزرتا ہے جہاں صرف انگریزی زبان بولی جاتی ہے اور سکھائی جاتی ہے اور اسلامی تعلیمات نہیں بلکہ عیسائیت کا سبق پڑھایا جاتا ہے۔ جس سے ان نونہالوں اور ہونہاروں کا متاثر ہونا ایک فطری بات ہے۔ اس طرح نہ صرف زبان بلکہ مذہب سے بھی یہ بچے نابلد ہوتے چلے جائیں گے۔ لہٰذا سخت اور شدید ضرورت اس بات کی ہے کہ ان بچوں کے ماں باپ گھر میں ان سے صرف اور صرف اردو زبان میں بات چیت کریں اور ان کو الفاظ کے معنی سمجھائیں اور ان کو اردو بولنے کی تاکید کریں اور اس کے لئے ہر وہ مناسب طریقہ اختیار کریں جو ان بچوں میں اردو زبان سے رغبت پیدا کرسکتا ہو۔ بہرحال یہ صورتحال نہایت شدید اور فوری توجہ کی محتاج ہے۔ خدانخواستہ ایسا نہ ہو کہ ہماری زبان، ادب اور مذہب سب کے سب مغربیت اور عیسائیت کی نذر ہوجائیں۔

زندگی سے بھرپور ادب کی تخلیق صرف ایسی شاعری سے ہو سکتی ہے جس کا تعلق انسانی زندگی کے عملی میدان سے ہو اور جو انسانی جذبات اور احساسات کا فطری اور حقیقی مظہر ہو اور جو ہر انسان کو یکساں طور پر متاثر کرے۔ مطالعہ بتاتا ہے کہ آج کل کے ادیب اور شاعر کی تحریریں اس کے وجود کا اقرار تو ہو سکتی ہیں لیکن اس کے عہد کی گواہ شاید نہیں ہو سکیں! ایسی شاعری جس میں کسی شاعر کے عہد کی تہذیب' رسم و رواج' طرز زندگی' معاشرت علمی و ادبی حالات و واقعات' مشاہدات و تجربات کو ظاہر کیا گیا ہو یا ان پر تنقید و تبصرہ موجود ہو تو وہ اس عہد کی گواہ بن سکتی ہے اور یہی صورت کسی ادیب کی نثر یا تحریر کی ہوگی لیکن آج کی نظم و نثر میں یہ پہلو بہت کم نظر آتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بڑی شاعری کی پیدائش یا وجود' مطالعہ کی وسعت اور مشاہدات و تجربات کی کثرت کا مرہون منت ہوتا ہے۔ چنانچہ اس پر مولانا حالی نے بھی اپنی تصنیفات میں کافی روشنی ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ ایک بڑا شاعر بننے کے لئے یا عظیم شاعری کی تعمیر کے لئے کس کس قسم کے سنگ و خشت درکار اور لازمی ہیں۔ ایک شاعر کے مکالمات تجربات اور مشاہدات جتنے وسیع اور عمیق ہوں گے اتنا ہی گہرا اور دیرپا اثر اس کے کلام میں ہوتا ہے۔ بشرطیکہ وہ اپنے مشاہدات' تجربات' معلومات اور محسوسات کو بلا کم و کاست' سچائی اور خلوص دل کے ساتھ مناسب الفاظ میں صفحہ قرطاس پر رکھ دے یا کوئی اور طریقہ ابلاغ اختیار کرے تو پھر ایسی ہی شاعری یا ایسا ہی کلام۔ دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ کی حقیقی تفسیر ہوگا۔ اقبال کا سارا کلام اس حقیقت کے ثبوت میں پیش کیا جا سکتا ہے جو ان کے بے پایاں مشاہدات' تجربات' محسوسات اور واردات قلبی و دماغی کا ایک حقیقی اور سچا مظہر ہے۔ اس سلسلے میں بیسویں صدی کے چند شاعر بطور نمونہ پیش کئے جا سکتے ہیں جن میں جگر' جوش' بہزاد' فراق شکیل' مخدوم' علی سردار جعفری' فیض' فراز وغیرہ جیسے چند اور شعراء شامل ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مزاحیہ شاعری طعن و طنز کا بہترین اور موثر ذریعہ بن سکتی ہے بشرطیکہ اس میں بیان کردہ واقعات یا حالات کو سل الفہم اور دلنشین طرز اور اسلوب کے ساتھ بیان کیا جائے۔ اگر یہ خود مزاح گو شاعر کی ذات سے متعلق ہوں تو یہ اور بھی زیادہ اثر کن ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ایسا شاعر خود اپنے آپ سے اپنی ذات ہی کو تنقید یا طعن و طنز کا ہدف بنا لیتا ہے اور ایک جیتی جاگتی مثال بن کر عوام کے سامنے پیش ہوتا ہے۔ انگریزی ادب میں (Oliver Gold Smith) گولڈ اسمتھ (۱۷۳۶ء-۱۷۷۱ء) اس کی ایک تاریخی مثال ہے جس نے نہ صرف اپنی ذات بلکہ خود اپنے باپ اور بہن کو اپنی طعن و طنز کا ہدف بنایا اور اسی وجہ سے انگریز ادیب و شاعر آج تک اس کا نام بڑی تعظیم اور وقار سے لیتے ہیں۔

سید اسد اللہ حسینی چکر

عکسِ فن

مزاحیہ قطعات

(امریکن بیوی)

بوسہ مانگا تو بولے "شٹ اپ ایڈیٹ" ہاتھ پکڑا تو بولے "گٹ آوٹ آف ہیر"
تھوڑی پی لی تو کہنے لگے "ڈارلنگ" "کم ہیر" نو فیر" گٹ نیر اینڈ نیر"

میں پریشاں پھر رہا تھا جستجوئے یار میں تھی وہ میرے ساتھ لیکن کھو گئی بازار میں
دیکھتا کیا ہوں کہ اپنے "ایکس ہسبینڈ" کو لئے ہے بہت مصروفِ بوسہ بازی میری کار میں

زلیخا کردے !

تو اگر چاہے تو اک قطرے کو دریا کردے ایک UGLY کو بھی چاہے تو زلیخا کردے
پھر نہ پہچان سکیں اسکو کبھی میرے رقیب میرے مولیٰ! میرے معشوق کو لیلیٰ کردے

○ مظلومیت ہی میں جینا ہو تو بہتر ہے یہی زندگی کے واسطے زہر ہلال ڈھونڈ لو
○ ان اندھیروں سے نہ گھبراؤ اٹھو باندھو کمر مشعل عزم مصمم لے کے منزل ڈھونڈ لو
○ اپنے پندار جنوں کا بھی تو کچھ رکھو لحاظ اپنی خاطر آپ زنجیر و سلاسل ڈھونڈ لو
○ "لوز" کر کے "ویٹ" تم تو "ٹین ایجر" بن گئیں لگ نہ جائے تم کو اپنے آٹھ بچوں کی نظر
○ جسکی کھاتے ہو اسکی گاتے ہو اس طرح زندگی نہیں ہوتی
اُنکی مُمّی کی ہو گئی چھٹی اب کوئی کرکری نہیں ہوتی
○ ڈالروں کا جو کال ہو جائے عاشقی ہی محال ہو جائے
○ امریکن عشق میں مگر مقروض آپ کا بال بال ہو جائے

افضال فردوس

روشنی سا چہرہ ہے مانگ میں ستارے ہیں
تجھ کو دیکھنے میں یہ زندگی گزر جائے

افضال فردوس

۲ جنوری ۱۹۹۶ء

Afzal Firdaus
6709 Hornwood
Apt 299 Houston. TX, 7707 U.S.A.

افضال فردوس
(ہیوسٹن)

افضال فردوس کا تعلق برصغیر کے اس خطے سے ہے جس نے گزشتہ آدھی صدی میں اردو زبان کی خدمت بڑی لگن بلکہ اس سے ایک درجہ آگے محبت اور عشق کے جذبے سے کی ہے۔ اردو کو بین الاقوامی زبان کا درجہ دلانے میں لاہور اور پنجاب کے دیگر علاقوں کے ادیب اور شعراء میں علامہ اقبال اور فیض کے ساتھ احمد ندیم قاسمی، ناصر کاظمی، قتیل شفائی، منیر نیازی کا نام بھی لیا جاسکتا ہے۔ ان کے ساتھ آج کا ایک ابھرتا شاعر افضال فردوس بھی ہے جس کی شاعری میں مستقبل کی روشن صبحوں کی جھلک ملتی ہے۔ افضال فردوس کا یہ شعر دیکھیے۔

جاؤ ہم نے وچن دیا ہم راہ تمہاری دیکھیں گے
بولو! اگلے سات جنم تک تو واپس آجاؤ گے

اسی لیے جیسے فیض احمد فیض کا نئی صبح کی جدوجہد کا پیغام دیتا یہ شعر آکر مصافحہ کرتا ہے۔

قفس اداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

افضال فردوس ۹ ستمبر ۱۹۵۸ء کو سیالکوٹ (پنجاب) کے ایک گاؤں جاکے چیمہ میں پیدا ہوئے۔ پرائمری اسکول گاؤں اور سیالکوٹ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد لاہور آگئے۔ اور اردو ادب میں ایم۔اے وہیں سے کیا۔ کچھ عرصہ لاہور کے ایک کالج میں پڑھایا۔ ریڈیو پاکستان لاہور میں تین چار سال تک مختلف پروگراموں کی میزبانی کی۔ کئی جرائد کی ادارت کی۔ اخبارات میں مضامین لکھے۔ حلقہ ارباب ذوق ماڈل ٹاؤن قائم کیا۔ اور رہنمائی اپنے والد محترم فردوس سیالکوٹی سے حاصل کی اور والد صاحب کی ذات ہی شاعری کی محرک بنی۔ احسان دانش، فیض اور منیر نیازی

کی محبتوں اور قرب نے اس شاعری کو جلا بخشی۔ ساتویں جماعت میں تھے تب سے شعر کہنا شروع کئے اور اس مقام تک پہنچے کہ ان کے کلام کا ترجمہ انگریزی، فرانسیسی اور عربی میں ہونا شروع ہوگیا۔ ویسے کالج کے زمانے میں افسانے اور انشائیے بھی لکھے لیکن پھر ساری توجہ شاعری کی جانب مرکوز کردی۔ اردو کے علاوہ پنجابی زبان میں بھی شعر کہے۔ پنجابی کلام کا مجموعہ زیر ترتیب ہے لیکن اردو شاعری کا مجموعہ "ستارے میرے ہاتھوں میں" ۱۹۹۱ء میں لاہور سے شائع ہوچکا ہے۔ غزل کے علاوہ نظم معریٰ اور آزاد نظم بھی کہتے ہیں اور شاعری میں ابلاغ کی اہمیت سے انکاری نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ آرٹ کی زبان اگر سمجھ میں نہ آئے تو وہ اعلیٰ نہیں۔ ان کی غزلیں پاکستان اور ہندوستان کے کئی گلوکاروں نے گائی ہیں۔

افضال گزشتہ دس سال سے امریکہ کی ریاست ہیوسٹن میں مقیم ہیں۔ وہ وطن سے دور ہیں لیکن وطن سے اتنی ہی قربت بھی رکھتے ہیں جب اپنے وطن میں تھے مگر جب مٹی کی خوشبو انہیں بے چین کرتی ہے تو بے اختیار کہتے ہیں۔

شدید لطف رفاقت، شدید تنہائی
میرے نصیب میں اتنا عذاب کیوں لکھا!

اسی حوالے سے سیف الدین سیف نے ان کی شاعری کے لئے کہا تھا کہ افضال کی شاعری میں سارا پاکستان کو چہ جاناں نظر آتا ہے۔ اور اسی حوالے سے ہندوستان کے شاعر ڈاکٹر بشیر بدر کہتے ہیں کہ "افضال کی غزلوں نظموں میں برصغیر کے سارے موسم نظر آتے ہیں۔" آپ افضال کی شاعری پر گہری نظر ڈالیں تو پاکستان کے امجد اسلام امجد کی اس رائے سے متفق ہوں گے کہ "افضال کے نغموں میں فکر کی تازگی اور امیجری کی حسن کاری نمایاں ہے۔ وہ لفظوں سے تصویریں اور تصویروں سے منظر بنانے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں"۔

اردو کے مستقبل کے تحفظ کے لئے اپنی رائے دیتے ہوئے افضال کہتے ہیں کہ غیر ممالک میں مقیم اردو سے محبت کرنے والوں کو چاہئے کہ مقامی اسکولوں کے نصاب میں اردو شامل کرائیں۔ مسجدوں میں جانے والے طلباء کو دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ اردو کی تعلیم بھی دی جانی چاہئے۔ اردو کی کتابیں نئی نسل کے ذوق اور شوق کے مطابق شائع کی جانی چاہئیں۔ ٹی وی اور ریڈیو کے پروگراموں کے ذریعے بھی نئی نسل کو اردو زبان سے دلچسپی دلائی جاسکتی ہے۔ بقول آتش۔

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

افضال فردوس

عکس فن

غزل

خزاں میں رنگ بھرنا چاہئے تھا
تمہیں اتنا تو کرنا چاہئے تھا

ہوائیں تیز اور شوریدہ سر تھیں
دیئے پر ہاتھ دھرنا چاہئے تھا

بدلنے کو ہے رُت ندی کنارے
پرندوں کو اُترنا چاہئے تھا

در و دیوار عاجز آگئے ہیں
کوئی نقشہ اُبھرنا چاہئے تھا

تمہی نے رہ بدل لی ہے مری جاں
تمہارا ساتھ ورنہ چاہئے تھا

تمہیں تو علم ہے میں بے گناہ ہوں
تمہیں ایسا نہ کرنا چاہئے تھا

○

رکھا ہے ایک پاؤں ہوا کی رکاب میں
لیکن ہے ایک پاؤں زمیں میں گڑا ہوا

○

چھلک پڑیں میری آنکھیں کہ درد گہرا تھا
نہ جانے کب سے یہ پانی یہاں پہ ٹھہرا تھا

جہاں پہ گر پڑا موتی ہماری مٹھی سے
خدا کی شان سمندر وہیں پہ گہرا تھا

اکبر حیدرآبادی

یہ ہوا، یہ آگ، یہ آب و گل ہیں علامتیں ہی علامتیں
کہ تسلسلِ شب و روز ہے فقط ایک حرفِ سوال ہم

اکبر حیدرآبادی
مارچ ۹۶ء

Akber Hyderabadi
30, Tuffley Road
BRISTOL BSIO. 5EG. U.K.

اکبر حیدر آبادی

برسٹل (انگلستان)

جو شخص نہ اپنی استطاعت جانے
فن کی وہ خاک قدروقیمت جانے
خوش قامتی سرو پہ کیا آنچ آئے
سبزہ خود کو جو سرو قامت جانے

اس رباعی کے خالق اکبر علی خان المعروف اکبر حیدر آبادی اپنے منفرد لب ولہجے سے ادبی وشعری حلقوں میں نمایاں ہیں۔ ۲۰ جنوری ۱۹۲۵ء کو حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ سینیئر کیمبرج تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد آر کیٹیکچر بنے۔ ملازمت کے سلسلے میں حیدر آباد اور بمبئی کے بعد آکسفورڈ اور برسٹل (انگلستان) آئے۔ بی بی سی ریڈیو آکسفورڈ سے آٹھ سال تک تارکین وطن کے لئے ہفتہ وار پروگرام بھی پیش کرتے رہے۔ ابتدائی زمانے میں افسانہ نگاری بھی کی لیکن مستقل وابستگی شاعری سے رہی۔

جناب اکبر حیدر آبادی اپنا تعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں کہ ”میری شعروادب سے آشنائی میری ہمشیرہ جہاں بانو نقوی کی مرہون منت ہے جو انشاء پرداز اور مضامین کے تین مجموعوں کی مصنف تھیں اور جامعہ عثمانیہ کلیہ اناث میں صدر شعبہ اردو تھیں۔ نانا مرزا نصراللہ خان فدائی چونکہ تاریخ ایران کی تین جلدوں کے مصنف اور صاحب دیوان شاعر تھے تو ہو سکتا ہے کہ شعروادب کا مذاق مجھے ورثہ میں ملا ہو۔ ابتدائی دور میں رومانی تاثرات سب سے اہم محرکات ہوا کرتے تھے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ غم دوراں نے ان کی جگہ لے لی۔ بالآخر فکرونظر کے ایک وسیع

اکبر حیدر آبادی

ترتناظر میں انسان، حیات اور کائنات کے باہمی رشتوں کے پیدا کردہ حالات و مسائل اور سائنس اور ٹیکنالوجی کا ارتقاء، سفر اور عصری تقاضے موضوع سخن بنتے گئے"۔

ان کی شاعری کا ابتدائی دور ترقی پسند نظریات سے متاثر رہا۔ چوتھی اور پانچویں دہائی میں اردو ادب پر ترقی پسند تحریک کا ایسا غلبہ رہا کہ نئی کھیپ کے لکھنے والے اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ان کے پہلے شعری مجموعے میں یہ اثرات جگہ جگہ نمایاں ہیں۔ اس کے بعد ۸۵ء میں فن تعمیر کی تعلیم مکمل کرنے کے لئے اکبر انگلستان چلے گئے۔ جہاں ایک عرصے تک تخلیقی دھاروں پر جمود طاری رہا کیونکہ اشتراکی نظریات کے پرچار کرلئے وہاں کا ماحول سازگار نہ تھا۔ ان کا کلام افکار، اوراق، شاعر، منشور، ابلاغ، ذہن جدید، شب خون اور سب رس میں شائع ہوتا رہا ہے۔ چار شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ جن کے نام یہ ہیں۔ خط رہ گزر (۶۷ء)، نمو کی آگ (۸۰ء)، آوازوں کا شہر (۸۷ء)، ذروں سے ستاروں تک (۹۳ء)۔ آخر الذکر مجموعے کو اردو مرکز انٹرنیشنل، لاس اینجلس (کیلی فورنیا) کی طرف سے ۱۹۹۳ء کی بہترین شعری تصنیف کا ایوارڈ دیا گیا۔

شاعری میں ابلاغ کے حق میں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "ابلاغ، ادیب و شاعر کے لئے یقیناً ضروری ہے اور تخلیق کار کو حتی الامکان اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ زبان اور اسلوب عام فہم ہو لیکن چونکہ آج کی زندگی بہت ہی گنجلک ہے اور بعض نئے علوم (مثلاً علم نفسیات وغیرہ) نے موضوعات کو گھمبیر بنا دیا ہے تو بعض اوقات شعر کا تہ دار ہونا لازمی بات ہے۔ ایسی صورت میں ترسیل و ابلاغ کے لئے قاری کو بھی تھوڑی سی محنت کرنا پڑتی ہے۔"

اکبر تنقید کے حق میں ہیں۔ کہتے ہیں ادب کی تمام اصناف میں تنقید نگاری سب سے زیادہ اہمیت رکھتی ہے کہ یہی وہ کسوٹی ہے جو کھرے کھوٹے کا کھوج لگاتی ہے اور ادب میں صحت مند اور ارتقاء پزیر رجحان کو فروغ دیتی ہے۔ یہ نہ ہو تو ادب انحطاط اور سہل انگاری کا شکار ہو جاتا ہے۔

ادبی رسائل کی عدم مقبولیت کا سبب ان کے نزدیک عوام الناس کی علمی موضوعات سے عدم دلچسپی اور سستی اور جذبات انگیز تحریروں سے رغبت ہے۔ اور ٹیلی ویژن بھی اس ضمن میں منفی رول ادا کرتا رہا ہے ان کا کہنا ہے کہ بظاہر یہ ایک مشکل صورت حال ہے مگر شعرو سخن کی نجی محفلیں کسی حد تک اس مسئلے کا حل فراہم کر سکتی ہیں۔ ایسی محفلیں بنیادی طور پر سماجی نوعیت کی ہونے کے باعث لوگوں میں بالواسطہ شعروادب کا مذاق پیدا کرنے میں معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔ اس طرح محلہ دار چھوٹی چھوٹی ادبی محفلیں تشکیل دی جا سکتی ہیں، جو کم از کم ہر دوسرے تیسرے مہینے تقریب کا اہتمام کر سکیں۔ تاکہ غیر شعوری طور پر شعروادب سے لوگوں کی وابستگی بڑھی

جائے۔

اردو زبان کی بقا کے سلسلے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ "نئی نسل اور اردو کی بقا کا مسئلہ امریکہ ہی میں نہیں بلکہ خود انگلستان میں بھی بہت تشویش ناک ہے۔ تاہم یہاں اردو کی تعلیم ترویج اور اشاعت کی پر بہت زور دیا جا رہا ہے۔ مساجد اور مدارس بھی بچوں کو اردو پڑھانے کا انتظام ہے۔ اردو کا ہفتہ وار اخبار "راوی" جو بریڈ فورڈ سے شائع ہوتا ہے بڑی لگن اور پابندی سے "اردو لکھئے اردو پڑھیے اور اردو بولیے" کی مہم کافی عرصے سے چلا رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اردو کی حمایت میں موثر ادائیے لکھ کر اردو میں (باانعام) تحریری اور تقریری مقابلوں کا اہتمام کرکے بالخصوص نئی نسل میں اردو دانی کا ذوق پیدا کرنے میں انتھک کوشش کر رہا ہے جو ایک امید افزا اور خوش انجام اقدام ثابت ہو رہی ہے۔ اسی طرح والدین کو بھی چاہئے کہ اپنے بچوں کے لئے اردو میں دلچسپی لینے کے سامان اور مواقع فراہم کریں اور ان کی طرف سے Positive response ملنے پر انہیں قیمتی تحفے اور تحائف سے نوازیں جس طرح عید بقرعید کے موقعوں پر ہوتا ہے۔ اس سے یقیناً ان میں اردو سیکھنے اور بولنے کی امنگ اور ولولہ پیدا ہوگا۔ مزید یہ کہ اردو کی بہبودی اور بقا کے لئے کام کرنے والے مقامی اور بین الاقوامی اداروں کو آپس میں قریبی رابطہ قائم کرنا چاہئے اور کم از کم سال میں ایک بار مل کر تبادلہ خیال کرنا اور ایک دوسرے کے تجربے اور مشورے سے استفادہ کرنا چاہیے۔

اکبر کی رائے میں آج وہ ادب تخلیق نہیں ہو رہا جس کی جڑیں ہماری زمین سے پیوست ہوں۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ موجودہ اردو شاعری مجموعی حیثیت سے غزل کی شاعری ہے اور ظاہر ہے کہ تنگنائے غزل میں اتنی وسعت نہیں کہ وہ زندگی کے اہم مسائل کا بھرپور احاطہ کر سکے۔ اور پھر جو غزل آج لکھی جا رہی ہے وہ اتنی رومان گزیدہ ہے کہ اس کی جڑوں کا زمین میں پیوست ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ نظموں میں یہ صلاحیت موجود ہے مگر افسوس کہ نظمیں نسبتاً بہت کم لکھی جا رہی ہیں۔ انہیں تنقید نگار کی اس رائے سے پورا پورا اتفاق ہے کہ آج کا ادب بے معنی ہوتا جا رہا ہے۔ اس کا سبب بتاتے ہیں کہ سہل انگار اور انحطاط پذیر ہو کر یہ "ادب برائے ادب" کے زمرے میں آتا جا رہا ہے۔ ادب سے یہاں مراد شاعری ہے کہ اردو جرائد کے مطالعے سے یہ بات شفاف آئینے کے عکس کی طرح اجاگر ہو جاتی ہے کہ محض الفاظ کی بھرمار ہے مگر معنویت اور مقصدیت عنقا۔ مجموعی اعتبار سے غزلوں کا معیار اوسط درجے کا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ غزل صرف مشاعروں کو پیش نظر رکھ کر لکھی جا رہی ہے۔ زبان کی چاشنی' خیال کی لطافت' اسلوب کا بانکپن اور فکر کی ندرت ناپید ہے اغلاط

اکبر حیدر آبادی

کو نئی زبان کے حیلے سے مستند قرار دیا جا رہا ہے اور یاوہ گوئی کو فن کا نام دیا جا رہا ہے۔ ایک وقت تھا کہ ترقی پسند تحریک نے ہمارے نیم جاں ادب میں نئی روح پھونک کر اسے ایک صحت مند و توانا وجود عطا کیا تھا۔ موجودہ ادب اپنی وہ رعنائی اور توانائی کھو چکا ہے۔

ان کے نزدیک یہ سوال بہت کٹھن (لاجواب کر دینے والا) ہے کہ آج کون کون سے شاعر اپنی ذات کے حوالے سے روح عصر کی عکاسی کر رہے ہیں؟ کہتے ہیں جزوی حیثیت سے تو کچھ نام لئے جا سکتے ہیں مگر ایسا ایک نام بھی ذہن میں نہیں آرہا جو کلی اعتبار سے اپنے ذاتی تجربے، اپنے مشاہدے اور اپنی منفرد فکر واحساس کے بل بوتے پر بامعنی ادب تخلیق کر رہا ہو۔ اردو کے بہت سے شاعروں کے یہاں نئے پن کا احساس ضرور ہوتا ہے مگر جب تک نئے پن کے کوئی معنی نہ بنتے ہوں اسے محض اس کے اکہرے اور سطحی وجود کی بناء پر قبول نہیں کیا جا سکتا۔

خُود جن میں سمٹ آتے ہیں یادوں کے ذخیرے
تنہائی کے کچھ ایسے بھی لمحے ہیں مرے ساتھ

اک پَل ہی میں جیتا بھی ہوں، مرتا بھی ہوں اکبؔر
اک آن میں بھی کتنے زمانے ہیں مرے ساتھ

اب تو خُورشید بداماں ہے لہو کی ہر بُوند
اور ہَوا خُوش ہے چراغ ایک بجھا کر میرا

عکسِ فن

سورج دریا اور میں

سُورج مجھ سے اُونچا لیکن
مجھ سا در و شناس کہاں؟
دریا مجھ سے گہرا لیکن
میری طرح حسّاس کہاں؟
کوئی مجھے سورج کی بلندی
دریا کی گہرائی دے دے
--------- دونوں کی تنہائی دیدے!

رباعی

کس نہج سے ہم نے اک کہانی کہہ دی
دو بیتوں میں بات دل کی ساری کہہ دی
لفظوں کی کفایت بھی ہنر ہے اکبرؔ
جب کہہ نہ سکے غزل، رُباعی کہہ دی

عتیق النظر
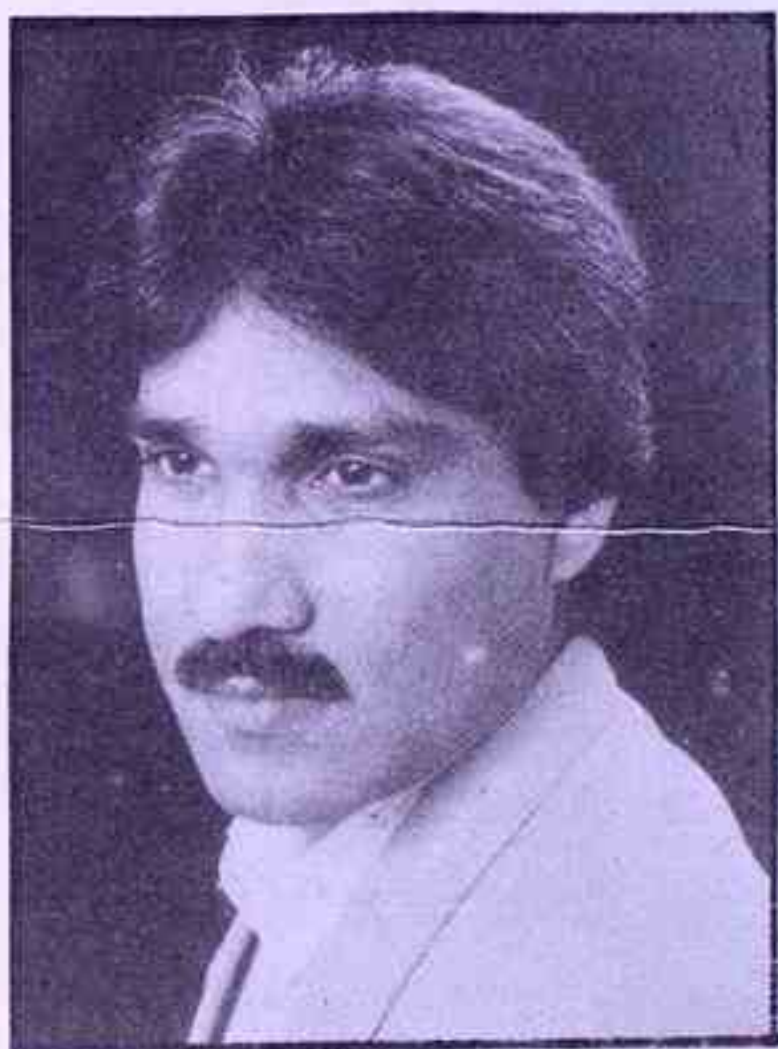
ان گھنے پیڑوں کے سایوں سے سدا دور رہو
یہ کسی پودے کو اونچا نہیں ہونے دیتے

عتیق انظر
۲۸ راگست ۹۵ء

Ateeq Unzer
P.O. Box 6901, DOHA, QATAR. (A.G.)

عتیق انظر

(دوحہ قطر)

ادب اور زندگی کے درمیان بلاشبہ ایک گہرا رشتہ ہے۔ جدید ٹیکنالوجی نے انسان کو نت نئی اشیاء کے حصول میں گم کردیا ہے۔ یوں زندگی کی رفتار اتنی تیز ہوگئی کہ فرصت کے لمحے عنقا ہوگئے ہیں۔ اس کے نتیجے میں ادب کی اقدار بھی بدلی ہیں۔ زبان و بیان میں تیزی سے تبدیلی آئی ہے۔ مشینی زندگی کے انقلاب کے بہاؤ میں لوگ اپنے گھروں سے نہیں اپنوں سے بھی دور ہوگئے ہیں۔ ان میں وہ بھی ہیں جنھوں نے زبان و ادب سے رشتہ استوار کیا اور صحرامیں بھی پھول کھلادیے۔ اپنی تنہائی کے خول سے نکل کر محفلیں سجائیں اور علم و آگہی کے چراغ جلائے۔ عتیق انظر بھی انہی میں سے ایک ہیں۔

نام ان کا عتیق الرحمٰن خان ہے۔ تخلص انظر بنارس (یوپی ہندوستان) میں ۱۹۶۳ء میں پیدا ہوئے۔ الہ آباد بورڈ سے عالم۔ دیوبند سے فاضل اور ۱۹۸۱ء میں جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب کامل کے امتحانات پاس کیے۔ ان کی مادری زبان پوربی ہے مگر اظہار کی زبان اردو۔ عربی انگریزی اور فارسی زبانوں سے استفادہ کی صلاحیت بھی ان میں موجود ہے ۱۹۸۳ء سے عملی زندگی کا آغاز دہلی کے ایک پبلشر کے ہاں ملازمت سے کیا۔ نئی دہلی میں واقع عرب لیگ کے آفس اور ایک ایکسپورٹ کمپنی میں بہ حیثیت مترجم و ٹائپسٹ کام کیا اور ۱۹۸۷ء سے دوحہ قطر میں بہ حیثیت مترجم (عربی، انگریزی اردو) کام کررہے ہیں شاعری کے علاوہ افسانے بھی لکھتے ہیں۔ ان کا کلام دہلی کے رسائل آج کل، بیسویں صدی، شمع، شمع، پاکیزہ، آنچل، گلفام، مالیگاؤں کے سہ ماہی رسالہ توازن، بمبئی کے ماہنامہ شاعر اور کراچی پاکستان کے ماہنامہ رابطہ میں شائع ہوتا رہتا ہے۔

عتیق انظر

عتیق انظر کی غزلوں اور نظموں کا پہلا مجموعہ "پہچان" کے نام سے ۱۹۹۴ء میں دہلی سے شائع ہو چکا ہے۔

میں نے پوچھا تھا کہ "شاعری کی ابتداء کیونکر ہوئی اور ان کی شاعری کس مکتبہ فکر کی مظہر ہے۔ نیز شاعری کے لئے ابلاغ کو کس حد تک ضروری سمجھتے ہیں"۔ جواب میں انظر نے کہا۔

"میری شاعری حادثاتی طور پر وجود میں نہیں آئی اس لئے میں کسی ایک شے کو اس کا محرک نہیں کہہ سکتا لوک گیت اور بریلوی کی خوبصورت فضا اور فطری ماحول میں غزل سے قربت اور انسیت ہوئی اور اس کی طرف طبعی میلان ہوا مطالعہ ادب سے شعر گوئی کا ذوق و شوق ہوا۔ پہلے شاعری کا محرک ہجر تھا اپنی تمام نوعیت کے ساتھ۔ اب انسانی دکھ ہی اپنے وسیع مفہوم کے ساتھ ہیں۔ ہاں میں جدید اردو شاعری پسند کرتا ہوں لیکن اسے کوئی مکتبہ فکر تصور نہیں کرتا یعنی یہ پسندیدگی کسی تحریک یا ردعمل کی مرہون منت نہیں۔ ہر اچھے شاعر کا کوئی نہ کوئی نظریہ، شعر، طرز فکر اور اسلوب اظہار ہوتا ہے کسی تحریک یا مشن کے مفہوم میں۔ میں نظریاتی ادب کا قائل نہیں' اس لئے کہ نظریاتی یا مشروط ادب کے ساتھ تخلیق کار زیادہ دور تک اور دیر تک نہیں چل سکتا اور اگر ایسا ہوا تو وہ خود کو بہت جلد دہرانے لگے گا یا اس نظریے کے ساتھ وفاداری نہ کر سکے گا اور نظریے سے ہٹ کر دوسرے موضوعات بھی اپنی تخلیقات میں پیش کرنے لگے گا۔ (اس کی مثالیں بہت سی مل جائیں گی) اس لئے میں غیر مشروط ادب کا قائل ہوں یعنی ایسا ادب جس میں انسان' زندگی اور کائنات کے تمام تر مسائل کو برتنے کی آزادی ہو' نظریاتی ادب کا مطلب تو ادب کو محدود کرنا ہے کسی ایک نظریے سے ادب کو وابستہ کر دیا جائے گا تو زندگی کے دوسرے مسائل کہاں جائیں گے۔ شعر کہتے وقت میری کوشش یہ ہوتی ہے کہ میری شاعری کلاسیکی شاعری سے (جس کا بڑا اور قیمتی ذخیرہ ہے اور اس میں اس نوعیت کا اضافہ محال ہے) اپنی لفظیات اور اسلوب کے لحاظ سے مختلف ہو۔ (جس کا ذخیرہ کم ہے اور اس میں اضافے کی ضرورت ہے اس سے آگے بھی سوچنے کی ضرورت ہے) اور موضوع کوئی بھی ہو اس میں اپنے تجربات و مشاہدات شامل ہوں۔ ادب میں میں بے ادبی اور عریانیت کا قائل نہیں میں اظہار کے لئے آسان زبان اور اسلوب کا قائل ہوں ادب کے لئے ابلاغ ضروری ہے لیکن شعر کے متعلق بطور خاص میرا یہ خیال ہے کہ اس میں معنوی تہوں کا وجود ضروری ہے اور اس کا ابلاغ فی الفور نہیں بلکہ ذرا توقف اور تجسس کے بعد ہو تو بہتر ہے' لفظوں کے لباس میں معنی چھپے ہوئے ہوں نہ کہ عریاں"۔

عتیق تنقیدی محفلوں کے حامی ہیں کہتے ہیں کہ "تنقید ادب کے لئے نئی راہیں تلاش کرتی ہے اور اس سلسلے میں ادبی تنقیدی (تنقیصی نہیں) محفلیں پچاس فیصد معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔ ادبی

رسائل کی عدم مقبولیت کے سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ آج کے دور میں ادبی رسائل کی عدم مقبولیت صرف اردو کا مسئلہ نہیں بلکہ ہر زبان کے ادبی رسائل کا مسئلہ ہے۔ اور اس کی وجہ آج کی مادیت پرستی ہے' لوگ پیٹ کی بھوک مٹانے کی کوشش میں روح کی غذا کو فراموش کرتے جارہے ہیں۔ اردو والوں کا مسئلہ ذرا سنگین ہے' اردو کے ساتھ ایک ناانصافی اور ہو رہی ہے کہ اس میں غیر معیاری تخلیقات و نگارشات کی اس قدر بھرمار ہے کہ ان میں معیاری تخلیقات چھپ جاتی ہیں غیر اہم ہو جاتی ہیں' ادب کے نام پر رسائل میں جگہ پانے والی غیر ادبی تحریروں نے قارئین کو بدظن اور مایوس کیا ہے جو شخص اردو صحیح پڑھ لکھ نہیں سکتا وہ ادب تخلیق کرنے لگا ہے' ظاہر ہے اس ادب اور زبان کا کیا معیار ہوگا۔ جو تحریریں رسائل میں جگہ نہیں پاتیں انہیں تخلیق کار نہیں بلکہ محرر خود اپنے پیسوں سے چھپوا کر اپنی "صلاحیت" کا مظاہرہ کرتا ہے۔ ادب نواز قارئین کی تعداد کم اور تخلیق کار قارئین کی تعداد شاید زیادہ ہے یہ بھی ایک مسئلہ ہے' عام طور پر ادب کا قاری پڑھنے کا شوق تو رکھتا ہے لیکن کتب و رسائل خرید کر نہیں پڑھنا چاہتا۔ ذرائع آمدنی کی کمی کی وجہ سے۔ اور میڈیا کے دوسرے وسائل کی ترقی کی وجہ سے بھی۔ امریکہ میں اردو کی بقا کے لئے اردو کے **مخلصین** اپنی اردو دوستی کا ثبوت دیتے ہوئے اردو کے اصل میدان میں آئیں جہاں ذرایعہ تعلیم اردو نہیں ہے وہاں نئی نسل کے لئے اس کی تعلیم کا اہتمام کریں' اسے اردو کی عظیم تہذیب سے آشنا کرائیں' انگلش میں اردو کی تعلیم کے لئے مختصر اور جامع نصاب مرتب کریں مختلف علاقوں میں ایک ایک دو دو گھنٹے اردو کی تعلیم کا بندوبست کریں۔ باقاعدہ اس بات کی تحریک چلائی جائے کہ اردو داں حضرات اپنے اپنے علاقوں میں بچوں کو رضاکارانہ طور پر اردو پڑھانے کی کوشش کریں' چھٹیوں میں اس جانب بطور خاص توجہ دیں۔

عتیق کا کہنا ہے کہ گو دور حاضر میں فیض کے بعد کوئی بڑا شاعر سامنے نہیں آیا لیکن دیکھا جائے تو آج بھی اچھے شاعر ہیں جو ذات کے حوالے سے روح عصر کی عکاسی کر رہے ہیں ان کی شاعری میں ان کا "نقطۂ نظر" (یہ نقطۂ نظر نظریاتی کے مفہوم میں نہیں) بھی ہے' تجربات' مثبت فکر اور مطالعہ بھی لہٰذا ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہئے۔

★

عتیق انظر

عکسِ فن

متفرق اشعار

خود سے بادل جو عنایت نہیں کرنے والے
پیڑ بھی کوئی شکایت نہیں کرنے والے
تم بھی سو جاؤ کسی سُوکھے ہوئے پیڑ کے ساتھ
اب یہاں لوگ محبت نہیں کرنے والے

○

پڑوسیوں کے بھروسوں پہ وار مت کرنا
کبھی تم اپنی ندی میں شکار مت کرنا
مری مُراد سمجھ لینا میرے لہجے سے
میرے بیان کا تم اعتبار مت کرنا

خالی کرسی

ہم بیٹھ کے اک ریستوراں میں
دو کرسی والی ٹیبل پر
امریکن کافی پیتے تھے
اور پیار کی باتیں کرتے تھے
پھر آج اسی ریستوراں میں
دو کرسی والی ٹیبل پر
میں رنجیدہ سا بیٹھا ہوں
اک ننھے کپ کے سینے سے
یادوں کی بھاپ نکلتی ہے
اور سامنے خالی کرسی ہے

سید باقر زیدی

سب ایک سے ہوتے ہیں تو میں سب سے الگ کیوں
یہ راز وہ مجھ پر کبھی کھلنے نہیں دیتا

شاعری مجبوری تو نہیں ایک سے سب ہوں
ہم اس طرح کے ہیں جناب اس طرح کے

باقر زیدی
۹ دسمبر ۱۹۹۵ء

Baqer Zaidi
13600 Engleman Drive
LAUREL M.D. 20708- 1324 U.S.A.

باقر زیدی

(میری لینڈ)

ان سے ملئے۔ یہ سید باقر حسن زیدی ہیں۔ قلمی نام ان کا باقر زیدی ہے۔ ۲۶ ستمبر ۱۹۳۶ء کو ہندوستان کی ریاست بھرت پور میں پیدا ہوئے جو راجپوتانہ میں واقع ہے۔ فروری ۱۹۴۸ء میں پہلی ہجرت کے نتیجے میں کراچی پاکستان آکر آباد ہوئے۔ ۱۹۹۰ء میں دوسری ہجرت انہیں میری لینڈ امریکہ لے آئی۔

بی۔اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد نیشنل بینک آف پاکستان میں ملازمت کی۔ دسمبر ۱۹۵۶ء سے ۱۹۸۸ء تک اس ملازمت سے وابستہ رہے۔ ابھی مدت ملازمت میں دس سال باقی تھے کہ اختیاری ریٹائرمنٹ لے کر امریکہ چلے آئے اور مری لینڈ میں مستقل سکونت اختیار کی۔

ہمارے اس سوال کے جواب میں کہ ان کی وابستگی ادب کی کس صنف سے رہی اور ہے۔ فرماتے ہیں کہ "ہر صنف ادب کا شوق مطالعہ کی حد تک رہا ہے لیکن خاص شغف اردو نظم ہی سے رہا۔ طالبعلمی کے زمانے میں کچھ مضامین بھی لکھے جو اسکول کے جریدوں میں شائع بھی ہوئے۔

سادات کے ایک معزز گھرانے میں ولادت ہی شعروادب سے وابستگی کا سب سے بڑا ذریعہ تھی۔ بچپن ہی سے اردو کے مشاہیر شعراء کے سلام قصیدے اور مرثیے کانوں میں پڑنے شروع ہوگئے تھے اور چار سال کی عمر ہی سے انیس و دبیر کی رباعیاں گھر کی مجالس میں ایام عزا میں آنے والے ذاکرین کی پیش خوانی کے لئے انہیں یاد کرا کے پڑھوائی جاتی تھیں۔ اسی مذہبی فضا کے فیض سے ادب عالیہ کے شہ پاروں سے کم سنی ہی میں زبان و گوش آشنا ہوگئے تھے اور رفتہ رفتہ عمر کے ساتھ ساتھ اس کلام کے محاسن بھی سمجھ میں آنے لگے اور طبیعت ایک صوتی توازن سے

آشنا ہوتی رہی جو بالآخر موزونی طبع تک لے آئی۔ کہتے ہیں۔ "ناموزوں کلام شاید ہوتا بھی ہو لیکن یاد نہیں کہ سابقہ پڑا ہو لیکن اب جتنے ناموزوں شعر سننے اور پڑھنے کو ملتے ہیں ان سے ادب کے ساتھ اس بے ادبی پر بہت افسوس ہوتا ہے۔ مشاعرے ہوں کہ نعت و منقبت کی محفلیں، اخبار ہوں یا رسائل اور حد تو یہ ہے کہ شعراء و شاعرات کی شاعری کی کتابیں بھی اس ناموزونیت سے خالی نہیں۔ زبان و بیان کی غلطیاں عام ہیں۔ اس قدر غیر معیاری نظمیں اور غزلیں شائع ہوتی ہیں کہ پڑھ کر تکلیف ہوتی ہے اور سونے پر سہاگہ یہ کہ اس بیداد کو داد سخن بھی ملتی ہے اور شاعر کی پذیرائی بھی ہوتی ہے جب تک شاعر کی اہمیت اس کے کلام کے بجائے دوسرے کوائف کے پیش نظر کی جاتی رہے گی ادب میں یہ گھٹیا پن موجود رہے گا اور اس کے معیار کے زوال کے اسباب پیدا ہوتے رہیں گے۔ اگر اخبارات اور ادبی جریدے صرف معیاری کلام چھاپنے پر اکتفا کریں تو غیر معیاری کلام خود بخود کم ہوتا جائے گا۔"

"شعر گوئی کا محرک کون سا جذبہ رہا؟" سوال سن کر بولے۔

"کوئی بھی جذبہ، خیال یا احساس شعر گوئی کا محرک ہو سکتا ہے لیکن سب سے توانا جذبہ جو دل کو متحرک کرتا ہے وہ ظلم اور ناانصافی ہے۔ طاقت کا غلط استعمال وہ خواہ کہیں ہو رہا ہو یا کبھی بھی کہیں ہوا ہو اس کا احساس بھی شعر کہلوا سکتا ہے۔"

باقر زیدی پر اپنی فکر کو کسی نظریے کے ماتحت رکھ کر شعر کہنے کے قائل نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ادب کائنات کی ہر شے پر محیط ہے۔ یہ کسی مخصوص نظام یا نظریے کی میراث نہیں ہے اب تک جتنے مکتبہ ہائے فکر رونما ہوئے جتنی تحریکوں نے جنم لیا جتنے نظریات سامنے آئے جتنے نظاموں نے رواج پایا۔ ادب نے سب کو اپنے دامن میں جگہ دی۔ ہر ادیب اور شاعر اپنے عصر کی آواز ہوتا ہے اپنے گرد و پیش کے مسائل پر قلم اٹھاتا ہے۔ یہ مسائل کسی بھی نظام یا نظریے سے متعلق ہو سکتے ہیں۔ مذہبی، لادینی، سرمایہ دارانہ، سوشلسٹک، زمیندارانہ، اشتراکی جتنے چاہیں نام اور اصطلاحیں وضع کرتے جایئے ادب بڑی کشادہ دلی کے ساتھ سب کی ضروریات کو پورا کرتا ہے۔ کیونکہ ادب سب کا مشترک سرمایہ ہے۔ ادیب اور شاعر کے ذاتی رجحانات اور اس کی افتاد طبع اس کی تخلیقات پر اثرانداز ہوتی ہے اور اس سے شاعر اور ادیب کی اپنی پہچان ہو جاتی ہے۔ دنیا کی کسی بھی قوم یا کسی بھی زبان کا ادب ہو وہ پوری انسانیت کا ایک مشترک ورثہ ہے۔ یہ ایک ایسا باغ ہے جس میں انواع و اقسام کے پودے نکلتے اور نشوونما پاتے ہیں۔ ہر رنگ و بو کے پھول اس میں موجود ہیں۔ ادب انسانیت کو ادب سکھاتا ہے اس لئے یہ انسانیت کی اعلیٰ قدروں کا امین بھی ہے اور وکیل بھی۔ نظریات باطل ہو سکتے ہیں۔ نظام فنا ہو سکتے ہیں

مکتبہ ہائے خیال بدل سکتے ہیں لیکن ادب ایک جاودانی اہمیت کا حامل ہے۔ دراصل ادب کو خانوں میں بانٹ کر ہم شاعر اور ادیب کا تشخص بناتے ہیں اور یہ کوئی بہت زیادہ پرانی بات نہیں ہے۔ دنیا میں بہت شاعر اور ادیب گزرے ہیں جن کا تشخص کسی تقسیم کا مرہون منت نہیں ہے۔ غالب' میر' سودا' مومن' داغ' اقبال' شیکسپیئر' ورڈزورتھ' تلسی داس' امیرخسرو' فردوسی' صائب' فانی' جامی اور ایسے سینکڑوں ہزاروں ادیب اور شاعر کس نظام سے وابستہ تھے؟ کس نظریے کے داعی تھے؟ کون سی تحریک کے علمبردار تھے؟ کس مکتبہ فکر کی نمائندگی کرتے تھے؟ یہ سب عالم انسانیت کے شاعر تھے مگر اپنے اپنے اسلوب بیان اور طرز کلام میں مہارت رکھتے تھے۔ اردو کی طرح اور زبانوں کو بھی ادب کی اس تقسیم سے پالا پڑا ہے جیسے دبستان دہلی اور دبستان لکھنؤ۔ مگر یہ بھی وہاں کے تہذیبی روایتی اور موروثی تقاضوں کے تشخص کی بنیاد پر پیدا ہوا اور یہ شاعر اور ادیب کی ذہنی افتاد اور اس کی طبیعت کے رجحان کو سمجھنے میں اس سے آسانی بھی پیدا ہوئی۔ یہ خیال بھی کہ ادب میں عصبیت ہوتی ہے غلط ہے۔ ہمارے اپنے رجحانات' ذہنی تحفظات اور میلان طبع ادب کو عجمی اور عربی بناتے ہیں۔ شاعر اور ادیب کے اپنے اندر کا تعصب اس کی پسند ناپسند کو ظاہر کرتا ہے۔ بڑا ادیب اور بڑا شاعر پوری انسانیت کے لئے ہوتا ہے۔ ایک ہی زاویے سے اور ایک ہی رنگ کی عینک چڑھا کر ہر چیز کو نہیں دیکھتا اور یہی تنوع اس کے ادب کو ہمہ گیری اور ہمہ وقتی عطا کرتا ہے۔

آپ کے اگلے سوال کے جواب میں کہوں گا کہ ابلاغ کے بغیر ادب ایک زیر زمین خزانے کی مانند ہے جس سے کوئی فیضیاب نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ابلاغ وہ ہوا ہے جو اس پھول کی خوشبو کو پھیلا کر سب کے مشام کو معطر کرتی ہے لیکن اسکے ساتھ ہی ابلاغ کی ذمہ داری ہے کہ اس کا حسن انتخاب صرف معیاری ادب کو آگے بڑھائے۔ زبان و بیان کی صحت کا خاص خیال رکھا جائے۔ کلام کی صحت اور پھر اس کی فصاحت و بلاغت ہی اس کے حسن کو چار چاند لگاتی ہے۔

تنقید کا ادب میں کیا مقام ہے اس سلسلے میں عرض ہے کہ حب ذات انسان کی کمزوری ہے۔ نقاد شاعر اور ادیب سب ہی اس کا شکار ہیں اس لئے ہوتا یہ ہے کہ تنقید جس کو شعر اور ادب سے سروکار ہونا چاہئے شاعر اور ادیب کی شخصیت پر نکتہ چینی کرنے لگی ہے۔ اگر مثبت انداز سے کی جائے تو بہتر نتائج کی حامل ہو سکتی ہے۔ تنقیدی محفلیں عام طور پر بدمزگی پر منتج ہوتی ہیں اور ان کے تجربات خاصے تلخ ہیں لیکن اس کو یکسر نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کسی بے لگام گھوڑے کو لگام دے کر اس سے منزل طے کی جا سکتی ہے۔

آپ کی تشویش بجا کہ ہماری اگلی نسل اردو زبان سے نابلد رہ جائے گی بلاشبہ اردو زبان ہم

سید باقر زیدی

سب کا ایک تہذیبی اور ثقافتی ورثہ ہے اور ہم سب پر اس کی حفاظت فرض ہے۔ امریکہ میں پیدا ہونے والے وہ بچے جو سن شعور پر پہنچنے سے پہلے یہاں آئے ہیں ان سے اس زبان میں بات کرنا اور اسے ذریعہ ابلاغ بنانا بہت ضروری ہے۔ گھر میں صرف اردو بولئے ورنہ یہ مادری زبان صرف ماں کی زبان رہ جائے گی بچوں کی نہیں۔ انگریزی تو یہاں رہ کر ان کو ہر صورت سے آہی جائے گی۔ ضرورت یہ ہے کہ اردو سکھانے کے کسی ذریعہ اور کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے۔ یوں بھی یہاں کے تعلیمی نصاب میں یہ بات شامل ہے کہ ایک غیر ملکی زبان سیکھی جائے اور یہ ضرورت بھی باآسانی اردو سکھا کر پوری کی جا سکتی ہے۔ اس ملک میں رہ کر اردو سے ذرا سی کم توجہ بھی مہلک ثابت ہو سکتی ہے۔ اس سے انحراف ہماری آئندہ نسلوں کو ہماری تہذیب و ثقافت سے دور کر کے ایک متضاد اور اجنبی تمدن میں آہستہ آہستہ ضم کر کے ہمارے تشخص کو مٹا دے گا۔

کسی تہذیب میں ڈھلنا بہت مشکل سہی لیکن
بہت آسان ہو جاتا ہے جب اپنی زباں بدلے

میں سمجھتا ہوں کہ آج کے ادب کی جڑیں اپنی زمین میں دور تک پیوستہ ہیں۔ آج بھی لکھنے والے وقت کی ضروریات سے واقف ہیں اور اپنی ذمہ داریاں پوری کر رہے ہیں۔ آج کا شاعر اور ادیب ارادی اور غیر ارادی دونوں طرح وہ ادب پیش کر رہا ہے جو اس کے ماحول اور مزاج کا ایک حصہ ہے بات یہ بھی ہے کہ Nostalgia اپنا رنگ دکھاتا ضرور ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہجرت' غریب الوطنی' بے زمینی اور اجنبیت کے مسائل آج کی شعری تخلیقات میں مسلسل نمایاں نظر آرہے ہیں۔ امریکہ میں اپنے کہے ہوئے یہ شعر اس بیان کی تصدیق کے لئے کافی ہیں۔

کہیں جا کر مرے کردار کی صورت نہیں بدلی
کہ آئینہ بدل جانے سے کب چہرہ بدلتا ہے

مجھے تسکین کیا دیں حال و ماضی
مجھے اندیشہ فردا بہت ہے

میں چل دیا ہوں یہ کس اجنبی سے رستے پر
یہ راستہ تو مرے گھر کے راستوں میں نہیں

باقر زیدی

عکسِ فن

متفرق اشعار

اِس عہد میں کچھ اور ہیں جینے کے تقاضے
لطف اور طرح کے ہیں عتاب اور طرح کے

○

جو یہ کہتے تھے مدد صرف خدا سے مانگو
وہ مسلمان بھی کافر کی اماں تک پہنچے
اور کچھ نام رکھو اِس کو محبت نہ کہو
وہ تعلق جو کسی سُود وزیاں تک پہنچے

○

سب دھوپ چھاؤں وقت کی گردش کے ساتھ ہیں
چھوٹے ہوئے جو دن تو بڑی رات ہوگئی
بیگانہ ہوکے عقل سے مذہب کی پیروی
پابندیِ رسوم و روایات ہوگئی

○

پیکرِ خاک ہو زمیں پہ رہو
آسماں پر مکاں نہیں ہوتے

○

کسی کی ہمنشینی سے کہیں فطرت بدلتی ہے
چمن میں خار بھی رہتا ہے اور پھولوں میں پلتا ہے
یہ سچ ہے سرد کردیتا ہے جلتی آگ کے شعلے
مگر جب جوش میں آتا ہے پانی بھی اُبلتا ہے

تجمل فاروق بانی

سسکتا دل درد کی چادر میں چھپاؤ بانی
فلک نے آندھی الم کی پھر چلائی ہے

تجمل بانی
مورخہ ۱۲ مارچ
۱۹۹۶ء

کینیڈا

Tajamul Farooq Bani
5618 River Grove Ave
MISSISSAUGA ONT L5M 3T7, CANADA

تجمل فاروق بانی

(ٹورنٹو کینیڈا)

اپنے وطن سے دور بیرون ملک بسنے والے شعراء چاہے سالہا سال گزار لیں وطن کی یاد ان کے دل کو گرمائے رہتی ہے اور پھر اگر وہ شاعر، ادیب، موسیقار اور مصور ہے یا کسی بھی فن سے اسے لگاؤ ہے تو حب الوطنی کا جذبہ ہر قدم پر اپنے آفاقی نقوش چھوڑ دیتا ہے۔

تجمل فاروق بانی بھی انہی افراد میں سے ہیں جو اپنی زمین سے دور ہوتے ہوئے بھی ان رشتوں کے بندھن کو مضبوط کرتے چلے گئے۔ شہر لاہور پاکستان کے تجمل فاروق شیخ نے ٹورنٹو کینیڈا میں پہلا ٹی وی پروگرام "جیوے جیوے پاکستان" کے نام سے اپنے ایک دوست کی مدد سے شروع کیا۔ ایک میوزک گروپ "موسیقار" بھی تشکیل دیا۔ ٹورنٹو اور لاہور سے بہ یک وقت "گلرنگ ڈائجسٹ" کا اجراء کیا۔ اور بحیثیت صحافی متعدد اخبارات و جرائد کے لئے رپورٹیں اور مضامین بھی لکھتے رہے۔

تخلص ان کا بانی ہے۔ ۱۳ فروری ۱۹۴۶ء کے دن لاہور کی سوندھی مٹی سے جنم لیا۔ اسلامیہ کالج لاہور سے ادیب فاضل کے بعد میرین اپرنٹس شپ، سول ڈیفنس اور ٹائپ و شارٹ ہینڈ کے کورسز بھی کئے۔ پہلی ملازمت کینیڈا میں موٹر لانچ اور پکنک ہاؤس ٹریلرز کمپنی میں تین سال تک بطور ماڈل ڈیزائنر کی۔ پھر ٹورنٹو شہر کی ایک انڈسٹریل کمپنی میں دو سال تک بطور مارکیٹنگ پرسنل خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد اپنا بزنس شروع کیا جو تا حال جاری ہے۔

شاعری کے ساتھ ساتھ بانی کو نثر کی صنف سے بھی شغف ہے۔ ان کے کئی افسانے، پاکستان و ہندوستان کے ادبی و فلمی رسالوں میں شائع ہوتے رہتے ہیں لیکن شاعری سے لگن ان

کی فطری توقع کے عین مطابق ہے۔ گھریلو ماحول میں اہل خانہ کی زبانی بلند پایہ شاعروں کا کلام سننے اور سمجھنے کا موقع ملا۔ پھر خود بھی کہنے کی تحریک ہوئی۔ اسکول کے زمانے میں اردو کلاس کے استاد محترم نے بہت حوصلہ افزائی کی۔ (اتفاق سے استاد محترم مشہور و معروف جاسوسی ادب کے لکھنے والے ابن صفی کے چچازاد بھائی ہیں) شعر سمجھنے اور خود کہنے کا ابتدائی سبق پڑھایا اور پھر کالج کے زمانے میں اسلامیہ کالج لاہور کے پروفیسر اور نامور شاعر جناب شہرت بخاری سے باقاعدہ ایک روایتی شاگرد کی طرح شاعری پر تربیت حاصل کی۔ ڈاکٹر پروفیسر احراز نقوی سے نثر کی اصلاح لی جو مرحوم ڈاکٹر صاحب ابوالحسن نغمی کے بھائی تھے۔ بانی کا کہنا ہے کہ ادب اور شاعری میں ابلاغ کی تحریک عین فطری اور قدرتی تقاضوں کی حامل ہے۔ فنون لطیفہ کے حلقے میں جہاں مصوری اور مجسمہ سازی اپنے زمانے کے حالات اور اپنے ماحول کی نشاندہی کرتے ہوئے تاریخی اہمیت رکھتی ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ پھیلتی پھولتی ہے۔ اسی طرح ادب اور خاص کر شاعری اپنے زمانے کی لفاظی، تصویر کشی، غزل، نظم، قطعہ، رباعی اور گیت کی صورت میں کرتی ہے۔ بعض دفعہ بلکہ اکثر اشعار تو مصور کی تصویر سے زیادہ خوبصورت طریقے سے منظر نگاری کرتے ہوئے آنکھوں کے راستے دل میں جاگزیں ہو جاتے ہیں۔ ہاں شرط ابلاغ کی ہے۔ اردو کی بقا کے سلسلے میں ان کے مشورے قابل قدر ہیں۔ کہتے ہیں کہ "آج کا انسان اپنی خود ساختہ مصروفیت مشکلات، حالات اور دیگر مسائل میں ایسا الجھا ہے کہ نکلنا مشکل ہے، ہر ایک آسان راستہ شارٹ کٹ، جلدی جلدی منزل کا حصول پانے کے لئے کوشاں ہے کہ اس طرح گھریلو ماحول اور تربیت کو نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ حالانکہ مذہب، زبان، آداب اور سوشل تربیت حاصل کرنے کا پہلا مدرسہ بچے کا اپنا گھر ہوتا ہے۔ جہاں پر اہل خانہ ہوتے ہیں۔ اگر گھر میں اپنی زبان بچے کو نہ سکھائی جائے تو گلہ کس سے کیا جائے گا؟ اس ناچیز کے خیال میں اور تجربے کی بناء پر عرض ہے کہ بچے کو گھر میں اردو زبان سے باقاعدہ روشناس کروایا جائے۔ الف، ب سے شروع ہو کر املا اور لکھنے کی تربیت دی جائے گو ان غیر ممالک میں آج کل کمیونٹی کی کوششوں سے اردو کلاسوں کا اہتمام بھی کر دیا گیا ہے جہاں بچہ ایک دو گھنٹے گزار کر گھر آتا ہے تو گھر میں عام بول چال غیر ملکی زبان (جو اس ملک کی زبان ہوگی) میں کی جاتی ہے۔ اس سے بچہ زیادہ الجھ کر رہ جاتا ہے لیکن بچہ بہرحال اس ملک کی زبان کو ہر حال میں سیکھ لے گا۔ گھر میں خاص اردو بولی اور پڑھائی جانی چاہئے۔ بچہ کا ذہن قدرتی طور پر بہرحال ہر تبدیلی کو جلد قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ بس تھوڑا وقت نکال کر صبر کے ساتھ ابتدائی تعلیم اور مسلم بچوں کو قرآن پاک پڑھانے کے لئے وقت اور معمول کا تعین کر لیں۔ میرے خیال میں اس سے بہتر

اور کوئی طریقہ نہیں۔ یہی طریقہ آزمودہ ہے۔ بفضل خدا ہمارا بیٹا اردو زبان 'لکھتا' پڑھتا اور سمجھتا ہے۔ اردو نظم اور نثر کو لطائف اور واقعات پڑھ کر اور سن کر بہت لطف اندوز ہوتا ہے۔ جیسے ہم لوگ اپنے ملک ہندوستان یا پاکستان میں بیٹھے ہیں۔ ہاں بچے کے لئے پڑھانے کا وقت دینا شرط ہے۔ انشاءاللہ وہ آپ کو مایوس نہیں کرے گا"۔

بانی کہتے ہیں "آج کا ادب قطعی بے معنی نہیں ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ جیسے اور چیزوں پر ماحول اثرانداز ہوتا ہے اور تبدیلی آتی ہے۔ اسی طرح ادب میں بھی تبدیلی آئی ہے اور آئے گی۔ ہر وہ چیز جو انسانی زندگی میں ساتھ ساتھ چلتی ہے' وہ ذہن' دل اور فطرت کے مطابق ہو تو اچھی محسوس ہوگی۔ وہ پھولے پھلے گی بھی۔ قدامت پسندی کے خواہاں (روایت پسندی نہیں لکھا) بہت کم لوگ ہوتے ہیں اور ان کم لوگوں کو ہی گلہ' شکوہ کرتے دیکھا گیا ہے۔ وقت کے تقاضوں کے ساتھ قصہ کہانیوں کی جگہ مختصر افسانے نے لی۔ ناول لکھنے کی تکنیک اور دوسرے مضامین میں بھی تبدیلی اور جدت آئی ہے۔ ہر جدت' ہر تبدیلی ہر نئی شکل اپنی بنیادی اصلیت کے ستونوں پر ہی قائم کی جاتی ہے۔ انسانی فطرت تحریک اور تخلیق کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اس سے ترقی کے نئے نئے راستوں کی نشاندہی بھی ہوتی ہے۔ یہ تبدیلی بہت پر معنی ہوتی ہے بے معنی نہیں۔ فنکار وہی ہے جو اپنے نئے انداز میں اپنی صلاحیتیں بروئے کار لائے اور پرانی روایت اور جدید تقاضوں کو ہم کنار کرتے ہوئے ادب اور خاص کر اردو ادب میں تبدیلی لائے۔ یقین ہے کہ ادب شناس اور اردو ادب کے شوقین لوگ ضرور دلچسپی سے پڑھیں گے اور سنیں گے بھی"۔

تجمل فاروق بانی

عکس فن
غزل

گلشن میں بہاروں نے بکھیری ہے جو لالی
ہر پھول نے رنگت تو میرے خوں سے چرالی

آساں تو نہیں اپنا وطن چھوڑ کے آنا
ہر موڑ پہ زنجیر محبت نے لگالی

اے دشمن جاں چھوڑ کے جاتا ہے تو جا
ہر یاد تری ہم نے مگر دل میں چھپالی

یارب تیری دنیا میں انساں ہوا عنقا
ہر دل تو دھڑکتا ہے محبت سے مگر خالی

اے گردش افلاک ہمیں چھوڑ دے تنہا
اس بندہ بے کس نے بہت جان جلالی

بانی کا بھی، انداز سخن سب میں کہاں
ہر نظم میں یکتا ہے تو غزل نرالی

●

بشر صہبائی
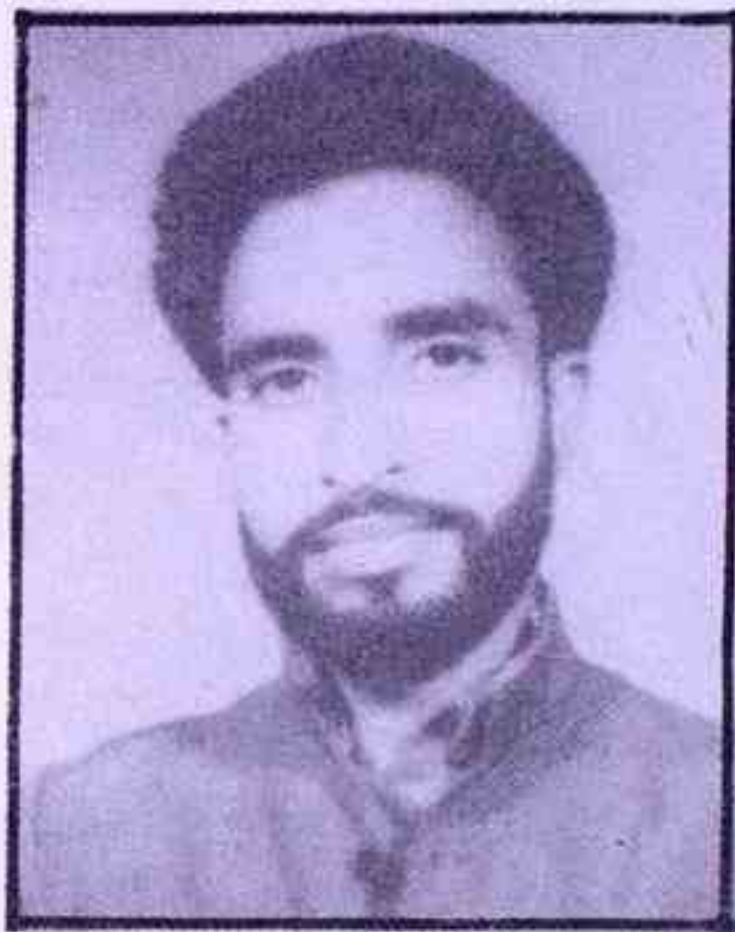
بیتے دانے وقت کی کیسے پھلوں کو بھی پھاڑ ڈالا
کھلونے بیچ کر بچے دوا بابا کی لائے ہیں

بشر صہبائی
30-9-95

Bashar Sahbai
C/O Nisar Rahi Advocate
P/44 Teela Jamal Pura BOHBAL 462001, INDIA

بشر صہبائی

(بھوپال ہندوستان)

ہمارے اور تمہارے کام میں بس فرق ہے اتنا
چمن سینچا ہے ہم نے اور تم نے گل کھلائے ہیں

گل کھلانے کے استعارے کو جس خوبی سے شعر میں استعمال کیا گیا ہے یہ بشر صہبائی کا ہی حصہ ہے۔ بھوپال ہندوستان کے اس شاعر سے میرا رابطہ ایڈووکیٹ نثار راہی کے توسط سے ہوا۔ اور نثار راہی سے شمع دہلی کی معرفت۔ میں نے نثار رہی کا افسانہ "نمفوگرل" پڑھا اور بے ساختہ داد کے طور پر انہیں خط لکھا۔ پھر سخن ور کے سلسلے میں ان سے تعاون چاہا اور نثار راہی نے میری بھرپور مدد کی۔ اگر نثار راہی جیسے لوگ آج کے دور میں نہ ہوتے تو ادب کی نیا اس طرح سبک سبک سہی چلکر کبھی بھی منزل کی جانب گامزن نہ ہوتی۔

بشر صہبائی کا کلام میری نظر سے گزرا تھا۔ انکا کلام ماہنامہ افکار کراچی کے علاوہ ہندوستان کے دیگر مقتدر رسالوں میں شائع ہوتا رہا ہے جیسے میگھ دوت' آذر' آفتاب جدید' آریہ دوت' ندیم' الحمرا اور اوصاف حمیدہ کے علاوہ کئی فلمی رسالے بھی شامل ہیں۔ مدھیہ پردیش کی حکومت نے ۲۵ سالہ سفر کے نام سے جو مجموعہ شائع کیا ہے اس میں بھی بشر صہبائی کا کلام موجود ہے۔ انکا پہلا مجموعہ "انا بشر" کے نام سے اردو اکیڈمی کی تحویل میں ہے جو جلد ہی منظر عام پر آئے گا۔ دوسرا مجموعہ بھی تیار ہے مگر مالی کم مائیگی کے عفریت کے پنجوں میں بشر کی طرح اور بھی بہت سے شعراء ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔ دیکھیں اس عفریت سے رہائی ملے تو بشر کا دلنشیں کلام بھی سامنے آئے۔ ابھی تو انکا دکھ انکے اشعار میں ہی سمویا ہوا ہے جو ہمارے آپ کے سامنے نہیں کہ ہمارے احساسات کو چھولے۔ کہتے ہیں۔

پہاڑوں پر اگر ہوتے تو چکنا چور ہوجاتے
جو ہم نے درد جھیلے ہیں جو ہم نے غم اٹھائے ہیں

اور

کریں لحاظ ادب کا قلم کے سوداگر
انھیں شعور عطا کر دماغ دے یارب

اور

بنا لیں گے مکاں، دل جوڑ لیں گے
خدا کا شکر ہے مکتب نہ ٹوٹا

بشر سلیس اور آسان زبان استعمال کرتے ہیں کیونکہ یہ کارگر ہوتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ابلاغ الجھاوے کا نام نہیں۔ ابلاغ تو شعر میں حسن پیدا کرتا ہے اور شعر حسن کے بغیر شعر نہیں رہتا۔

شعر گوئی کے لئے فطری جولانی طبع کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ ان کا یقین ہے کہ خوشی سے زیادہ تکلیف کا اثر شعر گوئی پر اکساتا ہے۔ انعام واکرام کے مقابل ظلم وزیادتی شعر گوئی کا سبب بنتے ہیں۔ بشر ادب میں نظریات کا عمل دخل اس حد تک ہی گوارا سمجھتے ہیں جو شاعری سے شعریت کو ختم نہ کردے۔ کیونکہ ادب میں نغمگی نہ ہو تو وہ دلوں کو چھوتی نہیں۔ ادب میں بلاشبہ مقصد اور عصری تقاضے شامل ہوں یہ مستحسن عمل ہے لیکن شاعری کی نزاکتوں کو مسمار نہیں ہونے دینا چاہئے۔ ان کا شعر ہے کہ۔

اگرچہ ہم نہیں استاد ریختی کے بشر
ہمارا رنگ تغزل ہے میر ہی کی طرح

انھیں اتفاق ہے کہ تنقیدی محفلیں ذہن وشعور کو بیدار کرتی ہیں اور ادب کو جلاء بخشتی ہیں مگر یکطرفہ فیصلے ساری کوششوں پر خاک ڈال دیتے ہیں۔ اکثر محفلیں ادب سے بڑھ کر ذاتیات پر حملہ آور ہو کر بے اثر ہو جاتی ہیں۔ تجربات شاہد ہیں کہ اکثر نقاد اپنا نظریہ فنکار پر تھوپنا چاہتے ہیں۔ تنقید میں اگر نیک نیتی شامل ہو تو وہ ادب کو نکھارنے اور سنوارنے کا کام دیتی ہے۔

بشر اس بات سے متفق نہیں کہ آج کے دور میں ادبی رسائل مقبول نہیں۔ فروخت میں کمی کی وجہ بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ اردوداں طبقہ کے پاس مالی وسائل کم ہیں۔ قوت خرید کی کمی ہے۔ اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ اردوداں طبقہ کو مالی مشکلات سے نکالا جائے۔ غربت اور مہنگائی نے عام آدمی کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ ہاں امریکی اردو باشندے سرگرم عمل ہوں تو اردو کی بقاء کے لئے خاطر خواہ کام ہو سکتا ہے۔ ادبی انجمنیں، نائٹ اسکول اور سستی کتابیں، رسالے اور آڈیو ویڈیو کے ذریعے کئی پروگرام ترتیب دیئے جاسکتے ہیں۔

بشر آج کے ادب سے مطمئن ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جو لوگ مطمئن نہیں یہ وہی ہیں جنہیں کل کی شاعری بھی نہیں بھاتی تھی۔ ادیب و شاعر کاغذ پر اپنا کلیجہ نکال کر رکھ دیتے ہیں۔ آج کے معروف دور میں ایک فنکار سے اس سے زیادہ کی امید بھی نہیں رکھنی چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ آج کا ادب بے مقصد نہیں۔ کچھ جذبے کچھ ضرورتیں ایسی ہوتی ہیں جو ازل سے ابد تک یکساں رہتی ہیں۔ ہر چیز میں تبدیلی ممکن نہیں۔ آج کا شاعر اور ادیب اپنا راستہ خود تخلیق کرنے کا ہنر جانتا ہے۔ شاعری کا سفر ویسے بھی آسان نہیں۔ آج کے ادیب کی مالی سرپرستی کسی راجے مہاراجے یا نوابین کے وظائف سے نہیں ہو رہی۔ آج کے فنکار کو اپنی تشنگی بجھانے کے لئے اپنا کنواں خود کھودنا پڑ رہا ہے۔

اپنے سفر حیات کی روداد سناتے ہوئے انہوں نے کہا کہ بچپن میں باپ کی شفقت سے محروم ہو جانے کی وجہ سے میں باقاعدہ تعلیم حاصل نہ کر سکا۔ میری پیدائش بھوپال (ہندوستان) میں غالباً" ۱۹۳۶ء میں محلہ فتح گڑھ میں ہوئی۔ نوعمری سے ہی مجھے جدوجہد کی زندگی سے سابقہ پڑا۔ پھر بھی میں نے تلاش معاش کے ساتھ حصول تعلیم کے شوق کو پروان چڑھایا۔ اردو ہندی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ فارسی اور انگریزی سے بھی واقفیت حاصل کی۔ تجارت کے سلسلے میں ہندوستان پاکستان کا سفر کیا ہے۔ ۱۹۵۷ء سے باقاعدہ شاعری شروع کی۔ گو شروع سے ہی طبیعت مائل تھی۔ علم عروض سے شناسائی کے بعد رباعیات' قطعات' منظومات کے ساتھ افسانہ نگاری' تبصرہ نگاری اور مقالات لکھنے پر بھی توجہ دی۔ کئی افسانے' مقالے اور تبصرے شائع ہو چکے ہیں۔ شاعری کی طرف رجحان کی وجہ میرے گھر کا شاعرانہ ماحول بھی تھا۔ یہ زمانہ سیماب' جگر' فانی اور اصغر گونڈوی جیسے شعراء کے کلام کے چرچے کا تھا۔ ان کا کلام ہر خاص و عام کی زبان پر تھا۔ ہر طرف ان کے تذکرے اور مباحثے ہوتے رہتے تھے۔ میں اپنی شاعری کے ذریعے اردو کی بے لوث خدمت کرنا چاہتا ہوں اور کر رہا ہوں۔ اپنے استاد محترم کی طرح۔ میرے استاد قبلہ حضرت صہبا قریشی نے بھی ساری عمر دوسروں کی اسی طرح نگہداری کی۔ میرے شاگردوں میں تین نام خاص ہیں جو اردو ادب میں اپنا مقام بلند کر رہے ہیں۔ یہ ہیں ڈاکٹر شمیم بھوپالی' ایاز قمر اور تاج الدین۔ میں نے صہبائی اپنے محترم استاد کے نام سے اپنے تخلص بشر کے ساتھ لیا ہے۔ ویسے میرا نام سید قمر علی ہے اور اپنے لئے میں کہتا ہوں کہ۔

علم و فن پر دسترس بھی خوب ہے
اور بھی میں بے ہنر لگنے لگا

بشر صہبائی

عکسِ فن

غزل

دبیز جہل کے پردے، دماغ دے یارب
اندھیرے ڈسنے لگے ہیں، چراغ دے یارب

خلوص و اُنس کی خوشبو لئے ہوئے ہوں پھول جہاں
سکونِ قلب ہو حاصل، وہ باغ دے یارب

بنا رہی ہے مئے زر ہمیں ہوس کا غلام
ہو جن میں حِلم کی مئے وہ ایاغ دے یارب

تمام جُود و سخا ہیں تری عطا کے سبب
کہ تو عظیم ہے، دستِ فراغ دے یارب

بطورِ خاص عطا کر عبادتوں کا شعور
جبیں ہو جس سے منوّر، وہ داغ دے یارب

بھٹک رہے ہیں بشرؔ راستے ہیں لامحدود
تو اپنی ذات کا کچھ تو، سُراغ دے یارب

سکینہ ساجد پنہاں

گھر کو کچھ تازے گلابوں سے سجاتے رہنا

چند لمحوں کی ہیں مہمان کسی کی یادیں
راز یادوں سے خیالوں کو سجاتے رہنا

(۲۲ مئی ۱۹۹۵ء)

بس اتنا جانتی ہوں زندگی کو
کہاں جینے دیا اس نے کسی کو

پنہاں
۲۳ اگست ۱۹۹۵ء

Sukaina Sajid Pinha
1811 E, Frankford Rd,
APT. # 2006 CARROLLTON TX. 5007 U.S.A.

سکینہ ساجد پنہاں
(ہیوسٹن)

سکینہ ساجد نام ہے اور پنہاں تخلص۔ ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۷ء کے دن لاہور (پاکستان) میں پیدا ہوئیں۔ اردو میں ایم۔اے کرنے کے بعد جامعہ کراچی میں پی۔ ایچ۔ ڈی کے لئے مقالہ داخل کر کے اب سند کے حصول کا انتظار ہے۔ ۱۹۸۳ء سے ۱۹۸۶ء تک نارتھ گرلز کالج میں اور ۱۹۸۷ء سے ۱۹۹۴ء تک عبد اللہ گورنمنٹ کالج برائے خواتین کراچی کے شعبہ اردو سے بحیثیت لکچرار منسلک رہیں۔ شاعری کے علاوہ مختصر افسانے بھی لکھتی ہیں۔ سچ کی جستجو اور اظہار کی تڑپ نے ان سے شعر کہلوائے۔ پنہاں کی شاعری میں بلاشبہ رچاؤ ہے اور جذبے سر اٹھا کر بولتے ہیں۔

جو بیت گئی دل پر کب اس کی شکایت کی
اک موم کی گڑیا نے سورج سے محبت کی

○

ہے لفظ کائنات کا معنی مرا وجود
مرکز ہے میری ذات یہ دنیا ہے دائرہ

پنہاں کی سوچ کسی مکتبہ فکر سے متاثر نہیں۔ کہتی ہیں "یہ تو مجھے نہیں معلوم کہ ادب و شعر کو نظریاتی ہونا چاہئے یا نہیں۔ مگر اتنا جانتی ہوں کہ ہر شعر ہر افسانہ کسی نہ کسی فکر یا کسی نہ کسی نظریے کا ہی واضح یا ڈھکا چھپا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن نظریے سے مراد اگر کسی خاص سیاسی، سماجی، مذہبی، معاشی نظریات کا پابند ہونا یا کسی مخصوص طقے یا گروہ کی تابعداری کرنا ہے تو بس واضح طور پر یہ کہہ سکتی ہوں کہ شاعری کو ایسا کسی نظریے کے ماتحت رہنے کی کوئی مجبوری لاحق نہیں۔ اور

سکینہ ساجد پنہاں

میری شاعری ایسی کسی خاص شاعری سے متاثر نہیں ہے کسی بھی سیاسی' سماجی' مذہبی' معاشی یا کسی بھی "سی' شی یا جی" کے خانے میں بند کیا جاسکے۔ حقیقت یہ ہے کہ شاعری تو بذات خود ایک مکتبہ فکر ہے۔ اور میں اسی مکتبہ فکر کے تحت شعر کہتی ہوں۔ میری شاعری زمین کی طرح نہیں ہے جس پر باڑیں لگائی جاتی ہیں' سرحدیں قائم کی جاتی ہیں۔ بلکہ میری شاعری تو آسمان کی طرح ہے میرے وجود کی پوری کائنات پر محیط"۔

پنہاں کی تخلیق ان رسائل میں قارئین ادب کی نظروں سے گذرتی ہوں گی۔ نقوش' افکار' نیا دور' اوراق' دائرے' نگار پاکستان' قومی زبان' جام نو' نیرنگ خیال' قرطاس' نئی قدریں' تخلیق' ادوار' عکاس' شاعر' سیپ' الفاظ اور طلوع افکار

پنہاں کے مطبوعہ مجموعہ کلام درج ذیل ہیں۔

۱۔ احساس ناکامی (غزلیں) ۱۹۸۱ء اشاعت دوئم ۱۹۹۳ء

۲۔ غزل سہیلی (غزلیں) ۱۹۸۸ء

۳۔ آدھی رات کا پورا چاند (نظمیں) ۱۹۹۳ء

ادب میں ابلاغ ضروری ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ "ادب وشاعری میں زبان وبیان کا آسان ہونا یقیناً ابلاغ میں سہولت فراہم کرتا ہے۔ لیکن ابلاغ اتنا ضروری نہیں جتنا ضروری خود شعرا و ادب ہے۔ مثلاً یہ کہ اگر کوئی شعر بہت بلیغ ہے مگر سلیس نہیں تو کیا۔ پھر بے مصرف نہیں۔ اگر اس کا ابلاغ کم پڑھے لکھے یا عام سطحی ذہنوں کے لئے ممکن نہیں تو نہ سہی اس شعر کا کام وہیں سے شروع ہوگا جس اعلیٰ سطح سے اس کا ابلاغ شروع ہوگا۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ ادب وشاعری کا ابلاغ عام ذہنی سطح پر ممکن ہی نہیں ہے۔ زبان واسلوب چاہے جتنا بھی آسان کیوں نہ ہو لیکن شعر کی روح تک رسائی ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہوتی اور اگر ہوتی بھی ہے تو ہر شخص کی پہنچ برابر نہیں ہوتی۔ ہر نظر اپنی روشنی تک جا کے کہیں نہ کہیں رک جاتی ہے۔ اور شاعری کے حسن کی انتہائی نزاکتوں اور لطافتوں تک صرف کچھ مخصوص ذہن ہی رسائی حاصل کرپاتے ہیں۔ کچھ لوگوں میں یہ صلاحیت خداداد ہوتی ہے اور کچھ تعلیم وتربیت کے ذریعے مذکورہ سطح تک پہنچنے کے قابل ہوجاتے ہیں۔ سوال یہ بھی پیدا ہوسکتا ہے کہ ابلاغ کس حد تک ضروری ہونا چاہئے۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ کسی طبقے کی سمجھ میں آرہی ہو مگر دوسرا گروہ اسے مبہم اور بے معنی قرار دے چکا ہو۔ لہٰذا میرا خیال یہ ہے کہ شاعری میں ابلاغ ہونا تو چاہئے مگر شاعری کو ابلاغ پر قربان نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے کہ اگر کوئی شعر یا نظم آج کسی کی سمجھ میں نہیں آرہی ہے تو ممکن ہے آنے والی نسلوں کے لئے خیر ونور کی سوغاتیں اس میں پوشیدہ ہوں"۔

پنہاں تنقید کی حمایت کرتے ہوئے کہتی ہیں کہ "شاعری کے لئے تنقید کی وہی اہمیت ہے جو پھولوں کے لئے مالی کی ہوتی ہے۔ مگر شاعری تنقید کی محتاج نہیں ہے۔ جیسے پھولوں کو کھلنا ہو تو وہ مالی کا انتظار نہیں کرتے۔ اسی طرح کسی فطری شاعر کے دل کی کوئی سچی تڑپ لفظوں میں ڈھلنے کے لئے کسی ناقد کی اجازت کی محتاج نہیں ہوتی۔ اور پھر ایسا بھی تو ہوتا ہے کہ اچھی شاعری خود تنقید کے نئے معیار وضع کرتی ہے۔ مختصر یہ کہ تنقید شاعری کو نکھارتی' سنوارتی تو ضرور ہے جیسے مالی باغ کی نگہداشت کرتا ہے مگر خود رو پھولوں کے کنج کسی مالی کے احسانات کے زیر بار نہیں ہوتے"۔

امریکہ میں نئی نسل اور اردو زبان کے حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ "اردو زبان کی بقاء اور فروغ کے لئے سب سے پہلا اور بنیادی ضروری کام یہ ہے کہ گھروں میں اردو بول چال کا ماحول رکھا جائے۔ بچوں سے اردو میں بات چیت کی جائے اور انہیں بھی اردو ہی میں جواب دینے کی عادت ڈالی جائے۔ اس کے علاوہ اردو کلب بنائے جائیں جو بچوں کی تفریح طبع کا ذریعہ بھی ہوں۔ اور کھیل ہی کھیل میں انہیں اردو کی تعلیم یوں دی جاتی رہے کہ نہ ان پر کوئی اضافی بوجھ پڑے اور نہ ہی وہ اسے ایک ناپسندیدہ اور بے کار سا کام سمجھیں۔ بلکہ انداز کچھ ایسا اپنایا جائے کہ بچے خود اس طرف اس طرح لپکیں جیسے دوسرے تفریحی مشاغل کی طرف دوڑتے ہیں۔ یوں انہیں اس معاشرے کی عام برائیوں سے بھی دور رکھنے میں کسی نہ کسی حد تک مدد ملے گی اور اردو زبان کے ذریعے ان کی اپنی تمیز و تہذیب اور سماجی قدریں بھی کافی حد تک ان میں سرایت کرتی رہیں گی جو بے حد ضروری ہے"۔

"آج کی شاعری اپنے اطراف کے سچ کی مظہر ہے یا نہیں؟" اس سوال کے جواب میں ان کا کہنا ہے کہ "ساری اردو شاعری تو اس معیار پر پوری نہیں اترتی مگر اچھی مثالیں بھی موجود ہیں۔ خصوصاً خواتین کی شاعری میں ایسی شاعری کی اچھی مثالیں زیادہ ملتی ہیں۔ یہاں میں ہر ایک شاعرہ کی بات نہیں کر رہی ہوں مگر بہت سی شاعرات ایسی تخلیقات پیش کر رہی ہیں جو ان کی ذات اور اطراف کا سچا عکس ہے اور جس کی جڑیں ہماری سماجی اور تہذیبی زمینوں میں دور تک گہری ہیں۔ اور چونکہ کسی بھی دور میں سینکڑوں میر' ہزاروں غالب اور لاکھوں اقبال پیدا نہیں ہوئے۔ اچھی اور فضول شاعری کی مثالیں ہر عہد میں ملتی ہیں۔ چنانچہ اب بھی ایسا ہی ہے۔ جدید اردو شاعری میں بے شمار تخلیقات ایسی موجود ہیں جو اپنے شاعر کے سچے وجود کا اقرار بھی ہیں اور اس کے عہد کی گواہ بھی۔ پھر ایک طرفہ تماشا یہ بھی ہے اور اس کے باوجود کہ شاعرات کے یہاں بہ اعتبار مقدار و معیار اچھی شاعری کی زیادہ مثالیں موجود ہیں۔ ہمارے ناقدین شاعرات کے حوالے سے افراط و تفریط کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کوئی کسی کو حد سے زیادہ چڑھا دیتا ہے کوئی کسی کی ذاتی زندگی

اور طور طریقوں میں کیڑے نکال کر اس کی شاعری کو قطعی طور پر رد کر دیتا ہے۔ حقیقت تو یہی ہے کہ سنجیدگی کے ساتھ سنجیدہ شاعرات کا مطالعہ سنجیدہ ناقدین نے کیا ہی کہاں؟ جس شاعری میں کچھ جان ہے اسے خواتین کی شاعری کہہ کر کنارے کھسکا دیا جاتا ہے۔ باقی جو کچھ ہے سب کے سامنے ہے۔

ہمارے یہاں مطالعے کا تو فقدان نہیں کیونکہ نقالوں کو کسی نہ کسی کی نقل کرنے کے لئے بھی اسے پڑھنا تو پڑتا ہی ہے۔ منفی تجربات اور منفی نقطہ نظر کی کمی بھی نہیں۔ باقی رہی بات مثبت فکر کی تو یہی تو وہ سرمایہ حیات تھا جو ہم نہ جانے کہاں گنوا بیٹھے۔ یہ المیہ ہمارے معاشرے کا بھی ہے' ہماری ذاتی زندگیوں کا بھی اور ہماری شاعری کا بھی۔ اس کے باوجود کچھ نام ہیں جو اس اندھیرے میں بھی روشن ہیں۔ مگر نام گنوانے بیٹھی تو آدھے سے زیادہ نام شاعرات ہی کے ہوں گے اور یوں صنفی جانب داری کا الزام فوراً مجھ پر عائد کر دیا جائے گا۔ جب کہ سچ تو صرف اتنا ہے کہ۔

ہم سخن فہم ہیں' غالب کے طرفدار نہیں

متفرق اشعار

دل پہ دستک سی دے گئی خوشبو
پھول شاید کوئی کھلا ہے ابھی

○

جو بیت گئی دل پر کب اس کی شکایت کی
اک موم کی گڑیا نے سورج سے محبت کی

○

کوئی تکتا تو ہوگا چاند میں میرے ہی چہرے کو
کسی کی آنکھ میں تو خواب ہوں گے رات بھر میرے

○

بہت کچھ کہہ کے بھی وہ کچھ نہ کہنے کی ادا پنہاں
غزل کو رفتہ رفتہ آگئے سارے ہنر میرے

سکینہ ساجد پنہاں

عکسِ فن

کٹھ پتلی

تماشا یوں ہی جاری ہے
نہ جانے کتنی صدیوں سے
اشاروں پر تمہارے بے بسی سے رقص کرتی
میں تھک کے اپنے اندر سو گئی تھی
عجب اک موت جیسی نیند تھی وہ
مگر موسم جو بدلا تو
مرے مردہ بدن کی سوکھی لکڑی
ہری ہونے لگی ہے
لہو بن کر اجالوں کی لکیریں ذہن و دل میں سُر سُراتی ہیں
سوالوں کا زباں پر ذائقہ جاگا
بتاؤ اور کب تک رقص کرنا ہے؟
اشاروں پر تمہارے بے بسی کا رقص کرتے
گزاریں کتنی صدیاں
مگر یہ ڈوریاں جو
مری گردن میں، ہاتھوں اور پیروں میں بندھی ہیں
بہت میلی پُرانی اور خستہ ہو گئی ہیں
پرانے ہو گئے وہ گیت سارے
الاپے تم نے جو صدیوں مرے بدلے
ان ہی تاریک مردہ بے تُکے بولوں کی جھوٹی لے پہ کب تک
بتاؤ اور کب تک رقص کرنا ہے؟

یعقوب تصور

سبھی بات اگر کہہ دینے کے دل میں ارمان بھی ہیں
پھر اس بات سے ڈر جاتا ہوں کہ دیواروں کے کان بھی ہیں

یعقوب تصور
ابوظہبی
۲۷ دسمبر 1995ء

Yaqoob Tasuwar
P.O.Box 4628. ABU.DHABI U.A.E.

یعقوب تصور

(ابوظہبی)

دنیا اور اس کے متعلقات ازل سے ارتقائی مراحل سے گزرتے رہے ہیں اس میں انسانی زندگی بھی شامل ہے۔ زندگی کا کارواں ہر لمحہ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ جو عناصر ساتھ چلتے ہیں وہ بدلے ہوئے حالات میں شامل ہو کر زندگی کے نئے تقاضوں کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ اس حقیقت کے پیش نظر ایک باشعور قلم کار روایت کی توانائی سے بھرپور فائدہ اٹھاتا ہے اور جدت کو آگے بڑھانے اور بہتر طور پر استعمال کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اسی امتزاج اور ہم آہنگی سے اچھا ادب وجود میں آتا ہے۔

یعقوب تصور نے اس نکتے کو پا کر شاعری کے موجودہ تقاضوں کو سمجھا اور قدم بقدم ساتھ چل کر اس کی توانائی میں اضافے کی پیہم کوششوں کو جاری رکھا ہے۔

یعقوب محمد نے ۱۹۴۵ء میں لکھنؤ میں جنم لیا۔ ۱۹۶۵ء میں جامعہ کراچی سے فزکس اور ریاضی میں بی ایس سی کیا۔ ریاضی میں ایم ایس سی کا سال اول اور ایل ایل بی کا بھی صرف سال اول کر کے مکینیکل ڈیزائنگ میں تربیت لی۔ اس سلسلے میں مغربی جرمنی بھی گئے۔ پیشہ ورانہ خدمات کی ادائیگی کے سلسلے میں ۱۹۷۵ء میں بحیثیت منیجر ابوظہبی گئے اور اب ڈائریکٹر اور منیجنگ پارٹنر کی حیثیت سے ابوظہبی کی المعاون امپورٹنگ اینڈ ٹریڈنگ کمپنی سے وابستہ ہیں۔

شاعری سے وابستگی کے مرحلے پر انہوں نے تصور تخلص اپنایا۔ بچوں کے گیت لکھے جسے ابوظہبی کی مغنیہ شیما محیط نے گایا اور آڈیو کیسٹ کی شکل میں عوام تک پہنچایا۔ انہوں نے

قاضی نذر السلام کے بارہ بنگالی گیتوں کا بھی اردو میں ترجمہ کیا جو شیما کی آواز میں آڈیو کیسٹ اور ایل پی پر بنے۔ ان گیتوں کی موسیقی بنگلہ دیش میں ترتیب دی گئی۔ یعقوب تصور کا کلام بھی ملک کے مقتدر جرائد میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ ان میں پاکستان کے نیرنگ خیال' افکار' فنون' اوراق' اقدار' نئی قدریں کے علاوہ ہندوستان کے بیسویں صدی' شمع اور شاعر وغیرہ ہیں۔ ان کی طبیعت میں اپج تھی اور گھر کے ادبی ماحول نے بھی حوصلہ افزائی کی لہٰذا نظم اور غزل کے میدان میں انہوں نے طبع آزمائی کی۔

ادب کی معنویت کے سلسلے میں اظہار خیال کرتے ہوئے یعقوب کہتے ہیں کہ "معنوی اور بے معنی ادب کی ایک طویل بحث ہے اور اس میں موافقت یا مخالفت میں لاتعداد استدلال پیش کئے جاسکتے ہیں۔ یہ تنازعہ ہر دور میں ادب کے مباحث کا ایک حصہ رہا ہے۔ آخر تنقید نگار کیا کرے؟ معنوی ادب سے کیا مراد ہے۔ یہی نا جس میں مقصدیت ہو' معاشرے' سماج اور کیفیات زندگی کا سچا عکاس ہو۔ جس میں گہرائی ہو اور جو احساسات اور جذبات کو ابھار سکے اور زندگی کو متحرک کر سکے۔ تو اس کا دارومدار دراصل ان حالات پر ہوتا ہے جن میں ہم سانس لے رہے ہوتے ہیں اور کسی بھی دور میں حالات' واقعات یا حادثات سے اس دور کے ادیب و شاعر یکساں انداز میں متاثر ہوتے ہیں لہٰذا وہ جو کچھ بھی کہتے ہیں اس میں یکسانیت لازمی ہے لیکن انداز بیان کا فرق اپنی جگہ ہے اور اب اسی یکسانیت کو چبائے ہوئے لقموں کا اگلنا کہا جا سکتا ہے لیکن کیا قحط کے دور میں لوگ فراوانی رزق کا قصیدہ لکھ کر اپنے فن سے انصاف کر سکتے ہیں؟ بات پھر وہی ہے کہ اگر کوئی ابلاغی ذرائع کی تحصیل کے باعث اور مواقع یا اپنی محنت اور قابلیت کی وجہ سے ہی سہی معروف ہو گیا ہے تو باقی سب اس کی نظروں میں خس و خاشاک ہیں۔ میر' غالب' ذوق سے لے کر ناصر کاظمی تک جو کچھ کہا گیا کیا وہ مسلسل انداز کے کلام کی تبدیلی کے ساتھ اعادہ نہیں ہے؟ (ترقی پسند ادب کا دور درمیان میں ہونے کے باوجود) کیا خود ترقی پسند شعراء اور ادباء نے اسلاف کے سخن و ادب کی پیروی نہیں کی؟ آج معاشی' معاشرتی' عمرانی' مدنی اور سائنسی ترقی و تبدیلیوں کے سبب ساری شاعری سے غیر متعلق مضامین متروک ہو چکے ہیں اور اس کی زندہ مثالیں موجود ہیں۔

"موجودہ دور میں اردو ادب سے ہماری دلچسپی کم ہوتی جا رہی ہے" اس پر تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔ ادب دراصل کشش رکھتا ہے تو تعلیم یافتہ طبقے کے لئے اور ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں تعلیم یافتہ طبقہ زیادہ تر تاحال تعلیمی ترقیوں اور رجحانات کے

باجود ۲۵ یا ۳۰ فیصد سے زیادہ نہیں اور ان میں بھی ادب سے حقیقی لگاؤ رکھنے والے شاید صرف ۵ یا ۷ فیصد ہوں گے بلکہ اگر حقیقت پسندانہ نظر سے جائزہ لیا جائے تو یہ کہہ دینا غیر مناسب نہیں ہوگا کہ ہندوستان اور پاکستان میں اردو ادب صرف وہی لوگ پڑھتے ہیں جو بذات خود شاعر یا کسی بھی طرح ادب سے تعلق رکھتے ہیں اور اس اندازے کے مطابق قارئین ادب و سخن فہم کو انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے۔

ادب سے دلچسپی پیدا کرنے کی ذمہ داری اولاً ہمارے گھریلو ماحول اور پھر اساتذہ پر عائد ہوتی ہے یہ ایک تدریجی عمل ہے اور جب تک اس کی جڑیں ذہنی خلیات سے منسلک نہیں ہوتیں اس کے خاطر خواہ نتائج حاصل نہیں کیے جاسکتے۔ یہ ایک معاشی جدوجہد اور معاشرتی مصائب کا دور ہے لیکن اگر ہم پہلے کل کے بارے میں سوچیں تو زیادہ مناسب ہے اور آنے والی نسلوں کو ادبی ذوق وشوق سے آراستہ کریں تو اس سلسلے میں جو عمل کیے جائیں گے اس کا اثر آج کے معاشرے پر بھی بہرحال پڑے گا۔ اسکولوں میں ادبی نشستیں اور مقابلے منعقد کیے جائیں تاکہ ذہنوں میں ادبی افادیت کے سوتے پھوٹیں پھر ادبی مجلوں کے علاوہ اخبارات' ریڈیو اور ٹی وی پر بھی ادبی پروگرام مختلف انداز میں زیادہ سے زیادہ پیش کیے جائیں اور سب سے اہم یہ کہ اکابرین ادب و سخن' نوواردوں کی ہمت افزائی کریں کہ دراصل یہی ان کی بڑائی ہے۔

ادب میں تنقیدی رویے پر بھی یعقوب مطمئن نہیں' کہتے ہیں کہ ''جہاں مختلف شعبوں میں آج کل مافیا ازم کا رویہ ہے ادب میں بھی بعض اوقات اس قسم کی اجارہ داری کا احساس ہوتا ہے۔ شاعروں' ادیبوں' محققوں اور نقادوں کے مختلف گروپس اور پلیٹ فارم بن گئے ہیں جو اپنے حمایتیوں کی سربلندی اور دوسروں کی مخالفت میں ہمہ وقت مصروف و مشغول ہیں جس میں تعمیری کام کم اور تخریبی زیادہ ہوتا ہے۔ حد یہ ہے کہ چند کے سوا بیشتر ادبی مجلّے کی رکنیت کے بغیر (مالی معاونت) تخلیقات کی اشاعت ممکن نہیں اور ادیب و شاعر کی محنت ردی کی ٹوکری کی نذر ہوجاتی ہے ہاں اب ایک مخصوص گروپ کی تخلیقات مسلسل شائع ہوتی رہتی ہیں۔ اردو ادب کے معیار کو بلند کرنے کے لئے اکابرین کو نئے آنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنی چاہیے تاکہ ان کے بعد یہ گزرگاہ خالی نہ رہ جائے۔

اردو کی بقاء کے لئے ان کا مشورہ ہے کہ بچوں کو اس بات کا احساس دلانا ضروری ہے کہ ان کی مادری زبان سے زیادہ دلکش کوئی دوسری زبان نہیں۔ دوسری زبانوں پر دسترس ایک اضافی قابلیت ضرور ہے لیکن اپنی زبان سے لاعلمی کسی بھی طرح تذلیل سے کم نہیں۔

والدین کو چاہیے کہ دورن خانہ بھی ادبی رجحان کی ترویج کے لئے بیت بازی یا گھریلو مشاعرے منعقد کریں جس میں محلے کے احباب بھی شرکت کریں۔

ان کے درج ذیل مجموعے زیر ترتیب ہیں۔

۱۔ غزلوں اور نظموں کا مجموعہ (ابتدائی دور کی) پیش رفت۔ متوقع اجراء۔ جولائی ۱۹۹۷ء

۲۔ مجموعہ کلام "سیپیوں کی قید میں" طباعت کے لئے تیار متوقع اجراء۔ جنوری ۱۹۹۸ء

۳۔ اوج تخیل حسیں۔ حمدوں اور نعتوں کا مجموعہ۔ زیر ترتیب

۴۔ سہ زاویے۔ ہائیکو اور ثلاثیاں۔ زیر انتخاب

۵۔ قطرہ قطرہ۔ منی نظمیں، منی غزلیں اور فردیات

۶۔ نکتہ نظر۔ ابوظہبی کے شعراء اور ادباء کی فنی صلاحیتوں پر تبصراتی مضامین جو مختلف تقاریب میں تحریر کئے اور پڑھے۔

قطعہ

نئے کپڑے دوشالے دیکھ لینا
یہ جھومر اور جھالے دیکھ لینا

تحائف جب نرالے دیکھ لینا
تو اِن ہاتھوں کے چھالے دیکھ لینا

●

يعقوب تصور

عکسِ فن

غزل

دلوں میں درد ہی اتنا شدید رکھّا ہے
کہ آنکھ آنکھ نے آنسو کشید رکھّا ہے

فَساد، ظلم، تشدّد، دَھماکے، آگ، دُھواں
ہمارے شہر میں اب کیا مزید رکھا ہے

نہ جس سے حل مشاکل کی راہ نکلے کوئی
اسی کا نام تو گفت وشنید رکھا ہے

سرشتِ شورشِ انسان ہی کے پیشِ نظر
فلک، حصارِ زمیں سے بعید رکھا ہے

کبھی تو زور سیہ آندھیوں کا ٹوٹے گا
بچا کے ایک چراغِ اُمید رکھا ہے

اُڑی ہے جب سے پرندوں کی واپسی کی خبر
ہر ایک شخص نے پنجرہ خرید رکھا ہے

بتارہے ہیں تصوؔر یہ شہر کے حالات
کسی کی پشت پہ دستِ یزید رکھا ہے

جاوید اختر

گن گن کے سکّے ہاتھ مرا کھُردرا ہوا
جاتی رہی وہ لمس کی نرمی برا ہوا

جاوید اختر
28-3-96

Javed Akhter
Jet Airways (India) Pvt. Ltd
Suite NO 101/108, The Leela,
Sahar, BOMBAY 400059 INDIA

جاوید اختر

(بمبئی)

سخن ور (حصہ دوم) کی طباعت کے سلسلے میں کراچی آنے سے قبل میں بمبئی پہنچی تو کتابوں کی ایک دکان پر جاوید اختر کے پہلے مجموعہ کلام "ترکش" پر نظر پڑی۔ ٹائٹل پر جاوید اختر کی تصویر ہے۔ پس منظر میں شہر بمبئی کی ایک بوسیدہ گلی ہے۔ جاوید کے قریب ایک ہاتھ گاڑی ہے یا غالباً پانی کا ایک چھوٹا ٹینک ہے اور ساتھ ہی زمین پر پانی یا دودھ سے بھرے جانے والے کچھ برتن اور کنستر رکھے ہیں۔

میں نے کتاب خرید لی اور پہلی فرصت میں پڑھ ڈالی۔ پہلے دیباچہ پڑھا جسے قرۃ العین حیدر نے لکھا ہے۔ "ترکش" کے نام کی وضاحت ان کے اس جملے سے ہو جاتی ہے۔ "ترکش غم جاناں اور غم دوراں کے تیروں سے پر ہے۔" پھر بھی میں نے ملاقات پر جاوید سے پوچھا۔ "ترکش" نام کیوں رکھا۔ کچھ تو ہوگا ذہن میں؟

"ہاں۔ میں شاعری اور ڈکشن میں اضافتیں پسند نہیں کرتا۔ مرکب نام یا ترکیب نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ کئی نام سوچے تھے۔ بس پھر "ترکش" ہی بہتر لگا۔" جاوید نے بتایا۔

بمبئی میں میرا قیام بہت مختصر مدت کے لئے تھا۔ جن شعراء کو میں سوالنامہ بھیج چکی تھی ان کے جواب کا انتظار تھا لیکن جاوید تک میرا سوالنامہ نہیں پہنچا تھا۔ میں دہلی میں تھی۔ تب اطلاع ملی کہ وہ شنکر شاد والے مشاعرے میں آرہے ہیں۔ سوچا وہیں ملاقات ہو جائے گی مگر وہ اس مشاعرے میں نہیں آئے۔ چنانچہ میں بمبئی پہنچی تو روزنامہ انقلاب کے ایڈیٹر ہارون رشید سے جاوید اختر کا فون نمبر لیا اور فون پر ملاقات کا وقت طے کرکے میں اپنی دوست امینہ کے ہمراہ (جو بڑودہ سے بمبئی مجھ سے ملنے آئی تھی) جوہو پر جاوید کے فلیٹ پر پہنچی۔ جاوید سے ملاقات سے

قبل شبانہ اعظمی آئیں چائے کے لئے پوچھا اور پھر جاوید آئے تو گفتگو کا سلسلہ شروع ہوا۔

میرا پہلا سوال تھا کہ شاعری اتنی دیر میں کیوں شروع کی۔ جاوید ہنسے اور بولے۔ "میرے چاروں طرف اتنے شاعر تھے کہ طالبعلمی کے زمانے میں شاعری کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ جب گھر سے نکلے تو بمبئی آگئے۔ پھر جدوجہد کا زمانہ تھا۔ لہٰذا پہلے روزگار کے حصول کی طرف توجہ کی۔ جب کمالیا تو شاعری کی طرف توجہ دی۔ کہتے ہیں بنئے کا لڑکا بگڑ جاتا ہے تو دکان پر بیٹھنا چھوڑ دیتا ہے اسی طرح شاعر کا لڑکا بگڑ جائے تو شاعری......" جاوید نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور قہقہہ لگایا جس سے میری دوست خوب ہی محظوظ ہوئیں۔

جاوید سے ملاقات سے پہلے میں شاعر اور افسانہ نگار گلزار سے مل چکی تھی۔ اردو زبان کے رسم الخط کے حوالے سے میں نے ان سے بھی گفتگو کی تھی۔ چنانچہ میں نے جاوید سے بھی پوچھا کہ عصمت چغتائی مرحومہ بھی کہتی تھیں اور آج کچھ اور ادیب بھی کہتے ہیں کہ ہندوستان میں اردو زبان کے مستقبل کی بقاء کے لئے اگر دیوناگری رسم الخط میں اردو لکھی جائے تو کیا حرج ہے؟

جاوید نے اس کی شدت سے مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ "اردو اور ہندی دو زمانے ہیں اور دونوں میں بہت نازک فرق ہے۔ میں بہت فارسی آمیز اردو بولوں بہت سنسکرت آمیز ہندی نہ بولوں تو فرق قطعی محسوس نہ ہو گا۔ بارہ بنکی یا پیلی بھیت کا آدمی آج کون سی زبان بول رہا ہے۔ مگر اردو اور ہندی کا فرق اس کے رسم الخط سے ہی ہے۔ میر اور غالب کی زبان اور ان کی شاعری پڑھانا ہے تو انہی کی زبان اور رسم الخط میں اس کی روح تک پہنچ سکتے ہیں ورنہ نہیں۔" اس ضمن میں جاوید نے احتجاجی لہجے میں کہا کہ آج اردو کے گلے پر چھری وہی پھیر رہے ہیں جو خود کو اس کا وارث اور اس کا نگراں سمجھتے ہیں۔ انہوں نے مثال دیتے ہوئے حکومت پاکستان کے رویے کی شکایت کی اور کہا کہ فنکار ایک طرح سے اپنے ملک اور اس کی زبان و ثقافت کے سفیر ہوتے ہیں لیکن پاکستان کا رویہ ہمیشہ ہی منفی رہا ہے۔ آشا بھونسلے نے کسی پاکستانی مرد گلوکار کے ساتھ ایک پاکستانی فلم میں گانا گایا تو اسے ریڈیو پر نشر کرنے کی اجازت نہیں ملی چنانچہ کسی پاکستانی گلوکارہ کی آواز میں اسے ڈب کرانا پڑا۔ ہم نے آپ کی گلوکارہ نورجہاں کو بلایا۔ آپ کے ملک نے آج تک لتا منگیشکر کو بلانے کا انتظام نہیں کیا۔ آپ کے ہاں سے نصرت فتح علی، مہدی حسن، قتیل شفائی اور دیگر گلوکار، فنکار اور شاعر آتے ہیں یہاں کی فلموں میں گانے لکھتے ہیں، میوزک دیتے ہیں ہم خوشدلی سے یہ سب قبول کرتے ہیں لیکن کیا پاکستان کے ریڈیو یا ٹی وی نے سردار جعفری، کیفی اعظمی یا کسی اور شاعر یا شاعرہ کا انٹرویو کیا؟ میں یہ باتیں ایک ہندوستانی

ہونے کے ناطے نہیں کہہ رہا بلکہ ایک شاعر اور ایک قلم کار کے رشتے سے کہہ رہا ہوں اور میں ہی نہیں پاکستان میں بھی بہت سے ادب دوست حضرات ہیں جو اس رویے اور سسٹم کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں اور حکومت پاکستان کو اس مسئلے پر سنجیدگی سے توجہ دینی چاہیے۔"

نثری نظم کے حوالے سے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے جاوید نے کہا کہ "میں نثری نظم کا حامی نہیں نظم ناؤن یعنی (Noun) اسم ہے اور نثر صفت (Adjactive) لہٰذا اس کا تال میل کہاں بنتا ہے۔ ان دونوں میں کیا فرق ہے میں اس پر بحث نہیں کرتا لیکن اگر یہ تجربہ بھی ہے تو ایسا کہ میں ایک کتاب چھپواتا ہوں اور اس کے سارے صفحے سادہ رکھتا ہوں تو یہ کیسا تجربہ ہوگا؟ نثری نظم آہنگ اور ردھم سے محروم ہوتی ہے لہٰذا یہ نظم ہی نہیں ہوتی۔"

اس موقع پر مجھے کشور ناہید کی نثری نظموں کے چند مصرعے یاد آگئے۔

سورج مکھی کی طرح
گھر کے حاکم کی رضا پر
گردن گھماتے گھماتے
میری ریڑھ کی ہڈی چیخ گئی ہے---------اور

ارے یہ کیا ہوا؟
منہ پر طمانچے کا نشان!
تنور میں روٹیاں یوں ہی لگتی ہیں--------اور
صحرا میں پتھر پھینکو تو' پتھر' ریت میں بے آواز دب جاتے ہیں

مگر اس وقت میرے پاس بحث کا وقت نہ تھا چنانچہ میں نے صرف اتنا کہہ کر بحث سمیٹ لی کہ ادب کی ہر صنف میں ہر زمانے میں تجربے ہوتے رہتے ہیں اور ہوتے ہی رہیں گے۔ ہمیں اپنی سوچ کے دروازے کھلے رکھنے چاہئیں۔

اب میں جاوید کا مختصر تعارف پیش کردوں گو وہ اس تعارف کے محتاج نہیں کیونکہ فلم کے میڈیا نے بحیثیت کہانی نویس' منظر نامہ نگار اور مکالمہ نگار اور اب گیت گار کی حیثیت سے بھی انہیں متعارف کرادیا ہے۔ اس کا انہیں خود بھی "شدید" احساس ہے اور پھر جب قرۃ العین اپنے دیباچے میں لکھ دیں کہ "جاوید اختر کی فلموں کا متنازعہ فیہ دائرۂ اثر اتنا وسیع ہے کہ اس کے مقابلے میں ایک سنجیدہ ادبی کتاب کا ایک ہزار جلد کا ایڈیشن بحر الکاہل میں تیرتے مٹر کے دانے کی حیثیت رکھتا ہے۔" تو اس کے بعد لوگ سرگوشیوں میں ہی سہی یہی کہیں گے کہ وقت ہی

سب سے بڑا ناقد ہے فیصلہ تو اسے کرنا ہے' اب چاہے وہ حد ادب سے زبان نہ کھولیں۔

جاوید کی تاریخ پیدائش ۱۷ جنوری ۱۹۴۵ء ہے۔ گوالیار (مدھیہ پردیش ہندوستان) کی سرزمین پر انہوں نے جنم لیا۔ لکھنؤ اور علی گڑھ سے اسکول کی تعلیم حاصل کی اور بھوپال سے بی۔اے کیا۔ جاوید نے علم دوست گھرانے میں جنم لیا تھا چنانچہ زبان وادب سے محبت ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ والد اپنے زمانے کے مشہور شاعر جان نثار اختر تھے۔ والدہ صفیہ اختر تھیں جن کے شوہر کے نام لکھے گئے خطوط کے مجموعے "حرف آشنا اور زیر لب" نے دھوم مچائی ہوئی تھی۔ ماموں انقلابی شاعر مجاز تھے اور فیض' جذبی' علی سردار جعفری' کیفی اور مخدوم کے ہم عصر تھے۔ قرۃ العین لکھتی ہیں کہ مجاز نے اپنے شعری مجموعے "آہنگ" کا انتساب اس طرح کیا تھا۔

"فیض اور جذبی کے نام جو میرے دل وجگر ہیں۔

سردار اور مخدوم کے نام جو میرے دست وبازو ہیں"۔

آج کا انفرادیت پرست تنہائی پسند شاعر ایسا انتساب نہیں کرے گا۔ مگر مجاز جنگجو کامریڈ شاعر تھا۔" وہ صفیہ اختر کے جاں نثار کو لکھے گئے ایک خط کے حوالے سے مزید لکھتی ہیں کہ اسکول میں بچوں نے قومی جھنڈے تیار کئے تو جاوید نے درانتی اور ہتھوڑے والا سرخ پرچم بنایا۔ پھر وہ شوہر کو مزید اطلاع دیتی ہیں۔ "جادو (جاوید) پاس ہی لیٹا ہوا مجھ سے افسانے گڑھ رہا ہے۔ بعض وقت ایسی ادبی گفتگو کرتا ہے کہ حیران ہو جاتی ہوں۔ ابھی ایک دو دن کی بات ہے۔ بائی پڑھنے آئی تھی۔ اسے میں جوش کے پانچ جرعے پڑھا رہی تھی۔ آخری حصے میں زمیں مست فلک مست کی تکرار ہے۔ جادو سن کر بولا امی یہ تو اپی کے جاگا قلم جاگی کتاب' سے ملتا ہوا ہے۔ یہ عمر اور یہ ناقدانہ نگاہیں! دیکھو یہ جوہر یونہی ضائع ہوتا ہے یا اپنی آب وتاب سے چمکتا ہے۔"

جاوید نے ایک زندگی جدوجہد میں گزاری۔ جاوید کی عمر آٹھ سال کی تھی کہ ماں کا انتقال ہو گیا۔ جاوید نے کم سنی سے ہی یتیمی اور بے گھری کی تکلیفیں اٹھائیں۔ ان کے بچپن کے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے قرۃ العین نے لکھا ہے۔ "جاوید کا بچپن چارلس ڈکنز' کے کسی ننھے مصیبت زدہ کردار کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ وہ ماں کی توقعات پوری کرنے کے لئے ایک شعلہ جوالا پارٹی ورکر بن سکتا تھا مگر طرز تپاک اہل دنیا دیکھ کر اس کا دل اتنا جلا کہ اس نے لڑکپن میں ہی طے کر لیا کہ وہ خود دولت مند بنے گا۔ بچپن لکھنؤ (ننھیال) اور علی گڑھ (خالہ حمیدہ سالم کے گھر) میں گزرا۔ بھوپال میں خاصی بے سروسامانی کے عالم میں کالج گئے۔ کلاس میں کبھی جی نہیں لگا۔ البتہ مباحثوں اور بیت بازی میں برق تھے۔ تقریروں کے انعامی مقابلے جیتے۔ جب بمبئی پہنچے

تو چھ دن بعد آدھی رات کو برستی بارش میں والد کے مکان سے نکلنا پڑا۔ (والد صاحب عقد ثانی کر چکے تھے) فٹ پاتھ پر رہے۔ فاقے کئے۔ اپنی ذہانت اور بذلہ سنجی کے بل بوتے پر دنیا سے لڑے۔ وہ خود ساختہ آدمی کی ایک کلاسک مثال ہیں۔ ان کے چھوٹے بھائی سلمان بھی کم ذہین نہیں۔ وہ بھی اچھے شاعر ہیں۔ ان کا مجموعہ کلام "کوبکو" شائع ہو چکا ہے۔ وہ بحیثیت سائیکو انالسٹ شکاگو (امریکہ) میں مقیم ہیں۔"

میں کرشن چندر کی تحریروں سے ہمیشہ متاثر رہی۔ ان کی تحریریں جب بھی پڑھتی ہوں نئی اور تازہ معلوم ہوتی ہیں۔ جیسے ابھی لکھی گئی ہوں۔ ایسی ہی ایک تحریر جاوید کے مجموعہ کلام کے اولیں صفحات پر ہے۔ لکھا ہے۔

"اپنی زندگی میں تم نے کیا کیا؟ کسی سے سچے دل سے پیار کیا؟ کسی دوست کو نیک صلاح دی؟ کسی دشمن کے بیٹے کو محبت کی نظر سے دیکھا؟ جہاں اندھیرا تھا وہاں کبھی روشنی کی کرن لے گئے؟ جتنی دیر تک جئے' اس جینے کا مطلب کیا تھا........؟

اس کے بعد جاوید اختر کے یہ شعر میرے سامنے کرشن چندر کی تحریر کی ایک دلکش اور ایک دل آویز تصویر کے روپ میں ہے۔

آج کی دنیا میں جینے کا قرینہ سمجھو
جو ملیں پیار سے ان لوگوں کو زینہ سمجھو

جاوید کا کلام پڑھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے شعری مزاج کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ بقول قرۃ العین حیدر کہ جاوید کا مجموعہ کلام "ترکش جدید اردو شاعری کی ایک اہم دستاویز ہے۔"

جاوید اختر

عکس فن

فساد سے پہلے

آج اس شہر میں
ہر شخص ہراساں کیوں ہے
چہرے
کیوں فق ہیں
گلی کوچوں میں
کس لئے چلتی ہے
خاموش و سراسیمہ ہوا
آشنا آنکھوں پہ بھی
اجنبیت کی یہ باریک سی جھلی کیوں ہے
شہر
سناٹے کی زنجیروں میں
جکڑا ہوا ملزم سا نظر آتا ہے
اکا دکا
کوئی رہگیر گزر جاتا ہے
خوف کی گرد سے
کیوں دھندلا ہے سارا منظر
شام کی روٹی کمانے کے لئے
گھر سے نکلے تو ہیں کچھ لوگ مگر
مڑ کے کیوں دیکھتے ہیں گھر کی طرف
آج
بازار میں بھی
جانا پہچانا سا وہ شور نہیں
سب یوں چلتے ہیں کہ جیسے
یہ زمیں کانچ کی ہے
ہر نظر
نظروں سے کتراتی ہے
بات
کھل کر نہیں ہو پاتی ہے
سانس روکے ہوئے
ہر چیز نظر آتی ہے
آج
یہ شہر اک سہمے ہوئے بچے کی طرح
اپنی پرچھائیوں سے بھی ڈرتا ہے
جنتری دیکھو
مجھے لگتا ہے
آج تیوہار کوئی ہے شاید

حسن چشتی

جہاں بھی شام ہوئی بس وہیں ٹھکانہ ہے
چمن ہے اب کوئی اپنا نہ آشیانہ ہے
دکن گئے تو ملے فرشِ راہ دیدہ و دل
خلوص کیا ہے یہ ہم نے وطن میں جانا ہے

حسن چشتی
۸ فروری ۹۶ء
شکاگو

Hasan Chishti
7130 North kedvale
Lincoln Road IL. 60646 U.S.A.

حسن چشتی

(شکاگو)

آج یکم مارچ ۱۹۹۶ء کی صبح ہے۔ وہی یو ایس سی اسپتال اور وہی اسپتال کا کیفے ٹیریا۔ آج بھی ۲۷ فروری ۹۶ء کی طرح کافی کی پیالی بلکہ گلاس سامنے ہے۔ اس دن میں جناب سعید قیس صاحب کا انٹرویو لکھ رہی تھی۔ آج حسن چشتی میرے سامنے بیٹھے مسکرا رہے ہیں۔ مزاج پرسی کرتے ہوئے پوچھ رہے ہیں۔ "اپنا پیر کیوں زخمی کر بیٹھیں؟" میں جواب دے رہی ہوں کہ "بیٹا کہتا ہے امی انسان ہو کر جناتوں کی طرح کام کریں گی تو یہی ہو گا۔" اور واقعی میں ۲۶ کی رات ایک شہر سے دوسرے شہر یعنی والنٹ سے گرناڈا ہلز آنے کے لئے اپنا سامان پیک کر رہی تھی۔ "سخن ور" کے انٹرویوز کے لفافے اور دیگر کاغذات بیگ میں تھے اور بیگ میرے ہاتھ میں۔ اوپری منزل سے نیچے آ رہی تھی کہ قالین منڈھی سیڑھیوں سے پیر پھسلا۔ جب تک سنبھلی انگوٹھا مڑ چکا تھا۔ گزشتہ رات بہت درد محسوس ہوا تو بیٹے سے شکایت کی۔ صاجزدے ڈاکٹر ہیں دیکھ کر بولے۔ فریکچر لگتا ہے اور ابھی ایکسرے کرایا تو ان کا "لگنا" درست ثابت ہوا۔ ایک ملیح چہرے والی مسیحا (جو سیاہ فاموں کے قبیلے سے تعلق رکھتی ہے) نے مسکراتے ہوئے بینڈج کی۔ خاص جوتا پہنا کر چار ہفتوں کے لئے پیر باندھ دیا۔ جبکہ ۴ مارچ کی رات دہلی کے لئے میری روانگی ہے۔ چلئے اسے بھی ایڈونچر میں شامل کر لیں گے۔ جس طرح حسن چشتی صاحب نے اپنی زندگی کے سارے دکھوں کو "ایک ایڈوانچر" بنا لیا ہے اور دوسروں کے دکھوں کا درماں بن گئے ہیں۔ انہی کا شعر ملاحظہ ہو۔

پرائے درد کو اپنا ہی درد جانا ہے

حسن چشتی

ہم اہل درد کا رشتہ بڑا پرانا ہے
اور

غریب شہر ہیں لیکن کلاہ کج ہے حسن
یہ بانکپن تو ہمارا بہت پرانا ہے

یہی بات جناب اقبال متین نے بھی حسن چشتی کا تعارف کراتے ہوئے کہی کہ "حسن چشتی کے بڑے چھوٹے سارے ہی رفاہی کاموں کا احاطہ کرنے کے لئے ایک دفتر چاہیے۔" حیدر آباد دکن میں جب حسن تھے تو وہاں بھی ادیبوں اور شاعروں کے دکھ اور بیماری میں اعانتی مشاعرے منعقد کروانے کے جتن کیا کرتے تھے۔ کینسر کے موذی مرض میں گرفتار طالب رزاقی کی اعانت کے لئے انہوں نے "خواتین کا مشاعرہ" منعقد کروا ڈالا۔

میں نے حسن چشتی سے دوبدو گفتگو نہیں کی لیکن فون پر ان سے ڈھیروں باتیں ہوئیں اور ہمیشہ ہی میں نے محسوس کیا کہ حسن چشتی میرے سامنے بیٹھے مسکراتے ہوئے ذکر فرماہیں۔ "بس آپ کے خلوص نے تو دل موہ لیا۔" (حالانکہ خلوص کا اظہار بارہا انہوں نے فرمایا۔ سخن ور کے سلسلے میں میری ہر طرح معاونت کر کے)

مسکراہٹ کی یہ سوغات بانٹنا ان کی عادت ہے۔ اس کی تصدیق تو ہر اس شخص سے ہوگی جو ان سے ملا ہے تو پھر میرا تصوراتی نقش جھوٹا نہ تھا۔ اس کی تصدیق راولپنڈی کے امین راحت چغتائی اس طرح کرتے ہیں۔ "جب حسن چشتی صاحب کو پہلی بار دیکھا۔" پھر سراپا کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتے ہیں۔ "چاند چہرے پر مسکراہٹ ایسی کہ ساری کائنات مسکراتی نظر آئے۔" شکاگو کے ایس زیڈ حسن لکھتے ہیں۔ "اگر مسکراہٹ اور ہنسی کے درمیان والی صورتحال کو لے کر خندہ پیشانی اور فراخدلی کے خمیر میں گھول کر روشنیوں اور چاندنیوں کے تانے بانے پر منڈھ لیا جائے اور اس پر ہمدردیوں اور دردمندیوں کے سلمی ستارے ٹانک دیئے جائیں تو جو وجود منظرعام پر آئے گا وہ ہوگا حسن چشتی کا سراپا۔" اقبال متین لکھتے ہیں۔ "مسکراتی آنکھیں اس کے اخلاص کو جب اس کے ہونٹوں پر بکھیر رہی تھیں تو پتہ بھی نہ چلا کہ اس چمک دمک کے پیچھے کسی اشک چشیدہ دل فریب کی گھلاوٹ بھی شامل ہے۔" جدہ سعودی عرب کے شجاعت راہی نے کہا کہ۔ "حسن چشتی صاحب کام بھی کرتے ہیں اور مسکراتے بھی ہیں اور یہ دونوں کام یقیناً مہارت کے زمرے میں آتے ہیں۔" توفیق انصاری شکاگو سے لکھتے ہیں۔ "شکاگو کے بستے بازار "دیوان ایونیو" کے گردونواح میں روشنی کا یہ چلتا پھرتا مسکراتا مینار دیکھنے والوں کو جگہ جگہ نظر آتا ہے۔" کینیڈا کے تسلیم الٰہی زلفی نے لکھا۔ "حسن چشتی کی سدا کی مسکراہٹ، مستقل مزاجی اور

جذبہ خدمت خلق نے انہیں ہردلعزیز بنادیا۔"

غالب آج کے دور میں ہوتے تو "اگر" کی شرط کے بغیر ہی کہتے۔ "تجھے ہم ولی سمجھتے ہیں۔" کیونکہ حسن چشتی کی بے لوث محبت ولی صفت لوگوں کا ہی خاصہ ہے۔ اور جو شخص اتنا اچھا انسان ہو وہ اچھا شاعر کیوں نہ ہوگا۔ اچھی شاعر بھی تو تب ہی وجود میں آئی ہے جب نظر میں وسعت ہو اور انسانی دردمندی زاد سفر ہو۔

حسن چشتی ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ والد صاحب سمیع احمد کا تعلق بہار ضلع گیا تھا۔ وہ اپنے وقت کے کنز نیشنلسٹ مسلم تھے۔ اردو کی پہلی جامعہ (مادر عثمانیہ) کے منتظم بھی تھے اور حسرت موہانی کے گہرے دوست۔ اس ماحول میں آنکھ کھولنے والے اور پرورش پانے والے حسن چشتی کو دردمندی کے ساتھ شعری ذوق بھی ورثے میں ملا۔ حیدر آباد کی قدیم درسگاہ "انوار العلوم" سے میٹرک کیا اور پھر بتدریج تعلیمی مراحل طے کرتے ہوئے جامعہ عثمانیہ سے فارغ التحصیل ہوئے۔ ۱۹۵۰ء کے اوائل میں حیدر آباد دکن سے نکلنے والے ماہنامہ "پاسبان" کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے۔ ان کی رومانی شاعری کا آغاز تو ۱۹۴۰ء سے ہو چکا تھا۔ اس زمانے میں ہی انہوں نے بڑی مرصع غزلیں اور نظمیں کہیں۔ ۱۹۷۶ء میں معاون رجسٹرار عثمانیہ یونیورسٹی کے ذمہ دار عہدے پر فائز ہوئے۔ انہی دنوں انہوں نے جامعہ عثمانیہ کی اسٹاف ایسوسی ایشن کے قیام کے لئے بڑی جدوجہد کی اور طویل عرصے تک اس کے بانی تو تھے ہی صدر بھی رہے۔ ۱۹۷۸ء میں انہوں نے رضاکارانہ طور پر وظیفہ حسن کارکردگی کے ساتھ جامعہ عثمانیہ سے سبکدوشی اختیار کی۔ ۱۹۷۸ء میں ہی وہ جدہ سعودی عرب گئے۔ وہاں بھی انہوں نے علم وادب کے شیدائیوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرکے "حیدر آباد ایسوسی ایشن جدہ" قائم کی جس کے بینر تلے سماجی، فلاحی اور ثقافتی خدمات انجام دی جانے لگیں۔ اس انجمن کے علاوہ انہوں نے علمی وادبی خدمات انجام دینے کے لئے "بزم اردو جدہ" کی بنیاد ڈالی اور عرصہ تک اس کے صدر رہے۔ اسی ادارے کے تحت پہلا بزم اردو جدہ ایوارڈ مبلغ پانچ ہزار سعودی ریال کی شکل میں معروف شاعر شاذ تمکنت (مرحوم) کو دیا گیا۔

سعودی عرب میں آٹھ سال کے قیام کے بعد حسن چشتی ۱۹۸۵ء میں امریکہ آ گئے۔ یہاں بھی وہ خاموش نہیں بیٹھے۔ ایک نئے عزم کے ساتھ انہوں نے یہاں بھی "خاموش خضر" کا روپ اختیار کیا۔ (انہیں "خاموش خضر" کا خطاب میں نے دیا ہے) شکاگو میں انہوں نے "نان ایزیڈنٹ انڈین ایسوسی ایشن" قائم کی۔ اب بھی وہ اس کے جنرل سیکریٹری ہیں۔ ان کی خدمات کو دیکھتے ہوئے اسٹیٹ نے انہیں "کک کاؤنٹی" کا نوٹری پبلک مقرر کیا۔ یہ خدمات وہ تقریباً ایک

عشرے سے انجام دے رہے ہیں۔ حسن چشتی کی کوششوں کے نتیجے میں شکاگو پبلک لائبریری کلچرل سینٹر کی جانب سے شعبہ جنوبی ایشیا کی توسیع عمل میں لانے کے لئے ایک لاکھ ڈالر کی گرانٹ کی منظوری سے شکاگو کے کتب خانوں میں اردو کے علاوہ ہندی، بنگالی، تامل اور گجراتی کتب فراہم کی گئیں۔ انہیں "بزم اردو شکاگو" کے بانی اور سیکریٹری جنرل ہونے کا فخر بھی حاصل ہے۔ اس ادارے کے تحت بین الاقوامی مشاعرے اور علمی ادبی کانفرنسیں ہر سال منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ عالمی اردو کانفرنس نئی دہلی کی جانب سے انہیں ان کی علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں "اسرار الحق مجاز عالمی ایوارڈ" بھی دیا گیا۔

حسن چشتی پر شعروں کی آمد بھی اسی وقت ہوتی ہے جب ان کے ساز دل پر ضرب لگے۔ حسن کے اسکول کے ساتھی اور دوست شاذ تمکنت کی موت کی خبر ملی تو آنسوؤں کی خاموش برسات میں ان کا زخمی دل فریاد کناں ہوا۔

وہ میرا ہم سبق، مرا ہمدم، وہ میرا شاذ
جو روٹھتا تھا مجھ سے بہت کم وہ میرا شاذ
زلف سخن سنوار کے خاموش ہوگیا
دن تھے ابھی بہار کے خاموش ہوگیا
دیوانہ تھا پکار کے خاموش ہوگیا

اب اوڑھ کر سفید کفن شاذ تمکنت
چپ ہوگیا ہے جان چمن شاذ تمکنت

حسن کہتے ہیں شاعری میں ابلاغ پہلی شرط ہے۔ ورنہ تحریر بے معنی ہو جاتی ہے۔ اسی سلسلے میں اپنے شعر کا حوالہ دیتے ہیں۔

یوں تو پہلے بھی ملا زہر بھرا جام مجھے
اب بھی سقراط مرا نام ہے کیا عرض کروں

حسن چشتی سود و زیاں سے بے نیاز ہو کر اپنا شعری سفر طے کر رہے ہیں۔ منزل سے بے نیاز ہر انسان کے دکھ درد کو اپنا سمجھ کر تعصب کی دیواریں گرا رہے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

پھر کوئی آبلہ پا گرم سفر ہے شاید
دشت کے نام بہاروں کا سلام آیا ہے
جانے کیوں جانب منزل نہیں اٹھتے ہیں قدم

حسن چشتی

شاید اے دل کوئی دشوار مقام آیا ہے

حسن چشتی نے اپنے غم کو چاہے وہ غم جاناں ہو یا غم دوراں انسانی برادری کے الم میں چھپالیا۔ ان کی اس جدوجہد میں ان کی شریک حیات زینت ان کا ہاتھ تھامے قدم بقدم ساتھ چل رہی ہیں کہ یوں قدم ملا کر چلنے سے ایک اکیلا کبھی تھکتا نہیں اور تاریک راہوں پر کامیابی کے چراغ آپ ہی آپ روشن ہونے لگتے ہیں۔

تری نگاہِ کرم ہے تو پھر کمی کیا ہے
ترے نثار مجھے فکرِ زندگی کیا ہے

عجیب شے ہے، محبت کا جذبۂ رنگیں
پھر اس کے بعد بساطِ غم و خوشی کیا ہے

مری نظر ہے بہارِ چمن کی جلوہ شناس
میں جانتا ہوں مآلِ شگفتگی کیا ہے

بہت بلند مقامِ حیات ہے، ہمدم
زمانہ ساز نگاہوں کو آگہی کیا ہے

الجھ رہے ہیں فریبِ نشاط میں جو حسنؔ
سمجھ سکیں گے وہ کیا غم کی زندگی کیا ہے

★

حسن چشتی

عکسِ فن

غزل

تیرے غم کو حاصلِ کون ومکاں سمجھا تھا میں
بے خودی میں ہر خوشی کو جاوداں سمجھا تھا میں
برق کی چشمک کو سعیِ رائیگاں سمجھا تھا میں
چار تنکوں پر بساطِ آشیاں سمجھا تھا میں
اُف یہ محرومی کہ منزل نے دیئے لاکھوں فریب
گردِ راہ کارواں کو کارواں سمجھا تھا میں
زندگانی اور بھی پامالِ غم ہوتی گئی!
وائے نادانی کہ ان کو مہرباں سمجھا تھا میں
انتہائے دوستی بھی دشمنی نکلی حسنؔ
اِبتدا میں اس حقیقت کو کہاں سمجھا تھا میں!

○

نالہ دل پہ اختیار نہیں
ورنہ شکوہ مرا شعار نہیں
اُن کے وعدوں کا اعتبار تو ہے
زندگی کا کچھ اعتبار نہیں
جب سے بدلی نگاہِ ناز حسنؔ
زندگانی کا اِعتبار نہیں

حمیدہ معین رضوی

یاروں کی محبتوں کے سامنے ‏— محنت کے سفر میں کام آئے
بس ایسے ہی نبھا گئے ہم ‏— ہر زخم کو پا کے مسکرائے

حمیدہ معین رضوی

Hamida Moeen Rizvi
38-Gainsborough Road
New Malden, Surrey K.T.35, NU, ENGLAND, U.K.

حمیدہ معین رضوی

(لندن)

اس میں قطعی شک وشبہ نہیں کہ ادب انسانی زندگی کے اعلیٰ مقاصد سے عبارت ہے۔ فکری اعتبار سے اچھے ادب کی پرواز بڑی اونچی ہو سکتی ہے لیکن اس کے پاؤں ہمیشہ زمین میں گڑے ہوتے ہیں۔ جو ادیب تقاضائے آب وگل سے صرف نظر کرتے ہیں وہ سچا اور اعلیٰ ادب تخلیق کر ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ ادب کا تعلق زمین اور زمین پر بسنے والے انسان سے براہ راست ہوتا ہے۔ زمین کی سچائی وہ نور ہے جس سے ادب کا چہرہ جگمگاتا ہے۔ انہی خیالات کی روشنی میں' میں نے سخن ور حصہ دوم کے شعراء وشاعرات کے تعارف کے حصول کے لئے سوالنامہ مرتب کیا تاکہ ہمارے دور حاضر کے فن کار کی فکر کا صحیح اظہار ہمارے سامنے آئے۔ کچھ لوگوں نے فراخدلی کا اظہار کرتے ہوئے وضاحت سے جوابات دیئے اور کچھ نے مصروفیات کا عذر کر کے اختصار سے کام لیا اور میں نے جو جس نے کہا' بڑی دیانت داری سے آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔

انگلینڈ کی حمیدہ معین رضوی بھی اپنی سوچ لے کر آئی ہیں۔ شادی سے پہلے بنت القمر حمیدہ رضوی تھیں۔ شادی کے بعد حمیدہ معین رضوی کے نام سے لکھتی ہیں۔ جائے پیدائش آگرہ ہندوستان ہے۔ اجداد کا تعلق مشہد ایران سے تھا۔ حمیدہ کی تعلیم وتربیت سیالکوٹ پاکستان میں ہوئی۔ حفظ قرآن' دینی تعلیم اور فارسی کی تعلیم اپنے والد سید قمرالحسن رضوی کے زیر نگرانی حاصل کی۔ منشی اور مڈل کی تعلیم ۱۹۵۷ء میں اور منشی عالم میٹرک ۱۹۵۸ء میں کیا۔ پھر ایم اے انگریزی ادبیات' ایم اے اردو سیالکوٹ سے اور پوسٹ گریجویٹ "ایجوکیشن" میں لندن سے کیا۔ اس کے علاوہ بھی کئی کورسز کئے۔ طالب علمی کے دور میں بھی بے شمار میڈلز اور انعامات حاصل کئے۔ بارہ سال کی عمر سے لکھنے کی ابتدا کی۔ مزاحیہ کہانیاں اور نظمیں بچوں کے لئے لکھیں جو شائع ہوئیں۔ پہلا تنقیدی مضمون "افق" میں چھپا۔ پہلا افسانہ فیض صاحب وصوفی

تبسم صاحب کی زیر ادارت "لیل و نہار" میں چھپا۔ پھر ادب لطیف' اوراق' ادبی دنیا اور قندیل وغیرہ میں ان کی تخلیقات چھپتی رہیں۔ افسانوں کے مجموعے چھپ چکے ہیں۔ کلام کا پہلا مجموعہ زیر اشاعت ہے۔

شاعری اور ادب سے وابستگی گھر کے ماحول اور ان کی فطری ذہانت کی مرہون منت ہے۔ ان کے والد صاحب روشن خیال تھے۔ انہوں نے اپنے گھر میں لڑکے اور لڑکی کے حقوق میں کبھی کوئی فرق پیدا نہیں ہونے دیا کیونکہ انہوں نے بھی اپنے گھر میں یہی سیکھا تھا۔ مساوات کا یہ درس لینے والی حمیدہ کو ازدواجی زندگی میں بے شک مسائل کا سامنا کرنا پڑا لیکن انہوں نے اپنی ذہانت سے اس زندگی میں اپنا اعتماد برقرار رکھا اور محبت و سمجھداری سے مسائل حل کئے۔

ایک شاعر اور ادیب اپنی ذمہ داریوں سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکتا ہے اس ضمن میں ان کا کہنا ہے کہ "میں زندگی کے بارے میں ایک فلسفہ رکھتی ہوں اور یقین رکھتی ہوں کہ ادب کا مقصد اخلاقی اقدار کی ترویج ہونا چاہئے۔ ادب معلم اخلاق نہ ہے نہ اسے ہونا چاہئے۔ مگر اخلاقی اقدار ایک روح کی طرح فن پارہ میں موجود ہونی چاہئے جو قاری کو بدی اور نیکی میں فرق کرنے کا چلن سکھائے۔ آج کل کی معاشی خوشحالی کے باوجود زندگی میں اس قدر اندھیرا اس چیز کا ثبوت ہے کہ محض دولت یا پیسہ خوشیاں مہیا نہیں کرتا۔ بڑے بڑے خاندانوں کے بچوں کا تشدد اور خون خرابے میں دلچسپی لینا۔ نشہ میں خود کو نابود کرنا۔ ایڈز میں مرنا اور پھر بھی جنس پرستی پہ جان دینا اس چیز کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ انسان اندر سے کھوکھلا ہو گیا ہے اور یہ کھوکھلاپن روحانی اقدار کو دفن کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ افسوس ہے کہ شرق جس نے دھیان گیان یوگ اور مراقبے کا سبق دنیا کو دیا جو ہر روحانی تحریک کا سرچشمہ رہا۔ آج مغرب کی نقل میں خود آزادی کی دوڑ میں شامل ہے اور اپنے قیمتی سرمائے کو برباد کر رہا ہے۔ اور اس سے زیادہ تو یہ ہے کہ آج مشرق والے بھی نراجیت اور خودکشی کے اس عمل کی ترغیب دیتے نظر آتے ہیں جو مغرب میں تباہی لایا ہے اور لا رہا ہے۔ بھائی' بہن' ماں باپ' بیٹی بیٹا' کیسے مقدس رشتے تھے۔ اب ان کا تقدس بھی فلش کر دیا گیا ہے اور انسان اپنی اس حیوانیت پر نازاں ہے۔ آزادی' مساوات' جمہوریت کو مذہب کی جگہ رکھ دیا گیا ہے۔ مگر آزادی کا مطلب عورت کے جسم کو لوٹ کا مال سمجھنا' مساوات کا مطلب عورت کو ہر کام پہ مجبور کرنا اور جمہوریت کا مطلب زر پرستی کا نظام لانا ہے۔ میڈیا آج کا سب سے بڑا دیوتا ہے اور ہر کریہہ صورت چیز کو خوبصورتی بنا کر پیش کر دینا' ہر اخلاقی گراوٹ کا جواز فرد کی آزادی کہہ کر دیا جاتا ہے۔ مندرجہ بالا عالمی پس منظر کے ہوتے ہوئے اگر آج کے ادیب بھی ادب میں منفی قدروں کے امین ہوں تو زندہ رہنے کے لئے حوصلہ

حمیدہ معین رضوی

کہاں سے آئے گا؟

ادب شخصیت کے ذریعے زندگی کی عکاسی اور زندگی کا اظہار ہے۔ اگر ادیب کی اپنی شخصیت ہی منفی ہے تو وہ زندہ رہنے کا ادراک کہاں سے کرے گا اور وہ قاری کے لئے کیا پیغام رکھے گا۔ ادیب کی معاشرہ سے اہمیت اسی لئے ختم ہو رہی ہے وہ زندگی کا صحیح ادراک نہیں کرپا رہا ہے۔ وہ بے اصول اور حریص ہے وہ زندگی کی نہج متعین کرنا تو دور کی بات ہے زندگی کی نہج اپنی کم نگاہی کے باعث دیکھ ہی نہیں پا رہا۔ اپنے ہم عصروں کے لئے میرا یہ ہی پیغام ہے کہ مثبت سوچ کی ترویج کریں اور مثبت عمل کا ایقان کریں اور یہی سوغات وہ اپنے قاری کو دیں۔

ادبی رسائل کی عدم مقبولیت کے سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ خود والدین کا رویہ اور مستقل ٹی۔وی پہ انحصار ہے۔ اگر بچے آنکھیں کھولتے ہی دیکھیں کہ والدین پڑھتے لکھتے ہیں تو ان میں بھی دلچسپی پیدا ہوگی۔ حل یہی ہے کہ گھروں میں رسائل منگوائے جائیں، پڑھے جائیں، تبادلہ خیال ہو۔ اردو کی اہمیت کا تذکرہ ہو بچوں کو اردو پڑھائی جائے تو بڑے ہو کر وہ ضرور ہی ان رسالوں کو پڑھیں گے۔ جو لوگ مخیر ہیں انہیں کسی ادبی رسالے کی فکری آزادی ضبط کئے بغیر رسالوں کے مدیروں کی مدد کرنی چاہئے۔ خصوصاً وہ لوگ جو مغرب میں رہتے ہیں وہ تو مستقل رسالے خرید کر انہیں زندہ رکھ سکتے ہیں۔

حمیدہ کہتی ہیں "اخبارات بھی اس سلسلے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ لندن میں اردو کا واحد اخبار "جنگ" ہے لیکن جنگ کی اردو اتنی غلط اور اتنی گنجلک ہوتی ہے کہ بچے تو بچے بڑے بھی اردو اخبار پڑھنے سے کتراتے ہیں۔ ایسے میں اخبار کے مدیر اور مالکان کو توجہ دینی چاہئے کہ وہ اخبار کے چربے اور بے معنی خبروں کے بجائے سیدھی سادی اردو میں خبریں اور فیچر دیں تاکہ لوگوں کی سمجھ میں آئے۔ اخبار کا پرنٹ اتنا گندا اور لکھائی اتنی باریک ہوتی ہے کہ پڑھنے کو دل نہیں چاہتا۔ پھر بچے بھلا کیسے پڑھیں گے۔ ایک تجویز یہ بھی ہے کہ بچوں کے خصوصی وڈیو بنائے جائیں۔ یہاں عالم یہ ہے کہ پاکستان میں بھی بچے انگریزی کارٹون دیکھتے ہیں حالانکہ پروگراموں کی اردو ڈبنگ کی جاسکتی ہے تاکہ بچے دلچسپی لیں۔ بہر حال غور و فکر کا مقام ہے اور ہمیں اردو کی بقا کے لئے عملی قدم اٹھانا چاہئے۔

حمیدہ معین رضوی

عکسِ فن

غزل

پچھلے پہر کا چاند یہ دیکھا کرتا ہے
بھیگا چہرہ ایک خلا میں تکتا ہے

سائے میں دیوار کے جو چپ بیٹھا ہے
کوئی مسافر ہے جو بھولا رستا ہے

پچھوا ہو کہ پُروائی سب رنگ نظر
سارے موسم ایک ہیں جب دل دُکھتا ہے

جانے والے لوٹ کے شاید آجائیں
ایک دیا دہلیز پہ اب تک جلتا ہے

چڑھتے سورج کے سب رشتے ناطے ہیں
تاریکی میں سایہ بھی چھٹ جاتا ہے

جیتے ہیں اور جان بکھرنے لگتی ہے
دل جب اک مانوس سی آہٹ سنتا ہے

مال و زر کا لٹنا ہے تو ایک زیاں
بڑا زیاں ہے جب کوئی خواب کو کھوتا ہے

کھیت سے اپنے کاٹے گا کیا جو دہقان
فصل اُگانے کے موسم میں سوتا ہے

ایک مصیبت ٹوٹے گی جس بستی میں
بھوک سے بے ماں باپ کا بچّہ روتا ہے

حمیرا رحمٰن

نیرِ دو نیم دائرے پر اک جوشِ افکار ہے کا
یہ میرا عکس ہے اور سایہ کا سارا ہوا میں ہے

حمیرا رحمان

۸ فروری ۹۶ء

Humaira Rehman
3,Young Ave
YONKER New York 10710, U.S.A.

حمیرا رحمٰن
نیویارک

اعضا کو شل کردینے کی روز نئی ایجاد
میری نسل کے سارے سکھ ہیں تن آسانی میں

سفر میں ایک ہی سچ تھا کہ گھر ہمارا ہے
گھروں کی شکل بجھی لوٹنے کی عادت سے

یہ لہجہ حمیرا رحمٰن کا ہے۔ زبان خود کہہ رہی ہے کہ میں حمیرا ہوں۔ نام کی طرح کلام میں بھی لہو کی سی روانی اور حیات بخش حدت ہے۔

حمیرا ۲۴ نومبر ۱۹۵۷ء کو کراچی (پاکستان) میں پیدا ہوئیں۔ گورنمنٹ کالج برائے خواتین ملتان سے بی۔اے کیا۔ ۱۹۷۱ء سے لے کر ۱۹۷۶ء تک ریڈیو پاکستان ملتان سے صداکاری کی جس میں خبریں، اناؤنسمنٹ، کمرشل سروس اور ڈرامہ وغیرہ شامل ہیں۔ والدین کی اچانک وفات کی وجہ سے انھیں ملتان چھوڑنا پڑا۔ بھائی سید الیاس احمد کے ساتھ طرابلس (لیبیا) میں ایک سال رہیں۔ پھر بہن رعنا نظام کے پاس لندن چلی آئیں۔ وہاں رہ کر بی بی سی لندن کے متفرق پروگراموں میں صداکاری کی جس میں خواتین کا پروگرام "برگِ گل" قابلِ ذکر ہے۔ پانچ ماہ بعد شادی کے سلسلے میں انھیں پاکستان جانا پڑا۔ شادی کے بعد اپنے شوہر سید نسیم الرحمٰن کے ساتھ امریکہ آگئیں۔ امریکہ میں قیام کے دوران واشنگٹن، ڈیلاس، لاس اینجلیس، سان فرانسسکو، ڈیٹرائٹ، شکاگو، مانٹریال کینیڈا، ٹورنٹو کینیڈا، ڈنمارک، ناروے، سویڈن، دہلی، لکھنؤ اور اناؤ ہندوستان کے مشاعروں

میں خصوصی طور پر شریک ہوتی رہیں۔ اسی طرح پاکستان کے بے شمار مشاعروں میں مہمان شاعرہ کی حیثیت سے شریک رہی ہیں۔

شاعری حمیرا کی پہچان ہے گو انہوں نے لکھنے کا آغاز افسانے سے کیا تھا اب بھی کبھی کبھار مختلف موضوعات پر اخباروں کے لئے مضامین لکھتی رہتی ہیں۔

حمیرا کہتی ہیں کہ انہیں شعر کہنے کے لئے گھر کا ماحول بڑا سازگار ملا۔ والد صاحب سید اخلاق احمد انگریزی ادب کے پروفیسر تھے اسلئے ان کے حوالے سے بہت سی ادبی لہریں جو اس وقت دکھائی نہیں دیتی تھیں لاشعوری طور سے ان تک پہنچیں۔ والدہ بھی ادبی مزاج کی خاتون تھیں۔ ملتان کی اردو اکیڈمی اور "حریم فن" کی محفلوں میں بڑے اہتمام سے والدہ کے ساتھ شرکت کرتی تھیں۔ وہیں سے ان کا شعری سفر بھی شروع ہوا۔

حمیرا کا کہنا ہے کہ لکھنے کے لئے انہیں سازگار ماحول سے تحریک ہوتی ہے۔ عام دنوں میں وہ ایک معمولاتی گھریلو زندگی میں مصروف رہتی ہیں لیکن جب کبھی کسی سلجھی ہوئی ادبی شخصیت سے گفتگو ہو، کچھ اچھا وقت گزرا ہو یا کوئی واقعہ یا سانحہ دل کو چھوتا ہوا گزر جائے تو آمد ہوتی ہے۔ پھر حمیرا کو اپنی کیفیت اشعار میں ڈھالنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

حمیرا، نظریاتی شاعری کی اس حد تک حامی ہیں کہ اظہار تبلیغ نہ بن جائے۔ پروپیگنڈہ ادب سیاسی رنگ اختیار کرلے تو اسکی لطافت ختم ہو جاتی ہے۔ جو چیزیں اخلاقی لحاظ سے یا معاشرتی نکتہ نظر سے غلط ہیں انہیں اپنے نظریہ فکر سے درست ثابت کرنا یا اس کی کوشش کرنا لکھنے والے کا ذاتی مسئلہ تو ہو سکتا ہے مگر شعر گوئی میں اس سے احتراز ضروری ہے۔

حمیرا کی تحریریں پاکستان وہندوستان کے فنون، افکار، طلوع افکار، الفاظ، اظہار اور روزنامہ جنگ کے ادبی صفحات کے علاوہ شب خون، اقدار، شاعر، بیسویں صدی، آنچل اور چہار سو میں شائع ہو چکی ہیں۔ حمیرا کا مجموعہ کلام "اندمال" کے نام سے ۱۹۸۵ء میں ہندوستان سے اور ۱۹۸۶ء میں پاکستان سے چھپ چکا ہے۔ دوسرا مجموعہ زیر ترتیب ہے۔

حمیرا ابلاغ کے حق میں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جو بات ہم کہہ رہے ہیں یا کہنا چاہتے ہیں اگر کسی کی سمجھ میں نہ آئے تو کہنے کا مقصد ادھارہ رہ جاتا ہے اس سلسلے میں علامتی زبان کو سراہتے ہوئے کہتی ہیں کہ اس میں جو حسن ہے وہ بالکل سیدھی بات کہہ دینے میں نہیں۔ اسی لئے وہ زیادہ پرکشش لگتی ہے اور اس کی مقبولیت بھی اسی وجہ سے ہے۔ اسی علامت کے باعث مختلف شعراء اپنی انفرادیت برقرار رکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح حمیرا تنقید کی بھی حامی ہیں۔ کہتی ہیں تنقید ادب کی ترویج اور نشوونما میں ایک اہم کردار ادا کرتی ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ تنقید بے لاگ ہو۔ (جو

آج کل تقریباً ناپید ہے) کھری تنقید شاعری کو نصیب ہو تو اس کے نہ نکھرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

امریکہ میں اردو کے فروغ کے لئے ان کی رائے میں ہمیں ترجمہ کی طرف بھرپور توجہ دینی چاہئے۔ اگر ہمارا جاندار ادب یہاں کے مقامی رسالوں میں ترجمہ ہو کر پہنچنے لگے تو نئی نسل خواہ وہ ہماری ہو یا کہیں کی اسے پڑھنے سے کچھ حاصل کر سکے گی۔ اس طرح اردو ادب دیگر زبانوں کے ادب کے ساتھ ایک ٹھہر جانے والا نقش قائم کر سکتا ہے۔

متفرق اشعار

کوئی ستارہ گرا آسمان خلقت سے
گماں چیل کئے ہر طرح کی وحشت سے

○

اکھڑ گئے ہیں مرے دائروں کے سارے شجر
مقابلہ ہے نئے سورجوں کی حدت سے

○

اعضاء کو شَل کردینے کی روز نئی ایجاد
میری نسل کے سارے سکھ ہیں تن آسانی میں

○

خوش فہمی کی کہر ہٹی تو فصل کھلا آخر
ہم بھی حمیرا قید تھے اپنی سحرِ بیان میں

حمیرا رحمان (نیویارک)

عکسِ فن

بے دھیان مسافتوں کے
ہم سفر کیلئے ایک نظم

تاریکی تو ہر موسم میں تاریکی ہے
اور خصوصاً
دکھ میں کوئی دلدار نہ ہو تو
دھوپ کہیں دروازے باہر
آنکھیں موندے 'چپ سادھے' ٹھہری رہتی ہے
کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے
میری آنکھ میں تیرنے والا آنسو پہلے
اس کی آنکھ سے ٹپک گیا ہے
جو کچھ میں نے اس سے کہنا چاہا ہے
گویائی سے پہلے
اس کی سماعت تک پہنچا ہے
یہ دنیا اظہار کی دنیا ہے
جس میں ہر کوئی اپنے
جذبوں اور لفظوں کو ظاہر کردے تو پہچانا جائے
گو ہم دونوں نے لفظوں کے کاندھے پر کم سر رکھا ہے
لیکن بے دھیانی میں چلتے چلتے
دونوں کتنا آگے نکل گئے ہیں!!

اور پھر جب!

اب کے گلاب کی جھاڑی میں
اتنے پھول آئے ہیں
کہ شاخیں اپنا ہونا بھول گئی ہیں
جیسے کبھی کبھی کوئی سرشاری
ہمیں ہماری
ہر پہچان بھلا دیتی ہے
جیسے کبھی کبھی کوئی ساعت
ہمیں ہمارے رستے سے بھٹکا دیتی ہے
اور پھر جب
آنکھوں میں بینائی واپس آتی ہے
منظر بدل چکا ہوتا ہے
جیسے شاخیں سبز دکھائی دیتی رہیں
اور ساری گلاب کی جھاڑی
خالی ہو جائے!

ڈاکٹر حنیف ترین سنبھلی

وہیں کھلے رہے بیداریوں کے پھول سدا
جہاں بھی خون سے خوابوں کی آبیاری ہوئی

حنیف ترین
۱۸؍جون ۹۵ء

Dr.Haneef Treen
Mustosaf Al.Jadaida
ARAR North Saudi Arbia

ڈاکٹر حنیف ترین

(سعودی عرب)

تھے بن کے پاس سجاوٹ کے حاتمی اسباب
انہیں کے رنگ محل میں سخاوتیں نہ ملیں

بے حسی اور منافقانہ رویوں کی کسک حنیف ترین کی شاعری میں جگہ جگہ نظر آتی ہے۔ طب کے میدان سے وابستگی کی مصروفیات کے باوجود ڈاکٹر حنیف ترین جب قلم اٹھاتے ہیں تو پھر لگاتار کہتے اور لکھتے چلے جاتے ہیں۔ پھر چپ سادھ لیتے ہیں تو یوں کہ

نہیں یاد آتی تو یاد ان کی مہینوں تک نہیں آتی

سرائے ترین۔ سنبھل ضلع مراد آباد (یوپی ہندوستان) میں یکم اکتوبر ۱۹۵۱ء کو جنم لینے والے اس شاعر کا نام حنیف شاہ خان ترین ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے انہوں نے بی۔ایس۔سی کیا۔ پھر برطانیہ سے ایم۔بی۔بی۔ایس کی ڈگری لی۔ علی گڑھ سے ایم۔ڈی کیا اور تین سال تک علی گڑھ یونیورسٹی میڈیکل کالج میں ڈیمانسٹریٹر کی خدمات انجام دیں۔ مارچ ۱۹۸۳ء سے سعودی عرب کی وزارت صحت سے وابستہ ہوئے اور تاحال عرعر شمال (واقع المتوصف سعودی عرب) کے ایک اسپتال میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ شاعری کے علاوہ افسانے بھی لکھے ہیں۔ لیکن زیادہ توجہ شاعری کی طرف ہے۔

بچپن سے ہی مزاج شاعرانہ تھا لیکن بقول خود "عشق میں ناکامی شعر گوئی کا موجب بنی" پہلی نظم ایم بی ایس کی طالب علمی کے دوران کہی۔ پھر پیروڈیز اور رومانی نظمیں کہہ کہہ کر کالج اور

یونیورسٹی میں شہرت حاصل کی جو انہیں ریڈیو اور ٹی وی تک لے گئی۔ طبیعت میں تلون اتنا تھا کہ ایک دوست کے مشورے پر شاعری ترک کردی۔ دس سال کے بعد ۱۹۸۶ء میں ایک شاعر دوست نے ان کی رگ شاعری کو چھیڑا اور کہا کہ تم غزل نہیں کہہ سکتے۔ چنانچہ حنیف ترین نے فوراً غزل کہی۔ یہ ان کی پہلی غزل تھی جو اس قدر مشہور ہوئی کہ بقول خود یہ "چل نکلے" یوں ۱۹۹۲ء میں پہلا مجموعہ "رباب صحرا" منظر عام پر آیا۔ جو صرف غزلوں پر مشتمل ہے۔

حنیف ترین کسی خاص مکتبہ فکر سے متاثر نہیں لیکن ایک مکتبہ فکر ہے "انسانیت"۔ وہ امن کے خواہاں ہیں۔ یہ دنیا جو تباہ کن ہتھیاروں سے لیس ہے حنیف ترین اسے اپنے کلام کے ذریعے گہوارہ امن بنانا چاہتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ قلم کی طاقت کو سربلند کریں اور دنیا کے تمام مہلک ہتھیاروں سے انسانیت کو نجات دلائیں۔ "یو این او" کو ایسا مضبوط بنایا جائے جو حریص اور جنگجو لوگوں کی دسترس سے دور ہو۔ اور ان کا یقین ہے کہ قلم کی طاقت ایک دن ان کا یہ خواب ضرور شرمندہ تعبیر کرے گی۔

حنیف کا کلام پاکستان کے جرائد طلوع افکار' صریر' اوراق' ارتکاز' سیپ' ادب لطیف اور اس کے علاوہ ہندوستان کے رسالہ شاعر' توازن' اسباق' مفہوم' کتاب نما' معلم اردو' گل کدہ' بیسویں صدی' ایوان اردو اور کوہسار وغیرہ میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ ان کی نظموں کا مجموعہ "کتاب صحرا" اپریل ۱۹۹۵ء میں شائع ہوا جس میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی اور اختر الایمان (مرحوم) کی رائے شامل ہے۔ ان کے مزید دو مجموعے زیر ترتیب ہیں۔

حنیف ترین سادہ اسلوب مگر گہری فکر کے قائل ہیں۔ کہتے ہیں ورنہ کلام بے معنی اور بے اثر ہوگا۔ وہ شاعری جو ایک عام قاری سے لے کر خواص تک پہنچ جائے اس کے اثرات دیرپا ہوتے ہیں اور وہی بلند شاعری کا درجہ حاصل کرتی ہے۔ شاعری کی وہ قسم جسے صرف لکھاری یا چند سرپھنیس ادباء ہی سمجھ سکیں' بڑی شاعری کے زمرے میں نہیں آتی۔ آج ادب کے نام پر ایسی ایسی تحریریں سامنے آرہی ہیں جنھیں سمجھنے کے لئے ذہنی جمناسٹک بھی کم پڑ جاتی ہے۔ حنیف کا کہنا ہے کہ وہ شاعری جو پابند نظم سے نثری نظم تک پھیلی ہوئی ہے اگر اس سے قاری کا ذہن جاگتا ہے تو ایسی شاعری کو حوصلہ ملنا چاہئے۔ میڈیا یا پی آر کے زور پر لایعنی شاعری کی حوصلہ افزائی نہیں ہونی چاہئے۔ اس کے لئے ایک انٹرنیشنل فورم ہونا چاہیے۔ وہ نہیں جو "نیو ورلڈ آڈر" کے ذریعے مغرب کی سوچ کو مشرق پر منڈھ دے۔

اردو زبان کے مستقبل کو روشن و تابندہ بنانے کے لئے ان کا مشورہ ہے کہ یورپ اور امریکہ کے باسی اپنی نئی نسل کی طرف توجہ دیں اور کوشش کریں کہ زبان ذریعہ معاش سے جڑ جائے ورنہ

اگلی نسل کو اس زبان سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہے گی۔ ڈاکٹر حنیف ترین سنبھلی

آج کی شاعری سے حنیف ترین مایوس نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس بکھراؤ کے دور میں بھی ایسی شاعری وجود میں آرہی ہے جو ادب میں اپنی ایک تاریخ متعین کرے گی۔ جو شعراء اور ادیب اپنے وسیع تر مطالعے، تجربات اور نئی فکر کی گلکاریوں سے قرطاس ادب کو رنگین بنارہے ہیں ان میں اختر الایمان، ظفیر غازی پوری، شہزاد احمد، فضا ابن فیضی، ڈاکٹر وزیر آغا اور ڈاکٹر عتیق اللہ (دہلی) کے نام نمایاں ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ سعودی عرب کے صحرا میں ڈاکٹر حنیف ترین اپنی مصروفیات کے باوجود اردو زبان کے پودے کی آبیاری میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ وقتاً فوقتاً اردو کے مشاعرے منعقد کرتے ہیں۔ ماہانہ ادبی محفلیں تو باقاعدگی سے ہوتی ہیں۔ حنیف ترین کو ان کی اپنی ادبی خدمات کے لئے خراج تحسین پیش کرتے ہوئے دہلی کی جواہر لال یونیورسٹی کے شیخ الجامعہ پروفیسر یوگیندر الغ نے کہا کہ "حنیف ترین نے اردو شاعری کے ذریعے ہندوستان میں ان لوگوں سے بھی مضبوط بندھن باندھ رکھا ہے جو اردو جانتے تو ہیں لیکن اردو زبان و ادب کے مطالعہ سے دور ہیں"۔ یہ خراج تحسین انہیں پچھلے سال ان کے دورہ جامعہ کے موقع پر پیش کیا گیا۔ جواہر لال یونیورسٹی کی جانب سے ڈاکٹر حنیف ترین کو دیئے گئے اس استقبالیہ میں معروف نقاد ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ہندوستانی زبانوں کے مرکز کے چیئرمین پروفیسر پانڈے، معروف شاعر محمود سعیدی، ماہنامہ شاعر کے ایڈیٹر افتخار امام صدیقی، پروفیسر شارب ردولوی اور راجیہ سبھا کے رکن م۔ افضل نے بھی اظہار خیال کیا اور حنیف ترین کی ادبی خدمات کو سراہا تھا۔

ہم کلامی
(بوسنیا کی جنگ کے تناظر میں)

یہ کون لوگ ہیں کہ جو
ڈٹے ہوئے ہیں دھوم سے
ہیں دوبدو ہجوم سے
صلیب کے جنون سے
قدم قدم پہ خون سے، جو لکھ رہے ہیں داستاں
حکایتِ بلاکشاں
یہ کیسے لوگ ہیں کہ جو
بلا کی بھوک و پیاس میں
غبارِ حرب و جنگ سے اَٹے ہوئے لباس میں
زبان جسم و جان کی فضائے بے حواس میں
خشوعِ قلب مطمئن
نگاہ سوئے آسماں کیئے
یہ کس سے ہم کلام ہیں؟؟

ڈاکٹر حنیف ترین سنبھلی

عکسِ فن

غزل

پہلے اس کو جتا دیا جائے
پھر عصا ہاتھ میں لیا جائے

خود میں غوطہ اگر لگا جائے
زندگی کا وہ بھید پا جائے

دفعتاً اس سے جب ملا جائے
کیا کہا جائے کیا سُنا جائے

اپنے اندر ہی جو سما جائے
اس مسافت کو کیا کہا جائے

ٹوٹ جائے جو چُھونے چکھنے سے
اس تعلق کا کیا کیا جائے

دوڑتے تیز گام لمحوں سے
کون ہے جو فراغ پا جائے

جب ہَوا دھوپ کو بجھا جائے
راستوں میں دیا رکھا جائے

موسموں کا یہی تقاضا ہے
زرد کو بھی ہرا پڑھا جائے

مل کے بچپن کے سات رنگوں سے
تتلیوں کی طرح اڑا جائے

ہر جگہ پتھروں کی بارش ہے
سر دعاؤں سے ڈھک لیا جائے

حیدر اعظمی

پرانی باتیں ہیں دل اور دیے جلانے کی
جدید دور ہے اب گھر جلائے جاتے ہیں

15/12/95

Haider Azami
P.O.Box 40170
DOHA - QATER (A.G.)

حیدر اعظمی
(قطر)

سید کرار احمد حیدر اعظمی ۱۹۵۴ء میں سید سبط حسن کے ہاں موضع شیوئی ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مولوی محمد ادریس صاحب سے پائی۔ اور شعری ذوق اپنے چچا جناب اوج اعظمی سے ملا۔

ابتداء سے طبعی میلان تیکنیکی تعلیم کی طرف مائل تھا۔ آٹو موبائیل کی تربیت مومون بابر علی کی زیر نگرانی بمبئی میں حاصل کی اور اس کے بعد گیارہ برس تک وہیں پر مصروف عمل رہے۔ ۱۹۸۵ء سے قطر میں مقیم ہیں۔

حیدر اعظمی کے اشعار ان کی شعری واردات اور پرواز فکر کے آئینے دار ہوتے ہیں۔ ندرت خیال اپنی جگہ دیدنی ہوتی ہے۔ الفاظ کو اتنی سادگی اور پرکاری سے مربوط کرتے ہیں کہ شعر روزمرہ زندگی کا عکاس بن جاتا ہے۔ ترنم سے پڑھتے ہیں اور خوب پڑھتے ہیں۔ زیادہ تر طبیعت سلاست اور روانی کی طرف مائل ہے۔ نعت، سلام، قصیدہ اور غزل میں طبع آزمائی کر چکے ہیں۔ غزلوں پر مشتمل مجموعہ کلام زیر ترتیب ہے۔

حیدر کہتے ہیں کہ "شاعری کے علاوہ ادب کی اور کسی صنف سے ابھی تک تو میری وابستگی نہیں ہاں مستقبل کا بھروسہ بھی نہیں اور شاعری کے محرکات کے سلسلے میں اتنا ہی کہوں گا کہ میرے حقیقی عم بزرگوار اوج اعظمی شاعر ہیں"۔

ابلاغ کے حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ "ادب اور شاعری کے لئے ابلاغ ضروری کیا بے حد ضروری ہے اور ادبی رسائل کی عدم مقبولیت واقعی تشویش ناک ہے کیونکہ ادبی رسائل کا کام نہ

تو آڈیو نہ ویڈیو نہ ٹی وی پر ہی مکمل ہو سکتا ہے ہمیں اپنی نسلوں کو اردو کی طرف مائل کرنا چاہیے تاکہ ہماری ثقافت دم نہ توڑ سکے۔ اور ادبی کتابوں کی پذیرائی کا جو حق ہے وہ اسی وقت ادا ہو سکتا ہے جب ہم اردو کی شناسائی نئی نسلوں سے کرائیں۔"

حیدر اردو کے مستقبل ۔سے پرامید ہیں کہتے ہیں کہ "دنیا کے بیشتر ممالک میں نئی نسل اردو سے ناآشنا نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جس حد تک اردو سے آشنا ہونا چاہیے تھا' نہیں ہے۔ پھر بھی اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں ہونا چاہیے ہاں یہ ۔ہے کہ ہمیں اس کی ترقی وترویج کے لئے اردو سے لوگوں کو روشناس کرانا چاہیے۔"

حیدر اعظمی اپنے وسیع مطالعہ کی بناء پر کہتے ہیں کہ "تنقید نگار حضرات کا کہنا کہاں تک حق بجانب ہے یہ تو وہی جانیں لیکن آج کا ادب بے معنی نہیں۔ الفاظ اکثر لوگوں کے یہاں ساتھ نہیں دیتے لیکن سچ ضرور بولتے ہیں۔ آج کے حالات کی عکاسی ہمارا آج کا ادب مکمل طور پر کر رہا ہے۔"

حیدر زباں پہ حرف صداقت جو آگیا
تیغ و سنان و تیر و تبر بولنے لگے

○

کسی کے غم کو جو اپنا سمجھ کے روتے تھے
وہ کیسے لوگ تھے حیدر وہ عہد کیسا تھا

○

وقت کی آندھی نے پھینکا ہے کوئی سو میل دور
ہو کے گھر بے گھر ہوئے ہیں آج حیدر اور میں

عکسِ فن

حیدر اعظمی

غزل

اپنی فطرت پہ رہا جبر کے خوگر کا مزاج
لاکھ بدلا بھی تو بدلا نہیں پتھر کا مزاج

کوئی کم ظرف سمجھتا نہیں وسعت دل کی
ندیاں کیسے سمجھ پائیں سمندر کا مزاج

ایسے شیشے بھی ہیں پربت سے جو ٹکراتے ہیں
ایسے پتھر بھی ہیں رکھتے ہیں جو گوہر کا مزاج

مجھ پہ سفاک نگاہی کا اثر کیا ہوگا
بارہا دیکھا ہے قاتل ترے خنجر کا مزاج

اس کی رفتار سے رفتار زمانہ برہم
گردشوں سے کوئی پوچھے مرے ساغر کا مزاج

میرے افکار سے حیدر یہی کہتی ہے ردیف،
شعر کہنے کے لئے رکھئے سخنور کا مزاج

○

حیدر قریشی

آج تو کھل کے ہنس دیجیے حیدر
دل کے زخموں کے جتنے ٹانکے تھے

حیدر قریشی
20.9.95

Hyer Quraishi
AUFDER Roos.7
65795 Hatte Rsheimi - GERMANY

حیدر قریشی

(جرمنی)

حیدر قریشی کا شعری سفر ایک طویل عرصے پر محیط ہے۔ انہیں میں نے بیس سوالات پر مشتمل سوالنامہ بھیجا تھا جس کا جواب انہوں نے تفصیل سے دیا۔ ان کی تحریر میں مطالعہ اور فکر کی عمیق گہرائی ملتی ہے۔ آپ ان کے نظریات، ان کی سوچ اور ان کے مطمع نظر سے متفق ہوں یا نہ ہوں لیکن ان کی کہی ہوئی باتوں سے صرف نظر نہیں کر سکتے۔ یقیناً ان کے جوابات فکر کی نئی راہیں کھولتے ہیں اور مزید دعوت فکر دیتے ہیں۔ سخن ور حصہ دوم کے لئے یہ سوالات مرتب کرنے کا میرا نظریہ بھی یہی تھا کہ ہر شاعر کی سوچ کی ایک واضح تصویر اس کے پڑھنے والوں کے سامنے آئے۔

حیدر قریشی کا پورا نام قریشی غلام حیدر ارشد ہے۔ تخلص حیدر قریشی اختیار کیا۔ ۱۳ جنوری ۱۹۵۲ء کو ضلع جھنگ کے چھوٹے سے شہر ربوہ میں پیدا ہوئے جہاں ان کی والدہ اپنے میکے آئی ہوئی تھیں تاہم ان کا آبائی علاقہ خانپور اور رحیم یار خان ہے۔

حیدر قریشی نے ۱۹۶۸ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول خان پور سے دسویں کا امتحان پاس کیا اور اسی سال یعنی سولہ سال کی عمر میں گھریلو ضرورتوں کے پیش نظر حسی سنز شوگر ملز خانپور میں ملازمت کر لی۔ اٹھتر روپے ماہوار اس وقت تنخواہ تھی۔ اسی دوران پڑھتے بھی رہے اور ۱۹۷۰ء میں پرائیوٹ طور پر ایف۔اے کا امتحان دیا۔ ۱۹۷۱ء میں شادی ہو گئی۔ ۱۹۷۲ء میں بی اے کا امتحان دیا اور کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۷۴ء میں انہیں ایم۔اے اردو کا امتحان دینا تھا جو ملک کے حالات کے تحت ۱۹۷۵ء میں ہوئے۔ حیدر قریشی نے یہ امتحان بھی دیا اور کامیاب رہے۔ اپنی

حیدر قریشی

زندگی کے انیس قیمتی سال شوگر ملز کی نوکری میں برباد کئے۔ پھر نوکری چھوڑ کر کچھ عرصہ بیروزگاری کی نذر کیا۔ ۱۹۹۰ء میں ایبٹ آباد کے ایک معیاری تعلیمی ادارہ میں اردو پڑھانے کی اچھی ملازمت مل گئی۔ ۱۹۹۲ء میں وطن عزیز کو خیرباد کہا۔ اب جرمنی میں مقیم ہیں۔

میں نے ان سے پوچھا کہ شاعری کے علاوہ نثر بھی تو لکھی ہے آپ نے۔ کچھ اس کے بارے میں بتائیں گے؟ میرے سوال کے جواب میں انہوں کہے کہا۔

"ہاں شاعری میری پہلی محبت ہے ویسے میں نے افسانے بھی لکھے ہیں۔ خاکے بھی لکھے ہیں۔ انشائیے بھی تھوڑے، بہت لکھے ہیں۔ باقاعدہ قسم کا نقاد تو نہیں ہوں تاہم اپنی ذاتی رائے کو مختلف مضامین میں بیان کیا ہے تو دو تنقیدی کتابوں جتنے مضامین لکھ ہی چکا ہوں۔

ادب اور شاعری سے وابستگی کے بنیادی محرکات کے بارے میں آپ نے پوچھا ہے تو عرض ہے کہ میں اس بارے میں کوئی حتمی بات نہیں کہہ سکتا۔ تاہم میری زندگی کے ابتدائی ایام ایک متوسط گھرانے کی متوسط خوشحالی کے ایام تھے۔ اباجی کا کپڑے کا بزنس خراب ہوا تو ہم لوگ بھیانک غربت کی زد میں آگئے۔ سو کم عمری میں پڑھائی چھوڑ کر نوکری کرلی تاکہ اباجی کا بوجھ بٹا سکوں۔ ہرچند خدا کے فضل سے پرائیوٹ طور پر اپنی پڑھائی بھی مکمل کرلی لیکن معاشرتی ناانصافیوں اور زیادتیوں نے میری روح میں بے شمار گھاؤ پیدا کئے ممکن ہے زندگی کا یہ سارا کھیل تماشہ ادب سے میری وابستگی کا محرک رہا ہو۔ یہاں دو دلچسپ باتیں بھی بتاتا چلوں۔ بچپن میں سنا کرتے تھے کہ میرے چھوٹے ماموں حبیب اللہ صادق صاحب (حال مقیم امریکہ) شاعر ہیں۔ ان کی شاعری تو ہماری جوانی سے پہلے ہی ختم ہوگئی لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں بچپن میں ماموں صادق کو ہمیشہ حیرت اور خوشی کے ساتھ دیکھا کرتا تھا اور اس بات پر خوش ہوتا تھا کہ میرے ایک ماموں شاعر ہیں۔ دوسری بات یہ کہ میری شادی ۱۹۷۱ء میں ہوئی اور اسی برس میری شاعری کا آغاز ہوا۔ اب بنیادی محرکات کو آپ خود ڈھونڈ لیں۔

میرے اس سوال کے جواب میں کہ "شعرگوئی کے لئے کون سی کیفیت یا جذبہ آپ کے لئے سب سے بڑا محرک ہوتا ہے۔" وہ بولے۔

"عام طور سے دکھ یا نارمل سی خوشی سے بڑھ کر کوئی بھی دکھ یا خوشی کی کیفیت مجھے اس طرف مائل کردیتی ہے۔ تاہم اس کے لئے مجھے ہمیشہ اپنے اندر کی آواز کا انتظار رہتا ہے۔ مناظر و مظاہر فطرت سے میں بیگانہ نہیں رہ سکتا اسی لئے دیہاتی ماحول کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔ آپ مجھے "پینڈو ادیب" کہیں تو مجھے شرمندگی نہیں ہوگی، خوشی ہوگی۔ محبت کا جذبہ میرے لئے لکھنے کا سب سے بڑا محرک ہوتا ہے لیکن یہ عام سطحی محبت کی بات نہیں ہے۔ اسے سمجھنے کے لئے

حیدر قریشی

میرے خاکوں کا مجموعہ "میری محبتیں" میرے دونوں شعری مجموعوں "سلگتے خواب" اور "عمر گریزاں" کے ساتھ ملا کر پڑھیئے۔ اور جہاں تک کسی مکتبہ فکر سے وابستگی کا تعلق ہے یا شاعری کو نظریاتی ہونا چاہئے یا نہیں۔۔ اس سلسلے میں عرض کروں گا کہ میں باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ کسی بھی نظریے کے تحت شعر نہیں کہتا اور نہ ہی ایسی شاعری کو اچھی شاعری سمجھتا ہوں جو پہلے نظریے کی پابندی کرائے اور پھر اس کے مطابق شاعری کرائے۔ ہر شاعر زندگی کے مختلف نظریات میں سے کسی نہ کسی کا معترف ضرور ہوتا ہے سو اس کا نظریہ اس کی روح کا جزو بن کر جب اس کے اندر سے آتا ہے، تو اعلیٰ فن پارہ بن جاتا ہے لیکن جب محض کسی عقیدے کا اظہار مقصود ہو اور شاعری ثانوی حیثیت اختیار کر جائے تب پروپیگنڈہ شاعری تو وجود میں آجاتی ہے اچھی شاعری نہیں۔ آپ اردو ادب میں ہندو، مسلم اور سکھ ادیبوں کے بڑے نام دیکھ لیں۔ مختلف عقائد اور نظریات کے باوجود ان سب نے بڑا ادب تخلیق کیا ہے کوئی ادیب کسی بھی نظریے کو ماننے والا ہو لمحہ تخلیق میں اگر وہ اپنے باہر سے آزاد ہو کر اپنے اندر کی آواز پر کہتا ہے تو اس کے اندر کے نظریے سے اپنے اختلاف کے باوجود میں اسے بڑا ادیب سمجھوں گا۔ میں نے جتنے مختلف قسم کے ادبی نظریات کو پڑھا ہے ان کے کچھ نہ کچھ اثرات تو ضرور مرتسم ہوئے ہیں۔ میں نے ایک مزدور اور محنت کش کی زندگی گزاری ہے اس کے اثرات بھی ہیں۔ روحانیت سے مجھے ہمیشہ لگاؤ رہا ہے سو تصوف کے اثرات بھی ہیں لیکن میرے نزدیک بنیادی اہمیت اندر کی آواز کو حاصل ہے۔ میری تحریریں مختلف وقتوں میں مختلف رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ابتدا میں "نگار پاکستان" اور "سیپ" میں چھپیں پھر "نئی قدریں" اور میرے اپنے رسالہ "جدید ادب" میں بھی میری تحریریں چھپتی رہیں۔ اوراق، تخلیق، تجدید نو، منشور، دستک، شاعر، اسباق، گلبن، توازن، مدیر، ادب لطیف، بیسویں صدی، مفاہیم، نیا دور، راشٹریہ ہمارا اور متعدد دیگر پاکستانی و عبارتی رسائل میں بھی تحریریں چھپ چکی ہیں۔

حیدر قریشی کی درج ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

مطبوعہ کتب :

سلگتے خواب (غزلیں)

عمر گریزاں (غزلیں، نظمیں، ماہیے)

روشنی کی بشارت (افسانے)

میری محبتیں (خاکے)

مرتب کردہ مطبوعہ کتب :

شفق رنگ (ضلع رحیم یار خاں۔ کے اہم شعراء)
کرنیں (بہاولپور ڈویژن کے اہم شعراء)
سرائیکی غزلیں (ایک بحث کے ساتھ سرائیکی غزلوں کا انتخاب)
پہلا ورق (اوراق کے اداریوں کا مجموعہ)

میں نے "جدید ادب" کی ۹ سال تک ادارت بھی کی ہے۔ آپ کے اگلے سوال کے جواب میں عرض ہے کہ اگر ادب ذات اور کائنات کا اظہار ہے تو خود ہی سوچئے کیا یہ کائنات ایٹم کے پارٹیکلز سے لے کر عظیم کہکشاؤں تک کوئی آسان اور عام فہم کائنات ہے۔ اسی طرح دوسروں کی ذات کو تو چھوڑ دیں۔ ہم میں سے ہر شخص اپنی ذات میں اتنا پیچیدہ ہے کہ زندگی بھر بھی اپنے آپ کو شاید ہی سمجھ پائے اسی لئے تو حضرت علیؓ نے فرمایا تھا کہ جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا۔ لہٰذا مشکل اور پیچیدہ ذات و کائنات کے اظہار کے لئے آسان زبان اور اسلوب کا مطالبہ کچھ مناسب نہیں لگتا۔ میں فن کے اظہار کے ساتھ اس کے ابلاغ کی اہمیت کو تسلیم کرتا ہوں لیکن اگر کسی تخلیقی لمحے میں فنکار کسی ایسی ارفع سطح پر پہنچ جاتا ہے جہاں اس کا اظہار ابلاغ کی عمومی سطح سے بلند ہو جاتا ہے تو میں اس کی عظمت کو بھی مانتا ہوں۔ البتہ جدیدیت کے نام پر پی آر شپ کے زور سے جن لوگوں نے جان بوجھ کر ابلاغ کو مشکل بنایا ہے ان کے مصنوعی اظہار سے جو یبوست پھیلی ہے میں اس کی مذمت کرتا ہوں۔ یہ سارے لوگ سرے سے ادیب ہی نہیں ہیں۔ ذرائع ابلاغ پر قبضہ کے باعث اور پی آر شپ کے زور سے جو جعلی ادیب سامنے آئے ہیں ان کی جعلسازی خود بخود ختم ہو جائے گی اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ایسے نام نہاد "جدیدیوں" کا جدید ادبی رجحانات سے اور جدید ادب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تنقید سے متعلق کئے گئے سوال کے جواب میں میں کہوں گا کہ ڈاکٹر وزیر آغا کی کتاب "تنقید اور مجلسی تنقید" اس سوال اور اس سے متعلقہ دیگر متعدد سوالات کا شافی جواب ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اصل تنقید اور سطحی تنقید کا فرق بھی واضح ہو جاتا ہے۔ اس سوال سے دلچسپی رکھنے والے سارے دوست مذکورہ کتاب کا مطالعہ ضرور کریں۔

اردو زبان کی بقا کے سلسلے میں آپ کی تشویش بجا ہے۔ امریکہ میں ہی نہیں ادھر یورپ میں بھی یہی صورتحال ہے لیکن ستم ظریفی دیکھیں کہ بعض پاکستانی اور بھارتی ادبی جرائد مغربی ممالک میں مقیم اردو ادیبوں کے ٹھکانوں کو "اردو کی نئی بستیاں" قرار دے رہے ہیں اور مغربی ممالک میں مقیم بعض ادیب اس پر بغلیں بھی بجا رہے ہیں حالانکہ انہیں اچھی طرح علم ہے کہ ان کی موجودہ نہیں تو اس سے اگلی نسل اردو سے بالکل بیگانہ ہو جائے گی۔ دوسرے مغربی ممالک

میں اس مسئلے کو کیسے حل کیا جاسکتا ہے۔ میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ جرمنی کے پاکستانیوں کو درپیش اس مسئلے کا حل موجود ہے۔ اگر حکومت پاکستان جرمن حکومت کے ساتھ ثقافتی اور تعلیمی معاہدہ کرلے تو جرمن حکام اس کے لئے آمادہ ہیں کہ جرمن کے جس اسکول میں بھی آٹھ دس پاکستانی طلبہ ہوں وہاں اردو کی کلاسوں کا انتظام ہوسکتا ہے لیکن حکومت پاکستان کو اس کے لئے کون احساس دلائے اور آمادہ کرے؟

آپ نے پوچھا ہے کہ کیا ہم اردو شاعری کے ذریعے ایسا ادب تخلیق کررہے ہیں جو زندگی سے بھرپور ہو اور جس کی جڑیں ہماری زمین میں دور تک پیوست ہوں؟

میرے خیال میں اگرچہ اردو ادب میں ٹریش بھی بہت چھپ رہا ہے تاہم ایسا ادب بھی یقیناً تخلیق ہورہا ہے جو زندگی سے بھرپور ہے اور جس کی جڑیں ہماری زمین میں دور تک پیوست ہیں۔ آپ نے درست کہا کہ "ادیب اور شاعر کی تحریریں اس کے وجود کا اقرار اور اس کے عہد کی گواہ بن جاتی ہیں۔" یہ قول ایک جزوی سچائی ہے اور آج کی شاعری بھی اور دوسری اصناف ادب بھی' ساری کی ساری تو نہیں لیکن بڑی حد تک اپنے تخلیق کار کے وجود کا اقرار بھی کرتی ہیں اور اس کے عہد کی گواہی بھی دیتی ہیں۔ اس تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھیں۔ پرانی داستانوں میں اڑن طشتریاں' اڑن قالین اور پریوں کو اڑانے والے داستان گو اپنے عہد سے آگے نکلے ہوئے تھے انہوں نے صدیوں پہلے ہوائی جہاز اور راکٹ کے زمانے کو اپنے ادبی کشف میں شامل کیا۔ یوں وہ اپنے عہد سے زیادہ انسان کے مستقبل کے گواہ بن گئے۔ ادب کے حوالے سے کوئی نظریہ ہو یا فکری لہر' سب اپنی اپنی جگہ جزوی سچائیاں ہیں۔ اور آپ کے سوال نمبر ۷ کے جواب میں' میں کہوں گا کہ یہ باتیں تمام تنقید نگار نہیں کہتے' بعض تنقید نگار کہتے ہیں۔ جدیدیت کے نام پر جن جعلی ادیبوں نے ادب میں لایعنی تحریروں کے انبار لگائے اور پھر پی آر شپ کے زور سے انہیں عظیم شاہکار قرار دلوایا۔ اگر محض انہیں مد نظر رکھ کر بعض تنقید نگار پورے اردو ادب سے مایوسی کا اظہار کررہے ہیں تو یہ مناسب نہیں ہے۔ ایسے ناقدین محض نام نہاد جدیدیوں کو پڑھ کر ادب کے مطالعہ سے ہاتھ اٹھا بیٹھے ہیں۔ وگرنہ سچے لفظ اور دل میں اترنے والے لفظ آج بھی صدائے کن کی طرح اتر رہے ہیں۔ ادب زندگی کا ماتحت نہیں ہے لیکن اس نے زندگی سے اپنا تعلق قائم رکھا ہوا ہے۔ ادب میں نیا پن بھی ہے۔ میرا ایک شعر ہے:

جو میری روح میں بس زہر گھولتا ہی رہے
مرے نصیب میں چینی کا کارخانہ تھا

میں اس جیسی بیسیوں مثالیں اپنی شاعری میں سے اور سینکڑوں مثالیں آج کی شاعری میں

سے دکھا سکتا ہوں۔ بتائیے اس شعر کا زندگی سے تعلق ہے یا نہیں؟ اس میں نیا پن بھی ہے یا نہیں؟

جہاں تک چبائے ہوئے لقموں کو اگلنے کا الزام ہے یہ تو غالب پر بھی لگایا جا سکتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ شاعری میں اور بالخصوص غزل میں قافیہ ردیف کی پابندی اتفاقیہ گل کھلا دیتی ہے۔ اسے اتفاقیہ توارد کہہ کر نظرانداز کیا جا سکتا ہے۔ ہاں یہ بات درست ہے کہ اچھے شعراء کی تراکیب اور استعاروں کو کمتر درجے کے شعراء اس حد تک دہراتے ہیں کہ ان کا سارا حسن غارت ہو جاتا ہے۔ یہ عمل غالب سے پہلے بھی ہوتا رہا ہے۔ غالب کے عہد میں بھی ہوا ہے اور آج بھی ہو رہا ہے۔ البتہ آج یہ تماشا بھی ہو رہا ہے کہ جو کمتر ادیب کسی اچھے ادیب کی خوشہ چینی کرتا ہے اسی کے خلاف حیلوں بہانوں سے کچھ نہ کچھ لکھتا بھی رہتا ہے۔ بہرحال میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا ادب ارتقاء پذیر ہے اور مایوسی والی کوئی بات نہیں ہے۔

آپ کے سوال نمبر اٹھارہ کے پہلے جملے کے بارے میں ایک وضاحت کرنا بے حد ضروری ہے۔ اچھی شاعری کے لئے ضروری ہے کہ وہ روح عصر کی عکاسی بھی کرے۔ اگر روح عصر کی عکاسی کرنا ہی اہم ہے تو پھر اخبارات یہ فریضہ ادب، سے کہیں بہتر طور پر سرانجام دے رہے ہیں۔ ہوا میں انسان سمیت مختلف جاندار سانس لیتے ہیں۔ فی ذات ہوا کا یہ فریضہ نہیں ہے کہ وہ ہر جاندار کو اس کی مطلوبہ گیس فراہم کرے تاہم اگر ہوا سے ہم خود اکتساب فیض کر رہے ہیں تو یہ اضافی اور ہمارے فائدہ کی بات ہے۔ اسی طرح اگر اچھے ادب سے روح عصر کی عکاسی بھی ہو رہی ہے تو کوئی حرج نہیں لیکن یہ اچھے ادب کی ذمہ داری نہیں ہے کہ وہ لازماً اس فرض کو ادا کرے۔ باقی اس میں کوئی شک نہیں اگر شاعر سچ مچ شاعر ہو تو اس کا نقطہ نظر وسیع تجربات اور مثبت فکر و مطالعہ مل کر اس کی شاعری میں انوکھی چمک پیدا کر دیں گے۔ آج کے زندہ شعراء میں اسکی سب سے تابندہ مثال وزیر آغا کی شاعری ہے۔ ہاں آپ کے اگلے سوال کے جواب میں عرض ہے کہ میں مزاح گو تو نہیں لیکن حس مزاح ضرور رکھتا ہوں۔ اچھے مزاح اور پھکڑپن کے فرق کو بھی جانتا ہوں۔ آپ کی بات میں مجھے وزن محسوس ہو رہا ہے۔ آپ کا اگلا اور آخری سوال ہے کہ رشید احمد صدیقی نے کہا ہے کہ "طنز و ظرافت اس سفلی عمل کی طرح ہے جس میں اگر عمل پورا نہ ہو تو عامل خود ہی اس کا شکار ہو جاتا ہے۔" آپ کس حوالے سے اس قول کی تصدیق یا نفی کرنا چاہیں گے؟"

میں عرض کروں گا کہ رشید احمد صدیقی نے جس تناظر میں یہ بات کہی ہے' درست کہی ہے۔ اخبارات کے فکاہی کالم نگار جو خود کو ادیب منوانے پر بھی مصر ہیں چند ایک کو چھوڑ کر اکثر

لطیفوں کی بھرمار سے، طنز کو دشنام کی سطح تک لا کر اور مزاح کو بھانڈوں کے انداز میں پیش کر کے "طنز و ظرافت" کے ادھورے سفلی عمل میں مبتلا ہیں۔ پھر بیشتر کالم نگار "نظریہ ضرورت" کے تحت لکھ رہے ہیں اور اپنی اپنی حاجتیں پوری کر رہے ہیں۔ کالم نگاروں کی ہی بات کیوں؟ ادب میں تخلیق ہو یا تنقید جو لوگ بھی کسی نجی "نظریہ ضرورت" کے تحت لکھ رہے ہیں اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہیں۔ ادب کو دنیاوی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے آلہ کار بنانا اور پھر اس کے جواز میں "پرویزی حیلے" سے کام لینا اپنے آپ پر ظلم کرنا ہے۔

ماہیے

کچھ رشتے ٹوٹ گئے
برتن مٹی کے
ہاتھوں سے چھوٹ گئے

○

سونے کی انگوٹھی ہے
پیار میں سچی ہے
پر قول کی جھوٹی ہے

○

پَت جھڑ کی ہوائیں تھیں
سہمے پرندوں کے
ہونٹوں پہ دعائیں تھیں

○

دوپہر جوانی تھی
پل میں بیت گئی
پھر شام سہانی تھی

○

ملنا ہو تو ملتے ہیں
پھول محبت کے
پت جھڑ میں بھی کھلتے ہیں

حیدر قریشی

عکسِ فن

غزل

اب تو جذبے، زبان مانگتے ہیں
پر بریدہ اڑان مانگتے ہیں

عشق کر پڑھنا چاہتے ہیں نماز
اور اذنِ اذان مانگتے ہیں

دُور سے صرف دیکھتے ہی رہیں
کب یہ ہفت آسمان مانگتے ہیں

ہم تہی دست آبروئے فقر
سود دے کر زیان مانگتے ہیں

دل کی اک بات کہنا ہے لیکن
پہلے جاں کی امان مانگتے ہیں

یا تو کچھ بھی نہیں ہیں مانگتے، یا
ترے سارے جہان مانگتے ہیں

ایسی عمروں کے پیار تو حیدرؔ
جسم وجاں سے لگان مانگتے ہیں

ڈاکٹر خالد سہیل

تمام شہر سے ملتی ہوں جس کی دیواریں
ہم اپنے شہر میں ایسا مکاں تلاش کریں

Dr. Khalid Sohail
PH 6, 100 White Oaks
WHITBY . ONT LIP IB7
CANADA

ڈاکٹر خالد سہیل

(کینیڈا)

میں آنند نرائن ملا کی "میری حدیث عمر گریزاں" پڑھ رہی تھی۔ آنند جی کا کہنا ہے کہ "جس ادب میں انسانی درد کی آواز نہیں وہ زیادہ سے زیادہ ذہنی عیاشی کے لئے سامان فراہم کر سکتا ہے لیکن دل و دماغ کی تربیت نہیں کر سکتا۔ کلام میں تاثیر خلوص سے پیدا ہوتی ہے اور عظمت انسانی درد کی آواز شامل کرنے سے"۔

پھر جب میں نے خالد سہیل کو پڑھا تو ان کی نثر و نظم دونوں ہی مجھے اس قول پر پوری اترتی محسوس ہوئیں۔ ڈاکٹر خالد سہیل گزشتہ دو صدیوں سے لکھ رہے ہیں۔ ۹ جولائی ۱۹۵۲ء کو پاکستان میں پیدا ہونے والے اس ادیب اور شاعر نے ہجرت کے دکھ بھی جھیلے ہیں اور تنہائیوں کا کرب بھی سمیٹا ہے۔ ۱۹۷۴ء میں خیبر میڈیکل کالج پشاور سے ایم بی بی ایس کیا۔ ۱۹۸۲ء میں کینیڈا کی میموریل یونیورسٹی سے ایف۔ آر۔ سی۔ پی نفسیات میں کیا۔ کہتے ہیں کہ "میں نے جب سے لکھنا شروع کیا میری یہی خواہش رہی کہ میں اپنے مشاہدات، تجربات اور خوابوں کو تخلیقی سطح پر پیش کر سکوں"۔ صنف کا چناؤ ان کے لئے ثانوی رہا۔ شاعری ہو یا افسانہ، مضمون ہو یا ناولٹ، انٹرویو ہو یا عالمی ادب کا ترجمہ۔ ان کے لئے یہ سب ایک ہی منزل تک پہنچنے کے مختلف راستے ہیں۔ بنیادی توجہ اس بات پر رہی کہ اپنے مخصوص نقطہ نظر کو تخلیقی طور پر عوام و خواص کے سامنے پیش کر سکیں۔

میرے اس سوال کے جواب میں کہ انہوں نے لکھنا کب شروع کیا۔ ڈاکٹر خالد سہیل یوں گویا ہوئے۔

"میں نے جب زندگی کی آغوش میں آنکھ کھولی تو اپنی چھوٹی سی دنیا کو روایات کی اونچی دیواروں میں محصور پایا۔ خاموشی، تاریکی اور گھٹن نے میرا استقبال کیا۔ لاکھوں انسان لکیر کے

ڈاکٹر خالد سہیل

فقیر بنے آباؤ اجداد کے نقش قدم پر چل رہے تھے' فرسودہ طرز حیات کو سینوں سے لگائے بیٹھے تھے۔ اس ماحول میں اندھا ایمان قابل قدر تھا' شک کرنا گناہ اور سوال پوچھنا جرم۔ میرے سراپا میں خوف کی لہریں دوڑنے لگیں۔ روایت سے انحراف نہ صرف ناپسندیدہ بلکہ قابل سزا جرم تھا۔ میں اپنے چاروں طرف دیکھتا تو احساس ہوتا۔

اس درجہ روایات کی دیواریں اٹھائیں
نسلوں سے کسی شخص نے باہر نہیں دیکھا

میرا جی چاہتا تھا کہ میں اس ماحول سے دور' بہت دور بھاگ جاؤں۔

میرے شعور نے جب بلوغت کی طرف قدم بڑھائے تو مجھے پڑھنے اور لکھنے کا جنون ہو گیا۔ میں ساری دنیا سے کٹ کر اپنی ذات میں ایک دنیا بسانے لگا۔ میرا قلم میرا ساتھی بھی تھا اور رقیب بھی۔ وہ مجھے ڈھارس بھی دیتا۔ میری اقدار پر چرکے بھی لگاتا اور میرے ایمان کو کریدتا بھی رہتا۔ میں نے اپنے قلم کو کدال بنایا تو میرے لئے دیواروں میں کھڑکیاں کھلنے لگیں۔

میں اپنے ماحول سے ایک عجیب رشتے میں منسلک تھا۔ میں ان ادیبوں اور دانشوروں سے زیادہ قریب تھا جو مدتوں پہلے اس دارفانی سے کوچ کر چکے تھے۔ لیکن میرے آس پاس بسنے والے لاکھوں زندہ انسان ایک ایسی دھند میں ملفوف تھے کہ میرے لئے ان کی پہچان اور اپنی ذات کی شناخت مشکل ہو گئی تھی۔ مجھے اس ہجوم میں کھو جانے کا ڈر تھا۔ میں نے قدم قدم پر۔

اپنی پرواز کا اندازہ لگانے کے لئے
اپنے ماحول سے آزاد فضائیں مانگیں

میں جب اپنی تلاش میں چند قدم آگے بڑھا تو میری ملاقات چند ایسے رشتہ داروں' اساتذہ اور دوستوں سے ہوئی جو میری طرح سے اپنے گھروں سے نئی دنیا کی تلاش میں نکلے تھے۔ چنانچہ ہم نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر آگے بڑھنے شروع کیا۔ ہمارے سامنے شاہراہیں نہ تھیں' پگڈنڈیاں تھیں لیکن ان پگڈنڈیوں پر چند نقش قدم ہی حوصلہ افزائی کے لئے کافی تھے۔ ہم زندگی کی کان میں مختلف نظریوں اور ضابطہ حیات کے مقناطیس لئے کھوٹے کو کھرے سے جدا کرنے کی کوشش کرتے رہے اور اپنے اپنے تجربات کی کسوٹی پر پرکھتے رہے۔

جب میرے ذہن اور میرے قلب کے کینوس پر کچھ واضح نقوش ابھرنے لگے تو میں نے اپنے افسانوں اور شعروں میں ان کے رنگ بھرنے چاہے۔ میں پرندوں کی طرح اڑنا چاہتا تھا' اونچا' بہت اونچا ان دیواروں سے بلند' ان لوگوں کی رسائی سے بہت بالا جو ہاتھوں میں تیر' کمان اور بندوقیں لئے کھڑے تھے۔

ڈاکٹر خالد سہیل

اپنی ذات کی کھوج میں، حقیقت کی جستجو میں، نئی صبحوں کی تلاش میں، میں مشرق و مغرب کی شاہراہوں، صحراؤں، وادیوں، جنگلوں اور شہروں میں گھومتا پھرتا رہا، جگہ جگہ اپنی روح کی پیاس بجھانے کے لئے رکا۔ مجھے یہ جان کر حیرانی ہوئی کہ میری سائنسی تعلیم کے برخلاف پانی کا بھی ایک رنگ تھا، ایک ذائقہ تھا۔

میں جب مغرب میں آبسا تو نفسیات کو اپنے پیشے کے طور پر اختیار کیا۔ میرے لئے یہ ادب اور فلسفے سے قریب ترین پیشہ تھا۔ میں پڑھتا رہا، لکھتا رہا، اپنی ذات کی گہرائیوں سے پردے اٹھاتا رہا، لوگوں کی زندگیوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا اور ان طالبعلموں کے ساتھ اٹھتا رہا، بیٹھتا رہا جو انسان اور کائنات کے رازوں کی گتھیوں کو سلجھانے میں الجھتے رہے۔ یہ محنت، یہ جدوجہد، یہ کوشش، یہ جستجو ---- ایک نئی زندگی، نئی دنیا کی تلاش میں تھی۔ ایسی دنیا جہاں ہمارا فردا ہمارے ماضی سے روشن تر ہوگا۔ میرے نزدیک یہی جدوجہد ہمیں انسانیت کے اعلیٰ معیار کی طرف لے جاتی ہے۔ مجھے فخر ہے کہ میں اس چھوٹے سے قافلے میں شامل ہوں جو اس منزل کی طرف بڑھ رہا ہے"۔

خالد سہیل کی ایک نظم میں وہ کہتے ہیں:-

میری ماں نے زیست کے ہر اک چوراہے پر
ہمت کے کچھ پھول کھلائے
چاہت کے کچھ گیت سنائے
اس ہمت نے، اس چاہت نے
دو کلیوں کا روپ سنوارا

اس طرح خالد کی کئی نظموں میں عورت کی عظمت و تقدس کا اظہار ملتا ہے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں۔ "میرے بچپن میں اہل خاندان، لڑکپن میں اساتذہ اور جوانی میں دوستوں نے مجھے بہت پیار اور خلوص دیا ---- شاید یہی وجہ ہے کہ مجھے زندگی سے محبت اور انسانوں پر اعتبار کرنے میں زیادہ دقت نہ ہوئی۔

اپنے سفر کے ہر موڑ پر میری ملاقات عورت سے ہوئی۔ میری ماں، میری بہن، میری دوست، میری محبوبہ۔ ہر قدم پر میں نے اسے قربانیاں دیتے دیکھا اور اس دن کا انتظار کرتے ہوئے پایا جب وہ اپنے ماحول سے مردوں کے برابر لطف اندوز ہو سکے گی اور معاشرہ اسے مرد کے برابر قبول کر سکے گا۔

میری ذات اور شخصیت کے ارتقاء میں عورت کی رفاقتوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

ڈاکٹر خالد سہیل

مجھے ماہر نفسیات ہونے کی وجہ سے ان انسانوں کے ساتھ بھی دو چار قدم چلنے کا موقع ملا جن کے ساتھ زندگی اور دوسرے انسانوں نے سوتیلے بچوں کا سا سلوک کیا۔ وہ لوگ جو اپنی ذات کا توازن قائم رکھنے کی جدوجہد میں ذہنی توازن کھو بیٹھے۔۔۔۔ وہ تنہائیوں کے دوزخ میں سلگتے رہے۔۔۔۔ اپنے ماحول اور بنی نوع انسان سے کٹ کر رہ گئے۔ مجھے ان ہمسفروں نے نئی بصارتیں اور بصیرتیں عطا کیں۔

میں زیست کی راہوں میں ان سرنگوں سے بھی گزرا جب اپنے ماحول کو اپنی ذات پر تنگ ہوتے ہوئے پایا۔ گھٹن اور حبس کا احساس بڑھنے لگا اپنے گھر سے اجنبیت ہونے لگی۔ چنانچہ میں ہجرت کی وادیوں سے گزرتا ہوا اپنی کائنات سے ایک نیا رشتہ دریافت کرنے نکل کھڑا ہوا۔ یہ جستجو مجھے اس مقام پر لے آئی جہاں دھرتی اور انسانیت ایک ہو گئے۔ یہ ذات اور کائنات کے عرفان کی پہلی منزل تھی۔ یہ سفر آج بھی جاری ہے۔

نئے رشتوں کی تلاش

نئے راستوں کی تلاش

نئی منزلوں کی تلاش

مجھے یقین ہونے لگا کہ انسان ایک ازلی وابدی مسافر ہے"۔ خالد سہیل اس حقیقت سے اتفاق کرتے ہیں کہ عظیم شاعری جارحیت اور داخلیت کو ایک ساتھ سمونے کا ریاض ہے۔ ایک بڑا فنکار بلاشبہ دنیا کے واقعات اور حادثات سے تاثر قبول کرتا ہے اور اسے اپنے ذہن و دل میں پرورش کرتا ہے، اسے اپناتا ہے اور پھر اسے اپنے تخلیقی شعور کی رفعت دیکر تحریر کرتا ہے۔

ان کا بیشتر کلام اس کیفیت کا عکاس ہے۔ خالد ہجرت کے دکھ سے آشنا ہیں۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں اس دکھ کو سمویا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ "زندگی کا ہر دور اپنی صلیب اپنے کاندھوں پر لے کر چلتا ہے اور ہر دور کے انسان اپنی جنت گم گشتہ کی تلاش میں مصروف رہتے ہیں"۔

"ہمارا عہد جدید آسائشوں کے ساتھ ساتھ نئے تقاضے بھی لے کر آتا ہے۔ ہم اس حقیقت کو زیادہ دیر تک نظر انداز نہیں کرسکتے کہ دنیا کے ہر گوشے میں بسے ہوئے انسان چاہے وہ کسی بھی رنگ، نسل، زبان اور مذہب سے تعلق رکھتے ہوں ایک ہی خاندان کے افراد ہیں۔ جس طرح جسم کا ایک حصہ باقی حصوں سے کٹ کر نشوونما نہیں پا سکتا اسی طرح ایک انسان یا انسانوں کا ایک گروہ باقی انسانوں سے جدا رہ کر زیادہ دیر تک کامیاب وکامران نہیں ہو سکتا۔

ہمیں انفرادی اور اجتماعی طور پر انسانی معاشرے میں انسانیت کی قدر مشترک کو جلد یا بدیر قبول کرنا ہوگا۔ یا تو ہم سب مل کر بہتر زندگی کی جستجو کریں گے یا مل کر خودکشی کرلیں گے (پوری

انسانیت کا ایٹمی توانائی سے مجموعی طور پر خود کشی کرنا بھی بیسویں صدی میں بھی ممکن ہوا ہے)

جب ہم اپنے چاروں طرف نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ چاہے وہ جنوبی ایشیا کی معاشی ناہمواریاں ہوں یا مشرق وسطیٰ کی سیاسی اور مذہبی رنجشیں' چاہے وہ شمالی امریکہ کا احساس تنہائی ہو یا جنوبی افریقہ کا احساس غلامی اور چاہے وہ اقلیتوں کے مسائل ہوں یا عورتوں کے حقوق کی جدوجہد۔ یہ سب ایک ہی تسبیح کے دانے اور ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں"۔

میرا اگلا سوال تھا کہ کیا آج کے ادیب نے اپنے قلم کا رشتہ اپنی دھرتی سے جوڑ رکھا ہے؟ خالد کہنے لگے کہ

"ایک ایسے معاشرے کے خدوخال واضح کرنے میں جس کی بنیادیں تعصب' جہالت اور انصاف کے آہنی ستونوں پر قائم ہوں ادب نے ہمیشہ ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ ادب نے ہمیشہ اپنے عہد کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کی ہے۔

بیسویں صدی میں افراد اور قوتوں کے رشتوں میں حیرت انگیز تبدیلیاں آئی ہیں۔ چونکہ ساری دنیا میں میڈیا اور سفر کی سہولتوں نے ایک عالمی گاؤں کی سی صورت پیدا کر دی ہے۔ اس لئے ایک انسان یا قوم کا تجربہ پلک جھپکتے ہی پوری انسانیت کا تجربہ بن جاتا ہے۔ اس تبدیلی نے ہمیں انسانی زندگی کے سفر کی اگلی منزل پر لا کھڑا کیا ہے اور ہمیں مجبور کیا ہے کہ ہمارے ادیب تجربات کو پورے خلوص سے تخلیقی سطح پر پیش کرنے کی' ہمارے سائنس دان (چاہے وہ ماہرین نفسیات ہوں یا ماہرین بشریات) ان تجربات کی منظم طریقے سے تفہیم کرنے کی اور ہمارے فلاسفر اور دانشور وجدانی طور پر انسانیت کے مستقبل کی پیشن گوئی کرنے کی کوشش کریں۔

انسانی تاریخ کے اس موڑ پر ایک مہاجر ادیب قیادت کے حوالے سے ایک اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ اس تیزی سے بدلتی ہوئی زندگی میں اس کا ایک سے زیادہ تہذیبوں' ثقافتوں' زبانوں اور معاشروں میں زندگی گزارنے کا تجربہ اور اس کا تخلیقی اظہار کاروان حیات کا رخت سفر بن سکتا ہے۔ اس تجربے نے اس کی تیسری آنکھ کھول دی ہے ایسی آنکھ جو اسے انسانی روح کے نہاں خانوں میں جھانکنے میں مدد دیتی ہے"۔

تخلیقی میدان میں خالد نے شجر سایہ دار تلے دم لئے بغیر سفر مسلسل جاری رکھا ہے۔ ان کی نظموں' غزلوں کا مجموعہ تلاش' آزاد فضائیں' تازہ ہوا کا جھونکا شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی دیگر کتابوں کے نام یہ ہیں جن میں افسانے' ترجمہ' انٹرویوز وغیرہ شامل ہیں۔ زندگی میں خلاء' چنگاریاں' ٹوٹا ہوا آدمی' امن کی دیوی' مغربی عورت' ادب اور زندگی' کالے جسموں کی ریاضت' انفرادی اور معاشرتی نفسیات' انگریزی اور پنجابی زبان میں ان کی تخلیقات اس کے علاوہ ہیں۔

عکسِ فن

ڈاکٹر خالد سہیل

پاکستان (مارشل لاء کے دور میں)

حدیثِ کربِ نہاں اب کرے بیاں کوئی
سنائے جبرِ مسلسل کی داستاں کوئی

میں کس سے شہرِ تمنا کا راستہ پوچھوں
کہ اِس ہجُوم میں پاؤں نہ ہم زباں کوئی

کسے ہے شک کہ وہ گھُٹ گھُٹ کے مر نہ جائیں گے
جو اپنے گھر میں بھی پائیں نہ رازداں کوئی

تمام شہر کو آزادیوں کی خبریں دے
قفس قفس پہ رقم کرکے آشیاں کوئی

جو بام و در پہ منقّش ہُوا ہے ذہنوں کے
وہ شہر درد کا شاید ہے بے نشاں کوئی

ہمارے بچوں کی سوچوں پہ کب سے پہرے ہیں
کہاں سے آئے گا آزاد نوجواں کوئی

شبِ حیات بڑی مختصر رہی خالدؔ
نہ ماہتاب ہی دیکھے نہ کہکشاں کوئی

عقیل دانش

ہمیں یقیں ہے کہ ہم پہ ستم تمام ہوئے
ہمارے بعد کسی پر ستم نہیں ہونگے

عقیل دانش
لندن بدھ ۱۳ر دسمبر ۱۹۹۵ء

Aqeel Danish
63, Windermere Ave
Wembley Middle Sex
LONDON, HA9 - 8QU- U.K.

عقیل دانش

(لندن)

شاعر، تنقید نگار، جرنلسٹ، براڈکاسٹر، ایجوکیشن ایکسپرٹ (ماہر تعلیم) اور اردو زبان کے احیاء و فروغ کے لئے جو لوگ سنجیدگی اور پوری توانائی سے کام کر رہے ہیں ان میں عقیل دانش کا نام بجا طور پر آتا ہے۔ سادات گھرانے سے تعلق رکھنے والے عقیل دانش ۲۵ جولائی ۱۹۴۰ء کو امروہہ ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۲ء میں اپنے گھرانے کے ساتھ کراچی آکر آباد ہو گئے یہاں چاروں طرف شاعری کی فضا پائی۔ چنانچہ چودہ پندرہ سال کی عمر سے ہی شعر کہنا شروع کر دیئے۔

۱۹۶۱ء میں گورنمنٹ کالج ناظم آباد کراچی سے اردو اور نفسیات کے مضامین کے ساتھ بی۔اے کیا۔ ۱۹۶۳ء میں کراچی یونیورسٹی سے وظیفہ پاتے ہوئے امتیازی حیثیت سے ایم اے کیا۔ انہیں "تمغہ بابائے اردو" سے بھی نوازا گیا۔ اس کے بعد فوراً ہی نیشنل ڈگری کالج کراچی میں بطور استاد مقرر ہوئے۔ جہاں سال بھر تک اردو پڑھاتے رہے۔ ۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۰ء تک گورنمنٹ کالج ناظم آباد میں اردو کے لیکچرار رہے۔ ۱۹۷۰ء میں انگلستان آگئے۔ اور کئی سالوں تک بی بی سی کی اردو سروس میں براڈکاسٹر رہے۔ اب بھی بی بی سی کے لئے جزوقتی کام کرتے ہیں۔ اسی دوران لندن یونیورسٹی کے اسکول آف اورینٹل اینڈ افریقن اسٹڈیز کے شعبہ اردو سے وابستہ ہوئے۔ پچھلے پچیس چھبیس برسوں سے یہ خدمات تاحال جاری ہیں۔ ۱۹۷۵ء میں شادی کے مقدس بندھن میں بندھے۔ ۱۹۷۸ء میں حکومت پاکستان کی جانب سے انہیں تمغہ اقبال سے نوازا گیا۔ ۱۹۸۴ء سے تاحال ارنسٹ بیول کالج میں اردو پڑھاتے ہیں۔ جبکہ گرین ہل

کالج میں اردو کے جز وقتی استاد بھی ہیں۔ ساتھ ہی دو اسکولوں کی گورننگ باڈی میں بھی گورنرز کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ دو سال تک برینٹ ایجوکیشن کمیٹی کے اعزازی ممبر بھی رہے ہیں۔ عقیل دانش اپنی بیگم کے تعاون سے اردو سیٹرڈے اسکول بہ نام "اجالا" ۱۹۸۵ء سے بہت کامیابی سے چلا رہے ہیں۔ ساتھ ہی وہ NEA کے لئے GCSE اور A Level کے امتحانات اور نصاب ترتیب دینے کا کام بھی کرتے ہیں۔ چیمبر آف کامرس کے اردو امتحانات سے بھی ان کی خدمات وابستہ ہیں اور کیمبرج یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے لئے جز وقتی کام کرتے ہیں۔ جنگ لندن میں دو سال تک ہفتہ وار کالم "رسائی دل تک" لکھتے رہے۔ اس کے ساتھ جنگ لندن سے سواسباق کا سلسلہ بہ عنوان "اردو لکھیئے اردو پڑھیئے اردو بولئے" لکھا جو یورپ بھر میں بہت مقبول ہوا۔ یہ جلد ہی کتابی شکل میں آنے والا ہے۔ انہوں نے جنگ لندن کا ادبی صفحہ بھی کچھ عرصہ تشکیل دیا ہے اور ماہنامہ "افشاں" کے نائب مدیر ہیں۔ اتنی مصروفیات کے باوجود "حلقہ فکر اقبال" اور "انجمن" کے ذریعہ اردو کی آبیاری کر رہے ہیں۔

"آپ نے شاعری کب سے شروع کی؟" اس سوال کے جواب میں بولے۔

"آنکھ کھلی تو امروہہ کی مٹی سے شعری لطف اٹھانا شروع کیا۔ چاروں جانب شاعری کی فضا پائی۔ کراچی میں بھی یہی ماحول ملا۔ فطرت میں شاعری تھی جو چودہ پندرہ سال کی عمر میں نوک قلم تک آگئی۔ عام طور سے غزل ہی کہتا ہوں پچھلے چند سالوں میں قطعات بھی لکھے ہیں۔ جنگ لندن نے بہت دنوں تک روزانہ ایک قطعہ چھاپا۔ مگر یہ سلسلہ مستقل نہیں ہے۔ کبھی کبھی خبریں سنتے ہوئے کوئی بات اس طرح کلک کر جاتی ہے اور قطعہ ہو جاتا ہے۔"

ہم نے پوچھا آپ کے نزدیک ایک اچھے شاعر کی کیا تعریف ہے؟ بولے

"شاعر کون ہے اس کا جواب وقت دیتا ہے۔ پبلک ریلیشنز میں بہت سے لوگ بہت دور دور تک اپنا نام اور شہرت پہنچا دیتے ہیں لیکن وقت سب سے بڑا مصنف ہے لہذا جب ان کا وقت ختم ہو جاتا ہے لوگ اس نام کو یاد بھی نہیں رکھتے لیکن فطری شاعر یا وہ لوگ جو باقاعدہ محنت کرتے ہیں وہ چاہے اپنے وقت میں اتنے جانے پہچانے نہ ہوں لیکن وقت انہیں یاد رکھتا ہے۔"

"لندن اور گرد و نواح کے علاقوں میں یہ صورتحال اکثر دیکھنے میں آتی ہے کہ شعراء کی تعداد سامعین سے شاید ہی کچھ کم نظر آئے.... تو کیا شاعری کرنا بہت آسان ہے.... چند الفاظ جوڑ کر کوئی بھی شاعر بن سکتا ہے؟

ہماری بات سن کر ہنسے اور کہا "بہت سی باتیں مختلف فضاؤں میں اپنی حیثیت بدل دیتی ہیں۔ حالی نے دلی کا مرثیہ لکھا۔

عقیل دانش

کردیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو
ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانہ ہرگز

اب چونکہ یہاں اردو سے تعلق رکھنے والا طبقہ محدود ہے جنہیں مشاعروں کا شوق ہے۔ ان میں سے اکثر نے شعر کہنے کی کوشش کی ہے۔ اس ماحول اور اس فضا میں لوگ انہیں برداشت بھی کرلیتے ہیں اگر ہم میں سے بہت سے لوگ بشمول میرے کراچی یا لکھنؤ جا کر پڑھنا شروع کریں تو عین ممکن ہے کہ لوگ اٹھا کر باہر پھینک دیں۔ چونکہ یہاں محدود لوگ ہیں لہٰذا سب کو سن لیتے ہیں۔ برداشت کرلیتے ہیں۔"

ہمارا اگلا سوال تھا "شاعری اب بھی بڑی حد تک گل وبلبل اور لب ورخسار میں الجھی ہوئی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟"

بولے "بڑا دلچسپ سوال ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ شاعری بنیادی طور پر انسان سے وابستہ ہے۔ انسان کا جذبہ اس کی سوچ' اس کے خواب یہ شاعری ہے پھر اردو میں بہت سے اشارے ہر شعبہ زندگی پر منطبق ہوتے ہیں چراغ ہے' پھول ہیں' کانٹے ہیں۔ اگر آپ کہنا چاہتے ہیں کہ اچھے کام کرو برائیوں سے بچو.... تو شاعر کہے گا گل ولالہ چنو کانٹوں سے بچو۔ گل وبلبل لب ورخسار اس وقت تک آتے رہیں گے جب تک انسان سے متعلق باتیں ہوتی رہیں گی۔"

"ایک شاعر کی سماجی ذمہ داری یہ ہے کہ ماحول کی باتیں کرے لیکن ہم اب بھی گل وبلبل اور رخسار وزلف میں الجھے ہوئے ہیں۔ کیا ہمیں مستقبل میں کوئی اقبال ملے گا؟

سوال سن کر بولے۔ اب تو یہ حال ہے کہ۔

ہم ہیں وہ لوگ جو بے قوم و وطن کہلائے
ہم کو جینے کے لئے کوئی حوالہ دے دو

دراصل یہاں ہندوستانی وپاکستانی سمجھتے ہیں کہ یہاں رہتے ہوئے ہم لوگ ہوا میں معلق ہیں۔ ہمارا حوالہ غائب ہوگیا ہے تو ہم کس ماحول کی بات کریں۔ دراصل غزل کے مقابلہ میں افسانہ میں یہاں کے ماحول کی بات زیادہ پیش کی جارہی ہے۔ کیونکہ غزل کا مزاج ہی ایسا ہے کہ آپ یہ کہنا چاہیں کہ پکاڈلی پہ ایک آدمی شراب پیئے الٹا پڑا ہے تو غزل تو نہیں ہوگی نا.... جہاں تک اقبال کا تعلق ہے تو انہوں نے قرآن واحادیث' تصوف وتاریخ کو شاعری میں ڈھال لیا۔ مگر آج کا شاعر مستقل حال کی باتیں کررہا ہے بلکہ میں کہوں گا کہ زندگی کی باتیں کررہا ہے۔۔

میں جو خوش ہوتا تھا پانی کی روانی دیکھ کر
کانپ اٹھتا ہوں گلی کوچوں میں پانی دیکھ کر

یہ زندگی سے مثال ہے.... دراصل وقت چالیس پچاس سال بعد بتاتا ہے کہ فلاں شاعر نے فلاں باتیں کی تھیں.... یہ الگ بات ہے کہ اس وقت یہ کام ایک ادارہ کی حیثیت سے نہیں ہو رہا مگر انفرادی طور پر کام ہو رہا ہے۔ "آج کا شاعر اگر زندگی کی باتیں بیان کر رہا ہے، تو عمل کا جذبہ کیوں نہیں ابھارتا" اس سوال پر وہ بولے۔

"نثر اور نظم میں ہزاروں لوگ کرب کا' زندگی کے کرب کا اظہار کر رہے ہیں۔ مگر بہت سے کام حکومت اور اداروں کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ جیسے منشیات کے خلاف بہت کچھ نظم و نثر میں لکھا گیا ہے جو زہر کی طرح معاشرے میں سرایت ہو رہا ہے... مگر اس کی ڈور حکومت کے ہاتھ میں ہے کہ وہ اس کی روک تھام کرے۔"

ایک سوال یہ بھی تھا کہ "آج کل کے مشاعروں میں ہماری نوجوان نسل نظر نہیں آتی' اس کی کیا وجہ ہے؟"

انہوں نے کہا کہ "ہم میں اور ہماری نسل میں زبان کے فرق کی وجہ سے ایک خلا سا آگیا ہے۔ پھر مشاعرے میں وہی آئے گا جن کو زبان سے لطف لینے کی حد تک دلچسپی ہوگی۔ دراصل نوجوان نسل کے دن رات کا زیادہ تر حصہ انگریزی زبان کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے لہٰذا ان کی سوچ انگریزی ہے۔ میں ربع صدی پہلے سے پڑھا رہا ہوں۔ ذریعہ تعلیم انگریزی ہے مگر چند گھنٹوں بعد ہی طبیعت اکتا جاتی ہے میں نے سوچا کہ وجہ کیا ہے تو اندر سے جواب آیا کہ میں سوچتا تو اردو میں ہوں پھر ترجمہ کرتا ہوں پھر اظہار کرتا ہوں تو مجھے انگریزی بولنے والے کے مقابلہ میں دوگنی محنت کرنی پڑتی ہے۔ ہمارے بچوں کے ساتھ یہی مشکل اردو زبان کے لئے ہوتی ہے.... دوسری بات یہ کہ زبان بول لینا الگ بات ہے ادبی صلاحیت کا پیدا ہونا علیحدہ اور شعر سے لطف اندوز ہونے کے لئے زبان اور ادب کی جو صلاحیت ہونی چاہئے وہ ان میں نہیں ہے۔"

"تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ کل ہمارا ادب صرف کتابوں تک محدود ہو کر رہ جائیگا؟

"بہت بڑی بات عرض کر رہا ہوں کہ یہ صورتحال نہ صرف یہاں بلکہ پاکستان و ہندوستان میں بھی جلد یا بدیر آنے والی ہے اس لئے کہ ایک صفت نے ہمارے بہت سے اداروں کو تباہ کیا ہے۔ اس وقت کون سا ایسا رسالہ ہے جو یہ دعویٰ کرے کہ وہ خالص ادبی ہے۔ ڈائجسٹوں نے ادب کی چاٹ لگا کر لوگوں کو پڑھنے پر مجبور تو کیا ہے مگر وہ بھی خالص ادبی ہونے کا دعویٰ پر نہ کتاب بیچ سکتے ہیں نہ رسالے.... یہاں پر نوجوان نسل کے حوالے سے یہ کہوں گا کہ A گریڈ میں ا، ، پاس کرنے کے باوجود نوجوان نسل کا ماحول ایسا نہیں ہے کہ انہیں اردو سے کوئی دلچسپی رہے۔ یہی بہت ہے کہ وہ تھوڑا بہت لکھ بول لیتے ہیں۔ ہماری کوشش یہی ہونی چاہئے کہ وہ اگر

اعلیٰ معیار کی اردو بول نہ پائیں تو کم از کم سمجھ ضرور لیں۔"

"اچھا ادب تخلیق کرنے والا اسے ذریعہ معاش کیوں نہیں بنا سکتا۔ یہ سسٹم ہمارے معاشرے میں کب تک چلتا رہے گا؟" اس سوال کے جواب میں انہوں نے کہا۔ "اس کی بھی کوئی امید نہیں ہے۔ ہمارے ہاں یہ روایت قائم ہی نہیں ہوئی۔ انگریزیا کسی دوسری زبان کا قلمدان اگرچہ کسی اور ذریعہ معاش سے وابستہ ہو مگر ایک ناول لکھ دیا۔ بک گیا۔ ملین ایئر بن گیا۔ ہندوپاک میں صرف ایک آدمی ہی ایسا نظر آیا ہے جس نے اس ذریعہ سے خوب پیسے کمائے۔ ۱۹۶۳ء میں ابن صفی کے پاس جیگوار کار اور ذاتی ڈرائیور تھا... جو اس زمانے میں کیا اس زمانے میں بھی کسی قلمکار کا تصور نہیں ہو سکتا۔ ہمارے ہاں ۹۹ فیصد قلمکاروں کا ذریعہ معاش ادب سے علیحدہ ہے۔"

"کیا ادب کے لئے ابلاغ ضروری ہے؟"

"بے شک ضروری ہے اس کے بغیر تو زبان کو فروغ ہی نہیں مل سکتا۔"

"آپ نے اپنی کتاب ابھی تک کیوں شائع نہیں کروائی؟"

"اس ملک میں کتاب شائع کرنے کا مطلب ہے کہ کتاب شائع کریں اور اپنے دوستوں کو پیش کر دیں۔ اگر ہمت ہوئی تو کوئی شام منالی اور لوگوں نے سو پچاس کتابیں خرید لیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ انہیں کتابوں کا شوق ہے بلکہ اس لئے کہ فلاں سے بڑے مراسم ہیں اب پانچ دس پونڈ کی کتاب کے لئے کیا منع کریں البتہ شاعر کو صرف اتنا فائدہ ہوتا ہے کہ جو کلام ادھر ادھر بکھرا ہے وہ ایک جگہ پر اکٹھا ہو جاتا ہے.... ذرا نام مل جاتا ہے مگر اسطرح کتابیں شائع کرنا کہ بار بار ایڈیشن شائع ہوں گے ناممکن نظر آتا ہے۔"

"مشاعروں میں بعض ترنم سے پڑھنے والے شعراء کے لئے لوگ شکایت کرتے ہیں کہ شعر معیاری نہ ہونے کے باوجود وہ داد سمیٹ کر لے جاتے ہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟"

"میرا تجربہ یہ ہے کہ ترنم کا اطلاق عام آدمی پر ہوتا ہے۔ اگر کسی شعر کا معیار کم ہو تو ترنم اس کا کچھ عیب ڈھانک لیتا ہے.... مگر شعر اور اچھے شعر کی پہچان رکھنے والا کسی طور پر غیر معیاری شعر سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ بہرحال اچھے شعر میں ترنم سے جان پڑ جاتی ہے۔"

عقیل دانش قدیم وجدید ادب کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں میر غالب، اقبال اور فیض سے متاثر ہیں۔ بہت سے دیگر شعراء ایسے ہیں جن کا کوئی نہ کوئی شعر دل میں ترازو ہو جاتا ہے۔

آپ نے سو اسباق کا سلسلہ "اردو لکھیے اردو پڑھیے اردو بولیے" جنگ میں لکھا تھا۔ سلسلہ کیسا رہا؟

"جی ہاں.... اور یورپ بھر میں وہ سلسلہ خاصہ مقبول ہوا تھا۔ وہ اسباق میں نے خود بچہ بن کر لکھے تھے۔ دراصل زبان بولنا اور بات ہے اور زبان پڑھانا اور چیز۔ میں تو ایک عمر تدریس سے وابستہ رہا ہوں لہٰذا میں نے بڑی باریکیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے لکھا تھا۔ اس سلسلے سے یورپ بھر سے خصوصاً ماؤں کے خطوط ملے جنہوں نے اس سلسلہ کو سراہا۔ دراصل اگر گھر کا ایک فرد بھی اردو جانتا ہو خصوصاً ماں تو اس کا مطلب ہے کہ اردو کئی نسلوں تک منتقل ہو سکتی ہے۔"

"برطانیہ میں اردو کے مستقبل کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

"وقت کا دھارا آدمی کو اپنے ساتھ بہا لے جاتا ہے..... آنے والے کل میں اردو اس انداز میں تو شاید زندہ نہ رہے مگر اردو رابطہ کی زبان ہے اور ہمارا رابطہ برصغیر سے ہے.... لہٰذا ہمارے لوگ اردو بولتے رہیں گے۔ لکھتے رہیں گے۔ پڑھتے رہیں گے۔ گو کہ ادبی انجمنیں اس سلسلہ میں بہت کام کر رہی ہیں۔ انفرادی کوششیں بھی اپنی جگہ ہیں مگر غالباً محفلوں کا یہ انداز باقی نہ رہے۔ اردو ضرور باقی رہے گی۔ بقول ظہیر کاشمیری؂

ہمیں یقیں ہے کہ ہم ہیں چراغ آخر شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے

غزل

ستم کی رات کو تاریخ کے حوالے کرو
اور اس کے بعد سے لمحے شمار کرتے رہو

زبانِ شعر کو تلوار کی صفت دے کر
لباسِ ظلم وستم تار تار کرتے رہو

کبھی کبھی تو روایت بھی لطف دیتی ہے
غزل میں تذکرۂ گلعذار کرتے رہو

عکسِ فن

حرف و صَوت سے رشتۂ زور و زر نہیں دیتا
بات صرف یہ دانش رُوح کے سکوں کی ہے

○

پاکستان

دوستوں کی تازہ دم تیغِ ستم کے باوجود
قائدِ اعظم کا یہ اِیقان مٹ سکتا نہیں

عہد ہے دانش ہمارا وقت سے، تاریخ سے
ہم تو مٹ سکتے ہیں پاکستان مٹ سکتا نہیں

○

تاج محل

شُفّاف تصّور کے سبک ساگر میں
رقاص شگفتہ سے کنول ہوتے ہیں

یہ بات الگ ٹھہری کہ تعمیر نہ ہوں
ہر ذہن میں کچھ تاج محل ہوتے ہیں

اطہر راز

چند لمحوں کی ہیں مہمان کسی کی یادیں
راز یادوں سے خیالوں کو سجاتے رہنا

(اطہر راز [illegible])

Ather Raz
21- Colwood Garden, Colliers Wood.
LONDON- SW 19 2DS U.K.

اطہر راز

(لندن)

اردو مرکز لاس اینجلس کے سالانہ مشاعرے میں شرکت کے لئے اطہر راز لندن سے تشریف لائے تھے۔ مشاعرے سے ایک روز قبل ہفت روزہ "پاکستان لنک" کے شعبہ اردو کے مدیر جناب رحمٰن صدیقی نے ان تمام مہمان شعراء کو عشایئے پر بلایا تھا۔ ازراہ محبت مجھے بھی انہوں نے مدعو کیا تھا۔ ان کی قیام گاہ پر میری ملاقات لندن کے منصور معجز، ڈاکٹر مختار الدین اور اطہر راز سے ہوئی۔ ان کے علاوہ ڈنمارک کے ترغیب بلند نقوی، ہندوستان کے والی آسی اور موج رام پوری بھی شریک تھے۔ کینیڈا کی نسیم سید کی آمد بھی متوقع تھی جنہیں اس سال یعنی ۱۹۹۵ء کی شاعری کا ایوارڈ اردو مرکز کی جانب سے ملنا تھا۔ مگر نسیم کی فلائٹ موسم کی خرابی کی وجہ سے تاخیر سے پہنچی۔ مقامی شعراء میں میرے علاوہ مجید اختر، خالد خواجہ اور نیر جہاں موجود تھے۔ میں نے تمام بیرونی مہمان شعراء کی خدمت میں سوالنامہ پیش کیا اور گزارش بھی کی کہ مجھے جلد از جلد جواب سے نوازدیں۔ ان میں صرف اطہر راز نے عملی سرگرمی دکھائی اور وعدے کے مطابق ایک ہفتے میں تعارف مع دیگر لوازمات روانہ کردیا۔ دوسرے ڈاکٹر مختار الدین تھے جنہوں نے کہا تھا کہ وہ نیویارک اپنے صاحبزادی کے پاس جارہے ہیں وہاں سے تعارف روانہ کردیں گے۔ سو انہوں نے اپنی بات نبھائی۔ تصویر چونکہ ان کے پاس موجود نہ تھی اس خط میں لکھا کہ لندن پہنچ کر بھجواؤں گا (یہ اور بات ہے کہ فروری ۹۶ء تک یہ وعدہ شاعرانہ بے نیازی کا شکار بنا ہوا ہے) یہ قصہ ہے نومبر ۹۵ء کا۔ سن ۹۶ء کا دوسرا مہینہ شروع ہوچکا ہے مگر دیگر شعراء بھی سوالنامہ کو تعویز بنائے بیٹھے ہیں۔

اطہر راز کا نام تو اطہر علی ہے۔ تخلص راز اختیار کیا۔ ۲۵ مئی ۱۹۳۵ء کو ضلع علیگڑھ ہندوستان کے شہر اترولی میں پیدا ہوئے۔ ریاضی میں بی ایس سی آنرز کیا اور اردو میں ایم اے کے علاوہ بی ایڈ کی ڈگری بھی حاصل کی ہے۔

اطہر راز

اطہر کا کہنا ہے کہ معاشرے کی خرابیوں کو منظر عام پر لانے کے لئے انہوں نے شاعری کو بہترین ذریعہ سمجھا۔ ترقی پسندانہ نظریات سے ان کی وابستگی ہے۔ ابتداء میں انہوں نے بچوں کے لئے نظمیں لکھیں۔ پھر مزاحیہ شاعری شروع کردی۔ طبیعت کے تلون نے انہیں طنزیہ شاعری کی طرف گھسیٹا۔ اب سنجیدہ نظمیں اور غزلیں کہہ رہے ہیں۔

اطہر اس خیال سے متفق نہیں کہ ادب وشاعری میں ابلاغ ہو۔ ان کا کہنا ہے ابلاغ شہرت کے لئے ضروری ہے۔ اردو زبان کے پڑھنے والے بہت کم ہیں۔ مشاعروں میں تفہیم شعر کی کمی ہوتی ہے۔

اردو کے مستقبل سے اطہر راز مایوس ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ برطانیہ میں درس وتدریس کا نظام بہت موثر ہے۔ ساتھ ہی وہ اس حقیقت کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ لندن میں پولینڈ زبان بولنے والے اور آرمینیا بولنے والے ستر اسی سال سے آباد ہیں پھر بھی وہ گھروں میں اپنی زبانوں کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے اپنے اخبارات بھی نکلتے ہیں۔ پھر اردو کے مستقبل سے مایوس ہونے کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ ہم اردو بولنے والوں کو اپنا سرمایہ زبان عزیز نہیں۔ یہ متاع چھن بھی جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ پھر واویلا کس بات کا۔

اردو ادب میں تنقیدی رویہ کا جائزہ لیتے ہوئے اطہر راز کہتے ہیں کہ ہمارے ناقدین جو کہنا چاہتے ہیں کہہ نہیں پاتے۔ ان کی تحریر میں ابہام ہے اور بے جا طوالت۔ وہ جو بھی لکھ رہے ہیں یورپی تنقید سے متاثر ہو کر لکھ رہے ہیں۔ اردو ادب میں نقاد کا ادبی رویہ بے حد مشکوک ہے ہمارے ناقدین پی آر شپ کی لعنت سے محفوظ نہیں ہیں۔ اسی وجہ سے اردو ادب غیر معیاری تنقید سے بھرا پڑا ہے۔

اطہر ایک طویل عرصے سے لکھ رہے ہیں۔ ان کی کتب کی فہرست ملاحظہ ہو۔

○ بچوں کے لئے نظموں کے مجموعے۔ ۱۔ کلی اور کرن ۲۔ لب پہ آتی ہے دعا ۳۔ شمع کی صورت ۴۔ پیارا وطن

۵۔ طنزیہ اور مزاحیہ افسانے بعنوان۔ آئینہ پیش پیش

۶۔ کلام نوٹو۔ منظوم ترجمہ — ۷۔ مرغ دل (مزاحیہ شاعری)

۸۔ خندہ بے جا (طنزیہ شاعری) — ۹۔ سایہ گل (غزلیں)

۱۰۔ لفظوں کے گلاب (منظوم اقوال) — ۱۱۔ دھوپ کا پیلا کفن (مجموعہ نظم)

۱۲۔ سفر اپنی ذات کے اندر (طویل نظم) — ۱۳۔ قابل ذکر لوگ (قطعات۔ زیر طبع)

اطہر راز

عکسِ فن

غزل

غمِ تنہائی سے بچنا ہے تو گاتے رہنا
کون دیکھے گا تمہیں شور مچاتے رہنا

آئینے کو بھی ہے تقریبِ ملاقات کا شوق
خود پہ ہنسنا ہے تو اس کو بھی ہنساتے رہنا

کچھ حسیں خواب حقیقت میں بدل جاتے ہیں
اپنے خوابوں کو تصوّر میں جگاتے رہنا

گھر کی دیواروں کو ہے حسنِ سماعت کا شعور
حال ان کو بھی اُداسی کا سناتے رہنا

شہر کے اونچے مکانوں سے بہت دُور کہیں
تم گھروندے کسی ساحل پہ بناتے رہنا

کیا خبر کوئی چلا آئے یکایک گھر میں
گھر کو کچھ تازہ گلابوں سے سجاتے رہنا

چند لمحوں کی ہیں مہمان کسی کی یادیں
رازؔ یادوں سے خیالوں کو سجاتے رہنا

سید علی طباطبائی راز

۱۰ دسمبر ۹۵ء

عزیزہ سلطانہ بی بی

جیتی رہو سلامت رہو۔ تمہارے حکم کی
تعمیل جسطرح بھی ہوا کچھ اوٹ پٹانگ
لکھ کر روانہ کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ یہ خط
بروقت آپ تک پہنچ جائیگا۔

ظاہر ہے کہ اختصار ملحوظ تھا ورنہ
لکھنے کو تو بہت کچھ تھا بقول مولانا صفی
مرحوم

سنے گا کون سُنی جائیگی صفی کس سے
تمہاری رازؔ کہانی یہ زندگی بھر کی!!

خداوند عالم تمہیں زبان و ادب کی خدمت کامیابی
اور کامرانی کے ساتھ کرنے کے مزید مواقع فراہم
فرمائے اور تمہیں درخشندہ مستقبل سے ہمکنار
کرے۔ آمین!!

دعاگو
علی طباطبائی

جھوٹی دے دے کے تسلی مجھے زندہ رکھا
لطف یہ ہے اُسی غمخوار نے مارا مجھکو

Syed Ali Tabatbaiee
1510 North, Hollydale Drive
Fullerton . CA 92631 . U.S.A.

سید محمد علی طباطبائی راز

(لاس اینجلس)

سید محمد علی طباطبائی کو کون نہیں جانتا۔ تخلص ان کا راز لکھنوی ہے مگر اتنے سچے اور کھرے ہیں کہ جو کہیں گے منہ پر کہیں گے۔ راز رکھ کر بد گوئی نہیں کریں گے۔ ان سے گفتگو کرو تو لگتا ہے کتابیں گھول کر پی لی ہیں۔ علم کے پھول جھڑتے ہیں۔ اب وقت ہے کسی کے پاس تو یہ خزانہ سمیٹ لے۔ لہجے میں طنطنہ ہے۔ ان سے شعر سنیں تو محترم سید ہاشم رضا کا لہجہ یاد آتا ہے۔ وہ بھی انہی کی طرح معلومات کا دریا بہاتے تھے۔ جب بھی بولنے اسٹیج پر کھڑے ہوتے تو پھر بہاؤ کو بند نہیں ملتا تھا۔ جی چاہے کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔

میں نے طباطبائی صاحب سے سخن ور دوم کے لئے ان کا تعارف مانگا۔ تو پہلے تو دعائیں دیں۔ "خداوند تمہیں زبان وادب کی خدمت کامیابی اور کامرانی کے ساتھ کرنے کے مزید مواقع فراہم فرمائے اور تمہیں درخشندہ مستقبل سے ہمکنار کرے۔ بی بی کہنے سننے کو تو بہت ہے۔ مگر بقول مولانا صفی مرحوم کہ۔

سنے گا کون سنی جائے گی صفی کس سے
تمہاری رام کہانی یہ زندگی بھر کی

میں نے انکے چہرے کی طرف دیکھا۔ تمکنت اور وقار کی روشنی چہرے پر بکھری ہوئی۔ آنکھوں میں اپنے سے چھوٹوں کے لئے شفقت کا نور اور فطری شوخی کی چمک۔ انکے چہرے کی نرمی اور انکے لب ولہجے کی گرمی نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا اور اکسایا کہ میں ان سے بیٹھ کر گھنٹوں باتیں کروں اور کبھی تھکن محسوس نہ کروں اور زندگی نے مہلت دی تو سخن ور سے فارغ ہونے

کے بعد تھوڑا سا وقت تو ان سے گفتگو کے لئے چھین ہی لوں گی۔

میں نے سوالنامہ سامنے رکھ کر ان کی طرف دیکھا تو مسکرا کر بولے۔ "بس اب بنے جاؤ۔ بیچ میں ٹوکنا مت۔ ۲۵ نومبر ۱۹۲۰ء کا دن تھا۔ میں لکھنؤ کی طباطبائی منزل، کٹرہ ابوتراب خان میں پیدا ہوا جس کے متعلق حضرت اثر لکھنوی نے کہا ہے۔

سقات کٹرہ کہہ کر لوگ ہم کو یاد کرتے ہیں
سند خود لکھنؤ میں بھی تھا معیار زباں اپنا

میں نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ بسم اللہ کلام پاک کی تلاوت سے ہوئی۔ خدا جنت نصیب کرے میرے مولوی صاحب کو جو مجھے بڑی محنت اور شفقت سے پڑھاتے تھے۔ گورنمنٹ جوبلی کالج سے انٹرمیڈیٹ اور لکھنؤ یونیورسٹی سے بی۔اے آنرز اور ایم۔اے لٹریچر میں کیا۔ یہ بات ہے ۱۹۴۰۔۴۱ء کی۔ انڈین پولیس سروس کے امتحان کے سلسلے میں صوبہ یو۔پی سے ہم صرف تین لوگ سلیکٹ ہوئے۔ ایک میں۔ ایک میرے نہایت ہی عزیز دوست محمود سلیمان (سر محمد سلیمان کے صاحبزادے) اور تیسرے میرے برادر عزیز امداد حسین جو بعد میں سندھ کے آئی جی پولیس بھی رہے۔ میں بہ سبب علالت فیڈرل پبلک امتحان میں شریک نہ ہو سکا۔ لہٰذا کچھ عرصے بعد فوج کا رخ کیا۔ حالانکہ خاندان بھر میں کبھی کسی نے سول سروس یا زمینداری کی نگہداشت کے علاوہ فوج کی ملازمت کرنا کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ چنانچہ ۱۹۴۳ء میں انڈین ملٹری اکیڈمی ڈیرہ دون سے کمیشن حاصل کیا اور سیکنڈ لیفٹیننٹ بن گئے۔ برصغیر کی تقسیم جب ہوئی تو میں نے پاکستان کے لئے آپٹ کیا اور اسکیم سی کراس کے تحت بمبئی سے اس ارض پاک تک پہنچ گیا جس کی عرصے سے مجھے تمنا تھی۔ جو کہ کچھ عرصہ پہلے ایک شاعر کا خواب اور ایک قومی لیڈر کی ضد تصور کی جاتی تھی۔ اس وقت میں کیپٹن تھا۔ جنوری ۴۸ء میں بذریعہ ہوائی جہاز ایک بار پھر لکھنؤ گیا اور لکھنؤ سے لاہور تک ایک اسپیشل ٹرین لایا جس کی کمانڈ جی۔او۔سی یو پی ایریا جنرل سے اس شرط پر حاصل کی کہ ٹرین کی حفاظت کے لئے مجھے حفاظتی دستہ وہ دیا جائے جو خالصتاً" مسلمان سردار صاحبان اور جوانوں پر مشتمل ہے۔ شکر ہے اس معبود کا کہ میری یہ کوشش کامیاب رہی۔ گو مشرقی پنجاب سے گزرنے میں کئی خدشات درپیش ہوئے مگر ہم ٹرین لے کر بخیر و خوبی لاہور پہنچ گئے۔ اور دو ہزار سے زیادہ پاکستانیوں نے پاکستان زندہ باد کیپٹن طباطبائی زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگائے اور کیوں نہ لگاتے اس لئے کہ یہ ٹرین جب لکھنؤ سے چلی تھی تو اس وقت صرف نو سو مسافروں پر مشتمل تھی مگر میرا حکم تھا کہ راستے میں جو بھی پاکستان کا عاشق ملے اسے بٹھاتے جاؤ چنانچہ جب ہم لاہور پہنچے تو دو ہزار سے زیادہ مرد اور

عورتوں نے ارض پاک کو بوسہ دیا اس کی مٹی کو چوما اور آنکھوں سے لگایا۔

اگر پاکستان فوج میں اپنی پوری ملازمت جو ۳۱ سال سے بھی زیادہ عرصے پر محیط ہے اس کی مختصر سی تفصیل بھی تحریر کروں تو سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے۔ مختصراً اتنا کہنا کافی ہے کہ اس معبود کے فضل و کرم سے تمام ملازمت انتہائی خوش اسلوبی اور باعزت طریقے سے کی۔ تین بار ملک سے باہر جانے کے مواقع حاصل ہوئے۔ یہ بڑا طرۂ امتیاز تھا۔ انگلینڈ اور امریکہ کی فوجی تنصیبات میں کورسز کئے۔ ۱۹۶۰ء میں حکومت پاکستان نے پہلی بار یونائیٹڈ نیشنز کی امن فوج میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ پاکستان فوج کے اس پہلے دستے یعنی کانٹنجنٹ میں میں نے ایک میجر کی حیثیت سے ایک سال سے زیادہ کانگو میں جو وسطی افریقہ کا بڑا ملک ہے 'یو۔این۔او کی امن فوج کے ساتھ گزارا۔ ۳۱ سال کی طویل مدت میں جنرل ٹکا خان تک جتنے بھی کمانڈرز انچیف گزرے ان کا زمانہ دیکھا۔ زیادہ تر جنرل ہیڈ کوارٹرز راولپنڈی میں قیام رہا۔ اور ۷۴ء میں پانچ سال تک بریگیڈیئر کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد ریٹائرڈ ہوا۔ اسی دوران جنرل ٹکا خان صاحب نے فرمایا کہ پاکستان اٹامک انرجی کمیشن میں ایڈوائزر لگ جاؤ۔ تو تقریباً دو سال تک ایڈوائزر رہا۔ پھر کراچی میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہر انسان پر تین عناصر کا بے انتہا اثر پڑتا ہے اور پیدائش کے بعد جلد شروع ہوجاتا ہے۔ اول خون (آج کل کی اصطلاح میں جینز کہہ لیجئے) دوم تربیت اور سوم ماحول۔ میری خوش قسمتی کہ اس معبود نے مجھے ایسے خاندان میں پیدا کیا جہاں دینی اور دنیوی تعلیم' حسن کردار' حسن اخلاق' ادب اور تہذیب کے بڑے بڑے قد آور مینار ضوفشاں تھے۔ یہ تھے میرے والدین اور میرے دیگر بزرگ خاص طور پر میرے چچا اور بعد میں میرے خسر محترم حضرت اثر لکھنوی۔ میرے برادران بزرگ احسن سروش اور باقر طباطبائی ان سب نے قدم قدم پر میری رہنمائی فرمائی۔ ان ہی کی صحبت اور شفقت کا فیض تھا کہ زبان ادب اور شاعری نے خواہ وہ اردو' انگریزی یا فارسی کی ہو مجھے طالب علمی کے زمانے سے اپنا گرویدہ بنالیا۔ پھر سونے پر سہاگہ یہ کہ لکھنؤ میں شعروسخن کی محفلیں اور مشاعرے بکثرت ہوتے تھے۔ لہٰذا ہم نے بھی تک بندی شروع کردی۔ الٹے سیدھے مصرعے اور موزوں ناموزوں اشعار نظم کرنے کی سعی رائیگاں کرتا جن کی تصحیح بڑے بھائی کردیتے اور مشاعروں میں مجھے باصرار ترنم سے پڑھواتے۔ بہرحال میری یہ "تک بندی" آخرکار یوں رنگ لائی کہ والد مرحوم کو خبر ہوگئی۔ میری پیشی ہوئی والد صاحب نے فرمایا کہ میں نے تمہارے کسی بڑے بھائی کو شاعری کرنے کی اجازت اس وقت تک نہیں دی تھی جب تک کہ وہ بی۔اے پاس نہ کرچکے ہوں۔ آپ نے تو

ابھی میٹرک بھی نہیں کیا ہے۔ اس دن سے میری توبہ۔ میں نے عہد کرلیا کہ نہ شاعری نہ تک بندی سب کچھ ختم!! شعرگوئی نہ سہی سخن فہمی سہی۔ شعروادب سے تعلق اور شوق قائم ہی نہیں رہا بلکہ بڑھتا ہی گیا۔ فوج کی ملازمت رخنہ انداز ضرور ہوئی مگر چور چوری سے گیا تو کیا ہیرا پھیری سے بھی گیا۔ چنانچہ یہ بھی میری خوش قسمتی کہ جب بھی حضرت اثر ہم لوگوں سے ملنے کے لئے لاہور یا راولپنڈی تشریف لائے تو میرا غریب خانہ چمنستان شعروادب بن جاتا۔ جناب حفیظ جالندھری، چراغ حسن حسرت، مولانا عبدالملک سالک، عابد علی عابد، فیض احمد فیض، امتیاز علی تاج، احسان دانش، جنرل شفیق الرحمن، ضمیر جعفری، شوکت تھانوی اور دیگر شعراء و شائقین شعروادب بزم کی رونق بنتے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد شعروسخن کی وہ چنگاری جو ایک مدت سے میرے سینے میں دبی ہوئی تھی لو دے اٹھی اور مشق سخن ہوتی رہی۔ مشاعروں میں شرکت سے اجتناب کرتا مگر اپنے اطمینان اور تسلی کی خاطر کبھی جناب جمیل جالبی، کبھی رئیس امروہوی مرحوم کبھی پروفیسر کرار حسین ایسے کرم فرماؤں کو بہ نظر اصلاح کلام سناتا۔ اپنے مشفق، مشفق خواجہ سے جب بھی ملاقات ہوتی تو ایک آدھ غزل انہیں ضرور سناتا۔ شعبہ طباعت سے ناواقفیت کی بناء پر میں نے حضرت اثر لکھنوی جن کا میں قانونی وارث ہوں، ان کا سارا کلام اور دیگر تصنیفات جن کی فہرست بہت طویل ہے۔ مشفق بھائی کے سپرد کردی ہیں تاکہ وہ شائع کروائیں۔ خدا کرے کہ وہ اس مقصد میں کامیاب ہوں۔ تو مختصراً یہ تھے شاعری اور شاعری سے وابستگی کے کچھ محرکات۔

آپ کے چوتھے، پانچویں اور چھٹے سوالات کے جوابات فردا" فردا" یا مجموعی طور پر بے انتہا اہم اور اتنے وضاحت طلب ہیں کہ صفحے کے صفحے لیپ ڈالئے پھر بھی سیری نہ ہو۔ مشکل یہ ہے کہ زمانہ اتنی تیزی سے بدلا۔ قدریں بدلیں۔ خیالات بدلے۔ لوگ بدلے۔

جہالت علم پر غالب آگئی۔ وہ خاندان وہ گھرانے جو کبھی تہذیب، اخلاق، زبان ادب کے گہوارے تھے رفتہ رفتہ سب کچھ بھلا بیٹھے۔ جڑیں کھوکھلی ہوگئیں۔ اب نہ کسی کو وطن سے محبت ہے نہ اپنی قومی زبان اردو سے باایں ہمہ وہ لوگ جو اتنے متعصب ہوچکے ہیں جن کی رگوں میں صوبائی تعصب اتنا پیوست ہوچکا ہے کہ وہ اب کھلم کھلا اعلان فرمارہے ہیں کہ وہ صوبائی زبان کو قومی زبان پر ترجیح دیتے ہیں تو پھر کہاں کی قومی زبان اردو کہاں کا ادب اور کہاں کی شاعری۔ چو کفر از کعبہ برخیزد...... اب انشاء اللہ پھر کبھی ان موضوعات پر قلم اٹھانے کی کوشش کروں گا۔ یہ مرض اتنا مہلک بھی نہیں ہے کہ لاعلاج سمجھا جائے۔ یہ سب کچھ تو ازماست کہ برماست! ہے۔

علی طباطبائی راز لکھنوی

عکسِ فن

جمالِ ہم نشیں

ہجومِ عاشقاں میں ڈھونڈتا پھرتا رہا برسوں
مگر تجھ کو نہ مجھ سا ایک بھی عاشق نظر آیا

گماں مجھ کو ہُوا، میں عاشقِ صادق نہیں ورنہ
کوئی تو ہم نفس، ہمراز، ہم آواز مل جاتا

اسی الجھن میں سرگرداں چلا میں جانبِ صحرا
شجر کے سائے میں دیکھا تو اک انسان سوتا تھا

مخاطب جب کیا میں نے تو وہ آرام سے اُٹھا
رِدا رخ سے ہٹی دیکھا تو وہ انسان میں خود تھا

مرے اشعار میں گر رازؔ کی باتیں نظر آئیں
تو سمجھو فیض ہے یہ شاعر مشرق کے شعروں کا

محمد ممتاز راشد

قطعہ

عظمتوں کا نشان ہوتے تھے
غیرتوں کا جہان ہوتے تھے
اتنی پستی میں گر گئے کیسے
آپ تو آسمان ہوتے تھے

محمد ممتاز راشد
۴/۷/۱۹۹۵ء

Mohd Mumtaz Rashid
P.O Box 41
DOHA - QATAR (A.G.)

محمد ممتاز راشد

(دوحہ قطر)

شجر کے واسطے ممکن نہیں ہے
کسی پر دھوپ میں سایہ نہ کرنا

اور

بلندی کا تصور مٹ نہ جائے
کسی کم ظرف کو اونچا نہ کرنا

یہ اشعار محمد ممتاز راشد کی فکر کی پوری تصویر سامنے لے آتے ہیں۔ جو لوگ راشد سے ملے ہیں وہ تو جانتے ہیں کہ راشد کا زاویہ نظر نیا بھی ہے اور سچا بھی لیکن جو نہیں ملے وہ انہیں ان کے کلام کے ذریعے پہچان جاتے ہیں کہ شاعر جھکنے والا بھی نہیں اور ٹوٹنے والا بھی نہیں۔

دوحہ قطر میں کم و بیش اٹھارہ سال سے مقیم راشد نے صحرا کے ریگزار میں بھی اپنی فکر کے پھول کھلائے ہیں اور وہاں کی مٹی کو زرخیز بنانے کے لئے قطر کی نہ صرف "بزم اردو" کے پودے کی آبیاری میں حصہ لیا بلکہ لاہور کے سہ ماہی "خیال و فن" کو بحیثیت مدیر اعلیٰ مشرق وسطیٰ میں بھی متعارف کرایا ہے۔

یوں تو راشد ۲۵ نومبر ۱۹۵۳ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۹ء میں باغبان پورہ لاہور سے میٹرک کیا۔ ۱۹۷۱ء میں پاک جرمن ٹیکنیکل سینٹر مغل پورہ لاہور سے دو سالہ کورس کر کے مکینیکل ڈرافٹسمین کا ڈپلومہ لیا۔ ۱۹۷۷ء میں قطر آگئے اور ۱۹۷۹ء سے اب تک حکومت قطر کی وزارت برق و آب سے وابستہ ہیں۔ یہاں آکر بھی خالی نہیں بیٹھے۔ ابتدائی عربی زبان کا چار

سالہ کورس کیا۔ ۱۹۸۷ء میں قطر سے پرائیوٹ انٹر کیا اور پھر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد سے "زبان و ادب گروپ" میں ۱۹۸۹ء میں گریجویشن کیا۔

شاعری کے علاوہ راشد نے افسانے انشائیے کے میدان میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور کئی علمی ادبی تحقیق مضامین لکھے ہیں۔ سفرنامے اور مزاحیہ مضامین اس کے علاوہ ہیں۔ ادبی و ثقافتی تقریبات کی رپورٹنگ بھی کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ شاعری کو تبلیغ یا پروپیگنڈے کا انداز نہیں دینا چاہئے لیکن شاعری میں بے شک کوئی نکتہ نظر ضرور ہونا چاہئے۔ اس ضمن میں ندیم کے اس شعر کا حوالہ دیتے ہیں۔

ابھی تکمیل کو پہنچا نہیں ذہنوں کا گداز
ابھی انساں کو ضرورت ہے غزل خوانوں کی

ادبی کتب و رسائل کی عدم پذیرائی کے سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ میڈیا کے دیگر تفریحی ذرائع نے کتابوں اور رسائل کو پیچھے دھکیل دیا ہے۔ لوگ پڑھنے سے زیادہ وژن پسند کرتے ہیں۔ ٹی وی اور ویڈیو نے ہر گھر میں اپنا مقام بنالیا ہے۔ اب کتابوں اور رسائل کا مقام بنانے کے لئے سائنسی بنیادوں پر کام کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ انفرادی کوششوں کے ساتھ ساتھ اجتماعی کوششیں اور کاوشیں ضروری ہیں جو ایثار، خلوص اور انتھک محنت کے بغیر کامیاب نہ ہوں گی۔

راشد بعض تنقید نگاروں کی اس بات سے متفق نہیں کہ آج کا ادب بے معنی ہوتا جارہا ہے اور لفظ دل میں نہیں اترتے۔ ایسا بھی نہیں کہ زندگی کسی اور سمت جارہی ہے اور ادب کسی اور سمت۔ اس طرح کے خیالات کا اظہار لوگ فیشن کے طور پر بھی کردیتے ہیں اور بغیر تحقیق و تنقید کے بھی۔ اردو ادب کا تعلق ہمارے اطراف کی زندگی سے پوری طرح قائم ہے۔ ادب کا رشتہ ہماری سماجی زندگی سے اس طرح جڑا ہوا ہے جس طرح دیگر کئی روایات کا رشتہ قائم ہے۔ زندگی میں نئی تبدیلیاں ایک فطری امر ہیں۔ ادب ان تبدیلیوں کا گہرا جائزہ لے رہا ہے چنانچہ آج کا ادب زندگی کے دھاروں سے قطعاً "کٹا ہوا نہیں ہے اور یہ کہنا کہ ادب میں نیا پن نظر نہیں آتا ایک رٹی رٹائی بات ہے۔ ویسے بھی بات بات پر نیا پن ڈھونڈنے کا جنون اچھا نہیں۔ یہ ایک سطحی انداز فکر ہے کہ ادب میں چبائے ہوئے لقمے اگلے جارہے ہیں۔ حالانکہ آج بہت سے نئے زاویوں سے بات ہورہی ہے۔ نئے قلم کاروں نے بہت سے پرانے موضوعات کو بھی نیا پن دیا ہے۔ مثال کے طور پر میں کہوں گا کہ میر تقی میر نے کہا تھا۔

نازکی اس کے لب کی کیا کہئے
پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے

اسی بات کو آج کے دور کے شاعر احمد نثار جونپوری نے اس طرح آگے بڑھایا ہے۔

بنا چکا تری تقدیر تو خیال آیا
ترے لبوں کے قریب تتلیاں ضروری تھیں

راشد کہتے ہیں کہ کسی بھی زبان میں بڑا شاعر روز روز جنم نہیں لیتا۔ آج بھی اس صدی میں اردو میں ایسے کئی شاعر ہیں جو اپنی ذات کے حوالے سے بھرپور انداز میں دور حاضر کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں وسیع تجربات اور مثبت فکر کی بھرپور ترجمانی موجود ہے۔ ان شعراء میں احمد ندیم قاسمی، پیرزادہ قاسم اور صہبا اختر کا نام نمایاں ہے۔ ایسے کئی شعراء آج بھی موجود ہیں جن کے کلام کی جڑیں دور تک ہماری زمین میں پیوست ہیں۔

راشد نے چونکہ طنز و مزاح کے ذیل میں نثری اور شعری دونوں میدانوں میں طبع آزمائی کی ہے لہٰذا یہ اس بات سے متفق ہیں کہ اپنی تحریروں میں اپنا مذاق اڑانے والے ہی طنز کا بہتر ہنر جانتے ہیں۔

راشد کی تخلیقات یہ ہیں :

۱۔ صحرا کی ٹھنڈی شامیں ۱۹۸۱ء (تذکرہ شعرائے کرام)
۲۔ کاوش ۱۹۸۶ء (مجموعہ غزلیات)
۳۔ عقیدت خام ۱۹۸۸ء (مجموعہ حمد و نعت)
۴۔ تری خوشبو سے دل مہکتا ہے ۱۹۹۴ء (قطعات کا مجموعہ)
۵۔ سخن ریزے (اشعار کا مجموعہ)
۶۔ ہم ہیں اپنے مزاج کے بندے زیر طبع (قطعات کا مجموعہ)

محمد ممتاز راشد

عکسِ فن

غزل

جسے چاہو، اسے رسوا نہ کرنا
ستم کرنا، مگر ایسا نہ کرنا

نوازا ہے مجھے اشکوں سے تم نے
مگر دیکھو انہیں دریا نہ کرنا

بڑی خوش فہمیوں میں مبتلا ہوں
مرے خدشات کو سچا نہ کرنا

مرا ہونا نہ ہونا ایک سا ہے
میں سایہ ہوں مرا پیچھا نہ کرنا

شجر کے واسطے ممکن نہیں ہے
کسی پر دھوپ میں سایہ نہ کرنا

اگر لکھنا تو لکھنا حرف روشن
یونہی اوراق کو کالا نہ کرنا

بلندی کا تصور مٹ نہ جائے
کسی کم ظرف کو اونچا نہ کرنا

گنوانا اجر کی دولت نہ راشد
کرو نیکی تو پھر چرچا نہ کرنا

○

دل و نظر کو غموں سے نڈھال رکھتے ہیں
یہ آپ خوب ہمارا خیال رکھتے ہیں

یہ اور بات کبھی پوچھتے نہیں ان سے
ہم اپنے دل میں ہزاروں سوال رکھتے ہیں

راہی شہابی

جب لوگ سرِ راہِ ادب آئینگے گزر ہم
کچھ نقشِ قدم اُن کو ہمارے بھی ملینگے

راہی شہابی

Rahi Shhabi
23.A Shive Shakti Colony
Malvia Nager Jaipur 302017 INDIA

راہی شہابی

(جے پور بھارت)

میں نے اپریل ۱۹۹۲ء کے "شمع دہلی" میں راہی شہابی کی نظم "تاریخ کی آواز" پڑھی۔ نظم میرے دل میں اتری ہی نہیں محفوظ ہوگئی اس کے یہ بند ملاحظہ ہوں۔

وہ کہتی ہے کہ جن کے تن پہ بوسیدہ عبائیں تھیں
انہوں نے دھجیاں کی تھیں قبائیں بادشاہوں کی
اور ان کے نام کی ہیبت یہ تھی کہ ان کے قدموں پر
کلاہیں کپکپا کر گر پڑی تھیں کج کلاہوں کی

ترے ماضی کی وہ شمعیں جنہیں تو نے بجھا ڈالا
لیا کرتی تھیں پالا آندھیوں کے تیز جھونکوں سے
ترے ماضی کی وہ تاریخ، جس کو تو بھلا بیٹھا
ترے اسلاف نے لکھی تھی شمشیروں کی نوکوں سے

دسمبر ۱۹۹۳ء کے شمع میں ان کی نظم فتح مکہ کے وقت میری نظر سے گزری۔ اس نظم نے میرا دل موہ لیا۔ آسان اور سادہ زبان۔ فکر کی گہرائی و گیرائی جیسے تاریخ کے وہ سارے کردار میرے سامنے ہوں اور میں حیرت سے وہ اعلان سن رہی ہوں۔ پھر جب میں نے سخن ور حصہ دوم کے لئے

راہی شہابی

شعراء سے رابطے کئے تو میں راہی شہابی کو نہیں بھولی۔ میں نے انہیں جون ۹۵ء میں خط لکھا مگر جواب ندارد.... میں بھی چپ..... وہ بھی چپ اور پھر ایک دن اچانک راہی شہابی آن دھمکے۔ بڑے طمطراق سے۔ میں نے پوچھا۔ ''آپ کا نام؟'' تو بولے ''کنور نفاست علی خان''
''وہ تو چہرے مہرے سے ظاہر ہے مگر'' میں نے کہنا چاہا تو انہوں نے کہا۔ ''آپ مجھے راہی شہابی کے نام سے جانتی ہیں۔ میں جے پور (ہندوستان) جو گلابی شہر کے نام سے مشہور ہے وہاں کا رہنے والا ہوں۔ لیکن میری پیدائش ضلع بلند شہر (یوپی) کی ہے''۔ انہوں نے اپنا مکمل تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''چلئے اب سوالنامہ سامنے رکھتے ہیں تاکہ سخن ور کے قارئین کے لئے آپ سے کچھ ادب اور شاعری پر بھی گفتگو ہو جائے۔'' میرا سوالنامہ ان کے سامنے تھا اور وہ کہہ رہے تھے۔

''میں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں بی اے تک تعلیم حاصل کی۔ روزنامہ نئی دنیا' دہلی روزنامہ پیغام کانپور اور ہفت روزہ آواز وطن' کانپور میں کام کیا ۱۹۶۵ء میں سرکاری ملازمت اختیار کی ۹۲ء میں ڈپٹی ڈائریکٹر پبلک ریلیشن کی پوسٹ سے ریٹائر ہوا۔ دوران ملازمت ڈیپوٹیشن پر ۱۸ سال تک راجستھان کے پانچ وزرائے اعلیٰ کا پریس سیکریٹری رہا ریٹائرمنٹ کے بعد حکومت نے راجستھان اردو اکادمی کا سیکریٹری مقرر کر دیا آج کل اسی پوسٹ پر خدمات انجام دے رہا ہوں۔

علی گڑھ میں بربنائے تعلیم کانپور دہلی اور جے پور میں ملازمت کے سبب میرا قیام رہا۔ مشاعروں میں شرکت کی بنا پر مجھے ہندوستان کے گوشے گوشے میں جانے کا موقعہ ملا۔ ہندوستان کے علاوہ نیپال اور پاکستان کے مشاعروں میں بھی شریک ہوا لندن' آسٹریلیا' امریکہ' کویت' شارجہ اور دوبئی سے بھی مشاعروں کے دعوت نامے موصول ہوئے مگر چونکہ میں ہوائی جہاز میں سفر نہیں کرتا اس لئے ان ملکوں میں جانا نہیں ہوا۔

شاعری کے علاوہ نثر نگاری میرا محبوب مشغلہ رہی ہے میرے متعدد نثری مضامین اخبارات میں شائع ریڈیو سے براڈ کاسٹ اور ٹیلی ویژن سے ٹیلی کاسٹ ہو چکے ہیں۔ میری نثری کتاب ''نغموں کے شعلے'' بھی شائع ہو چکی ہے۔ اختر شیرانی مرحوم پر میرا طویل فیچر ''اے عشق کہیں لے چل مجاز مرحوم پر میرا مضمون ''شاعر شہر نگاراں'' جگر مراد آبادی مرحوم پر ''مدتوں یاد کریں گے جام و پیمانہ تجھے'' ردش صدیقی مرحوم پر ''اک دیدہ ور کی موت ہے سارے چمن کی موت'' اور ''جنگ آزادی میں اردو ادب کاروں کا حصہ'' ملک میں مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔

میری خوش قسمتی ہے کہ ہوش سنبھالنے پر گھر میں ادبی ماحول ملا۔ میرے والد حضرت شہاب رنی مرحوم ملک کے بلند پایہ ڈرامہ نگار' افسانہ نگار' مضمون نگار اور صحافی تھے ان کے فیضان توجہ

سے میرے ادبی ذوق پر نکھار آیا میں شعر اس وقت ہی کہہ پاتا ہوں جب دلی واردات سے گزرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ شاعری آفاقی اور عالمگیری کیفیات کی آئینہ دار ہوا کرتی ہے شاعری کی وسعتیں لامحدود ہوتی ہیں شاعری کو کسی مخصوص فکر یا نظریے سے وابستہ کر دینا بحرِ بے کراں کو موج کم آب میں تبدیل کر دینے کی برابر ہے اس لئے میں نے اپنی شاعری کو کسی خاص نظریے کا ترجمان نہیں بنایا میری تخلیقات ماہنامہ بیسویں صدی دہلی، شمع دہلی، تحریک دہلی، جام نو کراچی اور نیرنگ خیال راولپنڈی وغیرہ میں شائع ہوتی رہی ہیں کافی عرصہ قبل میری قومی نظموں کا مجموعہ ''میرا وطن'' شائع ہوا تھا اب میرا مجموعۂ کلام ''ایک لمحہ'' کے نام سے زیر اشاعت ہے انشاء اللہ سال رواں کے اختتام تک منظرِ عام پر آجائے گا میری ایک طویل نظم ''کاروان آزادی'' کتابی صورت میں شائع ہو چکی ہے۔

میرے خیال میں آسان اسلوب بھی دل کشی رکھتا ہے اور ابلاغ میں بھی کشش موجود ہے ادب اور شاعری کے لئے یہ دونوں ہی ضروری ہیں جو کام آسان زبان سے لیا جاسکتا ہے وہ ابلاغ سے نہیں لیا جاسکتا اور جو کام ابلاغ سے پایہ تکمیل کو پہنچایا جاسکتا ہے وہ آسان زبان سے نہیں پہنچایا جاسکتا۔ مثال کے طور پر اس شعر میں جو بات آسان زبان میں کہی گئی ہے اس کے لئے ابلاغ کی قطعی ضرورت نہیں۔

وہ مجھ سے کہہ رہے ہیں کہا مان جائیے
اللہ تیری شان کے قربان جائیے

لیکن غالب نے دہلی کی تباہی پر اپنے قطعہ میں جو سخت زبان استعمال کی ہے وہی اس کا حسن ہے اگر غالب نے سہل زبان استعمال کی ہوتی تو مرثیہ پھیکا بے کیف اور بے اثر ہو کر رہ جاتا ذرا دیکھئے مشکل تراکیب کیا تاثر پیدا کر رہی ہیں۔

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہے
ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے
یا صبحدم جو دیکھئے آکر تو بزم میں

راہی شہابی

نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغ فراق محبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

میں مانتا ہوں کہ بے شک تنقید ادب اور شاعری کے لئے نئی راہیں ہموار کرتی ہے تنقیدی محفلیں ضرور منعقد ہوتی رہنی چاہیں' شاعروں اور ادیبوں کا شعور نکھرے گا اور ان میں اپنے معائب اور محاسن پرکھنے کا سلیقہ پیدا ہوگا"۔

ادبی کتب اور رسائل کے سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ "ادب مجموعی اعتبار سے اس وقت مائل بہ زوال ہے اسی لئے ادبی رسائل اور ادبی کتب کی پزیرائی ختم ہورہی ہے پہلے زمانے میں مشاہیر کی صحبتوں اور مطالعے سے ذہنوں کی نشونما ہوا کرتی تھی آج بے ہودہ لچر گھٹیا فلمی رسالوں سے ذہنوں کی تعمیر ہوتی ہے۔ معاشرے کو بدلنا ہوگا ذہنوں اور مذاق سخن کو تبدیل کرنا پڑے گا تب اس مسئلے کا کوئی حل نکلے گا اور جہاں تک اردو زبان کا سوال ہے۔ اردو صرف امریکہ ہی میں نہیں اگر بہی خواہان اردو کی بے حسی ختم نہ ہوئی تو مستقبل میں اردو کئی ملکوں میں ختم ہوجائے گی۔

اب اردو کی بقا کا انحصار ان پر ہے جو خود کو اردو کا جاں نثار' پرستار اور وفادار کہتے ہیں وہ اگر اپنی ذمہ داری نباہنا شروع کردیں گے تو اردو کا مستقبل روشن ہوجائے گا وہ اگر صالح ادب تخلیق کریں گے اور اپنی نئی نسلوں کو اردو کی تعلیم سے بہرہ ور ہونے کا موقع دیں گے تو صورت حال یقیناً تبدیل ہوجائے گی"۔

راہی کہتے ہیں کہ اردو شاعری نے ہمیشہ ایسا ادب تخلیق کیا ہے جس میں زندگی اپنی تمام تر رعنائیوں کے ساتھ جھلکتی نظر آتی ہے اور اگر اردو شاعری ایسا ادب تخلیق کرتی جو زندگی کی حقیقتوں سے محروم ہوتا تو چار سو برس کا سفر طے نہیں کرسکتی تھی کچھ ہی دنوں میں ختم ہوجاتی۔ ذات کے حوالے سے روح عصر کی عکاسی اردو شاعر ماضی میں بھی کرتا رہا ہے اور آج بھی کررہا ہے۔ماضی میں غالب نے کہا تھا۔

لکھتے رہے جنوں کی حکایات خونچکاں
ہرچند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

دور حاضر میں فیض احمد فیض نے کہا۔

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبولی ہیں انگلیاں میں نے

راہی شہابی

عکسِ فن

دمِ آخر

بجھ گئی آگ، دھواں بھی نہیں باقی لیکن
آج بھی چند شرارے سے اڑا کرتے ہیں

آج بھی آپ کی یادوں کے بھٹکتے سائے
دلِ برباد کی وادی میں پھرا کرتے ہیں

دلِ برباد کبھی مجھ کو یہ سمجھاتا ہے
جو بھی اب تجھ پہ گزرتی ہے، گزر جانے دے

جب بہاریں ہی نہیں ہیں تو نشیمن کیسا
اب یہ تنکے جو بکھرتے ہیں بکھر جانے دے

○

سید شمیم رجز

بس اب رجز میں ہے اک ہنر کہ ہے نام تیرا زباں پر
نہ فہیم ہے نہ عقیل ہے نہ شعور ہے نہ کمال ہے

بندۂ بے غرض
سید شمیم رجز
۵ نومبر ۱۹۹۵

Syed Shamim Rajes
1011 Cran Brook Ave Torrance
CA 90003 - U.S.A.

سید شمیم رجز

(لاس اینجلس)

سید شمیم رجز کا نام سید نجم الحسن رضوی ہے۔ پہلے شمیم تخلص کرتے تھے۔ پھر استاد محترم حضرت مہذب لکھنوی اعلیٰ اللہ مقامہ صاحب مہذب اللغات کے اصرار پر تخلص تبدیل کر لیا کیوں کہ امروہہ کے ایک مشہور شاعر کا تخلص بھی شمیم ہے لہٰذا اب رجز تخلص کرتے ہیں۔

اپریل ۱۹۲۰ء میں محمد پور ضلع کانپور یوپی ہندوستان میں پیدا ہونے والے شمیم نے ابتدائی تعلیم محمد پور میں حاصل کی۔ ۱۹۴۳ء میں شیعہ کالج لکھنؤ سے انٹر سائنس کا امتحان پاس کیا۔ سٹی کالج حیدر آباد سندھ سے بی۔ اے آنرز اور ۱۹۵۷ء میں پنجاب یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔ اے کیا۔

سرکاری ملازمت ۱۹۴۴ء سے شروع کی۔ ۱۹۸۲ء میں ریٹائر ہوئے۔ آج لاس اینجلس میں اپنے بڑے صاحبزادے سید حیدر شکوہ رضوی کے ساتھ مقیم ہیں۔ حیدر شکوہ کمپیوٹر انجینئر ہیں۔

شمیم رجز صاحب نے بتایا کہ چونکہ شیعہ ماحول میں پرورش پائی اس لئے شاعری کی ابتدا نوحوں سے ہوئی۔ جب آٹھویں جماعت میں تھے اس وقت پہلا مجموعہ "دریائے غم" کے نام سے شائع ہوا۔ دسویں جماعت میں تھے تب نوحوں کا دوسرا مجموعہ "محافظ اسلام" کے نام سے اور پھر دو سو بند کا اک مرثیہ "گلستان فاطمہ" کے نام سے شائع ہوا۔

۱۹۵۲ء سے قرآن حکیم کو منظوم کرنا شروع کیا۔ اور ۱۹۸۲ء میں "آب رواں" کے نام سے اسے پانچ جلدوں میں شائع کیا۔ اس کی ہر میں جلد چھ پارے ہیں۔ امریکہ آنے کے بعد "نہج البلاغہ" کا منظوم ترجمہ کیا۔ اس کے تین حصے ہیں۔ پہلا حصہ "نقش جاوداں" کے نام سے شائع

ہو چکا ہے۔ دو حصوں کی اشاعت ابھی باقی ہے۔ آج کل متفق علیہ احادیث پاک کا منظوم ترجمہ کر رہے ہیں۔ پانچ پانچ سو احادیث پر مشتمل "میر کارواں" کے عنوان سے دو جلدیں تیار ہیں۔ تیسری زیر تصنیف ہے اور اس کے لئے ناشر کی تلاش ہے۔

شمیم رجز صاحب کہتے ہیں کہ غزل کی طرف کبھی رجحان نہیں رہا۔ البتہ لاس انجلیس آکر مشاعروں میں شرکت کے لئے چند غزلیں کہی ہیں۔

ادب میں نظریات کے حوالے سے ان کا کہنا ہے کہ ادب برائے زندگی اور ادب برائے ادب یہ دو نظریات ہیں جن کے حوالے سے ادب تخلیق کیا جاتا ہے لیکن میرے نزدیک "ادب برائے ثواب" نظریہ اہم ہے جس کے تحت میں کام کرتا ہوں۔

سید شمیم رجز چونکہ کم سخن ہیں۔ یعنی ضرورتاً" بولتے ہیں لہٰذا لکھتے بھی ضرورتاً" ہیں۔ چونکہ سخن ور کے سوالنامہ کے جواب میں انہوں نے اتنا ہی لکھنے پر اکتفا کیا ہے۔ مگر ویسے انہوں نے کس عمر سے کتنا لکھا ہے اور اب تک کتنا کلام تخلیق کر چکے ہیں یہ آپ نے پڑھ لیا ہے۔ آج کل لاس اینجلس کے ہفت روزہ "پاکستان۔ ٹوڈے" میں ان کا قرآن حکیم کا منظوم ترجمہ شائع ہو رہا ہے۔ اس سے قبل یہاں کے ہفت روزہ "پاکستان لنک" میں "حروف کی آوازیں اور ان کے اثرات" کے عنوان سے ایک عرصے تک سلسلہ وار مضامین لکھے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔ لکھتے ہیں۔ "ہر حرف پسندیدہ الفاظ بھی رکھتا ہے اور ناپسندیدہ بھی۔ اگر پسندیدہ الفاظ کی تعداد زیادہ ہو تو آواز کو پسندیدہ اور اگر ناپسندیدہ الفاظ زیادہ ہوں تو اس حرف کی آواز کو ناپسندیدہ قرار دیا جاتا ہے۔ الفاظ سے مراد صرف مفرد الفاظ ہیں۔ خطابات' القابات یا عربی اور فارسی ترکیبوں اور مرکب الفاظ کا ہماری گفتگو سے کوئی تعلق نہیں۔ اب حرف کے نمونے ملاحظہ ہوں۔

"ز" کی آواز پسندیدہ الفاظ۔ ۳۴

" " "ناپسندیدہ الفاظ۔ ۵۴

آواز ناپسندیدہ ہے مگر اس میں گندے اور گالیوں کے الفاظ نہیں اس لئے شعراء تخلص میں اس کو لاتے ہیں۔

"ر" کی آواز۔ پسندیدہ الفاظ۔ ۳۴

" " "ناپسندیدہ الفاظ۔ ۲۵

"ر" کی آواز اچھی ہے۔ کاٹنے والی چیزوں میں یہ آواز کثرت سے پائی جاتی ہے۔ مثلاً ہتھیار' تلوار' خنجر' برچھی' شمشیر' کرپان' تیر' چھری' قرولی' مقراض' تبر' سروتا وغیرہ۔ اسی لئے مضامین غم کے لئے موزوں ہے۔ جو شعراء مضامین غم کو پسند کرتے ہیں ان کے تخلص میں اس کا وجود

ضروری ہے۔

بغیر ہاؤ ہو کئے سید شمیم رجز اکثر اپنے دولت کدے پر طرحی مسالمہ اور طرحی نعتیہ مشاعرہ منعقد کر کے اردو ادب کی ترویج کے لئے بیش قدر خدمات انجام دیتے رہتے ہیں۔ انہیں تشہیر سے قطعی غرض نہیں اور یہی ایک سادہ اور سچے خادم ادب کا خاصا ہے۔

سورہ حمد ترجمانی

بسم اللہ — کروں ابتدا لے کے خالق کا نام

الرحمٰن الرحیم — کہ رحمت ہے اس کی پئے خاص و عام

الحمد للہ — وہی لائق حمد ہے اے زباں

رب العالمین — وہی کل جہانوں کا روزی رساں

الرحمٰن — شب و روز جاری ہے اُس کی عطا

الرحیم — نہیں رحم کی کچھ حد و انتہا

مٰلک — وہ روز قیامت کا مختار ہے

یوم الدین — وہی قاسم جنت و نار ہے

ایاک نعبد — خدایا ہے تیری عبادت سے کام

و ایاک نستعین — مدد مانگتے ہیں تجھی سے مدام

اھدنا الصراط — چلا ہم کو یا رب رہِ راست پر

المستقیم — رہیں تیرے احکام پیشِ نظر

صراط الذین — ہو یارب ہمیں راہ ان کی حصول

انعمت علیھم — تری نعمتوں کا تھا جن پر نزول

غیر المغضوب — ہے ان کی روش سے ہمیں اجتناب

علیھم — ہمیشہ ہوا جن پہ تیرا عتاب

و لا — غرور و تکبر میں سرشار تھے ۱۲

الضالین — جو گمراہیوں میں گرفتار تھے

O

عکسِ فن

حمد

میں نشیب سجدہ و بندگی تو فراز اوج و کمال ہے
تری عظمتوں کو سمجھ سکے یہ کہاں بشر کی مجال ہے

تو ہی لم یزل تو ہی لم یلد تو ہی لازماں تو ہی لامکاں
نہ زمیں پہ تیری نظیر ہے نہ فلک پہ تیری مثال ہے

نہ ملک نے دیکھی جھلک تری نہ بشر کی تجھ پہ نظر پڑی
تجھے لاؤں کیسے خیال میں تو ورائے فہم وخیال ہے

تو قریب ہے تو بعید ہے تو کہاں نہیں تو کہیں نہیں
نہ کسی سے تو ہے جدا جدا نہ کسی سے تیرا وصال ہے

یہ زمیں یہ بحر یہ وادیاں یہ فلک یہ عرش یہ کہکشاں
تری صنعتوں کے نشان ہیں تری قدرتوں کا کمال ہے

مرے دل میں ہے تری آرزو تری آرزو مری آبرو
مری آرزو کو قبول کر مری آبرو کا سوال ہے

تجھے حامیوں کا نہ شوق ہے تجھے دشمنوں کا نہ خوف ہے
ترا شکر سے نہ عروج ہے ہے ترا کفر سے نہ زوال ہے

مرے خوں میں ترا ہی رنگ ہے جہاں جاؤں تیرا ہی سنگ ہے
ترا رنگ ہی مری تیغ ہے ترا سنگ ہی میری ڈھال ہے

یہی بس رجز میں ہے اک ہنر کہ ہے نام تیرا زبان پر
نہ فہیم ہے نہ عقیل ہے نہ شعور ہے نہ کمال ہے

رحمت قرنی

حد تو یہ ہے کہ مُقدر نہ ہوئے پتھر بھی
لوگ اِس شہر کے اِتنے ہی گئے گزرے ہیں

رحمت قرنی لندن

Rehmat Qarni
76.Cardington Square
Hounshow TW4-6AJ- MIDDX - U.K.

رحمت قرنی
(لندن)

میں نے ان سے پوچھا تھا "رحمت قرنی صاحب! یہ سوالنامہ آپ کے سامنے ہے۔ اس کی روشنی میں آپ کا تعارف چاہتی ہوں اور آپ کے خیالات بھی' تاکہ ادب ودوست حضرات مستفید ہو سکیں۔" میرے سوال کے جواب میں رحمت قرنی صاحب نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ۲۸ دسمبر ۱۹۲۸ء کو میری پیدائش آبادان (ایران) میں ہوئی' قرنی قبیلہ کی ایک رحم دل و ارفع اطوار خاتون دودھ ماں مقرر ہوئیں۔ آبادان سے کراچی و بمبئی تک بحری سفر کرتے ہوئے آگرہ اور امرتسر میں ایک دو ماہ قیام ہوا کرتا تھا۔ ۱۹۳۸ء میں مستقل طور پر امرتسر میں سکونت اختیار کر لی گئی۔

سات آٹھ سال کی عمر میں ہی اشعار وارد ہونے لگے تھے۔ پھر یوں ہوا کہ "دوستوں کو پڑھتے دیکھا اور غزل خواں ہو گیا" فارسی مادری زبان ہونے کے باعث ہر اسکول میں اور ہر کلاس میں مانیٹر مقرر کیا جاتا رہا۔ بچوں کے رسالوں میں نظمیں' کہانیاں شائع ہوتی رہیں۔ "بھائی جان" کراچی کے سالنامہ میں منظوم ڈرامہ لکھ کر اول انعام حاصل کیا۔

امرتسر میں علامہ سید فاضل مشہدی اور حضرت سید امین گیلانی کی سرپرستی میں' میں نے "ایوان اردو" کی بنیاد رکھی۔ ۱۹۴۷ء میں تقسیم ملک پر سکھر روہڑی سمینٹ فیکٹری میں ملازمت کی۔ ۱۹۴۸ء میں رائل پاکستان ایئر فورس میں شامل ہو کر خدمت وطن سے سرخرو ہوا۔ پھر ۱۹۶۲ء میں لندن آنا ہوا۔ فضائیہ کے انجینیئر ہونے کی نسبت سے ہیتھرو ایئرپورٹ ہونسلو میں رہائش رکھی۔ فلاحی کاموں کے پیش نظر پاکستان ویلفیئر ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی۔ جس کا آج بھی ٹرسٹی

ہوں۔ "یاران ادب" کا بانی و سرپرست اعلیٰ ہوں۔ ساؤتھ آل میں سب سے پہلے عوامی مشاعرے منعقد کروائے۔ سکھ دوستوں کو اردو سکھلانے اور اردو نواز بنانے کی مختلف کوششیں بار آور ہوئیں۔ اردو پنجابی کے نوآموز شعراء کی تخلیقات کی اصلاح کا کام بھی کیا۔ بلکہ پنجابی شاعروں کے اصرار پر پنجابی زبان میں بھی شعر کہنے شروع کیے تو میں "پنجابی ساہت سبھا گریٹ برٹن" کا جنرل سیکریٹری بنا دیا گیا۔ "سمندر پار" کے نام سے سب شعراء کے نمائندہ کلام پر مشتمل ایک مجموعہ شائع کروایا۔ میرا خیال ہے کہ ہم اسی طرح اردو کے لئے اپنا وقت صرف کریں تو اردو کے مستقبل سے مایوسی کا کوئی امکان باقی نہیں رہے گا۔

ہر ایک سے خوش خلقی سے پیش آنا اپنا مسلک ہے۔ مرنج مرنجان قسم کا آدمی ہوں۔ محدود سا شعری مطالعہ ہے۔ ہر شاعر و ادیب و فنکار کو خود سے بہتر سمجھتا ہوں۔ وطن سے 'اردو سے انتہائی محبت ہے۔ درون خانہ بیوی بچوں میں شاد آباد' بیرون خانہ احباب دلنواز میں مگن۔ صحبت مینا بدناں میسر ہو نہ ہو حدیث دلبراں میں محو رہتا ہوں۔ برطانیہ بھر کے مشاعرے ترنم سے پڑھتا رہا ہوں اور اسی کو ابلاغ سمجھتا ہوں۔ کلام کے ذریعے' اپنی شخصیت کے ذریعے' اپنی خدمت کے ذریعے۔ ابلاغ نہ ہوتا تو آج اردو باقی کہاں رہتی! دمہ کے عارضہ کے باعث اب تحت الفظ سے کام چلتا ہے۔ دروغ برگردان راوی لوگ کہتے ہیں کہ اب بھی مشاعرہ لوٹ لیتا ہوں۔ ایک پنجابی قطعہ پیش خدمت ہے۔

پل پل پلکیں پیلاں پاون پیڑ پئے پرچھاویں
رکھ سریری رتاں کولوں کیوں ایویں کھنبواویں
وا وڑولے کوکھے ککھ ہن' ذات دے جھرے کسکاں
کسے دے ہتھ کھڈوناں بن کے اپنی ہوند گنواویں

○

رحمت قرنی

عکسِ فن

متفرق اشعار

طبعِ موزوں کوئی موضوع ہو رواں ہوتی ہے
قدرتِ لفظ وبیاں تیغ وسناں ہوتی ہے
عرش ہل جاتا ہے چاہے نہ کھلے بابِ قبول
اشک آلودہ دعا ایک فغاں ہوتی ہے

○

جاتی ہے اگر عمرِ گریزاں تو چلی جائے
رہ کر بھی جو کمبخت نے انعام دیا ہے
خود لوٹ کے آجائے ہے گلشن سے قفس میں
صیادِ نے بلبل کو وہ آرام دیا ہے
ہم صنعتِ آورد کے تابع نہیں رحمت
قدرت نے ہمیں جوہرِ الہام دیا ہے

○

ظاہراً کہنا "کوئی فکر نہیں" اور چھپ کر
رونا اور ترکِ تعلق پہ پشیماں ہونا

○

عظمتِ نوعِ بشر ایسی ہے یزداں کو عزیز
خلد میں پھر نہ کبھی منکرِ آدم رکھا

رحمٰن صدیقی

ہم سے کیا پوچھتے ہو کیا گزری
کوئی محفل میں اس کی بات کرے تو!

Rehman Siddiqui
(Editor "Pakistan Link" Weekly)
11222 Lacienega Blvd Suite 244, Ingelwood
CA 90304 - U.S.A.

رحمٰن صدیقی

لاس اینجلس

دور حاضر میں جتنی ٹوٹ پھوٹ ہوئی ہے اس کے نتیجے میں کتنی ہی قدریں ادھوری اور نامکمل رہ گئی ہیں کہ اصل کیفیت کا اظہار مکمل طور پر ہو ہی نہیں پاتا۔ اور پھر صحافی ہونے کے ناتے شعری کیفیت کو بحال رکھنا کاردار ہے۔ مگر رحمٰن صدیقی ہر ہفتے اپنے ہفت روزہ "پاکستان لنک" کے لئے باقاعدگی سے قطعہ لکھتے ہیں اور وہ بھی حالات حاضرہ کے مسائل پر ایک لطیف طنز لئے ہوئے۔ رحمٰن صدیقی چونکہ بات کہنے کا ہنر جانتے ہیں اس لئے استعاروں میں بڑے سلیقے سے اپنے دکھ کا اظہار کردیتے ہیں۔

پھول کھلتے ہی آگیا گلچیں
اب سزا پائے گی کلی کھل کے

گو ان کی طبیعت میں لاابالی پن نہیں لیکن ذمہ داریوں کو اولیت دیتے ہوئے اس میں ایسے گھرے کہ اپنا بہت سا کلام محفوظ نہ رکھ سکے۔ کچھ ہجرتوں کے دکھوں نے گھیرا کہ بہت سا کلام ضائع ہوگیا۔ لیکن پھر احباب کے کہنے پر انہوں نے اپنے کلام کو محفوظ کرنا شروع کیا چنانچہ ایک سو سے زائد غزلیں اور اتنے ہی قطعات اب جمع ہیں کہ ایک مجموعہ کلام کی صورت میں قارئین کے سامنے آجائے اور شاید اسی سال ۱۹۹۶ء میں آپ کے ہاتھوں میں ہو۔

اپنا تعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں۔

"میرا پورا نام محمد عبدالرحمٰن صدیقی ہے۔ اکثر لوگ رحمٰن کہتے ہیں۔ میں خود عبدالرحمٰن صدیقی لکھتا ہوں۔ کراچی میں کچھ عرصہ رحمٰن مظہر کے نام سے مختلف اخبارات و رسائل میں خصوصاً جنگ میں لکھتا رہا ہوں۔ لیکن یہ نام میں نے عرصہ ہوا ترک کردیا ہے۔"

"آپ نے ابتدائی زندگی کہاں گزاری اور پھر امریکہ کب تشریف لائے؟ اس سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ "میں ایک علمی گھرانے کا فرد ہوں۔ ۱۹۳۸ء کے وسط میں سابق

رحمٰن صدیقی

ریاست حیدر آباد دکن میں پیدا ہوا والد، محمد فخرالدین صدیقی حیدر آباد سٹی کالج میں فارسی اور عربی کے لیکچرار تھے۔ پھر مولوی عبدالحق کے ایماء پر اورنگ آباد گئے اور وہاں ہائی اسکول میں فارسی اور اردو کے ٹیچر کی حیثیت سے کارگزار رہے۔

میں کم عمری میں شہر حیدر آباد سے ہجرت کرکے ۱۹۵۲ء میں کراچی پہنچا اور یہیں پر تعلیم حاصل کی۔ بی۔اے۔ کے بعد سلسلہ کچھ عرصہ منقطع رہا پھر ۱۹۷۵ء میں اردو لاء کالج سے ایل.ایل.بی اور کراچی یونیورسٹی سے قانون کی ڈگری لی۔ مختلف ملازمتوں کے بعد کچھ عرصہ محکمہ تعلیم میں ملازمت کی اور اس کے بعد کورٹ اور پھر کراچی کسٹمز میں پریکٹس کرتا رہا اور ۱۹۸۹ء میں امریکہ پہنچا جہاں میرے بڑے بیٹے فیض الرحمٰن پہلے سے موجود تھے جنہیں شروع ہی سے صحافت سے دلچسپی رہی ہے۔ وہ ڈی جے سائنس کالج پھر یونیورسٹی کے زمانے میں مختلف اخبارات میں لکھتے رہے تھے۔ چنانچہ یہاں بھی ۸۸۔۱۹۸۹ء میں انہوں نے ایک ماہانہ اخبار نکالا جو جلد ہی بند ہوگیا۔ اس کے بعد ۱۹۹۱ء میں ہم نے "پاکستان لنک" (انگریزی۔ اردو) جاری کیا جو الحمدللہ اپنی اشاعت کے اب پانچ سال مکمل کرچکا ہے"۔

"اور ادبی دنیا سے کب وابستہ ہوئے؟ سوال سن کر وہ مسکرائے اور پھر تفصیل بتاتے ہوئے فرمایا کہ شعر گوئی کی صلاحیت کا احساس بچپن ہی میں ہوگیا تھا۔ میں نے پہلی مکمل غزل پندرہ برس کی عمر میں ۱۹۵۳ء میں کراچی میں کہی لیکن شعر گوئی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی۔ تاہم امریکہ ہجرت کے بعد شاعری میں کچھ دلچسپی بڑھ گئی اس لئے بھی کہ ہر ہفتہ اپنے اخبار کے لئے انگریزی صفحات میں میرا ایک قطعہ چھپتا ہے جو عام طور پر پسند کیا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے شاعری سے پھر دلچسپی پیدا ہوگئی۔ خیر سے یہاں کی فضاء بھی ادبی ہے شعری محفلیں شعر کہنے کی تحریک پیدا کرتی ہیں اور یہی محفلیں معاون بھی بنتی ہیں پھر صحافت سے قربت کی وجہ سے دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں سے باخبر رہتے ہیں لہٰذا صحافت کے ساتھ ساتھ شاعری بھی جنم لیتی ہے بقول حسرت۔

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی

پاکستان سے باہر یورپ اور امریکہ میں اردو زبان کے مستقبل کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ "میں امریکہ میں اردو کے مستقبل کے بارے میں کچھ زیادہ پرامید نہیں ہوں، حالانکہ اگر اجتماعی اور شعوری کوشش کی جائے تو اردو کا مستقبل یہاں روشن ہو سکتا ہے۔ والدین اپنے اولاد کو اردو کی تعلیم دینے میں اپنی ذمہ داریوں کو محسوس نہیں کررہے ہیں یہ بہت افسوس کی بات ہے۔ اردو کا مستقبل اسی طرح محفوظ اور روشن ہو سکتا ہے جب کہ ہمارے بچے اردو لکھنے اور پڑھنے سے واقف ہوں، محض مشاعروں وغیرہ سے کام نہیں چلے گا!

عبدالرحمٰن صدیقی

عکسِ فن

غزل

ہر خوشی وہم ہے، خیالی ہے
زندگی آج بھی سوالی ہے

اتنے ناراض ہوگئے ہیں آپ
جیسے سچ بولنا بھی گالی ہے

گفتگو غیر سے، مُخاطَب ہم
آپ کی ہر ادا نرالی ہے

ہم نے مانا کہ ہم نہیں آتے
کیا قسم آپ نے بھی کھالی ہے

صبر کرنا بھی جُرم ہے گویا
بات کتنی عجب نکالی ہے

باتوں باتوں میں کہہ دیا سب کچھ
بات کہہ دی، بیان خالی ہے

اک ستمگر کے پیار کی خاطر
ہم نے ہر بات ہنس کے ٹالی ہے

والیِ شہر تماشا دیکھے
قوم کا صبر بھی مثالی ہے

رشی خان

سوچ کی پرواز جب تک پستیوں میں ہے رشی
خود کو تُو جو کچھ بھی سمجھ لیکن بہت چھوٹا ہے تُو

رشی خان جرمن

Rishi Khan
Kant Str, 38
10625 BERLIN - GERMANY

رشی خان

(جرمنی)

رشی خان کا مسکن تو برلن جرمنی ہے لیکن لاہور کی مٹی کی خوشبو انہیں دوڑائے رکھتی ہے۔ اپنی مٹی سے تو وہ کبھی جدا ہوئے ہی نہیں۔ جلا وطنی میں بھی ہواؤں کے دوش پر اپنی محبتوں کا پیغام بھیجتے رہے کہ وطن سے دور لی جانے والی ہر سانس وطن کے لئے ہی ہوتی تھی اور ہوتی ہے۔
اب جب رشی خان لاہور پاکستان آئے تو طفیل اختر (مدیر ماہنامہ مسکراہٹ لاہور) نے انہیں سخن ور کے لئے گھیرلیا ورنہ رشی طفیل سے دور بھی نہیں۔ لاہور اور طفیل اختر رشی کے لئے دو الگ الگ نام اور حیثیت نہیں ایک ہی ہیں۔

"رشی خان..... آپ رشید سے رشی کیسے بنے۔ شعر کا صحیفہ کب اترا آپ پر اور زندگی و شاعری کا سفر کیسے کیسے مراحل سے آپ کو گزار لے گیا۔ کچھ اس کی کہانی کہئے۔"

اس سوال پر رشی خان کی مسکراہٹ گہری ہو گئی جیسے کہہ رہے ہوں۔ "آبلہ پائی کی کہانی ایسی دلنشیں تو نہیں کہ شوق سماعت کو راحت ملے لیکن اصرار ہے تو یہی سہی۔"

اور پھر رشی نے کہانی یوں بیان کی کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ رشی اپنے دلچسپ انداز بیان میں سنا رہے تھے۔

"فروری ۱۹۵۴ء میں جب درختوں کی کونپلیں سردی زدہ اوڑھنوں میں اپنی نمو کی انگڑیاں لے رہی تھیں اور بسنت بہار کے تصورات جوان دلوں سے اٹھکیلیاں کر رہے تھے مجھے اس جہان رنگ و بو کے اسٹیج پر اپنا کردار ادا کرنے کے لئے انٹری لینا پڑی۔ پھولوں اور پھلوں کی سرزمین شعروادب کی آب و ہوا سے مالا مال زندہ دلوں کا شہر "لاہور" میری جائے پیدائش ٹھہرا۔

رشی خان

اسکول کی تعلیم کے دوران دلچسپیوں کا محور ہمیشہ غیر نصابی سرگرمیاں تھیں اور ماں باپ کو حیرت ہی رہی کہ میرا نام پاس ہو جانے والے بچوں کی فہرست میں کیسے شامل ہو جاتا تھا۔ کالج کا تمام عرصہ شاعروں، ادیبوں، فلمی کہانی کار اور نغمہ نگاروں کی صحبت میں گزرا۔ طبیعات اور کیمیا کی تعلیم کے لگاتار چار سال بھی رجحانات کی طبعی یا کیمیائی حالتوں پر اثر انداز نہ ہو سکے۔

ماں باپ کی لاکھ کوشش کے باوجود فوج کی باعزت ملازمت کی نسبت اسٹیج، ریڈیو، ٹی وی اور فلم نگر کے دھکے کھانے کو ترجیح دی اور اردو میں رعایتی نمبروں سے پاس ہونے کا اعزاز حاصل کرنے کے بعد بھی شاعر ہونے کے زعم میں مبتلا رہا۔

اور یہ نام کا سلسلہ میں نے مداخلت کرنا چاہی تو مسکرا کر بولے۔

"نام رکھتے وقت بڑوں نے چاہا تھا کہ ہدایت یافتہ بنوں اور ہدایت دینے کا کام کروں اس لئے ہزاروں کلومیٹر کے فاصلے سے در آمد شدہ عرب ریگزاروں کا پالا ہوا لفظ "رشید" میرے عنوان کے طور پر منتخب کیا مگر شاعری کے جنون نے مجھے اپنی جنم بھومی کے سینکڑوں سال پرانے لفظ "رشی" کی درویشی کے حصار میں لے لیا اور یوں میں رشید احمد خان سے رشی خان ہو گیا اور "رشی" میرا تخلص قرار پایا۔ شاعری کے سفر کا آغاز یوں ہوا کہ میں سن شعور کو پہنچا تو ریڈیو کے لئے بچوں کی کہانیاں لکھیں، مختلف جرائد کے لئے مختصر افسانے اور کہانیاں تحریر کیں۔ تھیٹر کے اسکرپٹ میں طبع آزمائی کی۔ فلمی ہدایتکاروں کی معاونت میں رہا اور فلمی صحافت سے لے کر سیاسی ہفت روزہ "صدائے وطن" کی ایڈیٹری تک سب کچھ کیا مگر ملک بدر ہونے کی بنیاد شاعری ہی بنی ہفت روزہ صدائے وطن میں شائع ہونے والی ایک نظم جس پر ضیاء آمریت کے دور میں مارشل لائی مقدمہ قائم کیا گیا) ادب میں شاعری کے ساتھ ساتھ افسانہ نویسی اور نثرپاروں سے وابستگی رہی جس کی گواہی کے طور پر بائیس سال کی عمر میں لکھی گئی نثرپاروں کی کتاب "ریزہ ریزہ کائنات" آج بھی چند قدردانوں کے پاس موجود ہے۔

جیل کے دنوں میں میں نے لکھنے پڑھنے کی طرف زیادہ توجہ دی روسی ناول اور ارنسٹ ہمنگوے کو پڑھا۔ فرانسیسی منصفین کی تحریریں اور جرمن لٹریچر پڑھا اور اس کے ساتھ شاعری کی مشق بھی کرتا رہا۔ آج پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو شاعری کے بنیادی محرکات کی کوئی باقاعدہ نشاندہی نہیں ہوتی۔ بچپن سے لے کر لڑکپن اور جوانی تک یا احترام سے لے کر عشق تک نہ تو میں نے کبھی جنون کے دامن کو چھوا اور نہ کسی سے کوئی ایسی توقع وابستہ کی کہ جو اس کی کج ادائی پر بے وفائی کہلا سکتی۔ وہ سبھی تعلقات، جو دل کی دھڑکنوں کو تیز کرنے کا سبب بنے میری دیگر مصروفیات کی گرد میں دب گئے۔ یوں ان تمام کہانیوں میں اگر بے وفائی کا کوئی کردار تھا تو عین ممکن ہے کہ وہ

خود میں نے ہی ادا کیا ہو اور شاید اسی بنیاد پر ایسے تمام کرداروں کے لئے میرے دل میں عزت کا جذبہ آج بھی موجود ہے۔

یہ شاعری جہاں تک میں سمجھتا ہوں' شاعری کہیں میری فطرت میں شامل تھی۔ بچپن میں جب میں ابھی اردو پڑھنے کے قابل ہی ہوا اور اقبال کا شکوہ جواب شکوہ میرے ہاتھ لگ گیا تو اس کے کئی صفحات میں نے جلد ہی ازبر کرلئے جو میں نجی محفلوں میں خوب ہاتھ اٹھا اٹھا کر سنایا کرتا تھا۔

ہائی اسکول میں بھی اردو کا نکما طالب علم ہونے کے باوجود نصاب کی نظموں اور غزلوں کے بیسیوں اشعار بغیر کسی شعوری کوشش کے یاد ہو جاتے تھے۔ شعور کی سیڑھیوں پر پہلا پاؤں رکھتے ہی "ساحر لدھیانوی" کو پڑھنے کا موقع ملا جس کے فوراً بعد شعر کہنے کی علامتیں ظاہر ہونے لگیں ۔ آس پاس صرف فوجی افسران' انجینئر یا سائنس دان تھے اس لئے اصلاح یا مدد کے مواقع میسر نہ آسکے اور یوں، شاعری کا یہ بیج کسی خود رو پودے کی طرح بغیر کسی قبولیت اور مثبت رد عمل کے نمو سے بڑھ کر بود و باش کی منزلیں طے کرتا رہا۔ فطرت میں موجود آہنگ سے آشنائی نے تیکنیک کو سمجھنے میں مدد دی اور مطالعہ تحقیق کی طاقت کے ساتھ مل کر حرف اور ورائے حرف کے در وا کرتا رہا اور یوں میں آج کہیں شاعری کی دیوی کے پاؤں چھونے کے قابل ہو گیا ہوں"۔

"ادب اور شاعری میں ابلاغ کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟"

"میں عرض کروں گا کہ یوں تو یہ موضوع ایک طویل جواب کا متقاضی ہے مگر مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ ادب اور شاعری میں ابلاغ انتہائی ضروری ہے۔ جو کچھ بھی لکھنے والا کہنے جارہا ہے وہ سمجھا بھی جانا چاہئے اور یوں لکھنے والے کو لکھتے وقت یہ خیال رکھنا چاہئے کہ آیا اس کا خیال کمیونی کیٹ بھی ہو رہا ہے یا نہیں۔ مگر جیسے کسی کیمیائی مرکب کے اجزائے ترکیبی کے فارمولے کو پڑھنے کے لئے ضروری ہے کہ پڑھنے والا اس فارمولے کی بناوٹ کی زبان کا علم رکھتا ہو۔ یہ جانتا ہو کہ کسی عنصر کے لئے کیا نشانی ہے اور کونسی لکیر اس کی کس صفت کی نشاندہی کرتی ہے اسی طرح شاعری اور ادب میں بھی ایسے لاتعداد موضوعات آتے ہیں کہ جن کے ابلاغ کے لئے جس فریکونسی (Frequency) کا ٹرانسمیٹر ہوتا ہے اسی فریکونسی کا ریسیور (Receiver) بھی ہونا چاہئے اگر کوئی فرہاد' اور مجنوں کو ہی نہیں جانتا تو وہ ان ناموں کی تشبیہات اور استعارے کیسے سمجھ پائے گا اسی لئے میں یہ ضروری خیال کرتا ہوں کہ جہاں لکھنے والے کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے "موجود قاری" کی ذہنی سطح کا خیال رکھے وہیں اسے چاہئے کہ وہ اپنے ان خیالات کو بھی قید تحریر میں لاتا رہے کہ جن کے قارئین آج موجود نہیں ہیں۔ یہاں میں ان فرانسیسی مصوروں اور غالب جیسے شاعروں کی طرف اشارہ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ جن کی تخلیقات ان کی وفات کے

عرصہ دراز کے بعد پذیرائی حاصل کر سکیں۔"

"ادبی جرائد آج بھی مقبول ہیں یا نہیں اس سوال کا جواب دیتے ہوئے رشی خان کہتے ہیں کہ "جہاں تک ادبی رسائل کی عدم مقبولیت کا سوال ہے تو میں اس خیال سے اتفاق نہیں کرتا۔ میرے خیال میں ہر طرح کا ادب اپنے قارئین میں ہمیشہ مقبول ہوتا ہے جس طرح "سٹار ٹریک" یا "بکی ماؤس" کے قارئین ان کی کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پڑھتے ہیں اسی طرح ادب کے شیدائی بھی ادبی رسائل اور کتابوں کی تلاش میں رہتے ہیں ادبی جرائد اپنے قارئین میں نہ تو کبھی غیر مقبول ہوئے تھے اور نہ ہو سکتے ہیں اور یوں بھی میں تو سمجھتا ہوں کہ ادب صرف تحریر، رنگوں اور برش تک محدود نہیں ہے۔ آج تو اداکاری، صداکاری بلکہ فوٹو گرافی تک میں ادب کی گنجائش موجود ہے۔ کوئی بھی نام دیا جائے یا کوئی بھی ٹرمینالوجی (Terminology) استعمال کی جائے ابلاغ کی گنجائش ہر جگہ موجود ہے ساحر لدھیانوی، قتیل شفائی، جان نثار اختر، حمایت علی شاعر، منیر نیازی اور اس قبیل کے کتنے ہی شاعروں نے فلمی گیتوں میں ادب کا پورا پورا رنگ بھرا۔ کتنے ہی افسانوں پر فلمی کہانیاں لکھی گئیں اور اگر آج کوئی چاہے تو وہ اشتہار کی بناوٹ تک میں اپنے ادبی جوہر کا مظاہرہ کر سکتا ہے یوں بھی کتابیں ہمیشہ آنے والے وقت کے لئے ہوتی ہیں اور اکثر ادیبوں اور شاعروں کی پزیرائی ان کے مرنے کے بعد ہی ہوتی ہے جب انہیں ان کی خدمات کا کوئی معاوضہ نہیں دینا ہوتا یا ایسا کسی ذاتی جذبے کی تسکین کے لئے ہوتا ہے یا اس کی وجہ کوئی کاروباری دلچسپی ہوتی ہے یا پھر دونوں وجوہات۔ اور جہاں تک اس کا سوال ہے کہ علمی ادبی پروگرام ادبی حلقوں کی خواہشات کے مطابق نہیں ہو رہے تو اس میں بھی خطاوار خود شاعر ادیب اور ایسے پروگراموں کے منتظمین ہی ہیں۔ جب شاعر، ادیب، تنقید نگار اور محققین خود کو کسی دوسری دنیا کا باشندہ ظاہر کرنے کی کوشش کریں گے تو یقیناً باقی دنیا ان سے کٹ جائے گی اور یہی وہ شاعر اور ادیب ہیں کہ جو ابلاغ کے قحط کا رونا روتے نظر آتے ہیں۔

میرے خیال میں علمی ادبی پروگراموں میں نوجوانوں کی زیادہ سے زیادہ شمولیت اور ان کی حوصلہ افزائی ایسے بے شمار مسائل کا حل ہے جو آج کل علمی و ادبی تنظیموں کو درپیش ہیں ہاں اگر ادبی اجلاس بند کمروں تک محدود رہیں گے تو ادب بھی کسی تازہ جھونکے سے محروم رہے گا"۔

انہوں نے گفتگو کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"میں اردو کے مستقبل سے بھی مایوس نہیں ہوں پچھلے پچاس سال میں برصغیر پاک و ہند سے دیگر ممالک کو ہجرت کر جانے والے ایسے لوگوں کی ایک کثیر تعداد ہے کہ جو اردو بولتے پڑھتے اور لکھتے تھے۔ مگر ان میں زیادہ تر ایسے لوگ تھے کہ جو روزگار کی تلاش میں گئے تھے اور دیگر مسائل

کے ساتھ ساتھ وسائل کی کمی کی وجہ سے وہ اپنی آئندہ نسلوں کو اردو کی تعلیم دیتے رہنے سے قاصر ہے مگر اس کے باوجود مشرق وسطیٰ اور یورپ کے کئی ممالک میں بلکہ امریکہ اور کینیڈا میں بھی اردو زبان نے ترقی کی ہے۔ جہاں آج نہ صرف اردو ادب کے بے شمار تراجم شائع ہو رہے ہیں بلکہ کئی یونیورسٹیوں میں اردو زبان کے مختلف شعبوں میں تحقیق کا کام بھی جاری ہے علاوہ ازیں کئی ممالک میں نئی نسل نے یورپی موسیقی میں اردو کا خوب خوب تڑکا لگایا ہے اور اس مقصد میں اچھی خاصی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اگر بیرون ممالک میں مقیم نئی نسل کے پاکستان کے ساتھ روابطہ بڑھائے جاسکیں تو یہ اردو زبان کی اچھی خاصی خدمت ہو سکتی ہے۔

ادب میں تنقید کو بھی بڑی اہمیت حاصل ہے مگر معاف کیجئے گا کہ برصغیر پاک و ہند کے بیشتر تنقید نگار لفاظی کے تخت سے نیچے ہی نہیں اترتے علاوہ ازیں وہ ادب کو بھی کیلکولیٹر اور کمپیوٹر کی طرح ناپتے تولتے ہیں اور اکثر اوقات ان کی اپروچ حرف تک محدود رہتی ہے جبکہ شاعری کی کلاسیک تو زیادہ تر ورائے حرف ہوتی ہے اسی لئے تو فیض احمد فیض جیسے شاعر تنقید نگاروں کی نظر میں پانچویں درجے کا شاعر ہونے کے باوجود انتہائی مقبولیت پاتے ہیں اور ن۔ م راشد جیسے شاعر جنہیں تنقید نگار اول درجہ عطا فرماتے ہیں محدود قبولیت سے باہر نہیں نکل پاتے۔"

"رشی خان! آپ اپنی جلاوطنی کے بارے میں کچھ بتائیں گے؟"

"بڑی لمبی کہانی ہے۔" رشی بولے۔ "انہوں نے مجھے جو سزا دی تھی وہ بالکل بے بنیاد تھی اور اس کی وجہ صرف اتنی تھی کہ جب میں اس میگزین کی ادارت کے لئے گیا تو میں نے اس میں تھوڑی سی تبدیلی کی تھی اور اس تھوڑی سی تبدیلی کو انہوں نے شدت سے محسوس کیا اور ہوم ڈیپارٹمنٹ نے اس پر فوراً ایکشن لیا۔ لیکن ثبوت تھا کچھ نہیں۔ انہوں نے دوسری پیشی پر مجھے سزا سنا دی تب میں جیل میں چلا گیا۔

میری وائف نے اس کے خلاف ہائی کورٹ میں رٹ کی اور اس رٹ کا نتیجہ یہ نکلا کہ عدالت نے سمری کورٹ سے ریکارڈ طلب کیا۔ ان دنوں کم از کم یہ تھا کہ سمری کورٹ کے فیصلوں کو ہائی کورٹ میں چیلنج کیا جا سکتا تھا تو جب ریکارڈ نہیں آیا تو چوتھی پیشی پر مجھے رہا کر دیا گیا۔

جیل سے واپس آکر دوبارہ میں "صدائے وطن" میں کام کرنے لگا پرچے کے مالک شفقت محسن چوہدری نے بلاخوف و خطر مجھے دوبارہ ادارت کے فرائض سونپ دیئے انہی دنوں بھٹو صاحب کو شہید کر دیا گیا۔ اس پر میں نے اور میرے رفقاء جن میں پرویز اقبال فوٹو گرافر بھی شامل تھے۔ بھاگ دوڑ کر کے تصاویر اور مسودات اکھٹے کئے اور پرچہ چھپتا رہا۔ تیسرے چوتھے ایشو پر ہمیں ایک نوٹس آگیا ہوم ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے۔ ہم نے معذرت کر لی کہ آئندہ ہم احتیاط

برتیں گے۔ وہ مان گئے۔ ہم نے تھوڑا عرصہ پرچہ نرم رکھا۔ پھر تھوڑا شروع کردیا۔ اس وقت سب سے بڑی بات یہ تھی کہ "مساوات" بھی بند تھا۔ دوسرے کسی اخبار نے ہمت نہ کی۔ سب مارشل لاء کی زد میں آچکے تھے۔ میں نے اس حد تک ہمت کی کہ سرورق پر بڑی بڑی شہ سرخیاں لگانی شروع کردیں۔ "عید کا تحفہ کیا چاہئے' جنرل ضیاء کا سر چاہئے" اس کے بعد پھر ایک نوٹس آگیا۔ میری ایک نظم تھی "تین اور چار اپریل کی درمیانی رات" یہ نظم ایف آئی آر میں شامل کی گئی۔ ایک ہمارے دوست تھے جو کبھی کبھی آرٹیکل ہمیں دیتے تھے پرویز حمید صاحب۔ حالانکہ ان کے مضامین میں باغیانہ رنگ زیادہ نہیں ہوتا تھا لیکن ان کا بھی پیچھا کیا گیا مگر وہ کسی طور بچ گئے۔

اگلے دن میں دفتر پہنچا تو بتایا گیا کہ پولیس آئی تھی اور آپ کا پوچھ رہی تھی۔ میں نے کہا اگر کچھ بات ہوگی تو پتا چل جائے گا۔ کچہری سے پتا کیا انہوں نے کہا ہمارے تو کچھ علم میں نہیں۔ پرویز اقبال نے بھی تھوڑی سی مدد کی۔ پولیس نے اس کے ساتھ بھی کھینچا تانی کی تھی۔ میں پھر وہاں سے بھاگ اٹھا اور کوشش کرتا رہا کہ کسی طرح ضمانت قبل از گرفتاری ہو جائے مگر نہیں ہو سکی۔ تب میں نے یہ سوچا کہ اب جیل میں رہ کر تو کچھ کام ہوگا نہیں اور جو کچھ لکھا گیا ہے ایف آئی آر میں اس سے بچت کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو پھر میں بھاگ کر جرمنی پہنچا۔ سفر بہت کٹھن تھا۔ جرمنی میں چند دوست پہلے سے کام کر رہے تھے۔ انہیں پتا چلا کہ میں رشی خان ہوں۔ ان کے پاس میری چیزیں پہلے سے موجود تھیں۔ انہوں نے مجھ سے درخواست کی کہ ایک رسالہ نکالتے ہیں۔ ان میں سے دو تین اسٹوڈنٹ تھے۔ اس طرح اپریل ۸۰ء میں ہم نے "جدوجہد" شروع کیا جو ۸۴ء تک شائع ہوتا رہا اور بڑی جگہوں پر پہنچا۔ اس کی وجہ سے دوستیاں دشمنیاں ہوئیں۔ مثال کے طور پر ہمارے پاس جو رپورٹس آتی تھیں۔ جنہیں ہم صداقت پر مبنی سمجھتے تھے۔ ان کو ہم شائع کردیتے تھے۔ اس طرح ایک بار میر مرتضٰی بھٹو نے ہمیں ایک رپورٹ فراہم کی۔ جس میں کچھ لوگوں کو غدار بتایا گیا تھا۔ خاص طور پر راجہ انور کو۔ اس رپورٹ کو ہم نے من و عن شائع کردیا۔ اس کا نتیجہ بہت ساری دشمنیوں کی صورت میں نکلا۔ اس کے ساتھ ساتھ چونکہ شاعری کا چسکا پڑا ہوا تھا۔ وہ میں کرتا رہا بعض نظمیں جو تحریک کے دوران لکھی گئیں۔ خاصی پسند کی گئیں۔ غزل وغیرہ بھی ساتھ ساتھ کہتا رہا ہوں۔ کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کا سیاست سے تعلق نہیں ہے لیکن کچھ ہیں جن کا گہرا تعلق سیاست سے ہے۔ یہ نظم بہت جگہوں پر گائی گئی۔

بے شک آنکھیں پھوٹ چکی ہیں
ہاتھ کٹے اور ہونٹ سلے
پاؤں ہلاؤ زنجیروں کے بجنے سے تقدیر بنے

کٹ کٹ کر سب کند کرو
یہ ظلم کی جو تلواریں ہیں
اس میں ڈوب مریں وہ ظالم گلیوں میں جو خون بہے

یہ سارا کام اتنا مضبوط تھا اور یہاں کے ثبوت بھی اتنے مضبوط تھے حالانکہ جونیجو حکومت کے وقت وہ کسی کو سیاسی پناہ دینے کو تیار نہیں تھے لیکن اس وقت جرمن حکومت نے سیاسی پناہ دی اور میں وہاں آخری لوگوں میں سے ہوں اب تک ...... میرے بعد کسی کو وہاں سیاسی پناہ نہیں دی گئی..... بلکہ کئی وہ لوگ جو کافی مضبوط کیرییر رکھتے تھے۔ ایک بار وہاں سے نکلے اور دوبارہ آئے تو ان کے لئے بڑی مشکلات نے سر اٹھایا۔

بیگم نصرت بھٹو جب میونخ میں آئیں تو وہاں پر ان کے جلسے کا میں نے اہتمام کیا۔ پھر بے نظیر صاحبہ آئیں ان کو جس جس چیز کی ضرورت تھی انہیں مہیا کی۔ انہیں یورپ اور وہاں کی سیاست سمجھنے میں آسانی ہوئی۔ پھر انہوں نے بلایا۔ ملاقات کی۔ میں نے تفصیلات بتائیں۔ پھر جیسے یورپ کے دیگر ممالک کے نمائندے تھے۔ ان کی طرح مجھے چنا۔ کئی بار چھوٹی چھوٹی باتوں پر مجھے وہ ٹیلی فون بھی کر دیتی تھیں۔ ان دنوں انہیں حالات و واقعات جاننے کی از حد ضرورت تھی۔ جو کچھ اس طرح سے مجھ سے ہو سکا' وہ میں نے کیا ان کے لندن کے جو جلسے تھے۔ ان کے لئے پروگرام ڈرافٹ کئے اور وہاں جا کر انتظامات بھی کئے۔ اجلاس بھی اٹینڈ کئے۔ لوگوں کو ان کی طرف مائل کیا۔ اس طریقے سے میں سیاست میں چلتا رہا۔

جہاں تک سیاسی وابستگی کا تعلق ہے۔ میں صاف لفظوں میں وہ کہوں گا جو میر مرتضیٰ بھٹو نے کہا ہے کہ پارٹی میں بھٹو صاحب کے قاتل موجود ہیں۔ انہیں کم از کم نہیں ہونا چاہئے۔ بے نظیر صاحبہ ایسے لوگوں کو اچھی طرح جانتی ہیں۔۔ بس ہمارے جذبات یہ ہیں کہ انہیں نہیں ہونا چاہئے۔ یہ بات انہیں ضرور مان لینی چاہئے۔

میری شاعری کے بارے میں عرض ہے۔ نثر پارے اور شاعری..... میں نے جب کچھ لکھنا چاہا ہے' لکھ دیا ہے۔ اب وہ انقلابی ہے۔ یا وہ سماجی ہے۔ محبت کا اس سے تعلق ہے یا نہیں۔ ان چیزوں پر میں نے غور نہیں کیا۔ یعنی میں نے یہ کوشش کبھی نہیں کی کہ مجھے کس ٹائپ کا شاعر کہا جائے۔ پابند میں نے خود کو نہیں کیا جو سرزد ہو رہا ہے۔ جو دیکھا ہے وہ منظر عام پر آگیا ہے۔ محسوسات کے خانے نہیں بنائے۔ میں سمجھتا ہوں ادب سماجی اور سیاسی حالات سے ہمیشہ متاثر ہوتا ہے ادب کو سیاست سے الگ نہیں کیا جا سکتا اس لئے ممکن ہے سیاسی زندگی اور سوچ میری شاعری سے غیر شعوری طور پر وابستہ بھی رہی ہو۔

رشی خان

عکس فن

غزل

تو کہ انساں ہے فرشتہ ہو نہیں ہوسکتا ہے تو
آدمی کے مرتبے سے کیوں مگر گرتا ہے تو

آسمانوں پر کمندیں ہیں تری بے فائدہ
جب تلک مرکز زمیں کو کر نہیں پاتا ہے تو

کر نہیں پایا ہے جس کو اپنے اندر تو تلاش
آسمانوں پر اسے اب ڈھونڈتا پھرتا ہے تو

حلقہ ہائے نوعِ اسرائیل سے باہر نکل
شکر کا کلمہ وگرنہ سن نہیں سکتا ہے تو

نوح کی کشتی بھی تجھ کو کیسے لے جائے گی پار
ڈگمگاتے پاؤں سے اس میں اگر چڑھتا ہے تو

عقل نے پہنچا دیا ہے حالتِ ہذیان میں
آدمی تو بن نہیں پایا خدا بنتا ہے تو

سوچ کی پرواز جب تک پستیوں میں ہے رشی
خود کو تو جو بھی سمجھ، لیکن بہت چھوٹا ہے تو

○

جو اکیلے میں انجمن ہوں گے
ان کے چرچے چمن چمن ہوں گے

جو سہیں گے عذابِ تنہائی
وہ محبت کا بانکپن ہوں گے

رئیس الدین رئیس

بہت عزیز ہے مجھکو مسافتوں کی تھکن
سفر کو پاؤں کی زنجیر کرتا رہتا ہوں

13/12/95

Raeesuddin Raees
10/1725 Delhi Gate
ALIGARH 202001 - INDIA

رئیس الدین رئیس

(علی گڑھ۔ ہندوستان)

میں نے رئیس الدین کا کلام پڑھا تو جی چاہا کہ اس شاعر سے رابطہ کیا جائے۔ پتہ میرے پاس نہ تھا مگر کہتے ہیں ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ سو میں نے رئیس الدین کو دریافت کیا۔ سوالنامہ بھیجا۔ رئیس الدین نے جو کچھ اپنے بارے میں لکھا جی چاہتا ہے آپ اسے ضرور پڑھیں۔ رئیس نے لکھا۔

محترمہ سلطانہ مہر صاحبہ۔۔ اسلام علیکم

آپ کا سوالنامہ اور خط میرے سامنے ہے۔ آپ نے میرا مختصر ترین تعارف پاکر مجھے سوالنامہ بھیجا اور اتنا محبت بھرا خط لکھا کہ جیسے میری اپنی سگی بہن مجھ سے مخاطب ہو۔ بس اسی انداز تخاطب اور محبت نے جیسے میرے زخموں کو چھولیا۔ چھالے پھوٹ پڑنے کو ہوگئے اور جی چاہتا ہے کہ مدت سے جو زہر میرے اندر سرایت کرتا جارہا ہے میں اسے صفحہ قرطاس پر بکھیر دوں۔ آپ کے سامنے اور اپنے پڑھنے والوں کے سامنے رکھ دوں۔ اکثر سوچتا ہوں کہ یہ دنیا اسی کی ہے جو اس کے رنگ میں رنگ جائے۔ سچ' ایمانداری اور دیانت کی تو بڑی قیمت چکانا پڑتی ہے۔ (جو میں چکا رہا ہوں) مگر میری تعلیم' میری تربیت اور میرے نام نے مجھے جو سکھایا ہے میں اس ڈگر سے ہٹ کر جی نہیں سکتا۔ اور مر مر کر جینے سے مجھے یہ زندگی پھر قبول ہے جس میں۔ بے چینی تو ہے مگر بے ضمیری نہیں۔ مجھے مرحومہ پروین شاکر کا ایک شعر یاد آرہا ہے۔

پیڑ کو دعا دے کر کٹ گئی بہاروں سے
پھول اتنے بڑھ آئے کھڑکیاں نہیں کھلتیں

اور باجی میرا شعر ہے کہ۔

رئیس الدین رئیس

مجھے کافی رئیس الدین ہوتا
زرافشاں وادی احباب کردے

لگتا ہے دونوں کے شعر دعا بن کر قبول ہوگئے۔

باجی! یہ بھی سچ کہ میں چہرے پر مکھوٹا نہیں رکھتا۔ جیسا ہوں اس کے اظہار میں ہچکچاتا نہیں خواہ سامنے والا جو چاہے تاثر لے...... کوئی جھوٹی بات نہیں کہتا کہ بعد میں شرمندگی ہو۔ ہاں آپ نے اسم بامسمی والی بات ٹھیک لکھی ہے کہ میں رئیس الدین ہوں واقعی رئیس دنیا نہیں ہوں۔ اپنے بارے میں کیا لکھوں ہمارا شجرہ حضرت ابوایوب انصاری رحمت اللہ علیہ سے ملتا ہے۔ آبائی وطن جیسور ضلع بلند شہر ہے۔ والد محترم ۱۹۴۰ء میں **علیگڑھ** آئے اور یہاں کوئلے کا تھوک کا کاروبار کیا اور اعلیٰ پیانے کیا بڑی خوشحال زندگی تھی میں آٹھویں کلاس میں تھا جب کئی ویگن کوئلہ اس وقت کے اسی ہزار روپے کا ریلوے کی غیرذمہ داری سے راستے میں کٹ گیا والد صاحب نے ریلوے پر مقدمہ دائر کردیا جو سپریم کورٹ تک چلا اور اس راستے میں آبائی وطن کی حویلی' امرود و آعام کے باغات' کاشت کی زمین' والدہ کے زیورات' **علیگڑھ** کا مکان' ہمارا مستقبل سب کچھ داؤ پر لگ گیا لیکن حکومت سے جیتنا آسان نہ تھا نہیں جیت سکے۔ آخری بازی ہار کر جب بستر پر آکر لیٹے تو بس لیٹے رہ گئے۔ میں ہائی اسکول میں تھا بڑے بھائی ہائی اسکول پاس کرچکے تھے چھوٹا بھائی پانچ سال کا تھا والدہ تھیں۔ ایک بیوہ پھوپھی تھیں جو اپنی شادی کے دسویں دن بیوہ ہوئیں پھر انہوں نے شادی نہیں کی۔ ہمارے والد نے سدا اپنے پاس رکھا۔ جب اباجی کا انتقال ہوا تو کچھ بھی پاس نہ تھا بس کئی لوگوں کے بھوکے پیٹ تھے۔ تعلیم تو چھوٹ ہی گئی پھر کام کی تلاش ہوئی وہ نوعمری' تعلیم معمولی' کیا نوکری ملتی تھی۔ پرائیوٹ طور پر کبھی کسی دکان پر کبھی فرم پر لکھنے پڑھنے کا کام کیا۔ چندہ ماہ بعد ہی والدہ محترمہ بھی اللہ کو پیاری ہوئیں اور چند ماہ بعد ہی پھوپھی صاحبہ بھی چل بسیں۔ بڑے بھائی نے اپنی دنیا الگ بسالی۔ شادیاں بھی ہوئیں اور اولادیں بھی الگ الگ ہیں۔ ہاں میں ۲ جون ۱۹۴۸ء میں پیدا ہوا تھا ۱۹۷۰ء میں شادی ہوئی۔ اب دو بیٹیاں ہیں بڑی بیٹی بشریٰ پروین بارہویں کلاس میں ہے' چھوٹی بیٹی شعیرہ فرحین پانچویں کلاس میں ہے۔ اولاد نرینہ سے محروم ہوں یعنی اندھے کو لاٹھی کا سہارا بھی نہیں ہے۔ آج بھی فروٹ منڈی میں اکاؤنٹ کا کام کررہا ہوں جہاں سے اتنی تنخواہ مل جاتی ہے کہ مہینہ میں پچیس دن دال روٹی مل جاتی ہے اس کے ساتھ ہولناک تاریک مستقبل کی لامتناہی فکر۔

کوئی سرکاری نوکری نہیں کہ **پینشن** ملے گی اور بڑھاپے میں روزی روٹی کی فکر نہ ہوگی۔ کوئی جائیداد نہیں کہ جس کا کرایہ پیٹ بھرتا رہے گا کوئی بیٹا نہیں کہ سہارا دے گا۔ کوئی کاروبار

تجارت نہیں کہ مستقبل کی فکر نہ رہے بس یہ دو بیٹیاں ہیں جن کے مستقبل کی فکر نے قبل ازوقت جھکا دیا ہے۔ یقیناً اللہ تعالٰی مسبب الاسباب ہے میں پابندی سے نماز پڑھتا ہوں۔ بیوی اور بچیاں بھی پڑھتی ہیں۔ باجی وہ لوگ کوئی اور تھے جن کے لئے من وسلویٰ اترتا تھا۔ چھپر پھاڑ کے دینے کی کہاوت ہی ہے۔ آج کل پیسے کو پیسہ کماتا ہے۔ آپ دس لاکھ کا کاروبار کیجئے ایک لاکھ کمایئے دس ہزار کا کاروبار کیجئے ایک سو کمایئے کبھی ایسا ہوا ہے کہ دس ہزار کے کاروبار میں ایک لاکھ نفع مل جائے؟ آدمی تو بس مزدوری کر سکتا ہے اور مزدوری میں پسینے کی بھی اجرت نہیں ملتی۔ یہ دور بھی انہیں قلمکاروں کا ہے جن کے ہاتھوں میں سونے کا قلم ہے یا جن کی کرسی آسمان کو چھوتی ہے بہرحال اللہ تعالٰی کی ذات پر یقین ہے اور اس کی طرف ہی آس لگی ہے۔

میرے مجموعہ کلام کے بارے میں عرض ہے کہ پچھلے سال ایک شفیق و مہربان دوست ساحر شیوی صاحب کی عنایت سے میرا شعری مجموعہ ''آسماں حیران'' ہے شائع ہوا ہے۔ ۱۹۷۰ء سے ہندوستان پاکستان کے تمام ہی معیاری رسائل وجرائد میں تخلیقات شائع ہو رہی ہیں پاکستان لنک امریکہ 'لبرٹی انگلینڈ' 'بازگشت ناروے اور بنگلہ دیش کے بھی رسائل میں شامل رہا ہوں۔ ساحر شیوی صاحب پھر لکھ رہے ہیں کہ دوسرا مجموعہ کلام ترتیب دے کر بھیج دوں دیکھئے کوشش کروں گا۔ آل انڈیا ریڈیو دہلی' آل انڈیا ریڈیو آگرہ کی شعری نشستوں ومشاعروں میں عرصہ دس سال سے شمولیت رہتی ہے۔ ہاں عوامی مشاعرے کم ہی نصیب ہوتے ہیں جس کی وجہ نوکری کی مجبوریاں اور گانے کا فن نہ آنا رہا ہے۔ آپ تو جانتی ہیں کہ آج کل کے عوامی شاعر صرف گلوکاروں کے دم پر چلتے ہیں یا ان شاعروں کے دم سے جو اسٹیج پر ناٹک بھی کر سکیں' بے حسی بھی ضروری ہے۔

ہاں ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا (آپ چاہتی بھی ہیں کہ کوئی دلچسپ واقعہ لکھوں) ایک کل ہند مشاعرے میں شرکت کے لئے میرے پاس دعوت نامہ لے کر ایک صاحب آئے ہیں۔ میں نے کہا کہ بھائی مجھے تو ترنم میں پڑھنا نہیں آتا۔ اگر شہرت ہی کیش کرنا چاہتے ہیں تو مجھے اسٹیج پر یونہی سجا دیجئے مگر وہ نہ مانے اور مجھے طویل سفر طے کر کے مشاعرہ میں جانا ہی پڑا ایک سے ایک جغادری ترنم والے شاعر موجود تھے۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ جب مجھے پڑھوایا گیا تو (آج بھی حیران ہوں) داد وتحسین کا ایک طوفان تھا۔ صرف میں ہی تھا جسے تین غزلیں پڑھنا پڑیں اور مشاعرہ کا کامیاب شاعر ٹھہرا۔ یہ سب کیسے ہوا کیوں کر ہوا آج بھی سوچتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں۔

گھر کا بیک گراؤنڈ لکھ چکا ہوں علی گڑھ ہی میں پیدا ہوا تھا۔ جدوجہد میں تو تمام ہی زندگی گزر چکی ہے۔ حالات نے کچھ کر گزرنے کی مہلت ہی نہ دی۔ سفر حیات میں کیا پایا ہے کیا کھویا

ہے اس کا گوشوارہ بنانے کی جرات مجھ میں نہیں ہے۔

میں کہتا ہوں ادب وشاعری میں ابلاغ ضروری ہے مگر ذریعہ کوئی معقول نہیں ہے۔ ادبی کتابیں رسائل ادبی پروگرام ہی ذریعہ ابلاغ ہیں مگر یہاں بھی ہر شعبہ میں من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو والا معاملہ ہے۔ اجارہ داری ہر جگہ ہے اور اجارہ داری ان لوگوں کی ہے جن کے ہاتھوں میں سونے کا قلم ہے یا وہ اونچی کرسیوں پر براجمان ہیں۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جن کو ایسے لوگوں کی پشت پناہی ملی ہے جو پہلے لکھا گیا ہے۔ اور اس کا کوئی حل تب تک نہیں نکل سکتا جب تک ہم ایماندار ہو جائیں خود کے لئے ادب کے لئے۔

دنیا میں بیشتر ممالک میں نئی نسل اُردو زبان سے نا آشنا ہے بلکہ یہ کہتے ہیں کہ جن ممالک میں اردو زبان پلی بڑھی ہے وہیں کی نئی نسل اردو سے نا آشنا ہوتی جارہی ہے جس کی ذمہ دار ان ممالک کی حکومتیں ہیں کہ آج سب سے اہم مسئلہ عیش وعشرت کی زندگی ہوگئی ہے جو اردو زبان کے ذریعہ نہیں مل سکتی ڈالر اور ریال کے درختوں پر اردو کی سیڑھی لگا کر چڑھا ہی نہیں جاسکتا۔

تنقید نگار جو کہتے ہیں وہ سب غلط ہے سچ تو یہ ہے کہ آج کا نقاد بے معنی ہے کیونکہ وہ دیانتدار نقاد نہیں ہے چند پاؤنڈز وڈالر اور یورپ کی سیر کے لئے بڑے بڑے نقاد اپنا قلم بیچ دیتے ہیں۔ آج کا بڑا نقاد اگر قلم اٹھاتا ہے تو ان شعراء وادیب کے لئے جن کے ڈنکے وہ بجوا چکے ہوتے ہیں اگر آج کے نقاد عہد حاضر کے ان قلمکاروں کے لئے بھی چند کلمات محفوظ کردیں جو اپنی جگہ بنا رہے ہیں تو اور مستحکم ہوسکتے ہیں۔ یہ بات تو قطعی غلط ہے کہ زندگی کسی اور سمت جارہی ہے اور ادب کسی اور سمت میرے خیال سے تو ادب زندگی میں اور زندگی ادب میں اس طرح محلول ہوگئی ہے کہ ادب ہماری زندگی کا جزو بن گیا ہے۔ آج کا شاعر اور ادیب چبائے ہوئے لقمہ نہیں اگل رہے ہیں بلکہ لوہے کے چنے چبا رہے ہیں اس کا احساس وہ بے حس نقاد ہی کرسکتے ہیں جو ایئر کنڈیشنڈ کمروں میں یا فائیو اسٹار ہوٹلوں میں بیٹھ کر ایک ڈگر پر تنقید فرما رہے ہیں اگر وہ آج کا ادب پڑھیں تب ہی تو معلوم ہوگا کہ ادب زندگی سے کس طرح جڑ گیا ہے۔ میرے یہ اشعار حوالے کے لئے درج ہیں۔

بہت عزیز ہے مجھ کو مسافتوں کی تھکن
سفر کو پاؤں کی زنجیر کرتا رہتا ہوں

میں شہر شہر بھٹکتا ہوں اور روزانہ
خود اپنی ذات کی تعمیر کرتا رہتا ہوں

رئیس الدین رئیس

عکسِ فن

قطعات

پتھروں کے شہر میں اے شخصِ آئینہ صفت
تجھ سے ہر آواز تیری اس طرح ٹکرائے گی
ذرہ ذرہ ٹوٹ کر ہوگا ترا اپنا وجود
اور دیارِ سنگ کی آندھی تجھے کھا جائے گی

○

دیارِ سنگ میں حیرت فزا سا ہے منظر
ضمیرِ اہلِ یقیں وُہم نے جھنجھوڑ دیا
تمام شہر میں بے چہرگی کا عالم ہے
طلسمِ شیشہ گری پتھروں توڑ دیا

○

مشکل تھا سفر راہ میں گو دھوپ کڑی تھی
پیروں میں مگر عزم کی زنجیر پڑی تھی
بچ بچ کے گزرتا تھا درختوں سے مسافر
منزل کی لگن سائے کی چاہت سے بڑی تھی

○

تیری عنایت سے کہتے ہیں مجھ کو رئیس الدین رئیس
تری عطا سے ہوا ہے روشن میرا نام ونسب اللہ

تسلیم الٰہی زلفی
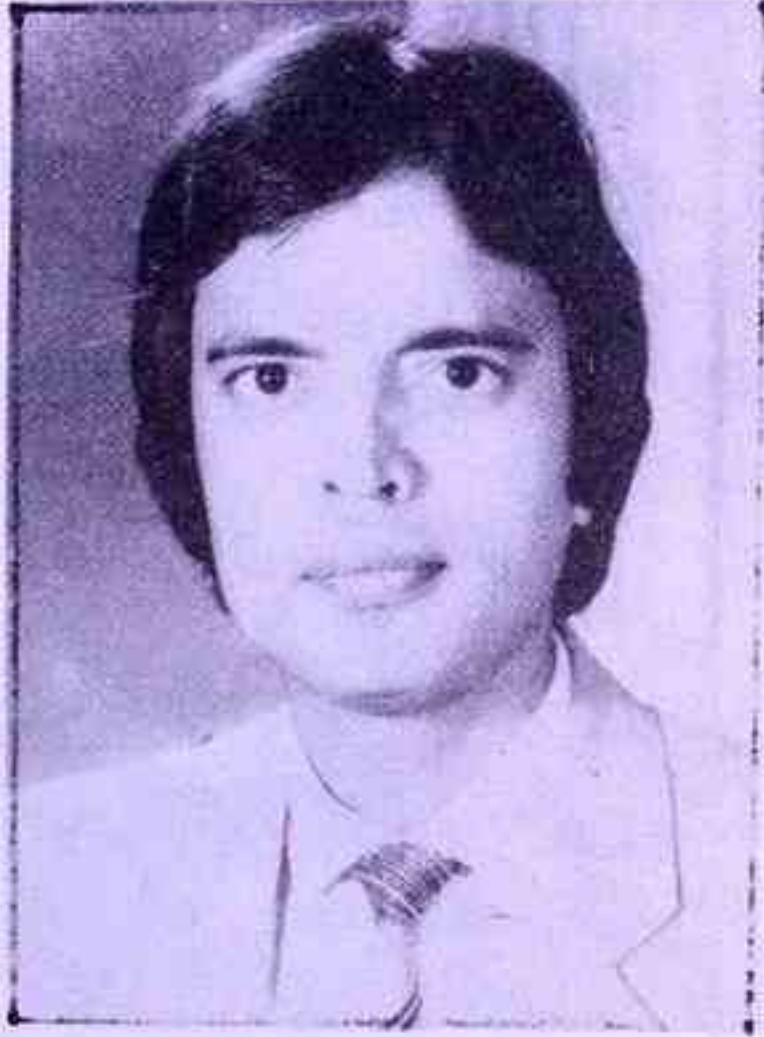
ہماری دوستی میں سخت گیری آ گئی ہے
یہ پودا نرم مٹی کا بچھڑنا چاہتا ہے

۱۲ نومبر ۹۵ء

Tasleem Ilahi Zulfi
138 Youk Land St
Unit # 77 Richmond Hill
ONTARIO LA5 IJI - CANADA

تسلیم الٰہی زلفی
(کینیڈا)

"تسلیم الٰہی زلفی باتیں تو اپنے عہد کی کرتے ہیں لیکن لب ولہجہ وہی اختیار کرتے ہیں جو ان کی مجلسی گفتگو کا ہوتا ہے۔ اسی لئے ان کا ہر شعر ایک انفرادیت لئے ہوتا ہے۔ لفظوں کا استعمال سوچ سمجھ کر کرتے ہیں"۔

زلفی کے بارے میں یہ رائے جناب فیض احمد فیض کی ہے جو جناب زلفی کے مجلّے "شخص و عکس" میں موجود ہے۔ آگے بڑھئے تو حفیظ جالندھری بڑی سنجیدگی سے رقم طراز ہیں۔ "زلفی اپنی زمین، تہذیب اور ادبی ماحول سے دور رہ کر بھی فکری طور پر جس طرح برصغیر سے جڑے ہوئے ہیں وہ قابل صد ستائش اور مبارکباد ہے۔ ان کے کلام میں تازہ کاری ہے"۔

علی سردار جعفری یوں گویا ہیں "زلفی کی شاعری میں گزشتہ چودہ پندرہ سال سے احتجاجی اور مزاحمتی رنگ بہت نمایاں ہے، جو ظاہر ہے ان کے وطن کی سیاسی اور استحصالی قوتوں کے خلاف ردعمل ہے۔ یہ بات قابل قدر ہے کہ ان کی احتجاجی اور مزاحمتی شاعری میں پھکڑپن یا جھنجھلاہٹ ہرگز نہیں بلکہ جدید روایتی غزل کی چاشنی اور زبان کی شائستگی ہے جو ان کی فکر اور مزاج کی دین ہے۔" ڈاکٹر مالک رام کہتے ہیں کہ میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ میں زلفی صاحب کی شاعری پر اظہار خیال کروں یا ان کی نثر نگاری پر کہ یہ ہر دو جہات کے شہ سوار ہیں۔ لیکن ابھی جب انہوں نے اپنی تازہ غزلیں سنائیں تو میرا یہ مسئلہ خود بخود حل ہو گیا کہ اب مجھے ان کی شاعری پر بات کرنی ہے۔ تو یوں ہے کہ زلفی کی شاعری میں بڑا رکھ رکھاؤ ہے۔ فکر میں گہرائی اور ذہن رسا کی وسعت ہے۔ یہ لفظوں کا انتخاب اور استعمال بڑی احتیاط سے کرتے ہیں۔ ان کی غزلوں کو پڑھ

کر اور ابھی سن کر مجھے یہ کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہو رہی کہ بلا مبالغہ ان کی شاعری اس عہد جدید کے رنگ و آہنگ میں رچی بسی ہوئی ہے۔ یہ بات میں پہلے بھی کہتا رہا ہوں کہ پاکستان میں نئی نسل کے شعراء بڑے خوبصورت شعر کہہ رہے ہیں جو بلاشبہ برصغیر ہندوپاک کی نمائندہ شاعری ہے۔ اور آج یہاں اس وقت تسلیم الٰہی زلفی اسی جدید تر نمائندہ شاعری کی نمائندگی فرما رہے ہیں"۔

چار بڑوں کی اس مسلم و مستحکم رائے کے بعد آیئے ہم زلفی سے گفتگو کرتے ہیں۔ مگر پہلے میں یہ بتا دوں کہ ان کا پیدائشی نام تسلیم الٰہی قریشی ہے اور تسلیم الٰہی زلفی ان کا ادبی نام ہے۔ ۱۳ جولائی ۱۹۴۳ء کو شکوہ آباد، ضلع مین پوری، آگرہ ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۴۷ء کے اواخر میں اپنے خاندان کے ساتھ کراچی پاکستان ہجرت کی، پھر ۱۹۵۰ء میں والدین کے ہمراہ دوسری ہجرت جدہ سعودی عربیہ کے لئے کی، جہاں ابتدائی تعلیم عربی مدارس سے پائی اور ثانوی تعلیم کے لئے اپنے وطن پاکستان گئے۔ وہاں کراچی یونیورسٹی سے سوشیالوجی میں امتیاز و اعزاز کے ساتھ ڈگری حاصل کی اور اس دور کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں نمایاں حصہ لیا اور بہت جلد شہرت و مقبولیت پائی۔ پھر سعودی عربیہ واپس چلے گئے، جہاں سے تیسرے مرحلے میں بیروت (لبنان) گئے اور امریکن یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم، اے کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فیض احمد فیض بیروت میں جلاوطنی کے دن گزار رہے تھے، لہٰذا زلفی کو وہاں ان کی صحبت حاصل رہی۔

تکمیل تعلیم کے بعد تسلیم الٰہی زلفی جدہ واپس آکر سعودی عربین ایرلائنز سے وابستہ ہوئے۔ جہاں بیس سال ایک ذمہ دار عہدے پر فائز رہے اور ساتھ ہی ساتھ شعر و ادب کی تخلیقی، اشاعتی اور مجلسی سرگرمیوں میں بھی مصروف رہے۔ اس طرح سعودی عرب میں اردو ادب اور تہذیبی اقدار کی بنیاد رکھنے اور اس کی ترویج و بقاء کے لئے عملی کارکردگی کا مظاہرہ کرنے کے بعد، جنوری ۱۹۹۰ء میں ٹورنٹو، کینیڈا تشریف لائے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی سے بارہا، خاص کر شمالی امریکہ کے عالمی مشاعروں اور کانفرنسوں میں زلفی مدعو کئے جاتے رہے ہیں۔ نیز دنیا بھر کے ادبی اجتماعات میں بھی شرکت کررہے۔ ۱۹۶۰ء کے اوائل سے ان کی تخلیقات برصغیر کے دقیق ادبی رسائل فنون، اوراق، سیپ، ادب لطیف، نیرنگ خیال، افکار، ادبیات وغیرہ وغیرہ میں پابندی سے شائع ہو رہی ہیں۔ جب کہ پہلا شعری مجموعہ "شہر افکار" ۱۹۶۷ء میں کراچی سے شائع ہوا۔ پھر جدہ سعودی عربیہ سے دوسرا شعری مجموعہ "دستاویز" ۱۹۸۳ء میں اور تیسرا دیوان "تنہا پرندے کی اڑان" ۱۹۹۰ء میں منظر عام پر آیا۔ شاعر زلفی کی ایک نثری کتاب "سخنور بہت اچھے" ہے جس میں پچیس ہم عصر شعراء و ادباء کے فن و شخصیت پر ان کے مطبوعہ مضامین، دیباچے، پیش لفظ اور منظوم خراج شامل

ہیں۔ نیز زلفی کا ایک منظوم عالمی سفرنامہ "آگرہ سے نیاگرہ" ہے جس کی پچیس ممالک پر سیاحی نظموں میں تہذیبی، تعمیری، فطری، تاریخی، سماجی، ادبی اور سیاسی قدروں کا تجزیہ ہے۔ اس کے علاوہ زلفی کی منتخب اردو نظمیں انگریزی ترجمے کے ساتھ "سات سمندر پار" کے نام سے ہیں۔ ان کا ایک اور شعری مجموعہ "ابابیلیں نہیں آئیں" ہے جس میں واقعاتی نظمیں شامل ہیں۔ زلفی کی ایک نہایت اہم کتاب "دیوان علی کرم اللہ وجہہ" کا عربی سے براہ راست اردو منظوم ترجمہ ہے، جو جلد شائع ہونے والی ہے۔ ادب میں ابلاغ کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے زلفی کہتے ہیں "ادب و شاعری خواب وخیال میں نہیں بسائے جاتے۔۔۔۔ تخلیق کئے جاتے ہیں اور یہ تخلیق کاغذ پر مرتسم ہو کر کتاب، رسالے، اخبار، ادبی اجتماعات اور نشریاتی میڈیا کے ذریعے اپنے قاری اور سامع تک پہنچتی ہے۔ ادب وشاعری کا ابلاغ ہر دور اور زمانے میں ایک مخصوص رفتار اور ڈھنگ سے ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ عہد حاضر میں ذرائع اور وسائل کی بہتری اور اضافے نے ابلاغ کی رفتار بڑھا دی ہے۔ اب یہ تو ہم لوگوں کی عادت بن گئی ہے کہ کبھی "ادب پر جمود" طاری ہونے کا رونا روتے ہیں اور کبھی ابلاغ ادب میں کمی پر تشویش کا اظہار کرتے ہیں۔ مجھے کوئی یہ بتائے کہ آیا میر وغالب کے زمانے میں ابلاغ ادب کی یہ رفتار اور وسائل تھے جو آج ہمارے عہد میں ہیں، کیا اس زمانے میں اتنی بڑی تعداد میں کتابیں، ادبی مجلات اور اخبار شائع ہوتے تھے یا عالمی سطح کے مشاعرے، کانفرنسیں اور نشریاتی ادارے ہوتے تھے؟ اگر نہیں تو یقیناً ہمارا عہد ابلاغ ادب میں کسی جمود کا شکار نہیں۔"

انہیں اس کا گہرا احساس اور دکھ ہے کہ ہمارے بچے اردو زبان سے ناواقف ہیں کہتے ہیں اب اگر دنیا کے بیشتر ممالک میں ہماری نئی نسل اردو زبان سے تقریباً ناآشنا ہے اور وہاں اردو کا مستقبل روشن نظر نہیں آتا تو یہ ہماری شخصیت کی ناپختگی اور احساس کمتری ہے جو ہماری تہذیب، ثقافت اور زبان سے اس قدر مرعوب ہیں کہ اپنے گھر میں بھی اس کی پیروی نہیں کرتے۔۔۔۔ اپنے بچوں سے اردو میں بات نہیں کرتے۔۔۔۔۔۔ اور بھونڈے انداز میں مغربی تہذیب کے پرچار اور غلط انگریزی بول کر فخر محسوس کرتے ہیں! اب جہاں ہماری اپنی پیدا کردہ ایسی صورتحال ہو وہاں ہماری تہذیب، ثقافت یا زبان کہاں تک دم نہ توڑے گی! لہٰذا لازم ہے کہ ہم اپنے تہذیبی اور لسانی ورثے کی بقاء کے لئے اپنے بچوں کو اپنی شناخت دیں اور نہ صرف یہ کہ ان سے اردو میں بات کریں بلکہ انہیں بھی اردو بولنے کی تلقین کریں، یہ نہیں کہ آپ تو ان سے اردو میں بات کر رہے ہیں اور وہ انگریزی میں جواب دے رہے ہیں۔۔۔۔ یہ صورتحال یہاں بیشتر گھروں میں دیکھنے میں آتی ہے۔ دوسرے یہ کہ اپنے بچوں کو اردو کلاسوں میں داخل کریں اور جہاں اردو

پڑھانے والے ادارے کام نہیں کر رہے ہیں وہاں والدین گھر پر باقاعدگی اور پابندی سے اردو کی تعلیم دیں۔"

ہمارا اگلا سوال دورِ حاضر کے تنقید نگاروں کے رویئے کے بارے میں تھا۔ اس ضمن میں ان کا کہنا ہے کہ ہمارے عہد کے نقادوں نے جانب داری اور مصلحت اندیشی کو اپنا کر خود کو ایک تماشا بنا لیا ہے! اور یہی جانب داری و مصلحت اندیشی ان نقادوں سے ان کے منظورِ نظر ادباء و شعراء کی تخلیقات میں معنی و مفاہیم کے ایسے بلند و بالا پیرائے تراشوا لیتی ہے کہ ایوانِ ادب میں تہلکہ مچ جاتا ہے اور بے چارے دوسرے تخلیق کاروں کے چراغوں کی لوئیں تھرتھرانے لگتی ہیں' جسے یہ نام نہاد نقاد "ادب کی بے معنویت" کا نام دیتے ہیں! جب کہ یہ تنقید کی بے معنویت ہوتی ہے----!

○

وہ جو اڑ سکتے تھے ان پر بندشِ پرواز تھی
طائرانِ پر بریدہ کو کھلا رکھا گیا

○

یوں تو افسانہ وہی تھا اور وہی کردار تھے
ہر دفعہ زلفی کوئی عنواں نیا رکھا گیا

تسلیم الٰہی زلفی

عکس فن

غزل

یہ صبح کیسی ہوئی، کیسا یہ سویرا ہے
ہمارے گھر میں ابھی تک وہی اندھیرا ہے

نہ جانے اب کے برس ہاریوں پہ کیا گزرے
پکی ہے فصل تو، بادل بہت گھنیرا ہے

اب اپنے نام کی تختی اتار دو لوگو!
ہمارے شہر کا عالی نسب لٹیرا ہے

میں اپنے سر کو چھپاؤں تو پاؤں کھلتے ہیں
دیا منڈیر پہ رکھوں تو گھر اندھیرا ہے

کٹے شجر کو نئی رت کا حال کیا معلوم
کہ واسطہ تو یہاں موسموں سے میرا ہے

پرند کیوں نہ اڑیں اس درخت سے زلفی
کمان بن گئیں شاخیں جہاں بسیرا ہے

ساحل صدیقی

جب آ کے ملیں گے وہ گلے پیار سے ساحلؔ
پھر کوئی نہ شکوہ نہ گلہ یاد رہے گا

ساحل صدیقی

Sahil Siddiqui

Sahil Siddiqui
17, Booth Ave
Sydenham, Overport - 4091
DURBAN (South Africa)

ساحل صدیقی

(ڈربن، ساؤتھ افریقہ)

میں نے ساحل صدیقی کا کلام "شمع" دہلی میں پڑھا ان کی ایک غزل نے متاثر کیا تو میں نے ان سے رابطہ کیا۔ ان کا نام رضوان میاں صدیقی ہے اور تخلص ساحل صدیقی۔ ۱۹۳۸ء سن پیدائش ہے۔ وطن دیوبند۔ تعلیم بی۔ اے تک حاصل کی۔ ان کا سلسلہ نسب خلیفہ اول امیرالمومنین حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملتا ہے۔ پیشے کے اعتبار سے طبیب ہیں۔ عرصہ دراز تک سہارنپور میں اور اس کے بعد رام پور میں مطب کیا۔ اس کے بعد دوستوں اور عزیزوں کے اصرار پر ڈربن آگئے کیونکہ وہاں یونانی طریقہ علاج کی ضرورت تھی۔ انہیں غزل اور نظم کے علاوہ مختصر افسانہ سے بھی دلچسپی ہے، لیکن مکمل وابستگی صنف غزل ہی سے رہی۔

ہمارے اگلے سوال کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ "شعر گوئی کا شوق بچپن ہی سے تھا۔ شاید یہ شوق ورثہ میں ملا ہے اس لئے کہ میرے نانا مرحوم حضرت حبیب حسن وحشی اپنے وقت کے کامیاب اور قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کا شمار اساتذہ میں ہوتا تھا اور وہ نواب مرزا داغ دھلوی کے ہم عصر تھے۔ امیر مینائی کے شاگردوں میں جس طرح جلیل مانک پوری کا نام قابل ذکر ہے اسی طرح حضرت وحشی کے شاگردوں میں علامہ تاجور نجیب آبادی کا نام بھی سرفہرست ہے۔ انہوں نے پہلی غزل غالباً دس سال کی عمر میں کہی تھی۔ جس کا ایک شعر آج بھی ان کے ذہن میں محفوظ ہے۔

جن کے کارن دنیا چھوڑی وہ خود ہم کو چھوڑ گئے
کیسے کیسے لوگ جہاں میں بیگانے بن جاتے ہیں

ساحل صدیقی کا کہنا ہے کہ ادب وشاعری کے لئے ابلاغ ضروری ہے۔ ادب رسائل اور

اخبار اس سلسلہ میں معاون ثابت ہوتے ہیں' لیکن ادب وشاعری کا فروغ رسائل واخبارات کی مقبولیت یا غیر مقبولیت پر منحصر نہیں ہے۔ جس زمانے میں رسائل اور اخبارات بہت کم تھے اس زمانے کا ادب زیادہ معیاری تھا۔ علمی اور تحقیقی عمل زیادہ ضروری ہے۔

یہ کہنا درست نہیں کہ علمی اور ادبی پروگرام نہیں ہوتے۔ معتبر اطلاعات کے مطابق نہ صرف ملک میں بلکہ بیرون ملک بھی بہت کامیاب پروگرام اردو کی ترقی اور فروغ کے لئے منعقد کئے جارہے ہیں۔ اردو کی مستقل تنظیمیں مختلف ممالک میں کام کررہی ہیں۔ جن کے تحت اردو کانفرنس' اردو سیمینار' عالمی مشاعرے مخصوص ادبی نشستیں منعقد کی جارہی ہیں۔ ادیبوں' شاعروں اور فنکاروں کی حوصلہ افزائی اور عزت افزائی کی جارہی ہے۔

اس کے علاوہ شکاگو ریڈیو سے اردو پروگرام "رنگین محفل" مستقل طور پر نشر کیا جاتا ہے۔ ڈنمارک سے اردو کے دو ماہنامے "منزل" اور "شاہین" شائع ہورہے ہیں۔ شمالی امریکہ سے ہفتہ روزہ "پاکستان لنک" اور آسٹریلیا سے اردو کا پندرہ روزہ رسالہ عرصہ دراز سے شائع کئے جارہے ہیں لیکن ان تمام تر کوششوں اور جدوجہد کے باوجود علمی اور تحقیقی عمل کی نہایت ضرورت ہے۔ جس کے بغیر اردو کا نہ حال روشن ہو سکتا ہے اور نہ مستقبل۔

اور اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کسی زبان کو سیکھنے کے لئے اور اس کا علم حاصل کرنے کے لئے صرف چند رسائل اور اخبارات پڑھ لینا کافی نہیں ہوتا۔ زبان کو باقاعدہ پڑھا اور سیکھا جاتا ہے' اور کیونکہ اردو اب ہماری ضرورت نہیں بلکہ غیر ضروری اور اختیاری شے ہوگئی ہے اس لئے اس کا سیکھنا بھی ضروری نہیں رہا ہے۔ اردو کے بغیر ہمارے سب کام پورے ہوجاتے ہیں۔ ہر ایک ضرورت پوری ہوجاتی ہے' اس لئے اردو زبان کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف غیر ممالک میں بلکہ اپنے ملک میں بھی نئی نسل اردو زبان سے ناواقف ہے۔ یہ صورت حال اردو زبان کے لئے بڑی تشویشناک ہے۔ اس سلسلے میں کچھ بنیادی اور مثبت اقدامات کی ضرورت ہے۔

- ○ گھر میں اردو کا ماحول بنانا چاہئے۔ گھر کے سبھی افراد اردو زبان ہی میں بات چیت کریں۔
- ○ والدین بچوں کے لئے اردو کی بنیادی تعلیم کا انتظام کریں۔ یا خود پڑھائیں۔
- ○ والدین اردو کی چھوٹی چھوٹی نظمیں' اشعار' کہانیاں بچوں کو سنائیں اور یاد کرائیں۔
- ○ بچوں کو اردو میں خط وکتابت سکھائیں۔
- ○ مشاعروں' ڈراموں اور اردو کے دیگر پروگراموں میں والدین اپنے بچوں کو ساتھ لے جائیں۔

○ گھر میں کم از کم اردو کا ایک اخبار، رسالہ ضرور آنا چاہیے۔ اخبار، رسالے اور کتابیں خرید کر پڑھیں۔

○ اردو میں نظم و نثر کے تحریری اور تقریری انعامی مقابلے ہونے چاہئیں۔ اس طرح بچوں کی ہمت افزائی ہوتی ہے۔

○ اسکولوں میں ابتدائی درجات تک اردو کی تعلیم کا انتظام ہونا نہایت ضروری ہے، اس سلسلہ میں کوششیں کی جائیں۔

ہم نے پوچھا کیا آج کا ادب اپنے دور کا ترجمان ہے؟ ان کا فرمانا ہے کہ "ادب کبھی بے معنی نہیں ہوتا اور نہ ہی ہو سکتا ہے۔ الفاظ بھی ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔ ادب زندگی کا ترجمان ہوتا ہے، زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ اسی کو ادب برائے زندگی کہتے ہیں۔ اور اگر ادب اور زندگی کی سمتیں مختلف ہو جائیں، ادب زندگی کی ترجمانی نہ کرے تو اس ادب کو "ادب برائے ادب" کا نام دیا جائے گا۔

آج کے ادیب اور شاعر کے سلسلے میں یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اس نے زندگی کے مسائل سے راہ فرار اختیار نہیں کی اور نہ تلخ حقیقتوں سے چشم پوشی کی ہے، بلکہ وہ انتہائی بیباکی کے ساتھ معاشرہ میں چھائی ہوئی برائیوں اور ناانصافیوں کے خلاف نبرد آزما نظر آتا ہے۔ جہاں تک چبائے ہوئے لقمے اگلنے کا سوال ہے---- تو اس بات سے کم از کم میں اتفاق نہیں کرسکتا۔ ہر زمانے اور ہر دور کے مسائل مختلف ہوا کرتے ہیں، شاعر اور ادیب اپنے اردگرد کے ماحول اور حالات سے متاثر ہوتا ہے اور اس کے جذبات زمانے کے نشیب و فراز کا مظہر ہوتے ہیں، اس حقیقت کے باوجود بھی حالات و افکار کی مماثلت کو کسی طرح بھی "چبائے ہوئے لقمے" کہنا درست نہیں ہوگا۔

مثال کے طور پر---- اقبال نے کہا کہ۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

موجودہ دور کا شاعر اس طرح کہتا ہے۔

جن درختوں سے پھل نہیں گرتے
ان کے نزدیک آندھیاں رکھ جا

عکس فن

متفرق اشعار

پھر تعاقُب میں ہے فرعُون کا لشکر اللہ
قوم کے ساتھ نہ موسیٰؑ نہ پیمبرؐ اللہ
پیر پھیلانے کی عادت بھی ہے کچھ ساحل کو
مختصر اتنی نہیں جسم کی چادرؔ اللہ

○

اس کے چہرے پہ بھی آنکھیں ہیں وہ دیکھے مجھ کو
میں ہوں مظلوم تو کیوں سُوئے ستمگر دیکھوں
تیری محفل میں ہر اک شخص ہے پتھر کی طرح
کیا کروں میں نہ اگر جانبِ آذر دیکھوں

○

اب ترے پیار میں پہلی سی وہ خوشبو بھی نہیں
پُھول بھی کوئی نہ اب میری کتابوں میں رہا
کون پڑھتا مجھے اور یاد میں کس کو رہتا
ذکرِ ساحل مراؔ منسوخ نصابوں میں رہا

○

گو عمر مری دشت نوردی میں کٹے گی
لیکن تری گلیوں کا پتا یاد رہے گا

رحمٰن واگلے ساز
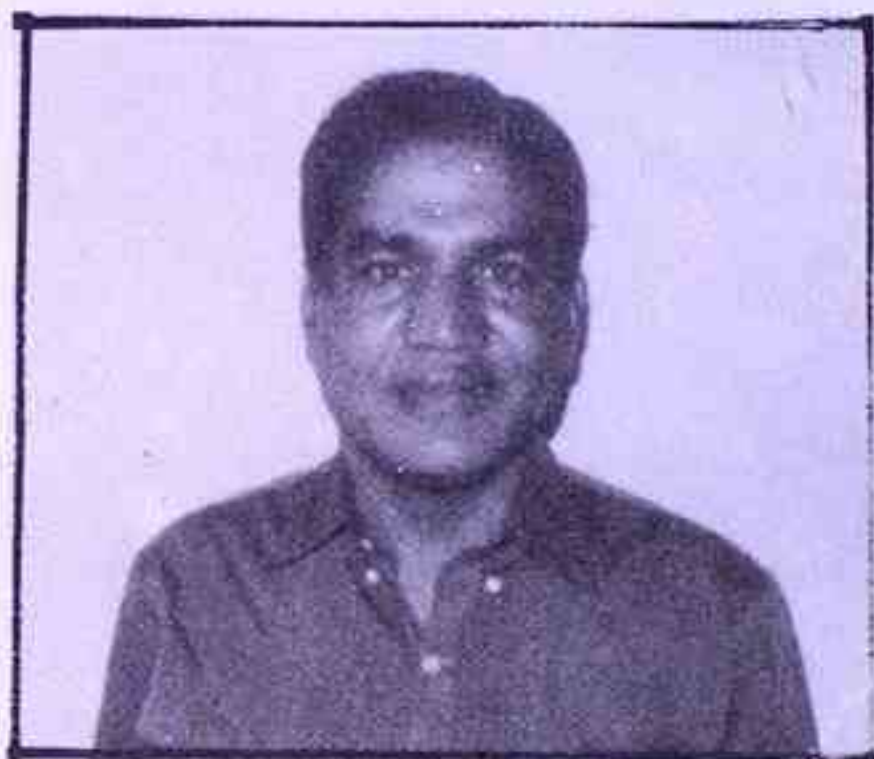
نوائے ساز ہے جب داستانِ سوزشِ غم
اِس عندلیب سے رنگیں بیاں میں کیسے ہم ہوں

رحمان واگلے ساز
2/25/96

Rehman Wagle Saz
7120, Venburen Way
BUENA PARK CA 90620 - U.S.A.

رحمٰن واگلے ساز
(لاس اینجلس)

رحمٰن واگلے ان کا نام ہے اور ساز تخلص۔ تاریخ پیدائش یکم جنوری ۱۹۴۱ء اور مقام پیدائش بمبئی ہے۔ بمبئی کے ہاشمیہ ہائی اسکول سے ڈگری لینے کے بعد سینٹ ڈیویس کالج سے انٹرمیڈیٹ پاس کیا۔ اس کے بعد ناگپور یونیورسٹی سے فارمیسی میں بی۔ایس کی ڈگری حاصل کی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب شاعری سے حقیقی لگاؤ کا آغاز ہوا۔ اور اردو ادب سے بھی دلچسپی پیدا ہوئی۔ "آخری خواہش" ایک ڈرامہ لکھا جس کو بین یونیورسٹی مقابلہ میں ایوارڈ دیا گیا اور یہ ڈرامہ ریڈیو سے براڈ کاسٹ بھی کیا گیا تھا۔

یونیورسٹی کی طالب علمی کے زمانے میں سیاسی طنزیہ نظمیں لکھنے کا آغاز ہوا۔ ناگپور یونیورسٹی سے بی۔ایس کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد امریکہ کی مسی سپی یونیورسٹی میں اسکالرشپ کے ذریعہ داخلہ حاصل کیا اور یہاں سے ایم۔ایس ان فارمسیوٹکل سائنس کی ڈگری حاصل کی۔ اور اس کے بعد دو سال تک پی۔ایچ۔ڈی کا کورس مکمل کیا لیکن بعض وجوہات کی بناء پر یہ ڈگری حاصل نہ کرسکے۔ لیکن سلسلہ تعلیم جاری رکھتے ہوئے نیویارک سے ایم۔بی۔اے کی ڈگری حاصل کی جو اچھی ملازمتوں کے حصول میں ممد و معاون رہی۔ اسی زمانہ میں مسلم اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کی بنیاد بھی رکھی۔ ان مصروفیات کے باوجود شعر و سخن کا شوق وذوق ترقی کرتا گیا اور غزلیں لکھنی شروع کیں۔ لیکن ان غزلوں کی کسی سے اصلاح لینے کا موقع نہیں ملا۔ کثرت مطالعہ ہی کی مدد سے اپنی غزلوں کی خود ہی اصلاح کرتے رہے۔ اور رفتہ رفتہ ان غزلوں کی خامیاں دور ہوتی گئیں اور ان کا رنگ نکھرتا گیا۔

تنہائی اور فکر و تخیل کو متحرک کرنے والے مشاہدات اور واقعات ان کے لئے فکر شعر و سخن کی تحریک کا باعث ہوتے ہیں۔ ان کے پسندیدہ اور محبوب شعراء میں غالب، فیض احمد فیض، مجاز لکھنوی، ساحر لدھیانوی، جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری اور جگر مراد آبادی وغیرہ جیسے شاعر شامل ہیں۔ اگرچہ ان کی غزلوں میں مذکورہ بالا شعراء کے فکر و مکاتب خیال کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں لیکن ان کے اپنے رنگ میں حقیقت پسندی اور سماجی مسائل پر طنز اور بیداری کے رجحانات بھی نظر آتے ہیں۔

ایک سال چند ماہ پہلے ۹۵ء میں انہوں نے "اردو کلچرل سوسائٹی" کے نام سے ایک ادارہ کی بنیاد رکھی جس کا بنیادی مقصد دیار مغرب (خصوصاً امریکہ) میں اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی ہے۔ اس مقصد کے تحت اس سوسائٹی نے گذشتہ سال کے دوران چھ ادبی محفلیں منعقد کی تھیں۔ جن میں غالب اور اقبال پر سیمینار، ادبی مباحثہ، زبان پر مقالہ جات، مشاعرے، بیت بازی اور بزم موسیقی وغیرہ شامل تھے جن میں مقامی ادیبوں، شاعروں اور دیگر فنکاروں نے بہت بڑی تعداد میں حصہ لیا اور یہ تمام اجتماع نہایت کامیاب رہے۔ رحمٰن وا گلے ساز کا یہی کام انہیں اردو زبان کی تاریخ میں زندہ جاوید رکھنے کے لئے کافی ہے کہ انہوں نے اردو زبان کی آبیاری کے لئے "اردو کلچرل سوسائٹی" کے نام سے ایک انجمن کی بنیاد ڈالی اور پھر اپنی بہترین تنظیمی صلاحیتیں استعمال کرتے ہوئے اس کے فروغ و مقبولیت کی منصوبہ سازی کر کے اپنے احباب میں کام کرنے کا جذبہ پروان چڑھایا۔ زبان و ادب کے ساتھ رحمٰن وا گلے ساز کا یہ خلوص ہی تو ہے کہ احباب ان کے مزاج کی تپش اور معصوم نادانیوں کو بھی جھیل جاتے ہیں اور ان کی محنت و لگن کو سراہتے ہوئے ان کی جدوجہد میں قدم قدم ان کے ساتھ چلتے ہیں۔

اقبال کہہ گئے ہیں کہ

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

ساز نے علامہ اقبال کے اس نکتہ کو پالیا ہے اور مسابقت کے اس دور میں اپنی اردو کلچرل سوسائٹی کو ادب اور کلچرل کے مختلف رنگوں سے سجا بنا کر نکھارنے میں اپنے شب و روز ایک کئے ہوئے ہیں۔ سوسائٹی کے صدر خضر مسیحا ان کے ساتھ ایک عزم صمیم کے ساتھ ڈٹے ہوئے ہیں۔ خضر مسیحا نے اردو کی ترقی کے لئے ایک اہم کام اور کیا کہ اردو کی کلاسز شروع کر دی ہیں تاکہ نئی نسل اردو پڑھنا اور لکھنا تو سیکھ لے۔ اور بلاشبہ یہ محنت، یہ لگن رائیگاں نہیں جائے گی۔

رحمٰن وا گلے ساز

عکس فن

آج رنگیں بیاں خموش ہیں کیوں
آج اہلِ زباں خموش ہیں کیوں

رہبرانِ زباں خموش ہیں کیوں
شاعرِ نکتہ داں خموش ہیں کیوں

غزل

غمِ حیات کو آرامِ جاں میں کیسے کہوں
جمودِ زیست کو عمرِ رواں میں کیسے کہوں

کیا ہے خون کی بارش سے جب چمن سیراب
بہارِ نو کو بھی آخر خزاں میں کیسے کہوں

اٹھائے پھرتا ہوں کندھوں پہ جب حیات کی لاش
شکستہ دل کو بھلا نوجواں میں کیسے کہوں

دیا ہے شانِ کریمی نے مجھ کو تحفۂ غم
نوازشوں کو بھی بارِ گراں میں کیسے کہوں

متفرق اشعار

گلے کا ہار گلوں کا نکھار لکھا ہے
حسین گلاب کو جانِ بہار لکھا ہے

○

ہتھیلیوں کی لکیروں میں اے مریضِ وفا
نہ شب کو نیند نہ دن کو قرار لکھا ہے

سحر مہدی

یہاں کی سرزمینِ عداوت کو دیکھ کر
شیطانیت سمیٹ کے شیطان گھر گیا

سحر مہدی
23/فروری 1996ء

Saher Mehdi
166, Morlborough Rd
Dagenham Essex ENGLAND RM8-2HA - U.K.

سحر مہدی
(انگلینڈ)

کہتے ہیں آگہی رحمت بھی ہے اور زحمت بھی۔ لیکن زحمت کو سراپا رحمت بنالینا بھی ایک فن ہے اور نجم السحر مہدی کو دیکھیں تو یہ بات سو فیصد سچ نظر آتی ہے۔ صنف نازک کی حیثیت سے نہ صرف گھر کی ذمہ داری ان کے نازک کاندھوں پر ہے بلکہ بیرونی ذمہ داریوں سے بھی نبرد آزما ہیں۔ خدمت خلق کے لئے اپنے مجازی خدا رحمٰن مہدی کے ساتھ قدم بقدم موجود۔ انگلینڈ کے معروف شب وروز میں سر اٹھانے کی فرصت نہیں۔ مگر ہر وقت مسکراتی صبح کے تارے کی سی شگفتہ چمک آنکھوں میں لئے نجم السحر ہر خدمت کے لئے حاضر نظر آتی ہیں۔ ان کی اپنی ایک سماجی تنظیم "حلقہ احباب" کے نام سے معروف ہے۔ عید بقر عید ہو یا پاکستان کے حوالے سے کوئی تقریب ہو، رحمٰن اور سحر ہر لمحہ چاق وچوبند نظر آئیں گے۔ اس پر مستزاد نجم السحر کی علمی وادبی مصروفیات، مشاعرے بھی برپا ہو رہے ہیں اور طرحی غزلیں بھی وارد ہوتی ہیں لیکن ان زحمتوں کو رحمتیں بنالینے کا فن سحر خوب جانتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک باوصف بیوی، ماں، دوست اور شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھی شہری بھی ہیں۔

سحر نے ۲۳ فروری ۱۹۶۲ء کو پاکستان کے شہر کراچی میں جنم لیا۔ گورنمنٹ اسکول نشتر روڈ کراچی سے میٹرک (سائنس) کیا۔ سرسید گرلز کالج کراچی سے نفسیات، سیاسیات واکنامکس میں گریجویشن کیا۔ ویسٹ ہیم کالج لندن سے آر۔ایس۔اے اور چند شارٹ کورسز بھی کئے۔ والدہ کی جانب سے سادات جارچہ غازی آباد انڈیا سے تعلق ہے۔ اس مٹی سے اٹھنے والے علامہ ابن حسن جارچوی جامعہ کراچی کے چانسلر وائس رہ چکے ہیں۔ فلسفہ آل محمد حصہ اول، دوئم، سوئم،

چہارم کے بھی مصنف ہیں۔ ان کی بصیرت امروز مجالس آج بھی اپنی مسلم حیثیت رکھتی ہیں۔ نخشب جارچوی بھی کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اسی طرح ظفر عباسی جارچوی (مصنف شمع طور) ادبی حلقوں میں واضح پہچان رکھتے ہیں۔

والد کی جانب سے سادات بنارس سے نسبت ہے۔ والد صاحب کے دادا اور پردادا سید احمد رضوی و سید محمد رضوی بنارس میں اپنے وقت کے بڑے مشہور مرثیہ گو تھے۔ اس طرح یہ ورثہ اپنی تیسری و چوتھی پیڑھی میں اپنی ہیئت بدلتا ہوا سحر کے حصہ میں آیا۔ (بہن بھی شاعری کرتی ہیں مگر انکا ذریعہ اظہار انگریزی ہے) والد اپنے زمانہ طالبعلمی میں ہی تشکیل پاکستان کے وقت خاندان کے چند افراد کے ہمراہ کراچی آبسے تھے جبکہ کچھ وہیں رہ گئے۔ اس طرح سحر کا رابطہ بہ یک وقت دونوں جگہ سے رہا ہے۔

گریجویشن کے فوراً بعد ہی والدین کے ساتھ لندن منتقل ہو گئیں۔ یہاں پر تعلیمی مراحل کے دوران ۱۹۸۳ء میں شادی کے بندھن میں بندھ گئیں۔ چند سالوں تک والد اور بھائی کے ساتھ ان کے بزنس میں شامل رہیں۔ پھر شوہر کے ساتھ ان کے کاروبار سے وابستہ رہیں مگر اپنے گلستان میں ننھے منے پھول کھل جانے کے بعد مکمل طور پر خود کو گھر سے وابستہ کرلیا۔

شاعری سے وابستگی کے بنیادی محرکات کے سلسلے میں سحر کا کہنا ہے کہ جب شعور سے آگہی کے مراحل میں داخل ہونے کا دور تھا تو زندگی کے ہر میدان سے احساس کے ہر مضمون تک تحیرات کا گھیراؤ تھا۔ دل ہر مضمون کی جانب لپکتا تھا۔ دماغ ہر میدان کو سر کرلینا چاہتا تھا مگر رفتہ رفتہ جب ٹھہراؤ کی کیفیت آئی تو پتہ چلا کہ قلم کا شاعری سے رشتہ استوار ہوچکا ہے۔ شروع شروع میں جب اشعار ہوجاتے تھے تو بڑی دیر تک ایک بے یقینی کے ساتھ خوش کن حیرانگی کا بھی احساس رہتا تھا۔ چنانچہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ پہلی باقاعدہ نظم اپنے اسکول کی کلاس دہم کی الوداعی پارٹی کے موقع پر کہی تھی جو بہت حد تک تک بندی تھی مگر دلچسپ مصرعوں کے باعث کئی سال تک ہیڈ مسٹریس کے آفس میں دیوار پر آویزاں رہی۔ سحر کا تعلیمی ریکارڈ بھی بہت شاندار رہا ہے۔ پانچویں جماعت میں جب بورڈ کے امتحان میں اپنے علاقے کے تمام اسکولوں میں اول پوزیشن حاصل کی تھی تو والدہ نے کتابوں کا سیٹ بطور تحفہ دیا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب کورس کی کتابوں کے علاوہ دیگر کتابیں پڑھیں۔ یہیں سے ان کے شوق کو پرواز ملی۔ اب مطالعہ کا یہ عالم ہے کہ کسی دن کچھ پڑھ نہ لیں تو عجیب سی بے کلی رہتی ہے۔ جہاں تک شاعری کا تعلق ہے تو یہ ہنر قدرت نے خود بخود ان کے قلم کو عطا کردیا ہے۔ کہتی ہیں "کبھی کبھی میں خود اپنی ذات کے انتشار سے شعوری طور پر آگاہ نہیں ہوتی مگر جب الفاظ اشعار کی شکل میں خود ہی ڈھل جاتے ہیں

تو اپنا آپ خود پر منکشف ہو جاتا ہے۔ یوں اپنے اندر جھانکتے رہنے کا روزن ہے میری شاعری۔ اپنے اندر ہر انسان کے ایک جہان آباد ہوتا ہے۔ اور اس جہاں کی سیر کرتے رہنا مجھے بت اچھا لگتا ہے۔"

شاعری کے علاوہ ادب کی دیگر اصناف سے بھی سحر کی وابستگی ہے۔ اس کی تفصیل بتاتے ہوئے کہتی ہیں کہ

"شاعری کو بنیاد بنا لینے کے باوجود قلم کبھی کبھی تبدیلی چاہتا ہے۔ یہ کیفیت زمانہ طالبعلمی میں زیادہ تھی۔ یوں شاعری کے ساتھ مختلف مضامین اور افسانے بھی لکھے۔ جب قلم میں روانی آئی تو ملک کے مختلف اخبارات و رسائل میں یہ مضامین اور افسانے بھی چھپے۔ مگر یہ مستقل لائن نہیں تھی۔ مزاج تھا جو تبدیلی کا خواہاں رہتا تھا۔ یوں بھی یہ ان وقتوں کی باتیں ہیں جب نہ فرائض تھے نہ ذمہ داریوں کے سلسلے۔ مگر شادی کے بعد زندگی نے حقیقتوں کا سامنا کرنا سکھایا تو قلم کا لہجہ ہی بدلتا چلا گیا۔ اور شاید اسی بدلے ہوئے لہجے نے مسلسل مطالعہ سے مل کر توجہ کو لپک لیا۔ شوہر کا بھی بھرپور ساتھ رہا جو خود بھی ادبی مزاج رکھتے ہیں۔ اور ایسا بھی ہوا کہ ایک طویل عرصہ خاموشی کی نذر ہوگیا یا یوں کہیں کہ زندگی کے تانے بانے پیش نظر رہے۔ اب فرصت کا لمحہ ملتا ہے تو طبیعت گزری ہوئی کیفیات کے اظہار کے لئے شاعری پر ہی آمادی ہوتی ہے۔ شاعری میں نظموں، غزلوں سے لے کر قطعات اور آزاد شاعری پر طبع آزمائی کی ہے مگر غزل کی زمین من پسند ہے۔ جہاں تک آزاد نظموں کا تعلق ہے تو میرے خیال میں وہ شاعری کی تلچھٹ ہیں مگر اوزان وضوابط سے خارج ہونے کے باوجود بسا اوقات اپنے اچھوتے خیال اور سلیقہ اظہار کے ساتھ دل کو چھوتی ہیں۔"

ادبی رسائل کی عدم مقبولیت اور اس کے ممکنہ حل کے سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ "دراصل ہمارے یہاں تعلیم کے فقدان نے ہمیں ذہنی مفلسی عطا کی ہے جو نسل در نسل چلی آرہی ہے۔ تھوڑی بہت تعلیم نے یہ تو بتا دیا کہ کیسے پڑھا جائے مگر کیا پڑھا جائے اس سے نابلدی ہی ہے۔ ڈائجسٹوں کی بھرمار کا بھی اس میں بہت بڑا ہاتھ ہے۔ اس کے باوجود جو لوگ ادب کے قدر سے واقف ہیں اور اپنی پوری سنجیدگی و توانائی کے ساتھ اس کے لئے کام کر رہے ہیں وہ ان حالات میں بہت قابل قدر ہے۔ خصوصاً وطن سے دور دیگر ممالک میں۔ برطانیہ میں بھی پچھلی چند دہائیوں کے مقابلہ میں آج نہ صرف اردو بولنے اور پڑھنے والوں کی تعداد بڑھی ہے بلکہ اردو زبان میں اخبارات و رسائل بھی شائع ہو رہے ہیں۔ البتہ ان میں جو چیز گراں گزرتی ہے وہ انگریزی الفاظ استعمال کرنے کی کثرت اور اردو کی جا بجا غلطیاں ہیں۔ تکلیف دہ چیز یہ ہے کہ یہ اخبار اور رسائل

نکالنے والوں میں سے بیشتر ادبی حیثیت سے بھی مشہور ہیں۔ وطن عزیز میں تعلیم کو عام کرنا' اور جہاں تعلیم ہے وہاں اس کے معیار کو بڑھانا ہی ممکنہ حل تک بنیاد بن سکتا ہے۔ آج عام طور پر یہ بات مستند مانی جاتی ہے کہ علوم اتنی تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہے ہیں کہ انسانی عمر اس کے لئے بہت چھوٹی ہے یہاں تک کہ کسی ایک علم کی صرف ایک شاخ کا ماہر بننے کے لئے بھی عمر کا بیشتر حصہ جدوجہد میں گزر جاتا ہے۔ پھر ہمارے لوگوں کا وقت ضائع کرنا چہ معنی دارد۔ اب ہر شخص کو یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ بارش کا پہلا قطرہ خود بنتا ہے۔ دراصل تعلیمی نظام کے ناقص ہونے پر تو ہر شخص شکوہ کناں ہو سکتا ہے۔ ہر شخص تنقید کر سکتا ہے۔ لیکن اگر تنقید ہی اسے سنوار سکتی تو یہ کام کب کا ہو چکا ہوتا۔ اس کے لئے ہر فرد واحد کو اپنا مثبت کردار ادا کرنا ہوگا۔ صاحب ادب افراد کو اپنے قلم اپنی گفتار سے زنگ آلود ذہنوں کا چمکانا ہوگا۔ اور یہ کوئی ایک دو دن کا کام نہیں ہے۔ زمانے چاہیں اس کے لئے"۔

سحر مہدی اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں۔ کہتی ہیں کہ دیار غیر میں ہمارا ادیب اپنی تشخصی ذمہ داری کم و بیش نبھا ہی رہا ہے مگر جو علم وہ کاغذ پر منتقل کر رہا ہے اسے پڑھنے یا سمجھنے والوں میں کم از کم یہاں کی نئی نسل شامل نہیں ہے اس کی بہت بڑی ذمہ داری والدین پر بھی عائد ہوتی ہے۔ کیونکہ وہی اپنے بچوں کا پہلا مدرسہ ہیں۔ وہ وقت گزر چکا جب معاشی و اقتصادی بدحالی نے ہمیں سراسیمہ کیا ہوا تھا مگر آپس کی کاٹ چھانٹ نے ہمیں آج بھی دوسری قوموں سے کہیں پیچھے لا پھینکا ہے۔ کہتے ہیں بند مٹھی لاکھ کی' کھل گئی تو خاک کی۔ اتحاد و یکجہتی پیدا کریں --- راہیں خود بخود استوار ہو جائیں گی وہ راہیں جو علم بڑھاتی ہیں علم سکھاتی ہیں۔ ہماری نئی نسل کا بیشتر حصہ یہاں کے ماحول کا پروردہ ہے۔ اپنے آباؤ اجداد کے کارناموں سے لاعلمی اسے دوسری اقوام سے متاثر ہونا سکھا رہی ہے۔ ورنہ تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو ہر میدان میں مسلمانوں کے کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ یہ شاندار کارنامے کون آگے بڑھائے گا؟ والدین کا فرض ہے کہ انھیں اپنے بچوں سے روشناس کرائیں۔ اپنے آپ پر فخر کرنا سکھائیں۔ اور اردو کو زندہ رکھنا ہے تو اردو سے پیار کریں۔ اس پیار کو عام کریں۔ اور اس کے لئے ہمیں بنیاد سے اٹھنا ہوگا۔ یعنی اپنے گھر سے۔ اپنے بچوں سے میں خود بھی حتی الامکان روز مرہ کی گفتگو میں اردو زبان کو اپنے ممکنہ رچاؤ تک استعمال کرتی ہوں۔ اس طرح بچے دن کا جس قدر حصہ ہمارے ساتھ گزارتے ہیں ان کے کان نہ صرف اپنی زبان سے مانوس رہتے ہیں وہ ہمارے ذو معنی جملوں اور محاوروں تک کو سمجھتے ہیں اور اکثر انکا استعمال بھی کرتے ہیں۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ والدین خود ہی انگریزیت کا شکار ہوتے ہیں جو میرے نزدیک بیمار ذہن کی علامت ہے وہ ذہن جو برسوں غلامی کی زنجیروں میں جکڑا رہا ہے۔

میں انگریزی زبان کے خلاف نہیں بلکہ کوئی بھی زبان ہو اسے سیکھنا اور بر محل اس کا استعمال اپنی جگہ مسلم حیثیت رکھتا ہے۔ مگر اپنی پہچان صرف اپنی زبان و اقدار میں ہی ہے۔

برطانیہ میں اب اردو اسکولوں میں بھی پڑھائی جاتی ہے۔ اور یہ بڑی خوش آئند بات ہے۔ یہاں ایسی کئی تنظیمیں ہیں جو پوری تندہی سے اپنی زبان اور ثقافت کی ترویج و ترقی کے لئے کام کر رہی ہیں ہم نے خود بھی "حلقہ احباب" کے نام سے پچھلے سال ایک تنظیم متعارف کرائی ہے جس کے دیگر مقاصد میں سے ایک نمایاں مقصد یہ بھی ہے کہ ہم اپنے ہر قومی و مذہبی دن کی تقریب نہ صرف پر شکوہ انداز میں منائیں بلکہ خاص طور پر بچوں کو آگے لائیں اور ہر انداز میں ان کی حوصلہ افزائی کریں بہر حال یہ ہمارا آنے والا کل ہیں، مستقبل ہیں۔ اس سلسلے میں بڑے مثبت پہلو ہمارے سامنے آئے ہیں۔ اور اس بات پر یقین ہو گیا ہے کہ۔

گر ہمت کی جولانی ہے
تو پتھر بھی پھر پانی ہے

○

سحر مہدی

عکسِ فن

غزل

گُل سے مہک، چمن سے متاعِ ہنر گیا
"تم کس ہوا میں ہو وہ زمانہ گزر گیا"

شوقِ جنوں میں کوئے ملامت نکل گیا
دل حدِ اعتبار سے آگے گزر گیا

بینا ہوئی جو آنکھ تو منظر بدل گئے
گویا ہوئی زباں تو دعا سے اثر گیا

خوف و ہراس بانٹتی پھرتی ہیں بلائیں
شہروں میں آگ و خون کا آسیب در گیا

یارب پھر ایک بار اَبابیل بھیج دے
میرے شہر میں فیلِ تباہی اتر گیا

یاں کی سحر زمین عداوت کو دیکھ کر
شیطانیت سمیٹ کے شیطان گھر گیا

امجد علی سرور

دکھ کے قانون اپنی مٹھی میں
جرم اب لان میں ٹہلتا ہے

امجد
۱۵/۱۲/۹۵

Amjad Ali Serwer
P.O.Box 3333
DOHA - QATAR (A.G.)

امجد علی سرور

(دوحہ۔ قطر)

امجد علی سرور خوش الحان' خوش گفتار' خوش سلیقہ' خوش نویس اور خوش فکر شاعر کا نام ہے۔ ۱۹۹۰ء میں دوحہ آئے۔ بزم سے متعارف ہوئے تو اراکین بزم نے صمیم قلب سے خوش آمدید کہا۔ پھر یوں ہوا کہ "پہلے جاں' پھر جان جاں' پھر جاناں جاناں ہوگئے۔" اور اب بزم کی ضرورت بن کر رہ گئے ہیں۔ خلقت نشرواشاعت سے سرفراز کئے گئے تو بزم کا شعبہ نشرواشاعت چہار دہام شہرت کی بلندیوں تک پہنچا۔ مجال ہے کہ ہندوپاک کے نمائندہ اخبار ورسائل میں بزم کی خبریں نہ ہوں۔ اب بزم و سرور لازم وملزوم گردانے جاتے ہیں۔ دوحہ کی ایک اور معروف فعال اسلامی ادبی تنظیم "حلقہ ادب اسلامی قطر" کے معتمد عمومی کے منصب کو بھی ۱۹۹۳ء سے بحسن خوبی انجام دے رہے ہیں۔

میرا امجد علی نام ہے۔ جامعہ ملیہ دہلی سے ادب اور میٹرک کرنے کے بعد خود کو مزید حصول علم پہ آمادہ نہ پاکر انتخاب روزگار کی سوجھی۔ شاعر آثار مزاج کی نزاکت نے کشیدہ کاری کو منتخب روزگار قرار دیا۔ والد محترم نے اس شوق کی باریابی کے لئے استاد سے مشین' دکان اور سامان تک مہیا کردیا۔ تادم تحریر ذریعہ رزق وشوق وہی گل بوٹے ہیں کبھی لفظوں کے پھول مصرعوں میں ٹانک دیتے ہیں تو کبھی ریشم کے پھول کپڑوں پہ۔ یہی قدر مشترک سرور کے فنی سفر کا طرۂ امتیاز ہے۔ ہر پڑاؤ پہ اپنے فن کا مظاہرہ کرتا ہوا جنکپور روڈ' سیتامڑھی (بہار) بمبئ اور بحرین ہوتا ہوا یہ شاعر قطر تک آیا ہے۔ محترم کیف پرتاپگڈھی سے ابتدا میں اور ڈاکٹر خلیل الرحمن راز سے کچھ عرصہ قبل تک اصلاح سخن لیتے رہے ہیں۔ ہندوپاک کے تمام مشہور ادبی رسائل وجرائد میں

شائع ہو چکے ہیں اور اصناف شاعری میں حمد، نعت، سلام، پابند نظم، آزاد نظم، سانٹ، رباعیات، قطعات، گیت وغیرہ پر طبع آزمائی کر چکے ہیں۔

۹ ستمبر ۱۹۵۵ء کو بردا ہادر بھنگہ بہار (ہندوستان) میں پیدا ہونے والے امجد علی سرور نے اپنے طالب علمی کے دور سے شعر کہنا شروع کئے۔ اس سلسلے میں کہتے ہیں کہ "چونکہ میرے گاؤں میں میری معلومات کے مطابق اس وقت کوئی شاعر نہ تھا۔ البتہ افسانہ نگاری کے میدان میں پیام نیّر نے اپنے قدم جمالئے تھے۔ اور کسی حد تک کامیاب بھی ہو چکے تھے۔ طالبعلمی کا زمانہ تھا۔ ادبی ماحول تھا نہیں۔ باوجود اس کے شاعری کی طرف خود کو مائل پاتا تھا اور کچھ شعر موزوں کرلیتا تھا۔ جسے دوستوں میں سنا کر سکون محسوس کرتا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ دو ایک حضرات باضابطہ شاعر ہیں لیکن گاؤں کے لوگ ان سے واقف یا بہت کم واقف تھے۔ ان کی حوصلہ افزائی نے جلا بخشی اور میں جزوقتی اور کل وقتی شعر کہنے لگا"۔

سرور شاعری میں آسان زبان استعمال کرتے ہیں کہتے ہیں۔ "ادب و شاعری کے لئے ابلاغ یقیناً ضروری ہے۔ ذریعہ ابلاغ نے ہمیں ایک دوسرے سے مربوط رکھا ہے۔ آج گھر بیٹھے ساری دنیا کے ادب کو سمجھ سکتے ہیں اور ہم ایک دوسرے سے قریب تر ہیں۔ جہاں تک ادبی رسائل کی عدم مقبولیت کا مسئلہ ہے تو "شمع" (دہلی) "رابطہ" (کراچی) "شاعر" (بمبئی) اور کئی دیگر رسائل ہیں جو نہ صرف معیاری ہیں بلکہ ان کی مقبولیت اردو بستیوں میں خوب تر ہے۔ میں سمجھتا ہوں آج ساری دنیا میں جس قدر اردو زبان کے لئے کام ہو رہا ہے شاید کسی دوسرے مقامی زبان یا سرکاری زبانوں پر کام نہیں ہو رہا ہو۔ اردو پہلے ہندوستان کی زبان تھی۔ اب نہ صرف ایشیا بلکہ ساری دنیا میں اسے دوسری بڑی زبان کی حیثیت حاصل ہے۔ اسکو عام کرنے کے لئے نعرہ بازی سے زیادہ عملی خدمت کی ضرورت ہے۔ ہم جہاں رہیں اپنے بچوں کو قرآن کی تعلیم کی طرح اردو کی تعلیم بھی دلوانی چاہئے۔ اگلی نسل کو ہم جس قدر تیار کر سکیں گے اردو کا مستقبل اتنا ہی تابناک ہوگا۔ عالمی پیمانے پر کس طرح درس وتدریس کا انتظام بحال کیا جائے اس کی باضابطہ تحریک شروع ہو چکی ہے۔ آج خلیجی ممالک اور مغربی ممالک میں جگہ جگہ مشاعرے، سیمینار، ادبی اجلاس منعقد کرائے جا رہے ہیں اور خوب کامیاب ہیں۔ کئی جگہ سے اردو رسائل بھی نکل رہے ہیں۔ ادباء، شعراء حضرات کی ہر جگہ خوب پذیرائی ہو رہی ہے۔ نت نئے الفاظ، نئے مفہوم، نئی ترکیبیں، نئے اسلوب، نئی صنعتیں، نئے تجربے اور نئی فکر اردو کی شاعری میں کثرت سے نمایاں ہو رہی ہیں اور اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ میدان عمل میں جلوہ گر ہیں۔ یہ غلط ہے کہ نئی نسل اردو سے نا آشنا ہے۔ اردو کو آج دنیا کے سامنے ہم دوسری بڑی زبانوں کے طور پر پیش

کر سکتے ہیں۔ البتہ لکھنے کی حد تک کی ضرور ہے۔ اس کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔ ویسے میں مطمئن ہوں اور اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں۔

تنقید نگاروں کے بقول کہ "آج کا ادب بے معنی ہوتا جارہا ہے اور اثر پذیر نہیں ہے"۔ کسی حد تک تو درست ہے مگر کلی طور پر تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔ دراصل اردو پر جس قدر کام ہو رہا ہے اندرون ملک تا بیرون ممالک ہر کوئی اپنی بساط علم کے اعتبار سے اپنی خدمات پیش کر رہا ہے۔ ظاہر ہے ہر کسی کے لئے معیار مقرر تو نہیں کیا جاسکتا۔ ہر زمانے میں چند ہی شخصیات شہرت کی بلندی کو چھوسکی ہیں۔ آج کا ادب آج کی شاعری عہد حاضر کی ہی ترجمان ہے۔ آج ادب برائے ادب کی نہیں ادب برائے زندگی اور مقصدی اصلاحی شاعری کی ضرورت ہے اور اس فکر کی طرف شعراء ادبا رفتہ رفتہ آرہے ہیں۔ جو یقیناً امید افزا ہے۔

رباعیات

"اردو"

اونچا ہے زمانے میں مقامِ اردو
قائم ہے بہرطور نظامِ اردو
نقّاد، ادیب اور غزل خواں کے طفیل
دلکش ہے، دل آویز کلامِ اردو

"ہوس"

سوئے ہوئے فتنوں کو جگاتی ہے ہوس
طوفان حوادث کے اٹھاتی ہے ہوس
زَن اور زَمیں، زَر کی طلب میں اکثر
اِنسان کو شیطان بناتی ہے ہوس

امجد علی سرور

عکسِ فن

غزل

خرامِ ناز سے دل میں جو گھر نہیں کرتے
ہم ان کا تذکرہ شام و سحر نہیں کرتے

تھیں آگے پھول سے بچوں کی حسرتیں ورنہ
پرندے بھول کے عزمِ سفر نہیں کرتے

کسے خبر تھی کہ ویران شہر کردیں گے
یہ حادثے تو کسی کو خبر نہیں کرتے

ضمیر و ظرف کے سوداگرو! خیال رہے
یہ کاروبار ہم اہلِ ہنر نہیں کرتے

وطن میں ہوتیں جو پوری ضرورتیں سرورؔ
دیارِ غیر میں خونِ جگر نہیں کرتے

○

تنگ ہے چادر ہماری اپنی قسمت کی طرح
پاؤں ڈھکتے ہیں تو رہتا ہے ہمارا سر کھلا

○

اُس کی خوش بختی پہ نازاں کیوں نہ ہوں اہلِ جہاں
موت سے پہلے ہی جس فنکار کا جوہر کھلا

رفعت سروش

محبت میں نئی لرزش کی فضا ہی
زمانہ جب کبھی کچھ احساس رکھ دے

رفعت سروش
۱۲ اپریل ۹۶ء

Rifat Sarosh
a-80, Sector,27
NOIDA 201301, INDIA

رفعت سروش

(دہلی)

رفعت سروش شاعر بھی ہیں اور ادیب، ڈرامہ نگار اور انشاء پرداز بھی۔ ۲ جنوری ۱۹۲۶ء کو نگینہ ضلع بجنور (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ نگینہ اور موانہ (ضلع میرٹھ) میں بچپن اور لڑکپن گزاری۔ جوانی بمبئی اور دہلی میں گزارا۔ نام ان کا سید شوکت علی ہے لیکن ۱۹۴۲ء میں انہوں نے قلمی نام رفعت سروش اختیار کیا۔ چنانچہ اب اسی نام سے جانے جاتے ہیں۔ تعلیم گریجویشن تک حاصل کی۔ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۸۴ء تک آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ رہے۔ اس کے بعد غالب انسٹیٹیوٹ دہلی سے وابستہ رہے۔ اب ملازمتوں سے آزاد زندگی گزار رہے ہیں۔ جس تخلیقی سفر کی ابتدا ۱۹۳۸ء سے انہوں نے کی تھی وہ اب بھی جاری ہے۔

جون ۱۹۳۸ء میں ایک دو شعر سے شاعری کی ابتدا کی۔ بحیثیت شاعر باقاعدہ طرحی مشاعروں میں دسمبر ۱۹۳۸ء سے سید شوکت علی شوق کے نام سے شرکت کی۔ ۱۹۴۲ء میں کچھ دن شعر گوئی ترک کردی تھی۔ پھر دسمبر ۴۲ء سے نیا رنگ و آہنگ، ایک نئے نام رفعت سروش سے شروع کی۔ پہلی نظم "گلاب کا پھول" ان کے نئے نام سے رسالہ ہمایوں لاہور میں شائع ہوئی۔ پھر ان کا کلام ادبی دنیا، شاہکار، ادیب اور دیگر رسائل میں شائع ہونا شروع ہو گیا اور اب تو ہندوستان و پاکستان کے تمام معروف رسالوں میں ان کی تخلیقات شائع ہوتی ہیں۔

رفعت سروش ترقی پسند نظریاتی کے قائل ہیں لیکن نظریاتی انجماد کو تخلیقی کاوشوں کے لئے مضر سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک شاعری پر کوئی نظریہ لادنا اس کے حسن کو تباہ کرنے کے مترادف ہے۔ لیکن وہ شاعری میں ابلاغ کو ضروری خیال کرتے ہیں ورنہ انسان لکھے کیوں اور کوئی پڑھے

کیوں؟ ہاں اگر ابلاغ سے مراد سیاسی پارٹی کا پروپیگنڈ ہو تو ابلاغ قطعی ضروری نہیں۔ اسی طرح ادب میں صحت مند تنقید کے بھی حامل ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ گروہ بند نقادوں نے تو ادب کا بیڑا غرق کردیا ہے۔ غیرجانبدارانہ تنقیدی نشستیں بلاشبہ مفید ہوتی ہیں کیونکہ ان میں کھل کر اظہار خیال کیا جاسکتا ہے۔

"ادبی رسائل آج مقبول کیوں نہیں؟" اس سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ "ادبی رسائل شائع کرنے کا مقصد محض تجارت ہے تو وہ گروہ بندی کے شکار ہوں گے۔ گر بہ صورت دیگر رسائل بکتے ہیں۔ کتابیں مقبول کیوں نہیں ہوتیں؟ اس مسئلے کا ایک حل تو یہ ہے کہ ہر ادیب دوسرے کی کتاب خرید کر پڑھے اور دیگر شائقین کو بھی کتابیں خریدنے کی تلقین کرے۔ اعزازی طور پر کتابیں حاصل کرنے کا رجحان ختم ہوجائے تو حالات بہتر ہوسکتے ہیں۔ اسی طرح اردو کی بقا کے لئے ضروری ہے۔ چاہے وہ امریکہ ہو یا ہندوستان یا پاکستان کہ جس زبان سے ہم محبت کرتے ہیں اس کے ادب کو پڑھیں۔ امریکہ اور یورپ میں یہ طریقہ اختیار کرنا چاہئے کہ کتاب کی Community Reading کی جائے۔ یہ مقرر کرلیا جائے کہ فلاں اور فلاں کتاب قسط وار پڑھی جائے گی تو جو لوگ پڑھنا نہیں جانتے مگر اردو بولتے ہیں ان کے کانوں تک بھی اردو ادب کی پہنچ ہوگی اور اس طرح ایک جماعتی حیثیت ہوجائے گی۔ اس سلسلے میں ایک مشورہ اور ہے کہ امریکہ میں وہاں کے لوگ جن ادیبوں اور شاعروں کو مدعو کریں وہ اعلیٰ درجے کے ادیب اور شاعر ہوں تاکہ اس کو سن کر اور ان سے مل کر نوجوان نسل میں ذوق سخن پیدا ہو۔ صرف متشاعر گویوں اور ناشاعر خواتین کو مجمع لگانے کے لئے بلانا اردو دشمنی کے مترادف ہے"۔

"کیا ہم اردو شاعری کے ذریعے ایسا ادب تخلیق کررہے ہیں جو زندگی سے بھرپور ہو اور جس کی جڑیں ہماری زمین میں دور تک پیوست ہوں۔" اس سوال کے جواب میں رفعت سروش کا کہنا ہے کہ اچھے ادب کی پہچان ہی یہ ہے کہ اس کی جڑیں ہماری زمین میں ہوں۔ بے جڑ کے پودے کبھی پھولتے پھلتے نہیں۔ اوروں کی بات اور جانیں۔ میری کوشش تو یہی ہے کہ میں اپنی زمین سے رشتہ جوڑے رکھوں۔ ہواؤں میں معلق رہ کر ادب نہیں پیدا کیا جاسکتا۔ مجھے اعتراف ہے اور آپ کا فرمانا بالکل صحیح ہے کہ ادیب اور شاعر کی تخلیقات اپنے عہد کا منظرنامہ ہوتی ہیں۔ آج کی شاعری بھی اس کسوٹی پر پوری اترتی ہے مگر اس کا فیصلہ آج نہیں کل ہوگا، جب سطحی شاعری اپنی موت مرجائے گی۔ وہی شاعری بچے گی جس میں زندگی کا دل دھڑکتا ہوگا"۔

آخری سوال کے جواب میں رفعت کہتے ہیں کہ شاعر کی ذات اور اس کے تجربات میں اس

کا پورا ماحول موجزن ہوتا ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ آج عالمی ادب کے مطالعہ کے بغیر اور نظریات سے بے خبر ہو کر شعر کہنا تضیع اوقات ہے۔ زندہ شاعروں کی مثالیں دینا غیر مناسب ہے۔ ہمارے دور میں راشد، فیض اور اختر الایمان بلاشبہ ایسے شاعر تھے جن کی شاعری ان جہات سے آشنا ہے جس کا ذکر سطور بالا میں کیا گیا ہے"۔

رفعت سروش کی دسترس میں لفظ کے اظہار کی تمام اصناف ہیں اور ناقدین ادب نے انہیں قادر الکلام شاعر تسلیم کیا ہے اور صاحب طرز نثر نگار بھی۔ ان کی مطبوعات کی فہرست خاصی طویل ہے۔ ۹ شعری مجموعے، ٦ منظوم ڈراموں کی کتابیں، ایک ناول، ٦ نثری تخلیقات اور تین تراجم۔ ان کی فنکارانہ صلاحیتوں کے اعزاز میں انہیں سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ، ہم سب غالب ایوارڈ (برائے ڈرامہ) آغا حشر عالمی اردو ایوارڈ (برائے ڈرامہ) انجمن عروج ادب ایوارڈ (برائے ڈرامہ) نشاط سجاد ظہیر (برائے ترقی پسند نظریات) باب العلم ایوارڈ (برائے اوپیرا نگاری) میرا کادمی ایوارڈ، دہلی اردو اکادمی کا خصوصی ایوارڈ (برائے شاعری) اور مختلف کتابوں پر مختلف اردو اکادمیوں کے ١٦ ایوارڈ پیش کئے جا چکے ہیں اور ان کی پچاس سالہ ادبی خدمات کے اعتراف میں رسالہ فکر و آگہی "رفعت سروش نمبر" شائع کر چکا ہے۔ اس ضخیم خصوصی نمبر کا ادبی حلقوں میں گرم جوشی سے استقبال کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ چند سال پیشتر بھوپال یونیورسٹی کی ایک طالبہ رعنا نور نے ایم۔ اے کے لئے ان کے منظوم ڈراموں پر خصوصی مقالہ لکھا ہے اور اسی یونیورسٹی کی ایک طالبہ عطیہ سلطان "رفعت سروش: شخصیت اور فن" کے عنوان کے تحت پی ایچ ڈی کے لئے تحقیقی مقالہ لکھ رہی ہیں۔

○

رفعت سروش

عکسِ فن

گھر

ہمارے گھر کی تھیں بس چار کچی دیواریں
شگفتہ رنگ کی بیلوں سے جو مہکتی تھیں
وہ سوندھی سوندھی سی، میٹھی عجیب سی خوشبو
بس ہوئی ہے میرے ذہن کے گلستاں میں
گزرتی گرمی میں چھپر چھوایا جاتا تھا
وہ بانس، پھونس کا چھپر، جسے چڑھاتے تھے
ہمارے سارے محلے کے لوگ جب مل کر
تو ایسا لگتا تھا ہم پر سبھی کا سایہ ہے
یہ کچا گھر تھا، مگر اس میں پیار بستا تھا
یہ ماتما کا گھروندا تھا، اس کے آنگن میں
میں گھٹنوں چلتا تھا، اٹھتا تھا اور گرتا تھا
مری بہن نے پکڑ کر یہیں میری انگلی،
مجھے سکھایا تھا، کیسے سنبھل کے چلتے ہیں
یہیں گزارا تھا بچپن، یہیں مسیں بھیگیں
مہک یہاں کی ابھی تک ہے میری سانسوں میں
کیا ہے وقت کی گردش نے مجھ کو آوارہ
چھٹا وہ گھر، تو پھرا شہر شہر میں، لیکن
جو کچے گھر میں سکوں تھا، ملا نہ محلوں میں
وہ ماسکو ہو کہ بغداد، بمبئی، لاہور
جہاں گیاں ہوں وہاں اپنے گھر کی یاد آئی
بدل گیا ہے زمانہ، بدل گئیں قدریں
وہ لوگ ہیں، نہ وہ ماحول ہے، نہ وہ دن رات
نہ سر پر باپ کا سایہ، نہ گود ممتا کی
بزرگ ہے نہ کوئی اور نہ کوئی بھائی بہن
ہر ایک دولت نایاب چھن گئی ہے
بہت الجھتا ہے جی شہر شور و شر میں جب
تو اپنے قصبے کی مانوس، تنگ گلیوں میں
میں اپنے گھر کا کھنڈر جا کے دیکھ آتا ہوں

سلطان الحسن فاروقی

کیا ہے غسل جس نے کوثر و تسنیم سے سلطان
وہی پاکیزہ و شائستہ ہے اردو زباں میری

آدمی کی قدر کیجئے   یہ خدا کا شاہکار ہے

سلطان فاروقی

۱۳ر دسمبر ۱۹۹۵ء

Sultanul - Hansan Farooqi
12 Burlington Road
Muswell Hill, LONDON N10 INJ
ENGLAND - U.K.

سلطان الحسن فاروقی

(لندن)

سلطان الحسن فاروقی شاعر بھی ہیں' افسانہ نگار بھی' تنقید نگاری بھی کرتے ہیں اور مصوروادا کار بھی ہیں۔

۱۶ دسمبر ۱۹۳۲ء میں ریاست گوالیار کے علاقہ اجین میں پیدا ہوئے۔ راجپوتانہ بورڈ ریاست بھوپال سے ہائی اسکول کی تعلیم حاصل کی۔ تقسیم ہند کے دوران کراچی آکر آباد ہو گئے۔ اسلامیہ کالج کراچی سے جغرافیہ اور پولیٹکل سائنس میں گریجویشن کیا۔ کالج کی بزم ادب کے سیکریٹری بھی رہے۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ ملازمت جاری رکھی۔ پہلے اسٹیٹ بنک آف پاکستان میں ملازمت اختیار کی۔ پھر امریکن ایمبیسی میں بطور آرٹسٹ رکھے گئے۔ مختلف ایڈورٹائزنگ ایجنسیز کے لئے بھی کام کیا۔ دوران تعلیم افسانے لکھے جو "ساقی اور نقوش" میں شائع ہوتے تھے۔ پروفیسر محمد حسن عسکری' جوش اور ابوالخیر کشفی کی صحبت نے ان کے ادبی ذوق کو جلا بخشی۔ لہٰذا ۱۹۶۰ء دہائی میں جب برطانیہ آکر آباد ہوئے تو شاعری میں سخن آزمائی اور "چھوٹی بحر کے سلطان" کہلائے۔ یہاں پر انہوں نے سینٹ مارٹن اسکول آف آرٹس سے پینٹنگ اور گرافک ڈیزائن کی سند حاصل کی۔ اسی دوران مختلف ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں میں کام کرتے کرتے ایک دن آرٹ ڈائریکٹر کے عہدے تک پہنچ گئے۔ اب کونسل اور دینی اداروں کے علاوہ کتابوں کے سرورق ڈیزائن کرتے ہیں۔ بچپن کا شوق آج کا ذریعہ معاش بن گیا ہے۔

۱۹۷۸ء میں انجمن اردو کی بنیاد رکھی جس کے تحت ادبی محفلیں اور مشاعرے منعقد کرواتے تھے۔ اسی دوران ایشین سینٹر کے سیکریٹری بھی رہے۔ لندن میں آغا شمس الدین کے مشہور ڈرامے میں "مرزا غالب لندن میں" مرزا غالب کا کردار ادا کیا۔

ہجری سال شروع ہونے سے پہلے ڈاکٹر کلیم صدیقی کے ایما پر ڈاک ٹکٹ ڈیزائن کیے جن کی نہ صرف کامیاب نمائش ہوئی بلکہ ڈاک کے یہ ٹکٹ پاکستان' ایران' بنگلہ دیش کویت اور سعودی عرب نے اپنے نام اور کرنسی کے ساتھ چھاپے' جو ایک اعزاز ہے۔ مشہور جریدے "امپیکٹ"

کے لئے کارٹونسٹ کی حیثیت سے اپنے فن کا لوہا منوایا۔ اپنی متعدد خوبیوں کے متعلق سلطان صاحب کہتے ہیں۔

کتھا کہانی، چتر کویتا، ناٹک اور سنگیت
راج محل کی ان پریوں میں قید ہوا سلطان

ان سے ہمارا پہلا سوال تھا "دنیا میں کوئی بھی کام کوئی بھی شخص کر سکتا ہے سوائے شاعری کے۔ شاعری اگر فطرت میں ہو تو بھی کسی چوٹ، کسک کی ضرورت ہوتی ہے آپ کا محرک کیا تھا؟"

"اگر چوٹ لگی ہوتی تو اس سے بھی بڑا شاعر ہوتا۔ دراصل ادبی صحبت ملی، اچھے شعراء کو سنتا تھا جوش صاحب سے ہر ہفتہ ملاقات رہتی تھی یوں شوق کو شاعری لازم ہو گئی"۔

"اچھا شاعر اچھا مصور بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنی جزئیات نگاری سے ہی بھرپور نقشہ کھینچ دیتا ہے آپ بیک وقت شاعر بھی ہیں اور آرٹسٹ بھی۔ کیا اس سے شاعری دو آتشہ ہوگئی؟"

"آرٹ تو میرا ذریعہ معاش ہے صرف شاعر ہوتا تو بھوکوں مرجاتا۔ اب شاعری پیٹ تو نہیں بھرتی نا۔ ویسے کسی چیز سے متاثر ہوتا ہوں تو بھی غزل فوراً نہیں ہوتی۔ مصروف آدمی ہوں ٹائم نہیں ملتا، فرصت کے اوقات کا، البتہ شاعری دلچسپ اظہار ہے۔۔۔۔ مطالعہ کا شوق ہے مگر میرے خیال سے بہت زیادہ علم حاصل کرکے انسان حکیم لقمان تو بن سکتا ہے، شاعر نہیں۔ ویسے میں افسانہ نگار کی حیثیت سے خود کو زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔ اظہار آسان ہے۔ مگر میں اس میں فنی جدت پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میری کہانیاں وہی عام معاشرے کی کہانیاں ہوتی ہیں مگر زاویہ نگاہ مختلف ہے؟"

"آپ کے نزدیک شاعری کی تعریف کیا ہے؟"

"انسان داخلی و خارجی طور پر جو دیکھتا ہے محسوس کرتا ہے، اس کی جدت، انفرادیت سے پیش کرنے کا انداز الفاظ کے مناسب چناؤ اور نظم و ضبط شاعری ہے۔ شاعری دو قسم کی ہوتی ہے ایک وہ جس میں شاعر دقیق خیال کو سادہ انداز میں پیش کرتا ہے اور ایک وہ جس میں سادہ خیال کو دلچسپ پیرائے میں بیان کرتا ہے جیسے آنسو دل کا بھید بتائے۔ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔

آزاد شاعری سے متعلق جوش کا ہم خیال ہوں وہ کہتے ہیں جو کاڑ بھی ہے اور جاہل بھی وہ آزاد نظم کہتا ہے۔

"بڑے بڑے نامور شعراء ہیں جنہوں نے آزاد شاعری اپنائی ہے۔ کیا آپ کے خیال میں وہ شاعر نہیں ہیں؟"

"یہ خیال ہے میرا آزاد شاعری کے متعلق۔ کسی کو شاعر ہونے یا نہ ہونے کی سند میں کیسے دے سکتا ہوں۔۔۔ ورنہ تو ایسے شاعر بھی ہیں جو شاعر تو نہیں مگر قافیہ و ردیف ناپ کر شاعر کہلاتے ہیں"۔

"آپ کن شعراء سے متاثر ہیں؟"

"جوش اور جگر سے زیادہ متاثر ہوں اور غالب سے تو کوئی منہ موڑ ہی نہیں سکتا۔ ان کو پڑھنے کے بعد میری جرات اظہار کو تحریک ملتی ہے"۔

"اردو کا کیا مستقبل دیکھ رہے ہیں؟"

"اردو زبان جس طرح انگریزی میں خلط ملط کی جارہی ہے اس سے بہت دل برداشتہ ہوں۔ یہاں تک کہ اردو اخبارات ورسائل جو زبان کی ترسیل کا کام کرتے ہیں وہ بھی انگریزی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ بھئی اگر اردو زبان میں پہلے سے ہی ایک لفظ بلکہ متعدد جگہ کئی کئی الفاظ موجود ہیں ان کو ہٹا کر آپ انگریزی لفظ کس نظریہ کے تحت استعمال کر رہے ہیں۔ اردو زبان عربی' فارسی' ہندی' سنسکرت کے الفاظ صرف اس لئے سمیٹ لیتی ہے کہ مزاجا" ایک جیسی ہیں۔ انگریزی کا تو مزاج ہی مختلف ہے ہمارے تو حکمران طبقہ تک کو اپنی زبان میں بات کہنے کا سلیقہ نہیں ہے" میں نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ "شاید اس لئے کہ انگریزی عام ذریعہ اظہار بنتی جارہی ہے۔۔۔۔۔ زیادہ تر علوم بھی اسی زبان میں ہیں" انہوں نے دلیل دی فرانس' جرمنی' جاپان انگریزی کیوں نہیں اپناتے۔۔۔۔ مثال ہیں یہ ہمارے لئے کہ ہماری ترقی ہماری اقدار میں ہے۔ مگر یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک تعلیم عام نہ ہو۔ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ حکومت خاص طور پر اس کا خیال رکھتی ہے کہ لوگ پڑھ لکھ نہ جائیں۔ ورنہ حکومت کیسے قائم رہے گی۔ یہاں برطانیہ میں تو اردو کو قائم رکھنا اور بھی مشکل ترین مسئلہ ہے۔ دراصل ہمارا معاشرہ اتنا مادہ پرست ہو گیا ہے کہ میرے اپنے بچے تک یہ کہتے ہیں کہ اردو پڑھنے سے کیا مل جائے گا۔ کیا آمدنی میں اضافہ ہو گا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمیں یہاں اپنا مستقبل بنانا ہے۔ ان کو سمجھانا بہت مشکل ہے۔ لہٰذا وہ جو بولنے کے ساتھ تھوڑا بہت اردو لکھ پڑھ لیتے ہیں وہی بہت ہے۔ ادبی محفلوں میں شرکت کرنے سے ہو سکتا ہے کہ ان میں زبان کا شوق پیدا ہو مگر انڈیا پاکستان میں ہی دیکھ لیجئے کتنے بچے مشاعروں یا ادبی محفلوں میں شریک ہوتے ہیں یہاں پر تو پھر بھی زبان کے فرق سے بات سمجھ میں آتی ہے۔ بہرحال اندھیرا چاہے کتنا ہی ہو روشنی کی امید رکھنی چاہیے"۔

غزلوں' **نظموں**' نعتوں اور گیتوں پر مشتمل اپنی کتاب کے لئے سلطان صاحب کام کر رہے ہیں۔

عکسِ فن

غزل

آخرِ شب قلبِ مومن نور کی تنویر ہے!
چاند کی ٹھہرے ہوئے تالاب میں تصویر ہے

آئینے میں دوش کی فردا کی اک تصویر ہے
میرا ماضی میرے اِستقبال کی تفسیر ہے

صد ہزار انجم کا خوں لاتا ہے پیغامِ سحر
آج کی قربانیاں کل کے لئے تعمیر ہے

بے امنگ و بے عمل ہے ملک و ملت آج کل
اونگھتی تدبیر ہے سوتی ہوئی تقدیر ہے

اپنی تہذیب و تمدّن اور اپنی شخصیت
بس یہ ہی سرمایہ اپنا اور یہ ہی جاگیر ہے

شخصیت اپنی بھلادی تو فنا ہوجاؤگے
وقت کی دیوار پر لکھی ہوئی تحریر ہے

یہ جہادِ زندگی سلطاؔن کرسکتا ہوں میں
میری خودداری مرے کردار کی شمشیر ہے

اشرف شاد

مجھے تو شاد بس اتنی سی اک شکایت ہے
کہ چاند میرے لئے کیوں گھٹا ہوا نکلے

اشرف شاد

Ashraf Shad
54 Macinosh Street
MASCOT, NSW 2620 - AUSTRALIA

اشرف شاد

(آسٹریلیا)

بحرین میں اشرف شاد جبتک موجود رہے شعری محفلوں کو اپنے کلام سے گرماتے رہے۔ پھر جب آسٹریلیا جانے لگے تو ان کے ساتھ احباب نے ایک شام منائی۔ ان کی اہلیہ یاسمین شاد نے اپنا پتہ لکھ دیا اور وعدہ رہا کہ خط وکتابت باقاعدہ ہوگی مگر نئی زندگی کی مصروفیات نے یہ فاصلے مزید بڑھادیئے۔ میں کراچی سے امریکہ چلی گئی تو یہ فاصلے اور بھی بڑھ گئے کیونکہ ان کا پتہ تبدیل ہوچکا تھا۔ میرا خط واپس آگیا مگر میں تھکنے اور ہارماننے والوں میں سے نہیں ہوں چنانچہ میں نے اشرف شاد کو بہرحال ڈھونڈ نکالا۔

اشرف شاد نے شاعری طالبعلمی کے زمانے سے شروع کی تھی۔ دو دہائیوں کے حوادث نے شاد سے جہاں بہت کچھ چھینا وہاں انہیں نئی فکر اور تازہ سوچ بھی ودیعت کی۔ وہ حالات سے کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ ناخوشگوار حالات میں بھی ایک روشن فردا پر ان کی ہمیشہ نظر رہی۔ زندگی کی ناہمواریوں کا مکمل ادراک اور کامل شعور ان کے کلام میں نظر آتا ہے۔ شاد لذت آشوب طوفان سے بھی محظوظ ہونے کا ہنر جانتے ہیں اور لب ساحل اترنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔ اپنا تعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں کہ میرا نام تو مرزا اشرف علی بیگ تھا' شاد کے تخلص کا اضافہ ہوکر یہ اور طویل ہوگیا تھا اس لئے درمیان سے ذات قبیلے اور مذہب کی شناخت نکال کر اب صرف اشرف شاد رہ گیا ہوں۔

اشرف شاد ۱۸ جولائی ۱۹۴۶ء کو مراد آباد (یوپی ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ کراچی میں اردو کالج سے بی اے کیا۔ یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلز سڈنی آسٹریلیا سے مغربی ذرائع ابلاغ

میں تیسری دنیا کی کوریج کے مسائل کی تحقیق پر ایم اے آنرز کی ڈگری بھی حاصل کی ہے۔ تیسری دنیا میں صحافت کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی تحقیق ابھی تشنہ ہے۔ ۷۵-۱۹۷۴ء میں بڈاپسٹ ہنگری سے صحافت کا ڈپلومہ بھی حاصل کیا۔ آج کل ایس بی ایس ریڈیو آسٹریلیا کی اردو سروس کے سربراہ ہیں۔ پیشے کے اعتبار سے صحافی تھے اور صحافی ہیں۔ ابتدا کراچی میں ۱۹۶۶ء میں روزنامہ حریت سے سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کی تھی۔ ۸ سال روزنامہ مشرق کراچی سے وابستہ رہے۔ اس دوران دو سالہ عتاب کا جو دور تھا اس میں ہفت روزہ الفتح کے اسسٹنٹ ایڈیٹر اور پھر روزنامہ اعلان (موجودہ امن) کے نیوز ایڈیٹر رہے۔ ۱۹۷۶ء میں پبلشنگ کا اپنا ادارہ قائم کیا جس سے ہفت روزہ معیار نکالا۔ شاد کہتے ہیں کہ "ضیاء الحق کے مارشل لاء کے دور میں اپنی تحریروں کی وجہ سے معیار اور اس کے ساتھ میں بھی زیرِعتاب آیا۔ چند ماہ جیل میں گزارے۔ ۱۹۸۰ء میں جلاوطنی اختیار کی جو بے وطنی کی صورت میں اب بھی جاری ہے۔ اس دوران بحرین میں گلف مرر اور کویت میں عرب ٹائمز سے وابستہ رہا۔ میں نے ابتدا نثرنگاری سے کی تھی۔ میرے دوست اب بھی بنیادی طور پر مجھے نثرنگار کہتے ہیں۔ شروع میں کچھ افسانے بھی لکھے لیکن بزرگوں کی نصیحت گرہ میں باندھی اور افسانہ نویسی ترک کرکے مضمون نگاری شروع کردی۔ مضمون نگاری کے اسی سلسلے نے صحافت کی طرف رہنمائی کی۔ شاعری کالج کے زمانے کا شوق تھا۔ شعری مقابلوں میں شرکت کرتے تھے۔ لڑکیاں اپنی فائلوں پر شعر لکھتیں سب کچھ بہت اچھا لگتا تھا۔ اس زمانے میں "نیرنگ خیال" کے جدید شاعری نمبر میں کشفی صاحب نے میرے اس شعر کو سراہا تھا"۔

مجھ کو بھی پڑھ کتاب ہوں مضمون خاص ہوں
مانا ترے نصاب میں شامل نہیں ہوں میں

"یہ شعر اس زمانے میں میری شناخت بن گیا تھا۔ کوئی بیس سال بعد ۱۹۹۰ء میں مرحومہ پروین شاکر اچانک اسلام آباد میں ملیں تو یہ شعر دہرا کر انہوں نے مجھے حیران کردیا تھا۔ صحافت کی سختیوں اور دلچسپیوں نے پوری طرح اپنے اندر جذب کرلیا تو شاعری ایک بھولا بسرا شوق بن گئی۔ شاعری کا دوسرا دور بحرین اور پھر کویت میں شروع ہوا اور وہیں پروان چڑھا۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس زمانے میں اظہار کا کوئی اور ذریعہ میسر نہیں رہا تھا' پھر خلیجی ملکوں میں گھریلو شعری نشستیں ایک سماجی روایت بن گئی ہیں۔ یہ نشستیں بھی تحریک دیتی تھیں۔ پھر حالات کا دباؤ بھی جو شعروں کی صورت میں اظہار پاتا تھا۔ میری کئی غزلیں

اور نظمیں بعض ملکوں اور بین الاقوامی حالات کے تناظر ہی میں کہی گئی ہیں۔ بحرین، کویت اور سڈنی میں، کی گئی شاعری کا مجموعہ "نصاب" کے عنوان سے زیرِ طبع ہے۔ "بے وطن" کے نام سے ایک ناول بھی عنقریب ختم ہونے والا ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ پاکستان میں اس طرح کا ناول ابھی تک لکھا نہیں گیا ہوگا۔"

"ادب اور شاعری میں ابلاغ ضروری ہے؟ اس سوال کے جواب میں شاد کہتے ہیں کہ "ابلاغ کے بغیر ادب وشاعری بے معنی چیز ہے۔ کتابیں طاقوں پر سجانے اور دیمک کے مطالعے کے لئے نہیں ہوتیں۔ ہمارے لکھنے والے یا شعر کہنے والے کتابیں نہ بکنے کی وجہ سے عوامی سطح پر بے ذوقی کا فروغ بتاتے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے۔ ہم یہ دیکھ کر نہیں لکھتے کہ کس کے لئے لکھ رہے ہیں۔ اکثر اوقات ہم صرف اپنی ذات میں ہو کر اپنے لئے کہتے یا لکھتے ہیں اور نتیجے میں پڑھتے بھی صرف ہم خود ہیں۔ ادبی رسالوں نے بھی اپنے آپ کو تبدیل نہیں کیا۔ معیار کے نام پر اس مواد کو چھاپنے کے لئے کاغذ ضائع کرتے رہے۔ جسے پڑھنے والا کوئی نہیں تھا۔ شاعروں کے لئے مسئلہ نسبتاً" آسان تھا۔ مشاعرے اور شعری نشستیں ان کے کہے ہوئے لفظ کی قبولیت کا پیمانہ بنی رہیں۔ مشاعرے کی تہذیبی اور سماجی روایت نے ہمارے یہاں شاعری اور شاعروں کو بہت آگے بڑھایا۔ لیکن نثرنگاروں کو ابلاغ کا کوئی اچھا ذریعہ میسر نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاید کوئی اچھا افسانہ یا ناول ہمارے یہاں بہت کمیاب بلکہ نایاب ہے اور اگر ہے بھی تو اسے قاری تک پہنچنے کا موقع نہیں مل رہا۔ ذرائع ابلاغ میں جو انقلابی تبدیلیاں آئی ہیں ہمارا ادیب اور شاعر اس سے بھی ناآشنا ہے۔ اور اگر آشنا ہے تو اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ پڑھنے کے لئے وقت اور پڑھنے والے کم ہو رہے ہیں۔ ہمیں ادب کو آڈیو اور ویڈیو کے ذریعے پیش کرنے کا ہنر سیکھنا چاہیے۔ ہم اس طرح ادب اپنی اس بڑی اکثریت تک بھی پہنچا سکیں گے جو پڑھنا جانتی ہی نہیں یا اتنی پڑھی لکھی ہے کہ صرف اپنا نام لکھنا جانتی ہے۔

اردو کے مستقبل کے بارے میں کہنا چاہوں گا کہ کسی بھی زبان کو آپ گھونٹ کر نہیں پلا سکتے۔ نہ ہی زبانیں جینز میں رچی بسی ہوتی ہیں کہ آپ کی اولاد آپ کی زبان سیکھتی ہوئی ہوش سنبھالے گی۔ غیر ممالک میں جو نئی نسل پیدا ہو رہی ہے وہ اسی معاشرے کی زبان سیکھے گی جس میں وہ ہوش پا رہی ہے۔ ان ممالک میں لنچ اور ڈنر کے بعد نئی نسل کی اپنی زبان اور تہذیب سے بیگانگی پر گفتگو کرنا ایک عام روایت ہے۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم ایک مختلف تہذیب میں رہ کر اس کے سارے پھل توڑنا، ہڑپ کرنا چاہتے ہیں اور پھر یہ بھی

چاہتے ہیں کہ ان تہذیبوں میں پلنے والے ہمارے بچے اپنی آنکھیں بند کر کے بڑے ہوں۔ ہمارا اپنے بچوں سے یہ مطالبہ کرنا ایک بہت غیر حقیقت پسندانہ بات ہے۔ اس سلسلے میں کوئی بھی آسان حل پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔ صرف ایک صورت ہے کہ بچے کو آپ اردو پر کاربند رکھنا چاہتے ہیں تو پھر کم از کم گھر میں اردو بول چال کو رائج کیا کیجئے بچے زبانیں اپنے گھروں میں سیکھتے ہیں۔ کوئی باہر سے آکر آپ کے بچوں کو صرف ٹیوشن کے ذریعے اردوداں نہیں بنا سکتا۔

آپ کے اگلے سوال کے جواب میں عرض ہے کہ آج کے ادب سے مراد اگر وہ ادب ہے جو پاکستان اور اردو زبان میں تخلیق ہو رہا ہے تو یہ تنقید بالکل صحیح ہے کہ ادب بے معنی بلکہ معاشرے سے بے تعلق ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ لفظ سچ بول نہیں رہا' زندگی کسی اور سمت جارہی ہے ادب کسی اور سمت جارہا ہے۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ اردو میں لکھنے والے ادیب کے تجربات بہت محدود ہیں۔ اس کے آفاق سکڑے ہوئے ہیں اور ان کرداروں اور کہانیوں کو جو اس کے دائرہ نظر میں آتی بھی ہیں' وہ معمول کا قصہ سمجھ کر آگے بڑھ جاتا ہے یا انہیں لفظوں کا روپ دینے کا حوصلہ نہیں پاتا۔ تو کم حوصلگی بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ کرداروں کو اور ان سے وابستہ کہانیوں کو اپنے ذہن سے گڑھتا ہے' زندہ جرثوموں کو پروان چڑھانے کے بجائے کہانیوں کے مردہ بچے پیدا کرتا ہے۔ جنہیں تنقید نگار مٹی پانی دے کر قبر میں گاڑ دیتے ہیں۔ نثرنگاری' خاص طور پر افسانے اور ناول لکھنے والے کا مسئلہ یہ ہے کہ اس کی کہانی بہت کمزور ہے اسی لئے اس کے کردار سچ بولتے نہیں لگتے۔ آج بھی اچھی کہانی صرف شوکت صدیقی اور اچھی نثر مشتاق احمد یوسفی لکھ رہے ہیں۔ آگے آیت ہے۔ باقی جو کچھ پہلے لکھا گیا اسی کی مجاوری کر کے حق اللہ کر رہے ہیں۔ ایک مسئلہ ہمارے تنقید نگار بھی ہیں۔ ہمارے اکثر لکھنے والوں کے قاری صرف تنقید نگار ہوتے ہیں اس لئے ہم لکھتے ہوئے صرف انہیں کو نگاہ میں رکھنے لگے ہیں جس کے نتیجے میں تخلیقات عام ذہنی سطح سے اور اوپر چلی جاتی ہیں۔ مغربی ادب میں ابھی تک پرانی چسی ہوئی ہڈیوں سے گودا نکالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ابھی تک موپاساں کی چکی پیس رہے ہیں۔ مغربی دنیا کے سماج اور ان کی قدریں بہت بدل گئی ہیں اسی کے ساتھ ان کا ادب بھی بدل گیا ہے۔ ہم اپنا ناطہ اس سے جوڑنے پر بھی شاید تیار نہیں ہیں۔ ہمارے ادیب کو اپنے قاری کا تعین کرنا پڑے گا اسی سے ابلاغ کی زبان سیکھنی پڑے گی۔ اس کے ساتھ اپنی ویو لینتھ (View lenth) ملانی

پڑے گی۔ اتنا حوصلہ پیدا کرنا پڑے گا کہ جو سچ عام آدمی خوفزدہ ہو کر اپنے سینے میں گھونٹ دیتا ہے وہ لکھ سکیں اور اپنے قاری کے بے نام جذبوں کو زبان دے سکیں۔ آج کے ادیب کو اس وقت سیاسی نہیں سماجی جبر کے خلاف لڑنے کی طاقت حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ اسے اپنی ناکامیوں کو شکایتوں اور بے قدری کے آنسوؤں کے پیچھے چھپانے کی عادت ترک کرنی ہوگی۔

○

ہر ایک حرف نگارش رٹا ہوا نکلے
کٹے زباں تو سخن بھی کٹا ہوا نکلے

تری کتاب میں شامل رہا تو ہوں لیکن
میں جس ورق پہ لکھا تھا پھٹا ہوا نکلے

یہ کیا ستم کہ جس زمیں پہ پاؤں رکھوں
اسی زمین کا محور ہٹا ہوا نکلے

وہ پاؤں جس کو کہ دھو دھو کے پی رہے ہو تم
کبھی تو گرد سفر میں اٹا ہوا نکلے

چمن کے کانٹوں میں اب تک ہے کتنی یکجائی
گلوں کا قافلہ لیکن بٹا ہوا نکلے

●

عکسِ فن

غزل

سانس اَٹکی ہوئی رہ گئی
عشق میں کچھ کمی رہ گئی

دل سے سب راحتیں اُٹھ گئیں
اب تو بس بے بسی رہ گئی

عمر کے ہر حسیں موڑ پر
زندگی سوچتی رہ گئی

ہنس دیئے ہم بچھڑ کے مگر
آنکھ میں کچھ نمی رہ گئی

دوستوں نے کئے وہ کرم
دشمنی دیکھتی رہ گئی

ہوگئے وہ مصاحب تو کیا
گردنوں میں خمی رہ گئی

شادؔ آئی سحر تو مگر
روشنی کی کمی رہ گئی

شاہد علی خان شاہد

بزمِ جاناں میں عجب کیفِ خود نما ہے شاہد

فرش پر عرشِ معلیٰ کا گماں ہوتا ہے

شاہد نجیب آبادی

۲۰ ستمبر ۱۹۹۵ء

Shahid Ali Khan
P.O.Box 26572
MANAMA - BAHRAIN (A.G.)

شاہد علی خان شاہد (نجیب آبادی)

(بحرین)

جگر مراد آبادی کے اس شعر۔

میرا پیغام ہے محبت جہاں تک پہنچے

کی تفسیر جاننے کے لئے شاہد علی خان شاہد سے مل لینا کافی ہے۔ ایک بار ملنے کے بعد ان کے خلوص کو بھلایا نہیں جاسکتا۔

۳ جولائی ۱۹۲۷ء کو نجیب آباد ضلع بجنور یو پی ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ نجیب آباد سے ۱۹۴۴ء میں میٹرک فرسٹ ڈویژن سے کیا۔ اور بی ایس سی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ۱۹۴۸ء میں کیا۔ تقسیم ہند کے بعد کراچی پاکستان آگئے۔ یہاں ۱۹۴۹ء سے ۱۹۵۱ء تک کمیونی کیشن اسکول سے ٹریننگ لی اور ۱۹۵۱ء سے حکومت پاکستان کے محکمہ اطلاعات (ریڈیو) سے وابستہ ہوگئے۔ ۱۹۵۹ء میں بحرین ریڈیو سے بحیثیت سینئر انجینئر وابستہ ہوئے اور تاحال اسی محکمے میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔

والد محترم جناب حامد علی خان (مرحوم) چچا محمد اجمل خان اجمل اور جناب اعلیٰ خان عارف نجیب آبادی کی قربت نے شاعری کی طرف راغب کیا۔ اب تک دو شعری مجموعے رمز حسن ۱۹۸۶ء اور رمز عشق ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئی۔ رمز عشق بحرین کی وزارت اطلاعات نے شائع کی۔ اپریل ۱۹۹۰ء میں دہلی میں منعقد ہونے والی عالمی اردو کانفرنس میں بحرین کے مندوب کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ غالب اکیڈمی نجیب آباد نے ہندوستان پاکستان کے شعراء کی تخلیقات بحرین کے اہل قلم حضرات کے مالی تعاون سے شائع کی ہیں ان میں بھی شاہد صاحب کا تعارف اور کلام شامل

ہے۔ ان کتابوں کے نام ہیں۔ عکس شعور، بام ہنر (اس کتاب کو یوپی کی حکومت نے اکیڈمی ایوارڈ دیا) ہوا تیز ہے، (ہندی رسم الخط میں اردو شاعری) دیار غزل اور ۱۹۹۵ء میں ساحل سے سفینے تک۔

شاہد صاحب کا کلام کراچی پاکستان کے ماہنامہ روپ، افکار، جاوداں، الوارث دہلی کے کتاب نما، ایوان اردو، بیسویں صدی۔ امریکہ کے پاکستان لنک اور ندا میں شائع ہو کر داد تحسین حاصل کر چکا ہے۔ شاہد علی خان کے کلام میں رومانیت کا عنصر غالب ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ شعر گوئی ایک وجدانی کیفیت ہے۔ ذہن میں ایک رو ہم پیدا ہوتا ہے۔ ایک مصرعہ تخلیق پاتا ہے اور پھر یہ عمل تیز تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ بقول خود یہ دوستوں کی بے وفائی، احباب کی دغا اور شکوۂ خویشاں سے گریزاں شاعری کے قائل ہیں۔ کہتے ہیں "اگر میں کسی رفیق کی بے وفائی کا رونا رونے لگوں تو یہ بھی ممکن ہے کہ میں بھی کسی کی نظروں میں بے وفائی کا مرتکب ٹھہرایا جاؤں۔ یہ الزامات گنبد کی گونج کی طرح ہوتے ہیں اور پھر یہ بیماری متعدی بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ میں "مرنجان مرنج" پالیسی کا قائل ہوں۔" اسی طرح نظریاتی شاعری کے لئے بھی اس میں تعمیر کے عنصر کو ضروری سمجھتے ہیں۔ نفرت، انتقام، طعن و تشنیع اور ذاتی مخاصمت کلام کو غیر دلکش، کریہہ اور شعریت سے محروم کر دیتی ہے۔ ان کے نزدیک ہماری روایتی شاعری جو دراصل ہماری تہذیب کی آئینہ دار ہے ایک محبت بھرا پیغام ہے۔ جس سے روح کو تازگی اور شعور کو حلاوت ملتی ہے۔ ان کے دوسرے دیوان "رمز عشق" کا محرک بقول ان کے یہی جذبہ تھا جس کا پہلا قطعہ اسی جذبے کا عکاس ہے۔ ملاحظہ ہو۔

باہمی ربط و کشش سے سارے عالم کو ثبات
ماہ و انجم کی ہو یا شمع پروانے کی بات
ذرہ ذرہ ہے جہاں کا مستقل محو طواف
یعنی رمز عشق میں مضمر حدیث کائنات

شاعری میں آسان زبان اور دلکش اسلوب کے حامی ہیں۔ کہتے ہیں میر کا کلام اس کا ثبوت ہے کہ بات دل سے نکل کر تیر کی طرح دل میں سما جاتی ہے۔ شاعری کا ابلاغ یقیناً ضروری ہے کہ اشعار میں الفاظ کا ربط اور ہم آہنگی دل و دماغ میں انقلاب پیدا کر دیتے ہیں۔ ان اثرات سے فکر اور فکر سے کردار متاثر ہوتا ہے۔ اقبالؒ کے کلام میں قومی حمیت، اتحاد، شجاعت، یگانگت اور دعوت عمل کے مضمون پر کہے ہوئے اشعار ہزار ہا وعظ اور لیکچرز سے زیادہ موثر ہیں۔ جس طرح یہ اشعار لوگوں کو ازبر ہیں۔

شاہد علی خان شاہد

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اول' طاؤس و رباب آخر

اور

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

یہ شاعری ابلاغ کرتی ہے۔ جذبہ عزت نفس پیدا کرتی ہے۔ انا کو احساس کا درجہ عطا کرتی ہے۔ یہ شاعری نئی نسل کی تربیت کرتی ہے۔

ادبی رسائل کی عدم مقبولیت کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ آج عالمی معاشرہ جس طرف گامزن ہے اس میں ریڈیو' ٹی وی اور احساس حظ (Fun,Pleasure) کا بڑا دخل ہے۔ آج کا انسان بنیادی ضروریات کے ساتھ زندگی کی دیگر مسرتوں بھری اشیاء کے حصول میں منہمک ہے۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں کہ مشکل زبان اور مشکل شاعری میں اپنا سر کھپائے' اسے سمجھنے کی کوشش میں وقت صرف کرے۔ یہ ایک عالمی ذہنی انقلاب ہے۔ جس سے نبرد آزما ہونا اپنی توانائی کو ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ اگر ٹی وی ریڈیو اور ویڈیو بند ہو جائیں تو لوگ پھر مطالعہ کی طرف راغب ہوں جبکہ ایسا ممکن نہیں۔ لہٰذا آسان زبان میں دلچسپی سے بھرپور ادب تخلیق کیا جائے۔ فکشن کی آج بھی مانگ ہے۔

اردو زبان کی بقا کے سلسلے میں دلیل دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اس کے ذمہ دار والدین ہیں۔ ہم نے بچپن سے ہی کراچی اور بمبئی میں رہائش پذیر پارسی خاندانوں کو دیکھا ہے جو ان علاقوں میں ہزار سال سے بھی زیادہ عرصے پہلے ہجرت کر کے آن بسے ہیں۔ وہ اپنی مادری زبان فارسی بولتے اور اپنے بچوں سے بلواتے ہیں چاہے وہ اور کتنی ہی زبانیں سیکھ لیں۔ وہ اپنے ماضی اور اپنی اصل کو باعث افتخار سمجھتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اردوداں خاندانوں کو امریکہ یا مغربی ممالک میں ہجرت کئے ابھی سو سال کا عرصہ بھی نہیں گزرا لیکن نئی نسل آہستہ آہستہ اپنی آبائی مادری زبان سے لاتعلق ہوتی جارہی ہے۔ اس سے نئی نسل کے تشخص (Identity) کے معاملے میں بڑی مشکلات کا سامنا ہوگا۔ یقیناً وہ ذہنی اضطراب کا شکار ہوں گے۔ بچوں کو بچپن سے ہی اپنی زبان سے مانوس کرانے کے لئے والدین کو محنت کرنا ہوگی۔ میں نے امریکہ میں اپنے قیام

کے دوران کچھ والدین کو اردو سے نابلد اپنے بچوں کے متعلق بھی کہتے سنا کہ ہم ان کو انڈین فلمیں دکھاتے ہیں اور مشاعروں میں لے جاتے ہیں۔ جبکہ اردو سیکھنے اور سکھانے کا یہ طریقہ نہایت غیر منطقانہ ہے۔

شاہد علی خان نقادان ادب کے اس خیال سے متفق نہیں کہ آج کا ادب اپنے دور کی ترجمانی نہیں کر رہا۔ ان کا کہنا ہے کہ ادب ہمیشہ سچ بولتا ہے۔ آج کے دور کی شاعری ہو یا افسانہ نگاری وہ اپنے معاشرے کی عکاس ہے۔ آج کوئی بھی قصہ چہار درویش، طوطا مینا کی کہانی، حاتم طائی یا طلسم ہوشربا طرز کا ادب تخلیق نہیں کر رہا۔ کوئی ایسا کرے بھی تو آج کے قارئین اسے رد کردیں گے۔

اس ضمن میں انہوں نے حمایت علی شاعر، پیرزادہ قاسم اور افتخار عارف اور دیگر شعراء کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ان کا کلام ان کا نقطہ نظر اور تجربات لئے ہوئے ہے۔ آج کے ابھرتے ہوئے شعراء بھی جدید تقاضوں اور نئے موضوعات کے ساتھ آج کے مسائل پر بڑے خوبصورت پیرائے میں اظہار خیال کر رہے ہیں۔ ان کی شاعری موجودہ طرز حیات کی عکاس ہے۔

مُتَفَرَّق اشعار

ترکِ مے کی بات شاہد کس سے ممکن ہے مگر
حرج ہی کیا ہے قسم کھانے میں کھاتے جایئے

○

ہائے وہ قربتِ شباب، وائے نگاہِ اجتناب
اپنوں سے غیر ہوگئے، خیر سے جب بڑے ہوئے

○

آپ آزردہ نہ ہوں اغیار کے بہتان سے
داغ تو کہنے کو کہتے ہیں مہِ کامل میں ہے

○

شمع کے شعلے ہی پہ شاہد نہیں دارومدار
سوزِ پروانہ بھی شاملِ گرمیِ محفل میں ہے

شاہد نجیب آبادی

عکسِ فن

دیکھنے میں ہے گُلستاں کی طرح
زیست ہے موسمِ خزاں کی طرح

میں حساب وکتاب سے خائف
اور وقت سر پہ امتحاں کی طرح

نکلا زاہد بھی ساتھ مے پی کر
میں جواں، اور وہ نوجوانوں کی طرح

وہ دھڑک کر نہ راز سب کہہ دے
دل سنبھالے رہو زباں کی طرح

پہلے دل میں سَمایا وہ اور پھر
چھا گیا سر پہ آسماں کی طرح

وہ مُقدّس کتاب کی مانند
اور میں حافظِ قرآں کی طرح

سطح پر میں حَباب سالرزاں
اور وہ بحرِ بے کراں کی طرح

اس کا ہر لمحہ، لمحہ ہے اَنمول
اور میں عمرِ رائیگاں کی طرح

میں تو پل میں گزُر گیا شاہد
وہ جو گذرا تو کارواں کی طرح

ڈاکٹر شبانہ نذیر

احسان شناسہ ہے یہ اہلِ گلستاں کا
ہم جیسے دیوانوں کو کانٹوں کی قبا دی ہے۔

شبانہ نذیر

Dr.Shabana Nazir
C10 Mr. Rifat Sarosh
A-80, Sector 27 NOIDA 201301 INDIA

ڈاکٹر شبانہ نذیر

(دہلی، ہندوستان)

۱۷ جنوری ۱۹۵۴ء کو میرٹھ (یوپی ہندوستان) میں مشہور شاعر اور نثر نگار رفعت سروش کے گھر جنم لینے والی شبانہ سروش شادی کے بعد شبانہ نذیر کہلاتی ہیں۔ ۴ دسمبر ۱۹۷۷ء کو ان کی شادی ناصر نذیر سے ہوئی۔

شبانہ نے اردو میں ایم اے اور پھر ایم ایڈ کی ڈگری لینے کے بعد ڈاکٹریٹ کیا۔ پی۔ایچ۔ڈی کے لئے ان کا موضوع تھا "اردو میں اوپیرا ۱۹۴۷ء کے بعد" ان کی شاعری کی ابتداء ان کے والد جناب رفعت سروش کا کلام سن سن کر اور پڑھ کر ہوئی۔ ان کا کلام بیسویں صدی، ایوان اردو، یوجنا اور جمناتٹ وغیرہ میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ مجموعہ کلام ابھی کوئی شائع نہیں ہوا۔

شبانہ کو بچوں کی نفسیات سے خاصی دلچسپی ہے۔ اس موضوع پر ان کی کئی تقریریں آل انڈیا ریڈیو سے نشر ہو چکی ہیں۔ شبانہ غزلیں بھی کہتی ہیں لیکن نثری نظم کی حامی ہیں۔ اس سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ اس صنف شاعری میں خیالات اوریجنل طریقے سے پیش کئے جا سکتے ہیں۔

شبانہ تنقیدی محفلوں کی حامی ہیں۔ ان کا کہنا ہے تنقید میں سچائی اور خلوص ہونا چاہیے۔ نقاد اگر ادب اور فن کے لئے خلوص رکھتا ہے تو وہ بدنام نہ ہو گا لیکن اگر اس کا مقصد ایک گروہ کی پبلسٹی اور سرپرستی ہے تو یہ فن کے ساتھ اس کی ناانصافی کہلائے گی۔ اسی خلوص اور سچائی کی کمی کی وجہ سے آج پیش لفظ اور فلیپ تحریروں کا اعتبار مجروح ہوا ہے۔

شبانہ شاعری میں ابلاغ کی قائل ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "میں چونکہ معلمہ ہوں اس لئے شاعری کے حسن کو اپنے طالب علموں تک پہنچاتی ہوں۔ اگر شاعری میں ابلاغ نہ ہو تو ایسی شاعری

مہمل کہلائے گی"۔

تعلیم شبانہ کا موضوع ہے۔ انہیں ڈبیٹ کا شوق بھی رہا ہے۔ اسکول اور کالج کے زمانے میں کئی انعامات لے چکی ہیں۔ ان دنوں دہلی کے ایک گورنمنٹ اسکول میں معلمہ ہیں اور وہاں کلچرل پروگراموں کی انچارج بھی ہیں۔

شبانہ کا سیاسی اور سماجی شعور بالغ ہے۔ وہ اپنی شاعری میں اپنے سماجی مسائل کا اظہار بڑے سلیقے سے کرتی ہیں۔ انہیں موجودہ روش سے دکھ بھی ہے لیکن ناامیدی کا لفظ ان کی لغت میں نہیں ہے چناچہ کہتی ہیں۔

تعبیر ملے شاید اب کل کے مورخ کو
ہم نے نئے خوابوں کی تصویر سجا دی ہے

صحراؤں سے ہم، گزرے کانٹوں کو لہو دے کر
ہر موڑ پہ منزل کے، اک شمع جلا دی ہے

ڈاکٹر شبانہ نذیر

عکسِ فن

کیوں

لفظ لبوں پر پھُول کی صورت کیوں کھِلتے ہیں
حرف، قلم کی نوکِ زباں پر کیوں آتے ہیں
ذہن میں بیٹھے بیٹھے اچانک کوئی خیال چمک جاتا ہے
بھُولے بِسرے لوگ کبھی خوابوں میں آکر
کیوں ماضی کو دہراتے ہیں
کیوں اپنے بچپن سے کٹ کر
بھول کے اپنی نادانی کو
جی نہیں سکتے آزادی سے کیوں؟ آخر کیوں!
کیوں ایسا ہوتا ہے آخر
شاید انساں پہلے دن پہلے لمحے سے
آخری دن اور آخری دم تک
ہوش و حواس کے زندانوں میں
جیتا ہے اک مجبوری سے
کیا اک دن ایسا آئے گا
ہم جب چاہیں مرجائیں
اور مر کر پھر زنداں ہو جائیں

مرتضیٰ شبلی

اگرچہ قسمت نے ہم کو میری
محبتوں، الفتوں سے یکسر
دور رکھا
میں اپنی جانب سے مطمئن ہوں
کہ میرے حصے کی الفتوں کی
زکوٰۃ کب کی ادا ہوئی ہے۔

Murtuza Shibli (signature)
19 Dec. 95

Murtuza Shibli
Midia Education Research Centre
University Of Kashmir SRINAGER, INDIA

مرتضٰی شبلی

(سرینگر)

میں نے شاعروں اور ادیبوں کے بہت سے انٹرویوز پڑھے اور جب مجھے خدائے برتر نے قلم کی دولت ودیعت کی تو میں نے بھی شعراء اور ادیبوں کے تعارف لکھے میں ان کی سوانح کے اس جملے پر آکر ہمیشہ اٹکتی تھی۔ "انہیں بچپن سے تعلیمی، شعری اور ادبی ماحول ملا۔" تب مجھے اپنے گھر کا ماحول یاد آتا۔ ابا میرے چاہتے تھے کہ ہم لڑکیاں پڑھ لکھ جائیں۔ انہوں نے اپنی ہی مادری زبان سے ہماری تعلیم کا آغاز کیا۔ ہم چھوٹے تھے۔ ایک پارسی خاتون ہمیں گجراتی پڑھانے آتی تھیں۔ بچپن کی پڑھی ہوئی نظموں میں سے ایک دو نظمیں آج بھی مجھے یاد ہیں۔

میں ایک بلاڈی پالی چھے
تے رنگے بہو رو پاڑی چھے

ترجمہ۔ (میں نے ایک بلی پالی ہے۔ وہ اپنے حسین رنگ کی وجہ سے بہت خوبصورت ہے۔)

اور

مارد چھے مور، ماری چھے ڈھیل
موتی چرنتی ماری چھے ڈھیل

ترجمہ۔ (میں نے ایک مور اور مورنی پالی ہے۔ میری مورنی موتی چگتی ہے)

لیکن اباجان کی ہزار کوششوں کے باوجود میں گجراتی کی کتابیں پرے رکھ کر چھپ چھپ کر اردو کی کہانیاں پڑھتی تھی۔ یہ شوق رنگ لایا۔ ہماری کم سنی میں ابا کا انتقال ہوگیا تو اماں نے

گیارہ سال کی "جوان لڑکی" کا اسکول چھڑا دیا اور غیر نصابی کتابوں کا مطالعہ بھی زہر قاتل ٹھہرا۔ پھر بھی چھپ چھپ کر پڑھنے کی لت نہ گئی۔ انہی دنوں مختلف شعراء کا کلام پڑھتے ہوئے کہیں "رنگین" کا یہ شعر بھی پڑھ لیا۔

کیا ہوا ہے شہر شملہ جو دو گانا میری جان
میں تو بلکوں اور زناخی یوں کھلاوے تجھ کو پان

اس وقت نہ "شہر شملہ" کا مطلب معلوم تھا نہ "زناخی" کے مفہوم سے آشنا تھی۔ لغت دیکھنے کا شوق تھا پر پیسے نہ تھے۔ کتابوں کی دکان پر ایک چھوٹی سی لغت دیکھی تھی۔ اندر صفحہ اول پر لکھا تھا۔ "اردو کی کامل و اکمل لغت۔ یعنی ۳۴ ہزار ۵۵۰ الفاظ کا مجموعہ۔ سعیدی ڈکشنری یا سعید اللغات۔ دل مچل گیا کہ خرید لوں مگر قیمت تھی بارہ روپے اور ہمیں ماہانہ جیب خرچ چار روپے ملتے تھے۔ میں نے دو ماہ کا جیب خرچ آٹھ روپے جمع کیا۔ بہنوں سے دو دو روپے ادھار لئے۔ یوں بارہ روپے جمع ہوئے تو محمد علی روڈ (بمبئی) پر عثمانیہ کتب خانہ جا کر لغت خرید لائی۔ شہر شملہ کے معنی ملے اندھیر نگری۔ اور زناخی کے معنی 'سہیلی' یا گوئیاں پایا تو شعر سمجھ میں آگیا۔ مگر یہ پھر بھی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ شعر کیوں اور کس کے لئے کہا گیا ہے۔ پس منظر بتلانے والا کوئی تھا نہیں۔ شعر کہیں نوٹ کر لیا اور کتاب واپس کر دی لیکن مری محنت کی کمائی (کہ میں نے ٹافیاں نہ کھائیں اور انہی روپیوں سے کتاب خریدی) سے خریدی ہوئی سعید اللغات بمبئی ہندوستان سے میرے ساتھ سفر کرتی ہوئی کراچی پاکستان اور پھر پاکستان سے امریکہ تک میری دلدار سہیلی کی طرح میرے ساتھ ساتھ رہی اور جو آج بھی میرے ساتھ ہے۔ گو اس کے بعد فیروز اللغات اور فرہنگ آصفیہ بھی آگئیں لیکن جو بات سعید اللغات میں ہے وہ "مولوی مدن میں کہاں!"

تو بات ہو رہی تھی رنگین کے سمجھ میں نہ آنے والے شعر کی۔ اس کے بعد جو شاعری ملی پڑھتی گئی۔ میر و غالب' اقبال' ساحر' فیض' قاسمی سے لے کر بے شمار شعراء کو جستہ جستہ پڑھا۔ پچھلے دنوں ایک نظم میری نظر سے گزری۔ "قدم قدم پر اگاؤ قبریں۔"

خلوص و مہر وفا کی قبریں
کہ آدمیت کا کوئی پرتو
زمیں کے اوپر نہ رہنے پائے
ہر ایسی آواز کو دبا دو
جو سچ کو سچ کہہ کے کہہ رہی ہو
ہر ایسے شاعر' ہر ایسے عالم

مرتضیٰ شبلی

ہر اس صحافی کو قتل کردو
جو چاہتا ہے، تمہارے بے آبرو غلاموں میں
عزت نفس جاگ اٹھے

اکتوبر ۹۵ء کے "شمع" دہلی میں، میں نے اسی شاعر کی نظم "ان خوابوں کی تعبیریں" پڑھی۔ نظم کیا ہے ظلم و جبر کی داستاں ہے اور موت کے بے ہنگم رقص کی کہانی ہے۔

جو زخم ہیں میرے سینے پر
وہ زخم ہیں سب کے سینوں میں
آجائے مسیحا بن کے کوئی
ان زخموں پر پھایا رکھنے
آجاؤ کہ ہر اک راہ گزر
ڈوبی ہے لہو میں سرتاسر
اور ایسی بہاریں آتی ہیں
کٹتی ہے جوانوں کی فصلیں
جلتے ہیں گھروندے بچوں کے
لٹتے ہیں یہاں ہر پاک بدن
ممتا کی بہاریں سوکھ گئیں
تخلیق کے سوتے خشک ہوئے
ہے موت کا ایسا رقص چلا
ڈل جھیل میں روحیں دفن ہوئیں
لولاب کی وادی لال ہوئی
اور جھیل ولر بھی خشک ہوئی
گلمرگ کی وہ برفیلی فضا
زخموں سے شکستہ چور ہوئی
یوسف کی طرح کوئی آجاؤ
بے رنگ پڑے ہیں صدیوں سے
ان خوابوں کو تعبیریں دو
یہ خواب جو ہیں شاداب مگر

مرتضیٰ شبلی

یہ خواب ابھی تک خواب ہی ہیں
کوئی آجاؤ! کوئی آجاؤ!

یہ وادی کشمیر کا جواں سال شاعر شبلی ہے جس نے وادی کشمیر کے لہولہان جذبوں کو زبان دی۔ جس کا قلم ہی لہو میں نہیں ڈوبا وہ خود بھی زخموں سے چور چور ہے اور فریاد کناں۔

مرتضیٰ شبلی نے ۲۳ مئی ۱۹۷۱ء کو سرینگر میں جنم لیا۔ بارہویں جماعت تک سائنس کے طالب علم رہے پھر تاریخ، ایجوکیشن اور انگریزی ادب میں گریجویشن کیا۔ دسویں جماعت تک اردو پڑھی اور اردو سے محبت نے اسے شاعر بنا دیا۔ گو اپنی مادری زبان کشمیری اور انگریزی میں بھی شاعری کر رہے ہیں لیکن اردو زبان کو اپنا اصلی وسیلہ اظہار سمجھتے ہیں۔ شبلی ان دنوں صحافت اور ماس کمیونی کیشن میں ایم۔اے کر رہے ہیں۔ اسی سال ۹۶ء میں ان کے (مارچ اپریل میں) فائنل امتحان ہونے والے ہیں۔

دسمبر ۹۵ء کے شمع دہلی میں شکاگو کے حسن چشتی صاحب کی معرفت بھیجی گئی میری کتاب "سخن ور" کی اشاعت کی خبر پڑھ کر شبلی نے مجھے اپنا مختصر تعارف، کلام اور خط بھیجا جس میں لکھا کہ "یہاں ہڑتالوں کا موسم چل رہا ہے اس لئے اپنی ایک پاسپورٹ سائز تصویر جو رکھی ہوئی ہے، وہی بھیج رہا ہوں"۔ میں نے شبلی کو سوالنامہ بھجوا دیا جس کا انہوں نے فوراً جواب بھجوا دیا۔

شبلی عموماً سیاسی تجزیہ نگاری یا رپورٹنگ کرتے ہیں۔ بمبئی کے کئی انگریزی اخباروں کے لئے بھی لکھتے ہیں۔ وادی کے کثیر الاشاعت ہفت روزہ چٹان سے بھی کچھ عرصہ تک خصوصی نامہ نگار کی حیثیت سے وابستہ رہے۔ امتحان کے بعد تلاش روزگار کی جستجو انہیں کہاں لے جائے کچھ طے نہیں۔

جموں کشمیر کے ہفت روزہ تکبیر، روزنامہ آفتاب، سرینگر ٹائمز اور ہفت روزہ کشمیر بات میں شائع ہونے والے ان کے مضامین اور کلام ان کی فکر کے آئینہ دار ہیں۔ نظم "قدم قدم پر اگاؤ قبریں" شبلی نے اپنے دوست مشتاق علی کی شہادت پر کہی جو سرینگر کے بی بی سی آفس میں بم دھماکے کے حادثے میں جاں بحق ہوئے۔

شبلی کا کہنا ہے کہ وہ آسان زبان استعمال کرتے ہیں تاکہ عام آدمی تک بھی ان کی بات پہنچے۔ ابلاغ نہ ہو تو آپ کی کہی ہوئی بات بے معنی ہو جاتی ہے۔

شبلی کا کہنا ہے کہ بڑی شاعری کے لئے مطالعہ مشاہدہ اور تجربہ بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ انسان خود وارداتوں سے گزر نہ جائے تو وہ صحیح عکاسی کر ہی نہیں سکتا۔

کہتے ہیں میں نے ابھی عمر کی پچیس منزلیں طے کی ہیں۔ شعور کی اس مختصر سی عمر میں جو

تجربے ہوئے ہیں انہی کا عکس میرے کلام میں ہے۔ مجھے اپنی زمین کا قرض پہلے ادا کرنا ہے۔ اس مشن کی تکمیل کے لئے خود کو وقف کیا ہے چنانچہ ایک جگہ میں نے کہا اور یہ ہی میرا منتہائے زیست ہے۔

تو حسیں ہے شبہ نہیں اس میں
تیری باتیں مجھے رجھاتی ہیں
تجھ سے ملنے سے کھل سا اٹھتا ہوں
اور جذبات بھی مچلتے ہیں
پر میں محصور ہوں تقاضوں کا
تجھ کو اپنا بنا کے میں یارا
تیری خوشیاں چرا نہیں سکتا
اور تمہیں کچھ بھی دے نہیں سکتا
اس لئے وقت کا تقاضا ہے
میں وفاؤں کی بھینٹ چڑھ جاؤں
آرزوؤں کا خون کردوں میں
دور ہو جاؤں میں بہت تجھ سے
گو کہ اس میں بڑی اذیت ہے
اور آنکھوں سے درد بولے گا
پر یہ دوری مرا مقدر ہے
اس کو سہنا مری عبادت ہے

مرتضیٰ شبلی

عکسِ فن

نظم

اس کو کہتے ہیں دل مرے ہمدم
کوئی کپڑا نہیں کہ تم جا کر
جس کو دھولو تو داغ نکلیں گے
یہ خیالوں کی ایسی دلدل ہے
جس میں جو بھی گیا نہیں نکلا
داغ دھبے کہاں نکل سکتے
وہ تو اپنی جگہ سلامت ہیں
دل تو قارون کا خزانہ ہے
جس سے کچھ بھی نکل نہیں سکتا

زندگی کے نام

ترے آنسوؤں سے میں گُل ہوا
ترے سخت پن نے جلا دیا
تری بے وجہ کی یہ شفقتیں
مری خود سری میں بدل گئیں
اور تمہارے غم کی بہار نے
مجھے خارزار بنا دیا
ترے ولولوں کے عذاب نے
یہی ساری عمر دکھا دیا

ڈاکٹر شبیر احمد

وہ مجھ سے پوچھتے ہیں یہ رہ گیر کون ہے
میں خود بھی جانتا نہیں شبیر کون ہے

ڈاکٹر شبیر احمد

Dr. Shabbir Ahemed
7901 NW 19 CT
Margate FLORIDA 33063 U.S.A.

ڈاکٹر شبیر احمد

(فلوریڈا)

مشہور جرمن فلاسفر نطشے Friedrich Nietzsche (۱۸۴۴ تا ۱۹۰۰ء) نے کیا خوب بات کہی تھی کہ "جو زیادتی تم نے میرے ساتھ کی ہے اسے میں تو معاف کردوں گا مگر اس طرح جو جرم تم نے اپنی ذات کے خلاف کیا ہے، اسے کون معاف کرے گا؟------- یہ بات درست ہے کہ ہمارے ہر گناہ، ہر ظلم اور ہر زیادتی کا منفی نتیجہ خود ہماری ذات پر بھی مرتب ہوتا ہے لیکن غور فرمایئے کہ عظیم فلسفیانہ دانش بھی وحی خداوندی اور حکمت نبوی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے آگے کیسی ہیچ ہے۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "بے شک نیکیاں گناہوں کو دور کردیتی ہیں۔" اور ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم ہے کہ اگر تم سے کوئی گناہ ہوجائے تو فوراً کوئی نیکی کرو تاکہ وہ نیکی تمہارے گناہ کو مٹادے۔ اگر نطشے کا مخاطب کوئی مسلم ہوتا تو وہ مسلم اسے جواب دے سکتا تھا کہ جب تم مجھے معاف کرتے ہو تو میں اپنے خدا سے رجوع کرکے اور نیکی کرکے اپنی ذات کے خلاف کیا ہوا جرم بھی مٹالوں گا۔"

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں
تو اقبال اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے

یہ شہ پارہ ڈاکٹر شبیر احمد ایم ڈی کا ہے جو ان کی کتاب "کہکشاں" میں موجود ہے۔ یہ اور ایسے جانے کتنے شہ پارے "کہکشاں" میں جمع ہیں۔ "کہکشاں" جو پہلے ایک ماہنامہ تھا جس کی کتابت ڈاکٹر شبیر خود کرتے تھے اور ماہ بہ ماہ بلاقیمت کئی ملکوں میں تقسیم کیے جاتے تھے۔ پھر پہلے چھتیس شماروں کو یکجا کرکے انہوں نے اسے کتابی شکل میں ۱۹۹۵ء میں طبع کرائی۔ اس شہ پارے سے ڈاکٹر شبیر احمد کی فکر کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ وہ اقبال کے جان نثاروں میں سے ہیں۔

اردو زبان سے انہیں والہانہ پیار ہے۔ چنانچہ کہکشاں میں انہوں نے قرآن اور سائنس کے موضوع پر بڑے معنی آفرین مضامین لکھے ہیں اور انتہائی اختصار کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ سائنس کا سرمایۂ افتخار قرآن حکیم میں بیان کردہ وہ حقائق ہیں جن تک سائنس رینگتے ہوئے صدیوں کا سفر طے کرنے کے بعد پہنچی ہے۔

یہی نہیں ڈاکٹر شبیر نے قارئین کو بھی لکھنے کی دعوت دی۔ چنانچہ کہکشاں میں قارئین کے رنگارنگ مضامین مختلف موضوعات پر ملتے ہیں۔ یہ مضامین مختصر ہوتے ہوئے بھی اثر آفرین ہیں۔ میں نے کہکشاں کے کئی شمارے پڑھے اور ڈاکٹر شبیر احمد کی سعیٔ پیہم، لگن اور جدوجہد سے خاصی متاثر بھی ہوئی کہ یہ محض بلا کسی معاوضہ کے بلکہ اپنی جیب خرچ کر کے نہ صرف اردو زبان وادب کے لئے کام کر رہا ہے بلکہ اپنی تہذیب وثقافت کی بقاء کے لئے بھی برسرپیکار ہے۔

ڈاکٹر شبیر احمد ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا میں ٹھیک اسی دن بھیجا جس دن پاکستان وجود میں آیا۔ یہ سعادت بھی کسی کسی کو حاصل ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اس عنایت کا حق بھی ادا کرے۔

شاعری کی ابتدا کیسے ہوئی اور شعر کہنے کے محرکات کیا ہیں اس سوال کا جواب دیتے ہوئے انہوں نے کہا کہ۔

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرم راز درون مے خانہ

اور

نغمہ کجا و من کجا، ساز سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

ڈاکٹر شبیر نثر میں افسانہ نگاری کو چھوڑ کر، تاریخ، دین (نہ کہ مذہب) کالم نگاری، فلسفہ، عمرانیات اور مزاح نگاری کو پسند کرتے ہیں۔ لکھتے بھی ہیں اور ان موضوعات کا لگن سے مطالعہ بھی کرتے ہیں کہتے ہیں کہ "آج معیاری ادب تخلیق نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے ادب کو بہت چھوٹی سرحدوں کے اندر قید کر رکھا ہے۔ غور کریں تو قرآن حکیم کائنات میں ادب کا اعلیٰ ترین شاہکار ہے اور آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ادب براہ راست بارگاہ خداوندی سے سیکھا تھا۔ اگر ادب کا مفہوم وہ لیا جائے جو آج مروج ہے یعنی شعر و نثر میں افسانوی اور خیالی "کبوتر بازی" تو ایسے ادب کی وفات پر ڈاکٹر شبیر احمد کو رنج نہیں ہوگا۔ جس ادب میں گہری فکر اور تخلیق کے عناصر موجود نہ ہوں اس کے بارے میں علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے کہ۔

ناداں ادب و فلسفہ کچھ چیز نہیں ہے
اسباب ہنر کے لئے لازم ہے تگ و دو

جب تک ہمارا ادیب نام و نمود اور محض ایک "اسمارٹ" بات کہہ دینے سے واہ واہ کا طالب رہے گا وہ زبان یا قوم کی خدمت کرنے سے محروم رہے گا۔ اب رہی بات اردو زبان کے مستقبل کی تو آپ جانتی ہی ہوں گی کہ ہمارے شعراء اور ادیب کی اکثریت خود اردو کی قاتل ہے۔ ان کے گھروں میں اردو کب بولی جاتی ہے۔ نہ وہ زحمت اٹھا رہے ہیں کہ بچوں کو اردو کی طرف راغب کریں۔ دوسرے اردو میں اوریجنل اور فکری معیاری تخلیقات وجود میں نہیں آرہی ہیں۔ ہندوپاکستان کے بڑے نامور شعراء' ادیب' افسانہ نگار اور کالم نگاروں کی حالیہ تحریریں نظر سے گرتی ہیں تو یہ سوچ کر دل بھر آتا ہے کہ جب ہمارے دانشور طبقے کی ذہنی سطح کا یہ عالم ہے تو شاید اللہ کو بھی ہمارا حافظ ہونا گوارا نہ ہو۔ میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ۔

عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیلؑ

آپ چاہیں تو سلطانہ باجی یہ عرضداشت شائع فرمائیں یا روک لیں کہ ہمارے ہاں سانحہ اتنا عظیم ہے کہ وہ متوفی شاعر قومی فکر و ادب و شعر کا نمائندہ سمجھا جاتا ہے جسے مے نوشی پر فخر تھا جس کی بیوی فرنگی تھیں۔ (اور ہیں) اور جو روس کا تنخواہ دار تھا اور جسے یہ کہہ دینے میں کوئی باک نہ تھا کہ۔

آئے کچھ ابر کچھ شراب آئے
اس کے بعد آئے جو عذاب آئے

اور

تری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے

تو ہمارے نام نہاد دانشور بہت سے ایسے ہیں جو فی الحقیقت قومی مجرم ہیں"۔

ڈاکٹر شبیر احمد

عکسِ فن

یومِ آزادی

"اور تم اپنے رب کی کون کونسی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے"۔ (سورۃ رحمٰن)

(۱۴ اگست کی رات لیلۃُ القدر تھی)

لیلۃُ القدر، لیلۃُ القرآن
لیلۃُ القدر، امِّ پاکستان
وہ میرا دین، یہ میرا ایمان
فبائ آلا ربکما تکذبان

چاند کی جیسی چودھویں راتیں
ویسی چودہ اگست کی باتیں
میرے پروردگار کی سب شان
فبائ آلاء ربکما تکذبان

ہیں خدا کی عنایتیں ہم پر
اور نبیؐ کی ہیں رحمتیں ہم پر
ہم اسی سے ہیں ہم سے پاکستان
فبائ آلا ربکما تکذبان

آؤ اٹھ کر سجائیں اپنا چمن
رشکِ جنت بنائیں اپنا وطن
جاں سلامت اسی سے اپنی آن
فبائ آلاء ربکما تکذبان

صرف جغرافیے کی بات نہیں
اپنی تاریخ کا وطن ہے امیں
پاک دھرتی ہے منزلوں کا نشان
فبائ آلا ربکما تکذبان

رخسانہ شمیم

رنگِ فضا ہے رنگ تمہاری آنکھوں کا رخسانہ شمیم
موسمی چڑیا دیکھے تو اس کو سرخاب بنا ڈالے

رخسانہ شمیم

برلن ۲۸ جنوری ۹۶ء

Rukhsana Shamim
Institure of Ethnology Free University
DROSSEL WEG 1/3
14195 BERLIN- GERMANAY

رخسانہ شمیم

(جرمنی)

رخسانہ شمیم کا تعارف لکھنے بیٹھی تو منظر علی خان منظر یاد آگئے جواب اس دنیا کے لئے مرحوم ہو چکے ہیں لیکن میرا ذہن ان کی موت کو قبول نہیں کر پا رہا ہے اور کرے بھی کیسے۔ میں ہفتہ بھر بعد (آج ۲۶ فروری ۱۹۹۶ء ہے) دہلی ہندوستان اور پھر کراچی کے لئے عازم سفر ہوں۔ ہندوستان اور پاکستان کے رفیقوں سے ملاقاتوں کے مناظر اپنے تمام تر ولولوں کے ساتھ ذہن کے افق پر تازہ ہو رہے ہیں۔ منظر علی خان کی دوڑ بھاگ یاد آرہی ہے۔ مصروفیت کے لمحوں میں ہر بات کے جواب میں ان کا اچھا۔ آ۔ آ (اس لفظ کو بہار کے لب و لہجے میں کھینچ کر بولنے کی عادت سے میرے گھر کے سبھی افرد محظوظ ہوتے تھے) اچھا۔ آ۔ آ کہنا یاد آرہا ہے۔ اپنے دفتر حبیب بینک واقع بولٹن مارکیٹ سے میرے دفتر ماہنامہ روپ حسن اسکوائر تک ان کا بھاگم بھاگ آنا۔ اپنی نئی غزل سنانا۔ اپنی کتاب کی رسم اجراء کی تقریب کے لئے میری شرکت اور مضمون لکھنے پر یاد دہانی کرانا اور پھر بقرعید کے دن اہتمام سے بہاری کباب لانا ان کی وضعدار طبیعت کے رنگا رنگ پہلو کے مظاہر تھے جو آج بھی یاد دلاتے ہیں کہ منظر صاحب ایسے بے مروت اور بے رحم تو نہ تھے کہ یوں بن ملے' بن بتائے چل دیتے۔ مگر جب میں کراچی میں قدم رکھوں گی اور دنوں تک ان سے ملاقات نہ ہوگی تو اندر سے آواز آئے گی کہ مان لو۔ وہ چلے گئے مگر نہیں میں پھر بھی نہیں مانتی۔ میں یہ سمجھوں گی کہ وہ امریکہ گئے ہیں۔ کیونکہ ۱۹۹۳ء میں جب میں کراچی گئی تھی تو وہ اپنے اسی عارضہ قلب کے علاج کے لئے اپنے بھائی کے پاس غالباً نیویارک گئے تھے مگر وہ واپس آئے تھے۔ ملے تھے اور کہا تھا کہ میں لاس اینجلس تمہارے بچوں کے پاس نہ جا سکا سو

اب میں بھی ان سے ملے بغیر آجاؤں گی اور انتظار کروں گی کہ ان سے مستقبل میں بہرحال ملاقات ہوگی۔ یہاں نہ سہی' وہاں۔ میں ہی چلی جاؤں گی۔ لیکن کراچی جاکر مجھے ان کی بیگم اور بچوں سے تو ملنا ہی ہے جن سے انہوں نے بڑے چاؤ سے ہمیشہ ملوایا۔ اور پھر اس پل صراط سے تو گزرنا ہی ہوگا جس پر میں چلنے سے گریز کر رہی ہوں۔ مجھ میں واقعی اس دکھ کو سہنے کی ہمت نہیں اس کا مجھے اعتراف ہے۔ اپنے رفیقوں سے بچھڑنے کا دکھ سہنے کے لئے وہ دل کہاں سے لائے کوئی۔ انور شعور نے غالباً اسی موقع کے لئے کہا تھا کہ۔

ہم تم کو روتے ہی نہ رہتے اے مرنے والو
مر کے اگر پاسکتے تم کو' مرجاتے ہم بھی

وہ ۸ ستمبر ۱۹۹۵ء کا دن تھا جب مجھے برلن سے رخسانہ شمیم کا خط ملا۔ رخسانہ نے لکھا تھا کہ میں آپ سے ملنا چاہتی تھی لیکن مجھے منظر صاحب نے بتایا کہ آپ پاکستان چھوڑ چکی ہیں۔ رخسانہ نے میرے سوالنامہ برائے سخن ور حصہ دوم کے متعلق بھی لکھا اور یہ بھی کہ منظر صاحب نے اسے سوالنامہ دیا تھا جس کا جواب وہ جلد بھجوا رہی ہے۔ میں اس خط کے بعد منتظر رہی۔ پھر خط لکھا اور پھر مجھے ۲۸ جنوری ۹۶ء کو رخسانہ کا دوسرا خط ملا۔ پتے کی تبدیلی کے ساتھ۔ اور ساتھ میں کئی بری خبروں کے ساتھ کہ اسے برونکائیٹس ہوا جو بگڑ گیا۔ کئی بار اس کی سانس رک گئیں۔ اس دوران گاڑی ایکسیڈنٹ ہوا۔ پھر رخسانہ کے بیٹے کا آپریشن ہوا اور پھر رخسانہ اپنی امی کی بیماری کی وجہ سے پاکستان روانہ ہوگئی۔ خط کے ساتھ رخسانہ نے اپنا کلام اور دیگر معلومات وتصاویر بھجوادیں۔ میں منتظر ہوں کہ خدا رخسانہ کو تمام آفات سے بچائے اور مجھے اس کی خیریت کی خبر جلد ملے۔ آمین۔

رخسانہ شمیم بیس سال سے جرمنی میں مقیم ہیں۔ یہ بیس سال رخسانہ نے ضائع نہیں کئے۔ اپنے روزگار کے حصول کی محنت کے ساتھ ساتھ اس نے نہ صرف جرمن زبان سیکھی بلکہ جرمنی میں شاعری بھی کرنے لگیں اور جامعہ کراچی کے شعبہ تصنیف وترجمہ کے ڈائریکٹر کے بقول رخسانہ پہلی پاکستانی شاعرہ ہے جو جرمن زبان میں شاعری کرتی ہیں۔

رخسانہ نے جامعہ کراچی سے حیاتی کیمیا میں بی ایس سی آنرز اور ایم ایس کیا۔ جس کا ادب سے کوئی رشتہ نہیں لیکن رخسانہ کا ادب سے لڑکپن سے رشتہ ہے۔ چنانچہ جرمنی پہنچ کر رخسانہ نے "اردو مرکز" برلن کی بنیاد رکھی اور اسی کے تحت قرۃ العین حیدر کے اعزاز میں میونسٹر یونیورسٹی کی تاریخ میں پہلی ادبی نشست رکھی۔ رخسانہ قرۃ العین کے فن کی پرستار ہے اور قرۃ العین حیدر سے دوستی کو اپنی زندگی کا ایک اہم واقعہ قرار دیتی ہیں۔

رخسانہ شمیم

رخسانہ نے قرۃ العین حیدر کے افسانہ "ڈالن والا" اور "جہاں پھول کھلتے ہیں" کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ حالانکہ ترجمہ جس میں اصل تحقیق کی روح بھی برقرار رہے آسان کام نہیں لیکن رخسانہ ہمہ جہت شخصیت کی مالک ہیں۔ انہیں زبان پر عبور حاصل ہے۔ ترجمے کا مقصد مکھی پر مکھی بٹھانا نہیں ہے۔ اس میں بنیادی چیز تہذیب و ثقافت سے مکمل آگاہی ہے۔ ایک اچھے مترجم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی زبان اور جس میں وہ ترجمہ کررہا ہے اس پر بھی دسترس رکھتا ہو اور پھر زبان کے تہذیبی اور ثقافتی رشتوں سے بھی اسے آگاہی حاصل ہو۔ چنانچہ رخسانہ پہلے تجربات کی بھٹی سے گزری ہیں۔ وہ وائس آف جرمنی میں ترجمان کی حیثیت سے کام کرچکی ہیں۔ جرمن ٹیلیویژن کی کئی فلموں کا ترجمہ کیا ہے اور پسندیدگی کی سند حاصل کرچکی ہیں۔ مسالماتی جنسیات میں جرمنی ماکس پلانگ انسٹیٹیوٹ اور میونسٹر یونیورسٹی سے ڈپلومہ لیا ہے۔

قرۃ العین کے افسانوں کے علاوہ انہوں نے عصمت چغتائی (مرحومہ)، احمد ندیم قاسمی، حمایت علی شاعر اور جمیل الدین عالی کی تخلیقات کا بھی جرمن زبان میں ترجمہ کیا ہے۔ ۱۹۹۴ء میں جرمن زبان میں ایک کتاب "دنیا کی سیاہ فام عورتیں" ایڈٹ کرچکی ہیں جو یوروپی برادری کے ویمن ٹریکشن کے تعاون سے برلن کے اشاعتی ادارے اورلنڈا فرلاگ نے شائع کی ہے۔ چونکہ رخسانہ جرمنی کی تاریخ میں ہونے والی پہلی بلیک ویمن سمر یونیورسٹی کی منتظمین میں سے ہیں اس لئے رخسانہ کے کلام میں ان کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کی پرچھائیاں واضح نظر آتی ہیں۔ ان دنوں رخسانہ تین جرمن زبان کی تین اہم شاعرات کی نظموں کے منظوم اردو تراجم پر کام کررہی ہیں۔ یہ کتاب ہندوستان سے شائع ہوگی۔ اس کا نام ہے۔ "روشنی پرچھائیوں کی" ان شاعرات کا نام روزے اڑس لینڈر، سلما میریاوم آئزینگر اور ماری لوئیزے کاشنس ہے۔ رخسانہ کی اردو شاعری کا مجموعہ "رائن کہے کچھ راوی سے" فرینکفرٹ کے بین الاقوامی کتاب میلے میں پیش ہوچکا ہے۔ اس کے ساتھ جرمن شاعر داس لیڈر پرگلدس رنگے کی نظموں کا ترجمہ "چوڑیوں کا زمزمہ" کے نام سے پیش ہوا تھا۔ رخسانہ کی شاعری کا دوسرا مجموعہ "پھول ہیں ہم ایک موسم کا" اشاعتی مرحلے میں ہے۔

ان دنوں رخسانہ شمیم برلن جرمنی کی "فری یونیورسٹی" میں انتھولوجی میں ویمن اسٹیڈیز کے موضوعات کی تعلیم دے رہی ہیں۔ ان کا کلام فنون، تخلیق، صریر اور توازن میں شائع ہوتا رہتا ہے۔

رخسانہ شمیم

عکس فن

غزل

آئے وہ آکر ہر اندیشہ وہم و خواب بنا ڈالے
دل پہ پڑے اس بوجھ کو آکر سبک سحاب بناڈالے

تنہائی کی جھیل میں گر کر تیرے لگاؤ کے پتھر نے
اندیشوں کی سطح پہ کتنے ہی گرداب بنا ڈالے

یارب دے وہ کمال سخن جو دل پہ لگے سب زخموں کو
لالہ و گل یا جوہی ، سوسن، سمن گلاب بنا ڈالے

ساتھ نہ دینا ہو تو بچھڑ جا، لیکن کوئی فیصلہ کر!
حیلہ جو! تونے تو میرے دن رات عذاب بنا ڈالے

جذب باہم کا ہے کرشمہ، سیدے ہوں یا انساں
کہیں شہاب ثاقب اور کہیں مہتاب بنا ڈالے

میرے عناصر کی ہیئت آکے بدل کر، کون ہے وہ
خون جگر سے آنکھ میں جو تصویر آب بنا ڈالے

رنگ فضا ہے رنگ تمہاری آنکھوں کا رخسانہ شمیم
موسمی چڑیا دیکھے تو اس کو سرخاب بنا ڈالے

فرحت شہزاد

اے کہ تجھ کو ترے جہاں والے
سب غفور و رحیم کہتے ہیں!
دیکھ کہ میری خشک آنکھوں سے
دل جگر خون ہو کے بہتے ہیں
کہ میری رات نے گزر کر بھی
اِک نئی رات ہی جنم دی ہے!

فرحت شہزاد

Ferhat Shhezad
51 Teasdate St.
Thousand Oaks CA 91360 - U.S.A.

فرحت شہزاد
(لاس اینجلس)

مجھے وہ چھوٹے بھائی کی طرح ہی پیارا ہے اس لئے اس کے کچے پکے وعدے بھی ہمیشہ پیارے لگے۔ اسے پہلی بار میں نے ۱۹۹۱ء میں گلنار آفرین کے گھر شعری نشست میں دیکھا۔ پھر دوسرے دن وہ گلنار کے ساتھ میرے گلشن اقبال کراچی والے مکان پر آیا اور پہلا شعری مجموعہ "مت سوچا کر" میرے ہاتھ میں تھما کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔ میں اس کا اداس چہرہ دیکھتی رہی۔ تسلی کے دو بول بھی نہ کہہ سکی۔ کیونکہ وہ جس کیفیت میں تھا اس عالم میں تسلی کے بول بھی زخم کرید کر رکھ دیتے ہیں۔ وہ اپنی نیتا کی جدائی کا گھاؤ اپنے دل میں چھپائے ہوئے تھا۔ میں اس دوسری ملاقات میں یہ جان چکی تھی کہ میرا چھوٹا بھائی جی دار ہے۔ (میں نے انہی لمحات میں اسے اس سے پوچھے بغیر اپنے دل میں اپنے اس چھوٹے بھائی کی جگہ بیٹھا لیا تھا جو سالوں پہلے کار کے ایکسیڈنٹ میں مجھ سے پوچھے بغیر مجھے چھوڑ کر چلا گیا تھا) سو اس جی دار پر مجھے بھروسہ تھا کہ وہ نیتا کے غم کو اپنی شاعری میں سمولے گا۔ اسے یہ ہنر اس وقت آتا نہ تھا مگر وہ ایک عملی آدمی تھا۔ لہٰذا اس کا تعارف حاصل کرنے کے لئے میں اس کے کچے پکے وعدوں کے پیڑ پر پھل لگنے کا انتظار کرتی رہی۔ اور جب ایک دن وہ میرے ہاتھ لگا تو اس طرح میرے سامنے بیٹھ گیا جیسے ایک ننھا معصوم بچہ چپ چپ سا۔ مگر اس کی ذہین آنکھیں پوچھ رہی تھیں۔ پوچھیے کیا پوچھنا چاہتی تھیں؟

"چاہتی تھی نہیں۔ چاہتی ہوں۔ یہ سوالنامہ ہم دونوں کے درمیان ہے۔" میں کہے جا رہی تھی اور وہ مسکرا رہا تھا۔ کیونکہ دکھوں کی کالی بدلیوں کو چیر کر چاند کی طرح مسکراتے دکھائی دینا اس کی عادت ہے۔ یہ ڈیرہ غازی خان (پاکستان) کی مٹی کی خوشبو میں بسا فرحت ہے جس نے اپنے مزاج کا سا تخلص شہزاد اپنایا۔ ۱۹۷۶ء میں جامعہ کراچی سے اردو میں ایم۔ اے کیا۔ انگریزی میں ایم۔ اے کرنا چاہا مگر ۱۹۷۷ء میں نامکمل چھوڑ کر دوسرے کاموں میں لگ گیا۔ ۱۹۸۶ء میں امریکہ

میں جا کر مزوری سینٹ لوئیس سے ایم-بی-اے کر لیا۔ پھر پی ایچ ڈی کی ٹھانی جو ناسازگار حالات کی وجہ سے ادھوری رہ گئی۔ مگر اب ۱۹۹۶ء میں پھر توجہ کی ہے اور اب ناکامی نہیں ہوگی کیونکہ اب اس کی زندگی میں ایک پیاری سی کومل سی شاعرہ امرت واقعی امرت دھار بن کر آگئی ہے۔

"شنزاد" میں اس سے پوچھ رہی تھی۔ "تمہارے کلام کے تین چار مجموعے اب تک شائع ہو چکے ہیں۔ مت سوچا کر، تم جدائی' اور سن پاؤ اگر۔ یہ بتاؤ کہ اس دور میں اردو ادبی رسائل اور کتابوں کی فروخت پر عذاب کیوں آیا ہوا ہے؟ شنزاد کہہ رہا تھا "ادبی رسائل اور کتابوں کی مقبولیت میں کمی کی دوسری کئی وجوہات کے ساتھ ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ آج زندگی بسر کرنے کی رفتار میں خطرناک حد تک اضافہ ہو گیا ہے۔ آج کے قاری کی جاگتی زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ اسی رفتار کا ساتھ دینے کی کوشش میں صرف ہوا جا رہا ہے۔ اس کے پاس دن بدن ان مصروفیات کے لئے وقت کم سے کم تر ہوتا جارہا ہے۔ لیکن اس رجحان کے ذمہ دار بہت بڑی حد تک ہم خود یعنی اہل قلم اور پبلشر حضرات ہیں۔ سخن دریا تو گزرے ہوئے کل کے رنگین خواب دکھا رہے ہیں یا آنے والے کل سے ڈرا رہے ہیں۔ آج کا ذکر صرف مسائل کے حوالوں سے ہو رہا ہے جن سے ہمارا قاری خود دوچار ہے۔ لیکن کوئی بھی اس تک ان مسائل کا حل یا کم از کم ہینڈل کرنے کا طریقہ نہیں پہنچا رہا۔ دوسری طرف پبلشر حضرات کے لئے کتاب یا رسالہ صرف ایک پراڈکٹ بن کر رہ گئے ہیں۔ وہ ان میں موجود مواد سے قطع نظر ان کی ظاہری زیبائش بڑھا کر انہیں ان داموں پر بیچنے میں مصروف ہیں جن پر زیادہ تر وہ گاہک انہیں خرید رہے ہیں کہ جو کتابوں کو ایک ڈیکوریشن پیس کی طرح خرید کر ایک خوبصورت شیشے کی الماری میں سجا دینا کافی سمجھتے ہیں۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لئے ہمیں کل کے خوابوں اور آنے والے کل کے وسوسوں سے نکل کر آج کے مسائل نہ صرف بیان کرنا ہوں گے بلکہ ان کا کوئی مثبت حل بھی تلاش کرنا ہوگا۔ پبلشرز کو کتابیں اس قیمت پر پیش کرنا ہوں گی جو ایک عام قاری ادا کر سکے۔ اس سلسلے میں ایک قدم اور آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔ یعنی کتابیں کیسٹس کی شکل میں پیش کی جائیں تاکہ وطن سے باہر بسنے والے قاری خاص طور پر اور عام طور پر ہر وہ شخص جس کے پاس کتاب پڑھنے کی صلاحیت یا واقفیت نہیں ہے اپنے فارغ وقت کو بے سر پیر کے گانے سننے کی بجائے سماعتی مطالعے میں استعمال کر سکے"۔

"پاک و ہند سے دور پرورش پانے والی نئی نسل کی اردو زبان سے دوری اور فاصلے ختم کرنے کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہئے؟" شنزاد نے سوال سن کر کہا۔

"نئی نسل کا اردو سے دور ہونا ایک فطری عمل ہے۔ وطن عزیز میں اردو بچوں کا پیٹ بھرنے

کا سبب بنی ہے نہ وطن سے باہر یہ ممکن ہے۔ عام بول چال میں استعمال ہونے والی زبان کتابی زبان سے حیرت ناک حد تک مختلف ہوتی جا رہی ہے۔ جب قاری اور کتاب کا فاصلہ آج کے دور جتنا ہو جائے یا جب کوئی زبان صرف اس لئے بولنے یا پڑھنے کی کوشش کی جائے کہ وہ ہمارے اجداد کی زبان "تھی" اور اس زبان کا بولنا معاشرے میں آپ کے لئے عزت نہ رہے بلکہ فرقہ واریت گردانا جائے تو اس زبان کے مستقبل کے بارے میں مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ میرے خیال میں سب سے پہلے اردو سے کسی خاص خطے یا ملک کی زبان ہونے کی مہر کو مٹایا جائے۔ اردو میں در آنے والے دوسری زبان کے الفاظ کو کھلے دل ودماغ سے پرکھا اور قابل قبول الفاظ وتراکیب کو قبول کیا جائے۔ ادیب، تخلیق ادب میں اپنے قاری سے تعلق اور رشتے کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کی کوشش کریں اور زیادہ سے زیادہ وہ زبان استعمال کی جائے جو ہماری عام زندگی میں مروج ہے"۔

"کیا لفظ آج سچ بول رہے ہیں؟" شہزاد کا جواب تھا۔ "لفظ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ ہاں یہ درست ہے کہ سخن ور نے ادب اور زندگی کی راہوں کو ہمارے دور میں بطور خاص، خاصی حد تک جدا کر دیا ہے۔ چبائے ہوئے لقمے ہر دور میں اگلے ہیں۔ ہمارے دور میں اس کی بہتات ہمارے اجتماعی معاشرے کی سوچ کا کھوکھلا پن ظاہر کرتا ہے۔ آج کی ظاہری سج دھج کو جو پذیرائی ہے وہ کسی دور میں اس حد تک نہ تھی۔ ہمارا قاری زندگی بسر کرنے کی تگ ودو میں گردن تک دھنسا ہے کہ اسے بہت سی کتابیں پڑھنے کا وقت ہے اور نہ ہماری کتابیں تحریر کرنے والوں کو کوئی کتاب پڑھنے کا شوق ہے۔ آج کے ادباء وشعراء کی کم علمی اور چند اہل علم وفن کی مقبولیت آمیز حوصلہ افزائی انہیں بزعم خود میر وغالب کے ساتھ اور بعض اوقات ان سے بھی اوپر بٹھا رہی ہے۔ اور جب ان احباب کے ہاتھ وسائل کی مصلحت آمیز تلوار اور ہمارے پبلشروں اور ادبی محافل کا اہتمام کرنے والے دوستوں کی ڈھال بھی آجاتی ہے تو اردو دنیا سوائے سینہ کوبی کے اور کر بھی کیا سکتی ہے۔

اشد ضرورت اس بات کی ہے کہ ادبی وشعری محافل کے منتظمین اور پبلشرز خواتین وحضرات مصلحت کے تقاضوں کو پس پشت ڈالنے کی کوشش کریں۔ اہل علم وفن دوست اردو کی بنیادوں کو ذاتی نمائش کی خاطر کھوکھلا کرنے کی کوشش کرنے والوں کو بے نقاب کریں۔ اور یہ دونوں کام بہرحال ایک دشوار ترین جہاد سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔"

فرحت شہزاد

عکسِ فن

غزل

گوشے گوشے میں مہک، پھول میں ڈالی ڈالی
دل کی حالت ہے مگر آج بھی برسوں والی

اپنے ہاتھوں سے تجھے سونپ کے اندھیاروں کو
ہم نے دل کو تری چاہت کی سزا دے ڈالی

رتجگے تو ہیں مقدر کا ہمارے حصہ
تیری آنکھوں میں کیوں اے شخص بھری ہے لالی

جستجو جس کی لئے پھرتی تھی صحرا صحرا
رہروِ زیست نے آخر کو وہ منزل پالی

چوٹ جس کو بھی لگے، درد ہمیں ہوتا ہے
یہ ہی فطرت ہے ہمیں دار پہ لانے والی

متفرق اشعار

رشتے، ناطے، بندھن سارے منہ تکتے رہ جائیں گے
اس پرشور سفر کا آخر تنہائی ہوگا انجام

اب شہزاد کا دنیا بھر میں کوئی نہیں، کوئی بھی نہیں
لے دے کر اک تو تھا، تو بھی چھوڑ گیا چل کر دو گام

○

سلتے ہیں تو سل جائیں کسے فکر لبوں کی
خوش رنگ اندھیروں کو کہوں گا میں سحر کیوں!

شمشیر سنگھ شیر

وہی قاتل وہی منصف وہی رب فیصلہ دیں گے
میری خودکشی تھی یا کہ قاتل ہی تھا میرا

شمشیر سنگھ شیر
9.6.96

Shamsher Singh Sher
Brandholms Alle 3E St. tv.
2610 Rodover DENMARK

شمشیر سنگھ شیر

(ڈنمارک)

شمشیر سنگھ نام اور شیر تخلص کرنے والے شاعر سے میری ملاقات دہلی میں ہوئی۔ ان کی کتاب ''خم خانہ شیر'' کی تعارفی تقریب اردو اکیڈمی دہلی کی جانب سے تھی۔ مجھے جناب مخمور سعیدی نے مدعو کیا تھا۔ اسی شام مجتبیٰ حسن صاحب (معروف طنز ومزاح نگار اور مرحوم ابراہیم جلیس صاحب کے بھائی) ساقی نارنگ کے ہمراہ ملاقات کے لئے آئے تھے۔ میں افسانہ نگار اور اپنی دوست انور نزہت کے گھر مقیم تھی۔ نزہت کو دو دن پہلے نیویارک اچانک جانا پڑا۔ ان کے صاحبزادے اقبال کی ناسازی طبع کی وجہ سے نزہت کا پروگرام اچانک بنا تھا' ماں جو تھیں۔ بیٹے کی بیماری کی خبر سن کر فوراً رخت سفر باندھ لیا۔ میں اور نجمہ انعم ساقی نارنگ صاحب کے ہمراہ اکیڈمی پہنچے۔ نجمہ انعم بھی شاعرہ ہیں اور تنقید نگاری میں جامعہ ملیہ دہلی سے پی ایچ ڈی کر رہی ہیں۔ چونکہ مجتبیٰ حسن صاحب کو کہیں اور جانا تھا اس لئے وہ ہمارے ساتھ نہ جاسکے۔

ہم اکیڈمی پہنچے تو ہال سخن فہموں اور شیر سنگھ کے مداحوں سے بھرا پڑا تھا۔ شیر صاحب نے اپنا مجموعہ کلام عنایت کیا۔ اس مجموعے میں تمام کا تمام کلام ''شراب'' کے موضوع پر ہے۔ قطعات اور رباعیات جو سب کی سب ان کے منفرد رنگ میں ہیں۔ کتاب کی طباعت بھی خوب ہے۔

شمشیر سنگھ شیر کا تعلق ہندوستان سے ہے۔ لیکن رہتے ڈنمارک (کوپن ہیگن) میں ہیں۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو راولپنڈی میں پیدا ہوئے۔ خاندان تجارت پیشہ تھا۔ ان کے ماموں چودھری بچن سنگھ کے اولاد نہ تھی انہوں نے شمشیر کو گود لے لیا۔ تیرہ سال کی عمر سے پنجابی زبان میں شعر کہنے لگے۔ بطور شاعر ان کی پہچان اس وقت سے ہوئی جب انہوں نے کرپس مشن کے خلاف ایک نظم

پڑھی۔ بھارت کی تقسیم کے بعد انہوں نے دہلی میں سکونت اختیار کی۔ وقت کے ساتھ ان کی سیاسی سماجی اور ادبی سرگرمیوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ شیر کی کتاب "پھل کلیاں" چھ سال تک پنجابی کے نصاب میں شامل رہی۔ پنجابی میں "ڈھلکدے ہنجو" اور تیریاں یاداں میرے گیت" اور اردو میں "پیام شیر" اور "صدائے دل" ان کی کتابیں صاحبان ذوق سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

شیر کی کئی نظمیں اور غزلیں ریکارڈ کی صورت میں بھی دستیاب ہیں۔ ان میں ایک شری گورونانک دیو کی جیون کتھا L.P کی صورت میں گورونانک جی کی ۵۰۰ویں برسی پر ایچ ایم وی نے جاری کی تھی جسے عالمی شہرت حاصل ہے۔ شاعری کے میدان میں شیر کی خدمات کا اعتراف آنجہانی وزیراعظم جواہرلال نہرو، لال بہادر شاستری اور اندراگاندھی نے بارہا کیا ہے۔ شیر کو شاعرانہ خدمات کے صلہ میں بے شمار انعامات سے بھی نوازا گیا ہے۔

شیر نے شاعری کی ابتدا پنجابی شاعری سے کی لیکن آج وہ اردو کو بہتر ذریعہ اظہار تصور کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اردو دانوں نے ان کو جو محبت دی ہے اور ان کی جو عزت افزائی کی ہے اس سے وہ اردو اور اردو والوں کے احسان مند ہو گئے ہیں۔

شیر کے پنجابی سے اردو تک کے سفر کی داستان بھی دلچسپ ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ۱۹۶۷ء میں وہ دیوبند کے ایک مشاعرہ میں گئے۔ اس مشاعرہ میں شرکت کی دعوت ان کے ایک پنجابی دوست نے دی تھی اور وہ یہی سوچ کر گئے کہ وہ پنجابی شعر سنائیں گے۔ لیکن حاضرین میں پنجابی سمجھنے والے انہیں نظر نہیں آئے۔ چنانچہ انہوں نے... فی البدیہہ ایک قطعہ کہا اور مشاعرہ لوٹ لیا۔ وہ قطعہ یہ تھا۔

میں ترکی نہیں ہوں حجازی نہیں ہوں
مجاہد نہیں کوئی غازی نہیں ہوں
یہ اللہ کے ہیں اور اللہ ہے میرا
ہوا کیا اگر میں نمازی نہیں ہوں

شیر کو مشاعرہ لوٹنے کا فن خوب آتا ہے۔ اسکے لئے انہوں نے زبردست جدوجہد کی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ اپنی جھجھک دور کرنے کے لئے وہ ویرانوں میں جا کر درختوں کو اپنے شعر سناتے تھے۔

۱۹۸۸ء میں دہلی میں منعقد ہونے والی عالمی اردو کانفرنس میں انہیں ان کی ادبی خدمات کے اعتراف کے طور پر اردو شاعری کا "جوش ملیح آبادی عالمی اردو ایوارڈ" دیا گیا۔ ۲۹ مارچ ۱۹۹۲ء کو

شمشیر سنگھ شیر

دہلی میں کیندریہ پنجابی لیکھک سبھا کی جانب سے کل ہند پنجابی کانفرنس، منعقد ہوئی۔ اس میں پاکستان کے معروف شاعر اور "پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز" کے چیئرمین جناب فخرزمان بھی شریک تھے۔ اس کانفرنس میں شمشیر سنگھ شیر کو بطور خاص مدعو کیا گیا اور انہیں اعزاز سے نوازا گیا۔

ہنس مکھ شمشیر سنگھ نے حوادث زمانہ سے لڑتے ہوئے زمانے کے دکھ اور الم کو اپنا ساتھی بنالیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج وہ اپنی عملی زندگی میں بھی کامیاب ہیں اور شاعری میں بھی کامیابی کی منزلوں کو چھونے کی جدوجہد میں مگن ہو کر کہتے ہیں۔

درد جگر سے یاری اپنی' شیر محبت رنج و الم سے
اٹھیں بیٹھیں ساتھ ہمارے اب دنیا بھر کی آفات

●

آئی شب چراغاں انسان جل رہا ہے
انساں کے روپ میں وہ بھگوان جل رہا ہے
ہے کفر کا اندھیرا ایماں کی روشنی میں
اور روشنی کی خاطر ایمان جل رہا ہے
جلتا ہوا یہ دیپک مہماں ہے رات بھر کا
اور رات کے گھر اس کا مہمان جل رہا ہے
ارمان تھا کہ ہم بھی دیکھیں کبھی دوالی
شیر آئی وہ دوالی ارمان جل رہا ہے

●

شمشیر سنگھ شیر

عکس فن

غزل

وہی ہیں ہمنوا لیکن جدا ان کے اشارے ہیں
سہارے لاکھ ہیں، لیکن کھڑے ہم بے سہارا ہیں
ہوئے اپنے پرائے، جن کی خاطر آج سب دشمن
مزے کی بات ہے دیکھو وہی دشمن ہمارے ہیں
ستاتی ہے یہ جن کی یاد آ آ کر خیالوں میں
انہی کی یاد کے صدقے میں ہم نے دن گزارے ہیں
مجھے دل شاد کرنے کو مجھے مسرور کرنے کو
زمیں پر لالہ و گل ہیں فلک پر چاند تارے ہیں
یہ دردِ دل، غمِ جاناں، غمِ دوراں، غمِ عقبیٰ
سہارے دل کے ہیں اے شیرؔ یہ ساتھی ہمارے ہیں

○

آئی شبِ چراغاں انسان جل رہا ہے
انساں کے روپ میں وہ بھگوان جل رہا ہے
ہے کفر کا اندھیرا ایماں کی روشنی میں
اور روشنی کی خاطر ایمان جل رہا ہے
جلتا ہوا یہ دیپک، مہماں ہے رات بھر کا
اور رات کے گھر اس کا مہمان جل رہا ہے
ارمان تھا کہ ہم بھی دیکھیں کبھی دوالی
شیرؔ آئی وہ دوالی ارمان جل رہا ہے

ضیاء خان

یہ جو ٹمٹما رہا ہے ذرا اس کی لو بڑھا دو
یہ چراغِ علم و فن ہے بڑی دیر تک جلے گا۔

ضیاء خان
۱۳ جنوری ۱۹۹۶ء

Zia Khan
P.O.Box 90987
RIYADH 11623 - Saudi Arbia

ضیاء خان

(لاس اینجلس)

بچپن ہی سے ذہین اور ہر ایک کو اپنی محبت کی روشنی سے جلا بخشنے والے شخص کا نام ضیاء الرحمٰن خان ہے۔ یعنی اسم با مسمی۔ اسلیئے تخلص بھی ضیاء بنایا۔ ۳۰ اکتوبر ۱۹۴۴ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدا ہی سے گھر کا ماحول ادبی و دینی تعلیم کا گہوارہ تھا۔ ادب سے لگاؤ اور شاعری سے وابستگی کی بنیاد اسی گھریلو ماحول میں پڑی اور تعلیمی اداروں میں پروان چڑھی۔ گھر میں ادبی ودینی رسائل کثرت سے مہیا تھے۔ یہ پڑھتے رہے۔ شوق بڑھتا رہا۔ پھر لائبریریوں کے چکر لگنے لگے۔ بات رسالوں سے کتابوں، ناولوں اور دیوان غالب وکلام فیض تک جا پہنچی۔ مطالعے کے ساتھ ساتھ لکھنے لکھانے کا شوق بھی جاری رہا۔ جو آج تک جاری ہے۔

شروع کے چند سال کراچی میں گزارنے کے بعد مستقل رہائش راولپنڈی میں رہی۔ ہائی اسکول کی تعلیم "پاکستان ایئر فورس پبلک اسکول لوئر ٹوپہ (مری ہلز) سے مکمل کرنے کے بعد گارڈن کالج راولپنڈی سے انٹر سائنس پاس کیا۔ ۱۹۶۶ء میں کراچی یونیورسٹی سے بی ایس سی (Bsc) کی ڈگری حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کی جستجو ۱۹۶۷ء میں امریکہ کی ریاست کیلفورنیا لے آئی۔ ۱۹۷۱ء میں لاس اینجلز سے الیکٹریکل انجینئرنگ کی ڈگری مکمل کرنے کے بعد یہیں مستقل رہائش اختیار کرلی، سو آج بھی ہے۔

ضیاء علم وہنر کی خاطر اک دن دیس سے اپنے نکلے تھے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ آج کل بزنس ایڈمنسٹریشن میں ڈاکٹریٹ کی تیاری میں مصروف ہیں۔

ضیاء کہتے ہیں کہ "حصول علم کے ساتھ ساتھ ملازمت کا سلسلہ ۱۹۶۳ء سے ہی شروع ہوگیا

تھا۔ ٹیلی کمیونی کیشن کی ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد چند سال کراچی میں گزارے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ امریکہ میں جاری رہا۔ ۱۹۷۸ء میں امریکہ سے مختلف ممالک جانے کا دور شروع ہوا۔ ملازمت کے سلسلہ میں سعودی عرب' بحرین' قطر' عمان' کویت' عرب امارات' مصر' بیلجیم اور یونان جانا اور رہنا ہوا۔ ملازمت کے دوران چھٹیوں میں دنیا کے مزید ممالک کی سیاحت کا موقع ملا۔ فہرست تو بہت طویل ہے لیکن روم' میلان' وینس' پیرس' لندن' ایمسٹرڈیم' ہیگ' جنیوا' زیورخ' ہمبرگ' فرینکفرٹ' ویانا' میڈرڈ' نیروبی و قاہرہ سبھی کے جانے پہچانے نام ہیں۔ زندگی کا یہ دور بڑی خوشگوار یادوں سے مزین ہے۔ نئی نئی بستیاں' نئے نئے لوگ' تجربات کا وسیع سمندر ہے جہاں تک نظر جاتی ہے علم حاصل کرنے کا یہ بھی ایک انداز ہے۔ خوشی اس بات کی ہے کہ انسانی زندگی کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ انسانی قدروں کا تضاد بھی دیکھا اور فطرت انسانی کی یکسانیت بھی۔ سعودی عرب کے قیام کے دوران ایک سال کا عرصہ جو جو مدینہ منورہ میں گزارا یقیناً حاصل زندگی ہے۔ یہ شعر ملاحظہ کریں۔

جنت کی تمنا ہے جو ضیاء چپکے سے مدینے آجاؤ
جنت بھی لگی ہے اس دھن میں سرکار کے در پر میں جاؤں

"اچھا ضیاء خان کچھ اپنی شاعری کے بارے میں بتایئے کہ کب یہ سانحہ گزرا؟" ضیاء ہنسے اور بولے۔ "جیسا کہ میں نے کہا شعر و سخن سے دلچسپی تو بچپن سے تھی ہی۔ مطالعہ کرنے کا شوق بھی پورا ہوتا رہا۔ سفر و سیاحت کے دوران مختلف ممالک کے ادب سے بھی تعارف حاصل ہوا۔ جزیرہ کریٹ پر چھ ماہ قیام کے دوران یونانی ادب سے شناسائی ہوئی اور کافی متاثر ہوا۔ لکھنے لکھانے کا شوق اسکول و کالج کے دور سے شروع ہو چکا تھا۔ غزلیں و مضامین گاہے بگاہے شائع ہوتے ہے۔ یوں تو طبع آزمائی کے لئے تحقیقی مقالے بھی لکھے' علمی و دینی موضوعات پر بھی قلم آرائی کی' سیاحت نامہ بھی بہت دلچسپ ہے مگر شاعری اور غزل سے مجھے پیار ہے۔ گھوم پھر کر غزل کی دنیا میں واپس آجاتا ہوں۔ ہاں نظمیں اور نعتیں بھی لکھی ہیں۔ ایک دور تھا' مشاعرے سننے کا شوق تھا۔ (اب بھی ہے) جب تک پاکستان میں رہے ریڈیو پاکستان کے مشاعرے پابندی سے سنتے رہے۔ شہر کراچی میں ہونے والے مشاعروں میں اکثر داد دینے پہنچ جاتے۔ پھر بزم ادب کی محفلیں ہونے لگیں۔ لاس اینجلز میں پاکستانی کمیونٹی کے لئے ادبی و سماجی پروگرام بڑے جوش و خروش سے کرتے رہے۔ غرض یہ کہ جب بھی موقع ملتا شوق ادب کی تسکین کا سامان پیدا کر لیتا۔ اس دور میں لاس اینجلس کے پہلے مشاعرہ میں زور شور سے حصہ لیا۔ اب موجودہ دور میں یہ محفلیں باقاعدگی سے ہونے لگی ہیں۔ دل بہت خوش ہوتا ہے کہ شمع اردو کی روشنی کہاں تک

پہنچ گئی۔ میں نے اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی میں بھی کئی تحریریں و نظمیں لکھی ہیں اور وہ شائع بھی ہو چکی ہیں۔ لاس اینجلس کے انگریزی ادب کے حلقوں میں بھی سننے سنانے کا موقع ملا۔ خصوصاً سفرنامہ و سیاحت سے متعلق مضامین بہت پسند کئے گئے۔

"ضیاء! آپ مطالعہ کو اہمیت دیتے ہیں؟" میرے اس سوال کے جواب میں انہوں نے کہا کہ "میری نظر میں تخلیق ادب کے لئے چند اجزا کا یکجا ہونا بہت ضروری ہے۔ سب سے اول مطالعہ گہرا مطالعہ جو کہ ایک طویل عرصہ سے جاری ہو اور ادب کی مختلف اصناف پر مبنی ہو۔ دوم زبان پر دسترس حاصل ہونا' الفاظ کے اک وسیع ذخیرہ کی ضرورت اور اس کا صحیح استعمال۔ سوم انسان کے ذاتی تجربات' احساسات و نظریات۔ اگر کوئی اپنے تجربات' نظریات و احساسات کو الفاظ کا خوبصورت جامہ پہنا سکے ایسا کہ جو پڑھنے والے پر اثرانداز ہو' اس میں انفرادیت ہو نیا پن ہو اور انسانی زندگی کی ترجمانی ہو تو پھر بات بن گئی۔ دراصل ادیب و شاعر اپنے ماحول و اپنی زندگی کے حاصل کردہ تجربات' احساسات و نظریات کی عکاسی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ جو بات کہنا چاہتا ہے اور اگر کہہ سکے اس طرح کہ اس کی تحریر پڑھنے والے پر اپنا تاثر چھوڑ جائے تو یہ اس کی کامیابی ہے۔ ضروری نہیں کہ ادب و شاعری صرف نظریاتی ہو۔ بسا اوقات سادہ سی بات بھی دل پر اثرانداز ہو جاتی ہے۔ کبھی اس کے ذریعے کوئی پیغام بھی دے دیتے ہیں۔ کبھی پڑھنے والے کی سوچ کو جگایا جاتا ہے۔ اپنی شاعری میں میری کوشش یہ ہے کہ سادہ سے مگر خوبصورت الفاظ و انداز میں اپنے تجربات' خیالات' احساسات اور نظریات کو ڈھال سکوں۔ زندگی کے اس سفر میں انسانی زندگی کا بہت قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ انسانی زندگی کے ساتھ ساتھ محسن انسانیت کی زندگی کا بھی مطالعہ کثرت سے کیا۔ اور یہی مطالعہ میری شاعری کی بنیاد ہے۔

میں نے صحرا قریب سے دیکھا
کتنی بارش ہو نم نہیں ہوگا
فلسفہ زیست کا ضیاء اتنا
پلکیں جھپکیں تو دم نہیں ہوگا

میرا اگلا سوال تھا کہ "شاعری میں ابلاغ کے سلسلے میں آپ کے خیالات کیا ہیں؟

"ابلاغ ادب و شاعری کی بقا کا ایک اہم عنصر ہے۔" ضیاء سنبھل کر بولے۔ "شاعر اپنے تخیل کو الفاظ کا جامہ پہنا کر جب اوروں کے سامنے پیش کرتا ہے اور داد پاتا ہے اور اس کے خیالات و تجربات سننے و پڑھنے والے پر اثرانداز ہوتے ہیں اور سامعین ان سے فیضیاب ہوتے ہیں تو یہی ادیب و شاعر کی کاوشوں کا ثمرہ ہوتا ہے۔ شاعر کے احساسات جب شعر کا روپ دھار لیتے ہیں

تو اس کی مثال سیپ سے نکلے ہوئے قیمتی موتی کی مانند ہوتی ہے۔ ابلاغ ایک ذریعہ ہے یہ موتی جوہریوں کے سامنے پیش کرنے کا۔ ذرائع ابلاغ کا ہونا بھی ضروری ہے۔ خصوصاً شمالی امریکہ میں یہ کمی بڑی حد تک محسوس کی جاتی ہے۔ گنتی کے چند رسائل یا اخبارات ہیں جن کا دائرہ اکثر مقامی حد تک محدود ہے۔ مشاعرے، ادبی محفلیں، تنقیدی نشستیں، واشاعت سب ہی ادب وشاعری کی جلا وبقا کے لئے بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ ادب کے تخلیق کاروں اور ادب شناسوں کی تنقیدی وشعری محفلیں، فروغ ادب میں مثبت کردار ادا کرتی ہیں۔ تنقید کا ادب میں اپنا مقام ہے۔ راہوں کا تعین، فکر واحساس کی کسوٹی، الفاظ کی موزونیت، خیالات کی ہم آہنگی اور نظریات سے اتفاق یا انکار تنقیدی وشعری محفلوں کے فوائد میں شامل ہیں۔ ہاں ایک بات کا خیال ضروری ہے کہ تنقیدی وشعری محفلیں ادب کی خدمت کے لئے ہوں نہ کہ گروہ بندی کے لئے ڈیڑھ اینٹ کی مسجد کی مانند۔ علم ودانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ادبی محفلیں منعقد ہوں اور تعمیری تنقید کی جائے اصلاح ہو، ہمت افزائی ہو، راہوں کا تعین ہو اور خلوص ومحبت کا اظہار ہو۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ ہر معاشرے وہر دور میں، ادب اس دور کے معاشرے کی عکاسی کرتا ہے۔ دور گزشتہ میں اردو ادب ایک ابھرتی ہوئی قوم اور خوشگوار معاشرے کی امنگوں کا عکاس تھا۔ ادبی رسائل کثرت سے مہیا تھے۔ ادبی محفلیں عام تھیں۔ علمی پروگراموں کا دوردورہ تھا۔ کالج ویونیورسٹیاں ادب کا گہوارہ تھیں پھر نہ جانے کیسی ہوا چلی کہ سب تاروپود بکھر گئے۔ کہتے ہیں کہ یہ ٹیلیویژن وکمپیوٹر کا دور ہے اب ٹیلی کمیونی کیشن کا زمانہ ہے۔ پڑھنے پڑھانے کی بجائے اب دیکھنے دکھانے کا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ ادبی وعلمی رسالوں کا فقدان ہوتا جارہا ہے اور اب گنتی کے ادارے باقی رہ گئے ہیں جو اب بھی اس کوشش میں سرگرداں ہیں کہ کسی طرح شمع ادب کو فروزاں رکھیں۔ وقت کی اہم ضرورت یہ ہے کہ ادب شناس ہمت نہ ہاریں، ادبی رسائل کی حوصلہ افزائی کریں، انہیں خریدیں اور پڑھیں۔ ساتھ ہی اپنے احباب وعزیزوں میں بھی پرچار کریں۔ اردو کے پرستار اب دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کے لئے ادب کی سرپرستی کرنا کوئی بڑی بات نہیں۔ بڑی آسانی سے یہ فروغ ادب کے لئے کام کرسکتے ہیں۔ امریکہ میں اردوداں طبقہ کی کوششیں قابل تحسین ہیں اور آج کل ادبی ادارے کثرت سے قائم کئے جارہے ہیں۔ لاس اینجلس اس کی عمدہ مثال ہے۔ مشاعروں وادبی محفلوں کا زور ہے۔ مگر یہاں نئی نسل کی کمی ان محفلوں میں بڑی شدت سے محسوس کی جاتی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اب بچوں کو بھی لکھنے لکھانے پر آمادہ کیا جائے۔ بچوں کے رسالے جاری کئے جائیں اور بچوں کی ادبی محفلوں وبیت بازی وغیرہ کا اہتمام کیا جائے۔ بچوں کے لئے مواقع اور ہمت افزائی ازحد ضروری

ہے۔ اگر اردو ادب کو زندہ رکھنا ہے تو یقین کیجئے یہ کوششیں بار آور ثابت ہوں گی۔"

"ضیاء خان! اردو شاعری و ادب کے موجودہ دور سے آپ مطمئن ہیں؟" میں نے پوچھا تو وہ ولولہ انگیز لہجے میں بولے۔

"اردو شاعری کے موجودہ دور کو اس کا بین الاقوامی دور بھی کہا جا سکتا ہے۔ اردو کے پرستار دنیا کے گوشے گوشے میں بکھرے ہوئے ہیں۔ یورپ' آسٹریلیا' افریقہ' مشرق وسطیٰ اور شمالی امریکہ میں کثرت نقل کے باعث اردو دانوں کی کثیر تعداد رہائش پذیر ہے۔ مانا کہ زندگی کی رفتار کچھ مختلف ہے۔ ماحول نیا نیا ہے۔ معاشرتی قدریں بھی مختلف ہیں۔ ہر سرزمین کے اپنے اپنے حالات ہیں' اپنے مسائل ہیں۔ یہ جڑیں ابھی اتنی گہری نہیں لیکن زندگی سے بھرپور ہیں۔ اردو زبان میں ایک نیا ادب اور نیا انداز شامل ہو رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ اردو ادب و شاعری کی ان نئی تخلیقات کو لوگوں میں متعارف کرایا جائے اور نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کی جائے۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اردو ایک لشکری زبان کی شکل میں وجود میں آئی اور آہستہ آہستہ ایک مسلمہ ادبی زبان کی حیثیت اختیار کر لی۔ شعر و غزل سے اس میں نکھار پیدا ہوا اور یہ خوب پھلی پھولی۔ ابتدا میں لشکر مختلف ممالک سے برصغیر میں آتے تھے اور اردو کی جڑوں میں نیا خون' نئے الفاظ' نئے خیالات اور نئے احساسات سے آبیاری کرتے تھے۔ آج کا دور وہ ہے کہ اب اردو داں کارواں مختلف سرزمینوں کی جانب رواں ہیں۔ ایک بار پھر نئی فکریں نئے خیالات اور نئے تجربات سے اردو ادب کی جلاء ہو رہی ہے۔ اردو اب بھی لشکری زبان ہے۔ مگر یہ لشکر اب آ نہیں' بلکہ جا رہے ہیں۔ شاید قدرت نے زبان اردو اور اس کے ادب و شاعری کی قسمت میں ابھرنا و ترقی کرنا اور اس کی نشوونما اسی طور لکھی ہے۔ نیا ادب و نئے ادیب اپنے عہد کے ترجمان ہیں۔ آج کا ادیب و آج کا شاعر اپنے عہد کا گواہ ہے۔ یہ مشینی دور جو کمپیوٹر و ٹیلی مواصلات کا دور ہے یقیناً ادب کے پرستاروں کو قریب لانے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ تنقید نگاروں کا یہ کہنا کہ آج کا ادب بے معنی ہوتا جا رہا ہے اور لفظ دل میں نہیں اترتا یا اس کی سمت اور ہے' درحقیقت درست بات نہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ اردو کے اس بین الاقوامی دور میں ایک عام روش سے ہٹ کر سوچنے کا انداز اپنانا چاہئے۔ تنقیدی نگاہ کے لئے ایک نئی عینک کی ضرورت ہے۔ دیکھنا اور سمجھنا یہ ہے کہ آج کے ادب و شاعری میں آج کل کے مسائل کا کتنا ذکر ہے۔ اس میں ایک گہرائی اور وسعت پیدا ہو رہی ہے۔ آج کا ادب جس انداز میں مختلف ممالک کے ادب و معاشرے سے متاثر ہو رہا ہے۔ شاید اس سے قبل کبھی ایسا نہ تھا۔ اردو ادب کی نئی تخلیقات میں نئے نظریات کے نقوش شامل ہیں۔ اس کے خدوخال کچھ بدلے بدلے سے ہیں۔ شاید یہی چیز

تنقید نگار کی فکر کو پریشان کیے ہوئے ہے۔ در حقیقت آج کا ادب چاروں جانب کی زندگی سے متاثر ہے۔ اس میں زندگی کے نئے دھارے شامل ہو رہے ہیں۔ نئی ہم آہنگی کا دور ہے۔ اسی وجہ سے آج کے تنقید نگار کو یہ کیفیت طوفانی نظر آتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ایک وقت آئے گا جب ادبی دنیا کے اس مدوجزر میں ایک ٹھہراؤ پیدا ہوگا۔ اور یہ بھی ایک مسلم حقیقت ہے کہ اچھا شاعر روح عصر کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ شاعری جس کی بنیاد خیال و فکر کی گہرائی، وسیع تجربات اور مثبت فکر و مطالعہ پر مبنی ہو یقیناً اچھی شاعری ہوگی۔ دور حاضر کے شعراء میں فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، اور احمد فراز قابل ذکر ہیں اور مجھے پسند بھی ہیں۔ بین الاقوامی سطح پر کچھ نئے نام ابھر رہے ہیں لیکن پہچان ہونے میں شاید وقت لگے۔ اچھا شعر و اچھی تخلیق ایک پھول اور اس کی خوشبو کی مانند ہے۔ نئے پھول کھلتے ہی رہیں گے اور ان کی خوشبو پھیلتی ہی رہے گی۔ بس اردو کا چمن شاد و آباد رہے۔ خدا کرے۔"

"ضیاء خان! آپ کا شکریہ کہ آپ نے اپنی مصروفیت سے وقت نکالا اور اردو زبان و ادب کے مسائل پر اتنی سیر حاصل بحث کی اور اتنے دلنشین خیالات و رائے کا اظہار کیا کہ اردو کے پرستاروں کو اس کی روشنی میں منزل تک پہنچنے کے لئے بلاشبہ نئی راہیں ملیں گی۔"

ضیاء خان

عکسِ فن

کوہِ طور

طور تیرا یہ سفر کاش مجھے راس آئے
میں بڑھوں تیری طرف، تو بھی مرے پاس آئے

ہیں فلک بوس چٹانیں ترے ایوانوں کی
ایک دنیا ہی الگ ہے ترے ویرانوں کی
پی کے مدہوش ہوئے مئے ترے پیمانوں کی
قابلِ رشک ہے قسمت ترے دیوانوں کی

فکر و احساس میں کچھ ربط ہوا جب پیدا
گفت و کردار میں کچھ ضبط ہوا جب پیدا
ریگزاروں میں ترے نقش قدم چھوڑ آیا
خواہشِ نفس کی دنیا کے صنم توڑ آیا

بات جو ضد کی کہو فطرتِ انسانی تھی
نور میں لپٹی ہوئی رحمتِ ربّانی تھی
دامنِ طور میں ہوں کیوں نہ مرا دل آئے
میری فطرت میں بھی ضد مجھ کو بھی کچھ مل جائے

○

ہے اب بھی تپش باقی اِن راکھ کے ذروں میں
دیکھو کوئی چنگاری پھر سے نہ سُلگ جائے

سید مظفر احمد ضیاء
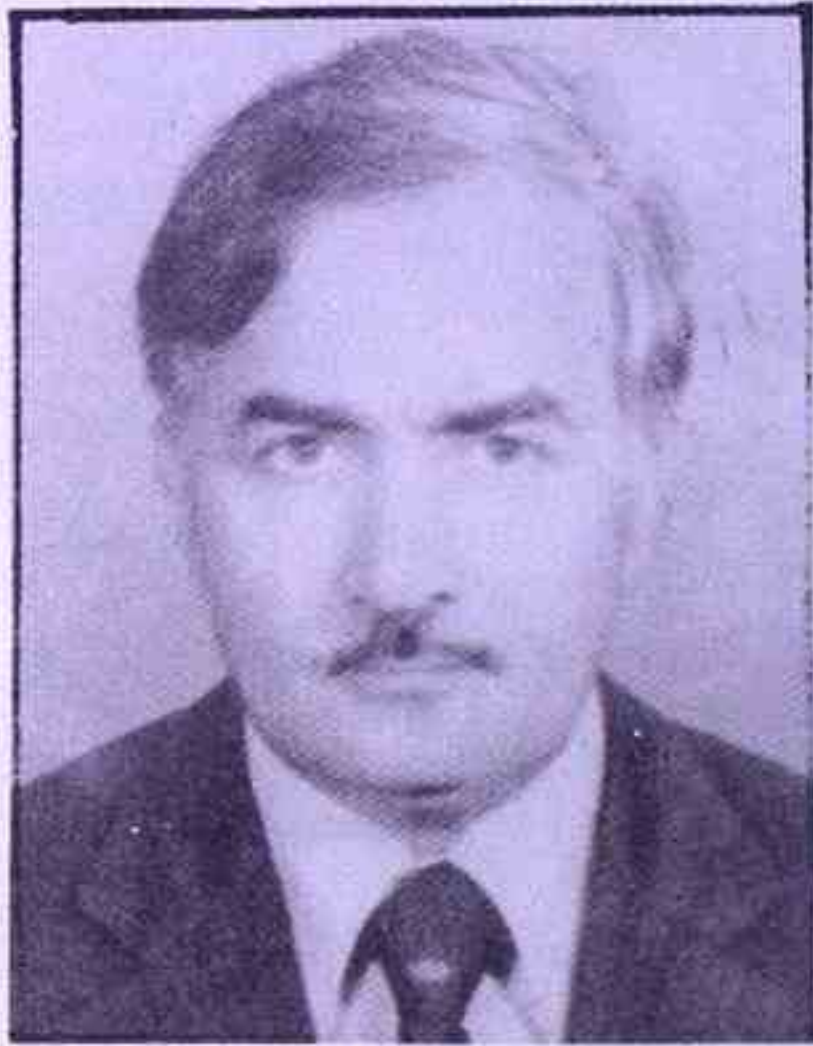
یہ مانا کہ شہ رگ سے نزدیک ہے تو

میں یہ فاصلہ بھی کہاں چاہتا ہوں

مظفر ضیاء

Muzaffer Ahemed Zia
1745 - A, West
Robin Lane Haffman Estate
IL 60195 U.S.A.

سید مظفر احمد ضیاء

(شکاگو)

اقبال نے دیا ہے مجھے درس بے خودی
مداح میر و غالب و سودا رہا ہوں میں

داغ کا انداز غالب کی زمیں ہے سامنے
پر ضیاء لائیں کہاں سے ہم تغزل میر کا

یہ دو شعر کہہ رہے ہیں کہ شاعر نے نہ صرف اپنے مشاہیر کا مطالعہ کیا ہے بلکہ ان کا مداح بھی ہے۔ یہ مظفر احمد ضیاء ہیں۔ ربع صدی پہلے ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ پھر بس ان سے کبھی کبھار مشاعروں میں ملاقاتیں ہو جاتی تھیں۔ یا بہت بعد میں جب رفعت سروش صاحب کو اپنے گھر مدعو کیا۔ عقدہ کھلا کہ دونوں ہی میرٹھ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ظاہر ہے وطن کی یادیں تو سرمایہ حیات ہوتی ہیں چنانچہ کھانے کی میز پر وہ یادیں تازہ ہوتی رہیں۔ اور پھر ملاقاتوں کا سلسلہ یوں ٹوٹ گیا کہ میں نے کراچی چھوڑا۔ کچھ عرصہ بعد پتہ چلا ضیاء صاحب بھی شکاگو میں سکونت اختیار کئے ہوئے ہیں۔ میں نے حسن چشتی صاحب اور نیاز گلبرگوی صاحب کی معرفت انہیں سوالنامہ بھیجا جس کے جواب میں ضیاء صاحب کا خط معہ ان کی تین کتابوں کے ملا جن میں سے دو تو ان کے کلام کے مجموعے ہیں۔ ایک "کاغذی ہے پیرہن" جس کی ترتیب و تدوین جناب قصری کانپوری نے کی۔ قصری کانپوری جن کا یہ شعر مجھے کبھی نہیں بھولتا۔

اگر اندھیرا اگلنے لگے چراغ کی لو
ہوا چراغ بجھانے میں حق بجانب ہے

یہ ایک شعر ہی قصری کانپوری کی شاعری کی جانچ کے لئے بہت ہے مگر ان کے پاس وسائل کی

کی تھی۔ پبلک ریلیشنشگ نہ تھی سو وہ ناہموار راہوں کے مسافر کی طرح وقت کی گرد میں دب گئے۔

ضیاء صاحب کا دوسرا مجموعہ "زبان قلب و نظر" ہے۔ تیسری کتاب "شخصیت و فن" ہے اور نام سے ظاہر ہے کہ مظفر ضیاء کی شخصیت کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔ یہ مضامین اور منظومات مختلف ادیبوں اور شعراء کی تخلیق ہیں۔ کتاب بیگم نفیس مظفر ضیاء نے ترتیب دی ہے اور شریک حیات ہونے کا حق ادا کردیا ہے۔ کتاب کو نادر تصاویر سے بھی سجایا ہے۔ ان تین کتابوں کے علاوہ ان کی شاعری کا ایک اور مجموعہ "روشنی کا سفر" کے نام سے بھی شائع ہوا ہے اور "اسلامی تصوف اہل مغرب کی نظر میں" ان کے مضامین کا مجموعہ ہے۔

کہتے ہیں کہ مرد کی کامیاب زندگی کی پشت پر اس کی شریک سفر کا ہاتھ ہوتا ہے۔ نفیس مظفر سے ملئے تو اس قول کی تصدیق ہوجاتی ہے۔ نفیس مظفر پہلے نفیس برنی تھیں ایک معروف افسانہ نگار۔ جنھوں نے گھرداری اور شوہر برداری کے پیچھے افسانہ نگاری کو خیرباد کہہ دیا۔ تو آیئے نفیس کے نصف بہتر شاعر مظفر ضیاء سے ملتے ہیں۔

سید مظفر احمد نام ہے اور ضیاء تخلص۔ ۱۵ جولائی ۱۹۳۱ء کو قصبہ الدن ضلع میرٹھ (یو۔پی ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ تعلیم کی تکمیل ایم۔اے' ایل۔ایل۔بی کی ڈگریوں تک محدود نہ رہی۔ اس کے بعد فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے مرکزی اعلیٰ ملازمتوں کے امتحان مقابلہ میں کامیابی کے بعد پاکستان کسٹمز کے محکمہ سے وابستہ ہوئے۔ سرکاری طور پر پاکستان کے علاوہ کینیڈا' امریکہ' برطانیہ' فرانس' جرمنی' ہالینڈ' اٹلی' چین اور جاپان کے مقامات بھی دیکھے۔ ذاتی طور پر سعودی عرب' افغانستان' مصر' لبنان' ترکی' متحدہ عرب امارات' یونان' ہسپانیہ' آسٹریا' سوئٹزرلینڈ' فلپائن' ہانگ کانگ اور تھائی لینڈ کی سیاحت بھی کرڈالی۔

اپنی زندگی کا قابل رشک واقعہ اپنی والدہ ماجدہ کے ہمراہ حج بیت اللہ کی سعادت کے حصول کو قرار دیتے ہیں۔ سبحان اللہ۔ انہیں فطرت سے پیار ہے اور یہی میلان طبع ان کی شاعری سے وابستگی کا بنیادی محرک ہے۔ مشاہدۂ حسن اور معاشرتی بوالعجبیاں ان کی شعرگوئی کے لئے مہمیز کا کام کرتی ہیں۔

ضیاء آسان زبان کے قائل ہیں۔ اپنے کلام میں اس کا اہتمام بھی کرتے ہیں کیونکہ بقول ان کے اظہار اور ابلاغ کے درمیان آسان زبان کا رشتہ اگر استوار ہے تو ابلاغ کی دشواری دور ہوتی ہے۔ تنقیدی نشستیں ان کے خیال میں ادب و شاعری کی نئی راہیں متعین کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔ ضیاء کا کہنا ہے کہ شرح خواندگی میں اضافہ اور صحت مند ادب کی

اشاعت سے لوگوں میں مطالعہ کا شوق بڑھایا جاسکتا ہے اس طرح جرائد اور کتب کی عدم مقبولیت کی شکایت دور ہو سکتی ہے۔

مظفر احمد ضیاء کا یہ مشورہ بھی کار آمد ہے کہ امریکہ 'یوروپ اور برطانیہ کے تعلیمی اداروں میں اردو کو باقاعدہ مضمون کے طور پر شامل کرواکر اردو کا مستقبل روشن اور شاندار بنایا جاسکتا ہے۔

مظفر احمد ضیاء احمد ندیم قاسمی 'احمد ہمدانی' احمد فراز' جگن ناتھ آزاد' راغب مراد آبادی' تابش دہلوی' ادا جعفری' محسن بھوپالی' خواجہ ریاض الدین عطش اور خود اپنی شاعری کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ بلاشبہ اچھا شاعر وہی ہے جو اپنی ذات کے ساتھ ساتھ روح عصر کی بھی عکاسی کرے اور ان شعراء کی شاعری اس نکتے کا مظہر ہے۔ اور بھی بہت سے شعراء و شاعرات ہیں جو اپنے عہد کی ترجمانی پر قادر ہیں۔ کہتے ہیں ہم زندگی سے بھرپور ادب کو اپنی ہی زمین تک محدود کیوں رکھیں۔ اردو میں تو اتنی صلاحیت ہے کہ عالمی سطح پر اس کے ادب کی جڑیں زمین کی گہرائی میں پیوست ہو سکتی ہیں۔ بس ہمیں لگن سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔

مظفر احمد ضیاء مزاح گو نہیں لیکن مشکور یاد کے حوالے سے رشید احمد صدیقی کے اس قول کی تصدیق کرتے ہیں کہ "ادب میں طنز و ظرافت کا استعمال اس سفلی عمل کی طرح ہے جس میں اگر عمل پورا نہ ہو تو عامل خود ہی اس کا شکار ہو جاتا ہے۔"

مظفر احمد ضیاء کی شاعری پر تبصرہ میرے امکان میں نہیں نہ ہی میرا یہ مقام ہے کیونکہ اول تو میں ناقد نہیں دوئم سخن ور کے لئے شعراء و شاعرات کے تعارف کے حصول کا مقصد انہیں ان کے کلام کو ان کے نظریات اور نکتہ نظر کو ایک جگہ یکجا کر دینا ہے۔ سخن ور میں آپ کو بہت سے شعراء و شاعرات ایسے ملیں گے جن کا مرتبہ شاعری میں بلاشبہ بہت بلند ہے لیکن ان کے کلام تک ہماری آپ کی رسائی نہ ہو پائی ہو۔ باقی تو وقت کے مورخ کا کام ہے کہ وہ ان کی درجہ بندی کرے لیکن ضیاء صاحب کے مجموعہ کلام "کاغذی ہے پیرہن" سے میں محترم شاعر لکھنوی (مرحوم) کے مضمون سے ایک اقتباس یہاں رقم کرنا چاہوں گی۔ شاعر لکھنوی بھی بہت مانے ہوئے بزرگ شاعر تھے۔ ایک زمانے میں ان کا ایک حلقہ تھا جس میں محشر بدایونی' تابش دہلوی' اقبال صفی پوری اور شاعر لکھنوی تقریباً ہر مشاعرے میں یکجا ہوتے تھے۔ شاعر لکھنوی کے ہمراہ کئی مشاعرے پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ مجھے مشاعروں میں شرکت کا کبھی شوق نہیں رہا لیکن روزنامہ "جنگ" کراچی میں صفحہ خواتین کی مدیر کی حیثیت سے میں ہر ہفتہ ایک شاعر یا شاعرہ کا تعارف لکھتی تھی اور بڑے اہتمام سے اس کی اشاعت ہوتی۔ وہ کالم بہت مقبول ہوا۔ اس کی وہی مقبولیت میری جان کا روگ

بھی بن گئی۔ اس کی پوری تفصیل تخن ور حصہ اول کے میرے مضمون بعنوان "دیکھیں کیا گزری ہے قطرے پر گہرے ہونے تک" میں موجود ہے۔ چنانچہ میں مشاعروں میں صرف اسی لئے شرکت کرتی تھی کہ میری بیرون کراچی سے آنے والے شعراء سے ملاقات ہو اور میں ان سے ان کا انٹرویو لے لوں۔ اسی طرح میں نے ڈھاکہ کے عندلیب شادانی' لائلپور میں رہنے والے شور علیگ اور لاہور راولپنڈی کے ضمیر جعفری' ناصر کاظمی' قتیل شفائی وغیرہ وغیرہ کے تعارف حاصل کئے۔ ٹیپ ریکارڈ میرے پاس تھا نہیں' میں لکھتی بہت تیز تھی۔ حافظہ بھی بہت شاندار پایا چنانچہ میں نوٹس لے لیتی تھی۔ انہی مشاعروں کے طفیل مجھے بہت سے شعراء سے تفصیلی گفتگو اور انہیں قریب سے جاننے کا موقع ملا۔ ایک مشاعرہ غالباً" سکھر کا ایسا تھا کہ اچانک ریلوں کی ہڑتال ہو گئی اور میں' میمونہ غزل' خالد علیگ اور شاعر لکھنوی صاحب اکٹھے ٹرک کے سفر کے ذریعے کراچی واپس آئے۔ راستہ بھر میمونہ غزل اور خالد علیگ شکار کے تذکرے اور ڈاکوؤں کا ذکر کرتے رہے۔ مجھے حیرت زدہ دیکھ کر وہ وقفے وقفے سے مجھے ڈراتے بھی کہ ڈاکو کسی وقت بھی حملہ کر کے ٹرک روک سکتے ہیں اور ہمیں اغوا کر سکتے ہیں۔ میری روح فنا ہوتے دیکھ کر محترم شاعر لکھنوی مجھے دلاسہ دیتے۔ ان کی طبیعت میں بے حد انکساری تھی اور لکھنؤ چھوڑے ہوئے انہیں عرصہ ہو گیا تھا لیکن وہی مرنجان مرنج طبیعت اور لکھنوی مروت اور محبت' جس نے ان کی محبت اور عزت میرے دل میں دوچند کر دی تھی۔ پھر ان کی علمی قابلیت کہ جس نے انہیں قادر الکلامی بخشی تھی۔ چنانچہ میں چاہوں گی کہ مظفر احمد ضیاء کی شاعری پر ان کے تبصرے کا ایک حصہ ضرور آپ کی نظر سے گزرے۔ موضوع سخن ضیاء صاحب کی یہ غزل ہے۔

بت خانہ آزر کا چلن ٹوٹ رہا ہے
اب سلسلہ رنج و محن ٹوٹ رہا ہے

ہے رنگ چمن خون تمنا سے عبارت
ہر پھول میں غنچے کا بدن ٹوٹ رہا ہے

ان دونوں اشعار پر تبصرہ کرنے کے بعد وہ غزل کے اس آخری شعر پر آتے ہیں۔

تم آئے ہو یہ جرات گفتار کسے ہے
ہنگام بیاں ربط سخن ٹوٹ رہا ہے

شاعر صاحب لکھتے ہیں۔ "جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ شاعر اپنے عہد کے خوش گو شعراء سے ذہنی طور پر متاثر ہوتا رہتا ہے۔ بعض اوقات تو اسے اپنے اس ذہنی تاثر کی خود بھی خبر نہیں ہوتی اور شعور و تحت شعور میں خفیہ طور پر یہ کھیل جاری رہتا ہے۔ اس شعر سے جو شعر

ذہن میں آیا وہ یہ ہے۔"

گفتگو کسی سے ہو ان کا دھیان رہتا ہے
ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے سلسلہ تکلم کا
(فرید جاوید)

لکھتے ہیں۔ "ممکن ہے ضیاء کے تحت شعور میں اس شعر کی کوئی جھنکار دبی ہوئی رہ گئی ہو جو شعور کی مدد سے اپنے ایک علیحدہ پیمانہ اظہار میں ڈھل گئی ہو۔ یہ نوعیت کچھ ضیاء ہی کے ساتھ مخصوص نہیں۔ بڑے بڑے شعراء کے یہاں دوسروں کی صدا کی گونج ان کی اپنی لے میں سنائی دیتی ہے۔ اس کی چند مثالیں اس لئے پیش کی جارہی ہیں کہ مظفر ضیاء اسے خالصتاً" اپنی ہی طرف منسوب نہ سمجھ لیں۔ اس سے مراد غلط فہمی پیدا کرنا نہیں۔ غلط فہمی دور کرنا ہے۔ مرزا یقین کا شعر ہے۔

اسیران قفس کی ناتوانی پر نظر کیجیو
بہار آئے تو اے صیاد مت ان کو خبر کیجیو

اب اسی شراب کہنہ کو سراج لکھنوی کے جام شعر میں نئے انداز سے ملاحظہ کیجئے۔

اور سب کہنا اسیران قفس سے صیاد
یہ نہ کہنا کہ گلستاں میں بہار آئی ہے

جگر مراد آبادی کا شعر ہے۔

عمر بھر روح کی اور جسم کی یکجائی ہو
کیا قیامت ہے کہ پھر بھی نہ شناسائی ہو
تمام عمر کی قربت کے باوجود اکثر
نگاہ دل میں بڑے فاصلے نکلتے ہیں

میر تقی میر کا شعر ہے۔

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو
دیر سے انتظار ہے اپنا

غالب کہتے ہیں

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی

یقین دہلوی کا شعر ہے۔

چراغ آخر شب اس قدر اداس نہ ہو
کہ تیرے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے

ظہیر لکھنوی کا شعر دیکھیں۔

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغ آخر شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے

شاعر لکھنوی کا شعر یہ ہے۔

بدل کر رہ گئی تاریخ جنت
جواب لغزش آدم نہیں ہے

اسے ماہر القادری یوں کہتے ہیں۔

فرشتوں کی یہ شان بے گناہی
جواب لغزش آدم نہیں ہے

ملاحظہ کیا آپ نے کہ بات سے بات نکال کر انہوں نے علمیت کے کتنے ہی در وا کر دیئے۔ وہ جو آج کہتے ہیں کہ غم روزگار نے فرصتیں چھین لی ہیں۔ غم روزگار تو ہر دور کے شعراء وادیبوں کو گھیرے رہا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ کچھ ہم بھی تن آسان ہو گئے ہیں چنانچہ اس تن آسانی کے جواب میں محرومیاں تو ملتی ہی ہیں ہمیں۔

خوشی ہے کہ آج بھی بہت سے ادیب و شاعر موجود ہیں جو بڑی لگن سے کام کر رہے ہیں اور مظفر احمد ضیاء کا شمار ان میں کیا جا سکتا ہے۔ ایک عرصہ تک انہوں نے کسٹم کے محکمے میں دیانت داری کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیئے اور اس دیانتداری کے انہیں عذاب بھی اٹھانے پڑے کیونکہ کسٹم اور انکم ٹیکس جیسے محکموں میں "دیانت داری" کو معاف نہیں کیا جاتا۔ دونوں طرح سے نقصان ہے۔ نہ آپ ھذا من فضل ربی سے فائدہ اٹھا کر خوشحال خاں بنتے ہیں نہ دوسروں کو بننے دیتے ہیں۔ آپ کی ذات کی حد تک تو آپ کا قصور معاف۔ رہیئے فقیرانہ انداز میں۔ مگر دوسروں کو "بے فیض" کیوں رکھتے ہیں۔ سو اسی کے دکھ مظفر ضیاء نے جھیلے لیکن حسرت کے اس شعر پر عمل کے ساتھ کہ۔

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی

چنانچہ میں کہوں گی کہ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ اور زیادہ

عکسِ فن

عشقِ سرورؐ

عشقِ احمدؐ سے ہوں ضیاء سرشار
اس سے بڑھ کر کوئی سرور نہیں

میں دیارِ نبیؐ سے دور سہی
دل دیارِ نبیؐ سے دور نہیں

اہلِ قلم

گہ وقفِ غمِ دہر ہوں گہ وقفِ صنم ہوں
میں قوم کی آواز ہوں ملت کا بھرم ہوں
خود ذات میں گم ہوں کبھی آفاق میں گرداں
تاریخ کا نباض ہوں، میں اہلِ قلم ہوں

متفرق اشعار

نشاطِ غمِ دو جہاں چاہتا ہوں
تبسم بقدرِ فغاں چاہتا ہوں

○

ضیاء اس کو سب چاہتے ہیں مگر میں
خلافِ مذاقِ جہاں چاہتا ہوں

○

ہے رنگ چمن خونِ تمنا سے عبارت
ہر پھول میں غنچہ کا بدن ٹوٹ رہا ہے

طہ آفندی

"جنازہ"

تھرتھراتے ہوئے ہونٹوں کا سہارا لے کر
ڈبڈبائی ہوئی پلکوں کا اشارہ لے کر
زندگی، موت کی دہلیز پہ آ بیٹھی ہے
اپنے کندھوں پہ خود اپنا جنازہ لے کر

طہ آفندی

Taha Afendi
P.O.Box 13
Flying Wing Division
MANAMA - BAHRAIN (A.G.)

طہ آفندی

یہ ۱۹۷۸ء کی بات ہے۔ بحرین میں بہت محبت کرنے والے احباب کے تعاون سے میری کتاب سخن ور (حصہ اول) کی تعارفی تقریب منعقد ہوئی جس کی صدارت بحرین کے اردو عربی کے شاعر جناب استاد ابراہیم العریض نے کی تھی۔ بحرین میں مقیم تقریباً سارے ہی شعراء شریک تھے مگر نہ تھے تو طہ آفندی۔ میں نے سوچا دعوت نامہ شاید ان تک پہنچا ہی نہیں۔ جناب سعید قیس صاحب اور شاہد علی خان صاحب سے استفسار کیا تو پتہ چلا کہ طہ آفندی گوشہ نشین شعراء میں سے ہیں۔ انہیں کبھی کسی نے مشاعرے میں نہیں دیکھا اس لئے کہ وہ مشاعرے میں شرکت کرتے ہی نہیں۔ چلئے چھٹی ہوئی۔

مگر چھٹی کہاں ہوئی۔ میں نے ان کا کلام "شمع دہلی" میں اکثر پڑھا تھا اور ان سے ملنے کی متمنی تھی۔

اور ملاقات ہوئی۔ انہیں جب پتہ چلا کہ میں ملنا چاہتی ہوں تو وہ خود تشریف لائے۔ کچھ جھجکے جھجکے سے۔ محتاط محتاط۔ بات کرنے سے پہلے سوچتے ہیں کہ یہ جملہ کہا جائے یا نہیں۔ (مجھے ہمیشہ ایسا ہی محسوس ہوا) اور یہ نہیں کہ ایسا پہلی ملاقات تک ہوا۔ وہ جب بھی ملے ہمیشہ اسی طرز عمل کے ساتھ۔ کیونکہ یہ شرم وحیا ان کے مزاج کا ایک حصہ ہے۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ باتیں نہیں کرتے۔ باتیں کرتے ہیں اور خوب کرتے ہیں مگر نصف ملاقات میں۔ یعنی خطوط میں۔ وہ بزرگوں کے اس مقولے پر پورے پورے عمل پیرا ہیں کہ پہلے تولو پھر بولو۔ لیکن طہ آفندی لکھنے میں سول تول نہیں کرتے۔ بہت لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ ان کے خط بھی کہانی اور گفتگو کا رنگ لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ جب میں نے انہیں سوالنامہ بھیجا اور لکھا کہ مجھے ان کا تعارف درکار ہے تو وہ خط میں یوں گویا ہوئے۔

"آپ کا سوالنامہ دیکھا۔ اتنا کٹھن نظر آیا کہ سارے جوابات صحیح دے دوں تو کہیں اچھی خاصی ملازمت مل سکتی ہے۔ معافی کا خواستگار ہوں، مجھے شامل نہ کریں۔ کیونکہ اپنے آپ کو شاعر نہیں سمجھتا یہ اور بات ہے کہ اتنی نظمیں اور غزلیں لکھ چکا ہوں کہ باآسانی ایک دیوان چھپ

جائے۔ لیکن میری نظروں میں یہ تک بندی کا دیوان ہوگا۔ اس دور کے نوے فیصد شاعر تک بندی سے کام چلاتے ہیں۔ فیتہ لے کر شعر کی لمبائی ناپتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں اثر نہیں ہے۔"

یہ جناب طٰہٰ آفندی کی انکساری تھی۔ میں انہیں جانتی تھی۔ طٰہٰ بہت اچھے شاعر ہیں مگر منکسرالمزاج۔ جس طرح عزیز حامدمدنی کے متعلق مجھے معلوم تھا کہ اعلیٰ پائے کی شاعری کے خالق ہیں مگر طبیعت کی سادگی انٹرویو دینے میں مانع ہے۔ سو میں نے ان سے کس طرح انٹرویو لیا اس کا ذکر آپ سخن ور (حصہ اول) میں عزیز حامد مدنی (اب مرحوم) کے انٹرویو میں پڑھ سکتے ہیں۔ طٰہٰ آفندی بھلا کب تک راہ فرار اختیار کرتے۔ پھر بحرین میں جناب شاہد علی خان نجیب آبادی اور سعید قیس صاحب جیسے جید شعراء اور مخلص ترین احباب کی موجودگی میں طٰہٰ آفندی کا انکار زیادہ عرصہ ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ سو انہوں نے اپنا تعارف بھجوادیا۔ جو یوں ہے۔

نام :۔ سید محمد طٰہٰ آفندی۔ سنہ ولادت :۔ ۱۷ مئی ۱۹۴۵ء حیدر آباد دکن۔

تعلیم :۔ ہائر سیکنڈری اردو میڈیم۔ ۱۹۶۱ء میں بحیثیت "نیوی بوائے" انڈین نیون بحری فوج سے منسلک ہوئے۔ سولہ سال انڈین نیوی کے فضائی شعبے سے وابستہ رہے۔ نیوی کی ملازمت کے دوران سنگاپور' کویت اور بحرین جانے کا اتفاق ہوا۔ انڈین نیوی کی ملازمت چھوڑنے کے بعد ضلع کڑپہ (آندھرا پردیش) میں ریاستی حکومت کی Byretes کی کان پر ایک سال تک سیکیورٹی آفیسر رہے۔ اس کے بعد مشرق وسطیٰ کی ریاست بحرین چلے آئے۔ بحرین میں تادم تحریر پولیس ڈیپارٹمنٹ کی فضائی شاخ میں ہیلی کوپٹر انجینیئر کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ ٹریننگ کے سلسلے میں مونٹریال (کینیڈا) فورٹ ورتھ (ٹیکساس امریکہ) اور لندن میں بھی قیام رہا۔

پہلی منظوم تحریر ہائی اسکول کے میگزین "The Hive" میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد افسانوں کی طرف رجحان ٹھہرا۔ ۱۹۵۹ء میں حیدر آباد دکن کے روزنامہ "رہنمائے دکن" کے بچوں کے صفحات میں کئی کہانیاں شائع ہوئیں۔

نیوی کی ملازمت کے باعث تقریباً دس سال تک لکھنے میں تعطل رہا۔ اس کے بعد ذہن آمادہ ہوا تب سے سلسلہ جاری ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے بائیس ماہناموں میں طٰہٰ کی کہانیاں' نظمیں اور ڈرامے شائع ہوئے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو حیدر آباد سے ان کے لکھے ڈرامے نشر بھی کئے گئے۔ افسانوں کا ایک مجموعہ "نقش حیات" ۱۹۷۷ء میں آندھرا پردیش اردو اکیڈمی کے تعاون سے شائع ہوا۔ ۱۹۸۱ء میں اسٹار پبلی کیشنز (دہلی ہندوستان) نے ان کا پہلا ناول "دشت سفر" شائع کیا۔ اب تک دو سو سے زائد افسانے لکھ چکے ہیں جو سب شائع ہو چکے ہیں۔ ایک مجموعہ کلام بھی

تیار ہے۔ ایک ناول "اونچے کھلاڑی" بھی مکمل ہے لیکن ان کی سیلانی طبیعت ان تخلیقات کو کتابی شکل میں لانے کے لئے آمادہ نہیں۔ حالانکہ ان کے پرستار یہ کام کررہے ہیں۔ چنانچہ چندی گڑھ (مشرقی پنجاب) سے ڈاکٹر کیول دھیر "ادب کے سفیر" کے عنوان سے ساحر کلچرل فورم کی جانب سے ایک کتاب شائع کررہے ہیں جس میں طہ آفندی کا تذکرہ اور تعارف شامل ہے۔ نیشنل بک ٹرسٹ دہلی (حکومت ہند کا ادارہ) کی جانب سے پچھلے ۳۵ سال میں ابھرنے والے افسانہ نگاروں میں سے چند ایک کی تخلیقات جمع کرکے چودہ زبانوں میں مجموعہ شائع کررہا ہے اس میں طہ کی کہانی "شکست کی آواز" شامل ہے۔ اس مجموعہ کو جناب رام لعل اور جناب اظہار عثمانی مرتب کررہے ہیں۔

اردو زبان وادب کی ترویج کے سلسلے میں مشاعرے کہاں تک معاونت کرتے ہیں اس سوال پر اظہارخیال کرتے ہوئے طہ آفندی کا کہنا ہے کہ "آج کل اکثر بیشتر مشاعرے، مشاعرے نہیں بلکہ خودنمائی اور پبلسٹی کا ذریعہ ہیں۔ ایسے مشاعروں میں وہی شاعر زیادہ کامیاب رہتے ہیں جو بہترین گلوکار ہوں۔ جو شاعر یا شاعرہ اپنے کلام کو جتنا لمبا کھینچ کر اونچی تان میں گاکر پڑھیں گے وہی ہاتھوں ہاتھ لئے جائیں گے۔ جبکہ بعض تحت لفظ پڑھنے والے بہترین شاعر کا کلام سامعین کے سروں پر سے گزر جاتا ہے۔ اکثر کی تو ایسی زبردست ہوٹنگ ہوتی ہے کہ غریب زندگی بھر کے لئے شاعری سے توبہ کرلے لیکن ایسے مشاعروں میں اپنی مٹی پلید نہ کرائے"۔

طہ کا کہنا ہے کہ "یہ میرا مشاہدہ ہے ضروری نہیں کہ سب اتفاق کریں مگر یہ غلط بھی نہیں کہ ایسے مشاعروں میں ہر شخص دولہا اور خاتون فیشن شو کی دلہن نظر آتی ملتی ہیں۔ سامعین کا ایک بڑا من چلا طبقہ شاعری سے زیادہ اس فیشن شو پر توجہ دیتا ہے اور پھر بعض استاد شعراء بھی اپنی دو چار ہٹ غزلوں کے علاوہ کچھ اور نہیں پڑھتے۔ اور سامعین بھی یوں فرمائش کرتے ہیں جیسے ان کے سامنے شاعر یا شاعرہ کی بجائے لتا منگیشکر یا کمار سانو بیٹھے ہوں۔ بھلا ایسے ماحول میں سچا شعر کہا اور سنا جاسکتا ہے؟ یقین کیجئے کہ فائیو اسٹار یا شاندار ہوٹلوں میں بیٹھ کر مشاعرہ پڑھنے والے شاید ہی اردو کی خدمت کرسکیں۔

اس مشاہدے کے بعد اگر میں مشاعروں میں شرکت نہیں کرتا تو کیا غلط کرتا ہوں!"

طٰہٰ آفندی (بحرین)

عکسِ فن

خوابوں کی لذت

میں جو بستر پہ لیٹا تو نیند آگئی
نیند آئی تھی مجھ کو کہ تم آگئے

میری پلکوں پہ یادوں کے دِیپک جلے
سارا ماحول روشن سا ہوتا گیا

لفظ پُھولوں کی طرح بکھرتے رہے
زلف خوشبو کی طرح مہکتی رہی

شکوے کتنے زباں پر مری آگئے
اور پلکوں پہ آنسو سے تھّرا گئے

زخمِ دل اپنے تم سے چھپاکر کہا
آؤ، ماضی کی یادوں میں کھوجائیں ہم

جسم دو ہیں، مگر ایک ہوجائیں ہم
تم نے شرماکے نظریں چرالیں، مگر

میں نے بانہوں میں جس دم سمیٹا تمہیں
میری آنکھوں سے خوابوں کی لَذت گئی

وہ سماں میری آنکھوں سے غائب ہوا
اور اچانک مری آنکھ بھی کُھل گئی

ہاں، مگر میرے بستر کی اِک اِک شکن
یادِ محبوب سے ہے معطر ہنوز

ظفر عظیمی
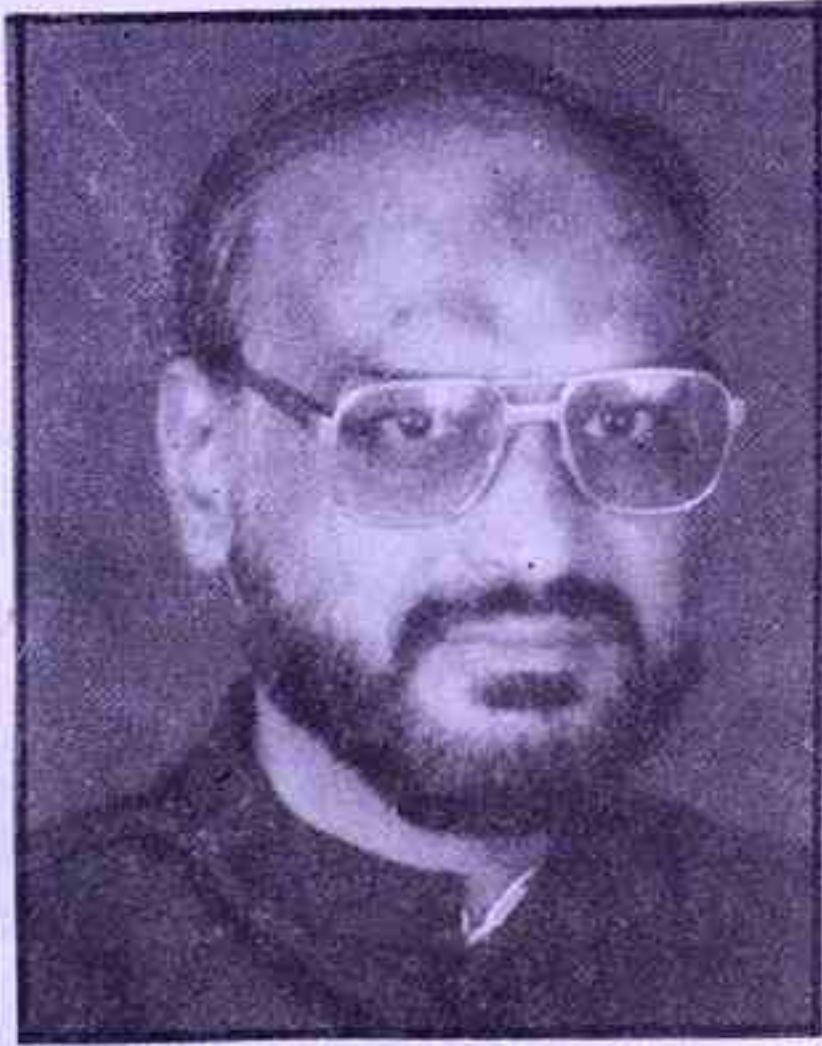
معراج کو پہنچیں سبھی آساں تو نہیں ہے
یہ لطف و کرم صاحبِ ایماں کے لئے ہے

ظفر عظیمی
11/12/95

Zafer Azimi
P.O.Box 217
DOHA - QATAR (A.G.)

ظفر عظیمی

(دوحہ قطر)

اونچا پیڑ کھجور کا دیکھن میں ہے سہائے
دوپہری کی دھوپ میں، چھاؤں کوئی نہ پائے

اس دوہے کے خالق ظفر عظیمی ہیں جن کا نام مظفر الحق ہے۔ ۱۰ جنوری ۱۹۴۳ء کو عظیم آباد پٹنہ (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۷ء میں ٹیلی مواصلات میں ڈپلوما اور تربیت لے کر ڈھاکہ (بنگلہ دیش) میں محکمہ ٹیلی گراف وٹیلیفون سے منسلک رہے۔ سٹلائیٹ کمیونی کیشن میں ٹریننگ لینے کے بعد ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۷ء تک کراچی پاکستان کے ارتھ اسٹیشن سے منسلک رہے۔

شعروادب سے تعلق تو کالج کے زمانہ سے ہی تھا چنانچہ کالج کے مشاعروں میں پیش پیش رہتے تھے۔ قطر آئے تو دوحہ کی اولین اردو ادبی تنظیم "بزم اردو قطر" سے وابستہ ہوگئے۔ شاعری کی بیشتر اصناف میں طبع آزمائی کی ہے جس میں حمد ونعت کے علاوہ غزل، نظم، سانٹ، قطعہ اور خاص طور سے ہندی میں دوہے بڑے سلیقے سے کہتے ہیں۔ یہ دوہے ان کی پہچان بن چکے ہیں کیونکہ دوہے ان کی فکر اور ان کے مشاہدات کے عکاس ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

چنتا ایسی اگنی ہے، تن من دھن کو جلائے
اٹھے دھواں نا آگ جلے، اندر اندر کھائے

ظفر کو شاعری کے ساتھ ساتھ افسانہ نگاری کا بھی شوق ہے۔ ان کے شعری اسلوب میں بے ساختگی ہے اور انداز سخن سبک اور آسان ہے۔

اردو زبان کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں عظیمی کہتے ہیں کہ ادب اور شاعری کے لئے

ابلاغ بے حد ضروری ہے۔ ادبی رسائل وجرائد کے علاوہ آج کل ریڈیو، ٹی وی، ادبی محافل، مشاعرے اور سیمینار بھی اردو کی ترویج کے لئے موثر ذرائع ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ آج کل نئی نسل میں ادبی کتابیں پڑھنے کا رجحان کم ہے۔ اس کی خاص وجہ مغرب کی تقلید ہے۔ عام طور پر ایک انگریزی پڑھنے والے کو ہمارے معاشرے میں جو مقام حاصل ہوتا ہے وہ ایک اردو یا عربی پڑھنے والے کو حاصل نہیں ہوتا یا مشکل سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نئی نسل اردو سے زیادہ انگریزی کی دلدادہ ہے۔ اور اس وجہ سے نہ تو ادبی کتابوں کی پذیرائی ہوتی ہے اور نہ ہی ادیبوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ حصول معاش کی بھی زبان نہیں۔ پھر بھی اردو کا مستقبل کافی روشن نظر آتا ہے۔ اردو اپنے محور سے نکل کر خلیجی ریاستوں سے ہوتی ہوئی یورپ اور امریکہ تک پہنچ چکی ہے۔ ان ممالک میں اردو کے شائقین بڑے پرجوش طریقہ سے مشاعرے، سیمینار اور ادبی محافل آراستہ کرتے رہتے ہیں اور ان محفلوں کی مقبولیت روز بہ روز بڑھتی جارہی ہے۔ آج کل ویڈیو بھی ابلاغ کا ایک موثر ذریعہ ہے۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق دنیا میں ہندوستانی زبان (ملی جلی اردو ہندی) دوسرے نمبر پر بولی جاتی ہے۔

مظفر عظیمی

عکس فن

فرطِ غم سے وہ لہو رنگ تمہارے آنسو
دیکھ کر جس کو نہ رک پائے ہمارے آنسو

غم کے طوفاں جو اُمڈ آئے ہیں دل میں ہمدم
بن کے سیلاب نہ بہہ جائیں وہ سارے آنسو

جان پہ میری نہ بن جائے کہیں وہ ساعت
جس گھڑی دیکھوں تری آنکھوں میں پیارے آنسو

دل مرا خون ہوا دیکھ کے خونِ ناحق
شعلۂ غم سے ہوئے ہیں یہ شرارے آنسو

جب لبوں پہ کوئی حق بات ہو لانا مشکل
آنکھوں آنکھوں ہی میں کرتے ہیں اشارے آنسو

بعد بارش کے فضا جیسے نکھر جاتی ہے
ان کے رخسار کو ویسے ہی نکھارے آنسو

لاکھ چاہا کہ نہ ظاہر ہو مرا غم ان پر
پھر بھی آجاتے ہیں آنکھوں کے کنارے آنسو

ان کی یادوں سے ظفر دل ہوا روشن روشن
میری پلکوں پہ ہیں مانند ستارے آنسو

عبدالحمید سولکر ظہور

یوں راز نہ رہ پائینگی باتیں ظہورؔ کی
آیا ہے ڈاک سے اک لفافہ کھلا ہوا

عبدالحمید سولکر ظہورؔ

عبدالحمید یوسف سولکر ظہور حالیہ پتہ : پوسٹ بکس نمبر ۱۱۳ البریمی Al - Buraimi
مستقل پتہ : ۵۴۶ گلستان۔ نیو کالونی کرلا پوسٹل کوڈ : ۵۱۲
پوسٹ : کرلا Karla سلطنت عمان Sultanate of Oman
تعلقہ و ضلع : رتنا گیری Ratnagiri
پن کوڈ ۴۱۵۶۱۲ (مہاراشٹرا اسٹیٹ) (انڈیا)
فون نمبر : ۲۰۷۱۲۔ ۲۳۵۲۔ ۹۱

عبدالحمید سولکر ظہور
(سلطنت عمان)

اس میں کوئی شک نہیں کہ میر تقی میر اپنے دور کے ترجمان اور اپنے دور کے نمائندہ شاعر ہیں لیکن میر کی شاعری صرف اپنے دور کے اظہار تک محدود نہیں۔ اس کی خوبی ہی یہ ہے کہ میر نے اپنے دور کے کرب کو آنے والے زمانوں کی روح سے بھی ملادیا اسلئے میر کا غم ذاتی ہوتے ہوئے بھی ذاتی نہیں ہے اور وقتی ہوتے ہوئے بھی وقتی نہیں۔ میر کے اشعار ان کے اپنے دور میں بھی لوگوں کے دلوں میں اتر جاتے تھے اور آج بھی ازبر ہوجاتے ہیں۔ اسی لئے میر کا شمار بڑے شعراء میں ہوتا ہے۔

شاعری ہمیشہ ہی مسائل حیات کی ترجمان اور اس کی مظہر رہی لیکن وہ دلوں میں جگہ تب بناتی ہے جب اس کی بنت میں بھی مہارت ہو۔ شاعر مسائل حیات کو کس طرح اور کس انداز سے اپنی شاعری میں ڈھالتا ہے یہی وہ پہلو ہے جس سے عام اور خاص شاعری کے درجات مقرر کئے جاتے ہیں۔

سلطنت عمان میں بسنے والے شاعر عبدالحمید سولکر ظہور نے بھی اپنی شاعری میں مسائل حیات کو اجاگر کیا ہے۔ ظہور اپنا تعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں۔

"میرا پورا نام عبدالحمید یوسف سولکر اور تخلص ظہور ہے۔ میں نے بھارت میں مہاراشٹر اسٹیٹ کے شہر رتناگیری کے کرلا نامی گاؤں میں ۳ دسمبر ۱۹۴۷ء کو آزاد بھارت کی آزاد فضا میں آنکھ کھولی۔ چونکہ کرلا گاؤں کا رہنے والا ہوں اس لئے دوست احباب اس ناچیز کو "ظہور کرلوی" نام سے بھی یاد فرماتے ہیں۔ رتناگیری کے گوگے کالج سے بی۔اے (آنرز) کی ڈگری ۱۹۷۰ء میں حاصل کی اور بمبئی کے قریب پنویل کے گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن سے ۱۹۷۷ء میں بی۔ایڈ فرسٹ کلاس میں پاس کیا۔ ۱۹۷۰ء سے تدریس کا پیشہ اپناتے ہوئے ہوں۔ ۸ سال تک رتناگیری شہر اور مضافات رتناگیری میں سروس کرنے کے بعد ۱۹۷۹ء سے سلطنت عمان کے شہر البریمی میں

عبدالحمید سولکر ظہور

ہائر سیکنڈری اسکول میں انگریزی ٹیچر کے فرائض انجام دے رہا ہوں۔

شاعری کا شوق بچپن سے ہے۔ شروع شروع میں حمد و نعت اور رفتہ رفتہ غزلیں، نظمیں، رباعیات، قطعات پر طبع آزمائی کرتا رہا۔ آزاد شاعری کا بھی شوق ہے۔ شاعری کے علاوہ افسانے اور ڈرامے لکھنے کی طرف بھی طبیعت مائل ہے۔ اب تک بچوں کے لئے کئی مزاحیہ ڈرامے تحریر کر چکا ہوں۔ تین بابی ڈرامہ "بہکے قدم" ۱۹۷۰ء میں اسٹیج پر کیا گیا تھا جسے بے حد سراہا گیا۔ افسانوں میں "اس کی کہانی، نئی تہذیب" اور آخری خون" قابل ذکر ہیں۔ بمبئی سے ستر کی دھائی میں شائع ہونے والے ہفتہ روزہ "جمہوریت" میں میرے افسانے چھپتے رہے ہیں۔ فی الحال بمبئی کے ماہنامہ "نقش کوکن" میں میری غزلیں اور نظمیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ حال ہی میں شمع نئی دہلی میں بھی کچھ کلام بھیجا ہے۔

شاعری میں حالات حاضرہ کے موضوعات پر زیادہ توجہ دیتا ہوں۔ طنز و مزاح میری شاعری کا خاص پہلو ہے۔ مہنگائی کا ذکر کرتے ہوئے میں نے ایک جگہ لکھا ہے کہ۔

آج بھکاری گلی گلی میں لگا رہا ہے یہی صدا
دس روپے کا سوال ہے بابا جو دے گا اس کو ہو بھلا

مہنگائی کا یہ حال ہے کہ بھکاری بھی اب دس روپے کا سوال کر رہے ہیں۔ ایک جگہ میں نے ایک اور طنز کیا ہے۔

گھی اور تیل پیاز اور لہسن مہنگے ہوگئے ہیں جب سے
پانی سے تڑکا دے کر بیگم نے پکایا ہے تب سے

اپنی نیک خواہشات پیش کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہیں کہ سلطانہ صاحبہ کو اپنے مقصد میں کامیاب کرے۔ آمین"

عبدالحمید سولکر ظہو

عکسِ فن

یہ کیسے راز ہیں ان کو سمجھ سکا نہ کوئی
گلے لگا کے گلے بھی دبائے جاتے ہیں
یہ قتلِ عام نہیں تو اور کیا شے ہے
زہر دواؤں کے اندر ملائے جاتے ہیں

رباعیات

مفلسی میں لوگ اپنے بھی پرائے ہوگئے
شام جوں ہوتے ہی جیسے دور سائے ہوگئے
جن کو دعویٰ تھا ہماری دوستی کا اے ظہورؔ
آج ہم محفل میں ان کی بن بلائے ہوگئے

(بابری مسجد کی شہادت کے بعد)

فلک پہ رات ستاروں کا کارواں دھندلا
زمیں پہ آج نظر آرہا سماں دھندلا
صبح بھی آج عجب رنگ لے کے آئی ظہورؔ
شفق کے رنگوں میں لگتا ہے آسماں دھندلا

قطعہ

زندگانی گزارنے کے لئے
تلخیٔ رنج وغم مٹاتا ہوں
لوگ بیزار ہیں زمانے سے
میں زمانے میں مسکراتا ہوں

عابد جعفری

بات تو جب ہے لے کے اسے ساحل تک جا پہنچو
دریا کو کیا فرق پڑے گا ناؤ ڈبونے سے

عابد جعفری
۱۴ نومبر ۹۵ء

Abid Jaferi
10 - 1235, Radom St
Pickering, ONTARIO LIW IJ3 - CANADA

عابد جعفری

(ٹورنٹو کینیڈا)

عابد جعفری کے مجموعی کے مجموعہ کلام "سپنے جاگتی آنکھوں کے" میں لندن کے عاشور کاظمی عابد جعفری اور ان کی شاعری کے ضمن میں لکھتے ہیں کہ "اپنے وطن سے ہجرت کر کے ترقی یافتہ مغربی ممالک میں آنے والا ہر شخص کچھ سہانے خواب دیکھ کر یہاں آیا تھا۔ یہاں کے مشاہدات اور درپیش حالات نے ان خوابوں کو ریزہ ریزہ کر دیا۔ جسے ہم جنت ارضی سمجھ کر نکلے تھے وہ جنت ارضی جسموں کے لئے جنت ارضی سہی، ذہنوں کے لئے جہنم کا عذاب ہے۔ جو لوگ جسموں کی حد تک سوچتے ہیں انہیں یہاں بہت آسودگی ہے لیکن ذہن اور فکر والوں کے لئے ایک کرب کے سوا کچھ نہیں۔ خوابوں کی اس شکست و ریخت کو دیکھ کر عابد جعفری پکار اٹھتے ہیں۔

جزائے کاوش تعمیر یہ ملی ہے ہمیں
صدائے تیشہ سدا ساتھ گھر میں رہتی ہے

یا

یہ ان دنوں جو سر پہ مرے سائبان ہے
اک دھوپ ہے کہ چھاؤں کا جس پر گمان ہے

عابد جعفری نے ترک وطن کا فیصلہ گو اپنی خوشی سے کیا لیکن وطن کی یاد انہیں پھر بھی بے چین رکھتی ہے۔ چاہے وہ کتنا ہی آسودہ سہی لیکن ذہنی تشنگی سے بدحال جب آنکھیں موندے اپنے گھر کے متعلق سوچتا ہے اور اپنی گلیوں میں قدم رکھتا ہے تو اسے جلے ہوئے گھر، ویران راستے اور بارش کی طرح برستی ہوئی گولیوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ وہ جنت جسے وہ کل چھوڑ آیا تھا

آج خرابے کی شکل میں نظر آتی ہے۔ محبت کی ہواؤں کے بغیر ایک گھٹن لئے' اندھیروں کی چادر میں لپٹی ہوئی۔

بے چراغی میں رہی اپنے گھروں کی میراث
روشنی پوچھتی پھرتی ہے یہ گھر کس کا ہے

کیوں آج اجنبی سا ہمیں اپنا گھر لگا
یہ کیا ہوا کہ اپنے ہی سایہ سے ڈر لگا

کوئی تو ہو کہ جس سے تبسم ادھار لیں
اس شہر میں تو جو بھی ملا نوحہ گر ملا

وجود جن کا تھا منسوب پاسبانوں سے
دھواں سا آج بھی اٹھتا ہے ان مکانوں سے

عابد سے میری ملاقات ۱۹۹۱ء میں اردو مرکز لاس اینجلس کے سالانہ مشاعرے میں ہوئی تھی۔ اس وقت عابد نے اپنا مجموعہ کلام جس کا اوپر ذکر آیا ہے' دیا تھا۔ پھر میں نے عابد کو خط لکھنا چاہا مگر کتاب پر پتہ درج نہ تھا اس لئے عابد سے رابطہ نہ ہوسکا کہ میں انہیں اتنی اچھی شاعری پر مبارکباد دے سکتی۔ لیکن جب میں نے سخن ور حصہ دوم کے لئے شعراء سے رابطہ کیا تو مجھے عابد کی یاد آئی۔ انہی دنوں "شمع" دہلی میں' میں نے عابد جعفری کا ایک خوبصورت دل موہ لینے والا افسانہ پڑھا۔ جیسے عابد کی شاعری نثر میں ڈھل گئی ہو مگر اس وقت یہ معلوم نہ تھا کہ یہ وہی شاعر عابد جعفری ہے۔ اپنے شبے کو یقین کی صورت دینے کے لئے میں نے شمع میں دیئے گئے پتے پر عابد کو خط لکھا۔ (میرے لئے شمع کا یہ رویہ قابل ستائش ہے کہ شعراء اور ادیب کی تخلیقات کے ساتھ ان کا پتہ شائع کیا جاتا ہے۔ میں نے شمع دہلی کے توسط سے ہی بیشتر شعراء سے رابطہ کیا) عابد نے جواب دے کر تصدیق کی وہ وہی عابد جعفری ہیں جو لاس اینجلس میں مجھ سے مل چکے ہیں۔ پھر عابد نے میری بڑی حوصلہ افزائی کی کہ میں دیار غیر میں رہ کر بھی تنہا یہ دشوار گزار راہیں طے کر رہی ہوں۔ عابد نے کئی شعراء کے پتے فراہم کئے اور کئی سے خود بھی رابطہ کیا۔

عابد ۱۹۵۰ء میں پاکستان میں پیدا ہوئے۔ کراچی کے لیاقت سائنس کالج' علامہ اقبال کالج اور ایس ایم کالج سے تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۷۵ء میں ٹورنٹو کینیڈا آگئے اور ان دنوں میونسپل کارپوریشن ٹورنٹو میں بحیثیت پاور انجینئر تعینات ہیں۔

عابد کہتے ہیں کہ شاعری کی ابتدا افسانہ نگاری کے بعد ہوئی۔ اگرچہ گزشتہ تیس سالوں کی

ادبی زندگی میں افسانہ نگاری کی طرف توجہ دینے کا موقع کم ملا اور شاعری زیادہ فعال رہی مگر اس کے باوجود ان کے افسانے پاک وہند کے ادبی پرچوں میں شائع ہوتے رہے۔ کم عمری سے ہی طبیعت افسانہ نگاری کی طرف مائل رہی۔ کالج کے زمانے میں کراچی کے مختلف کالجوں میں منعقد ہونے والے مشاعروں میں بھی شریک رہے۔

لیاقت سائنس کالج میں بزم ادب کے نائب صدر منتخب ہونے کے بعد اس کالج میں پہلی مرتبہ ایک عظیم الشان مشاعرہ منعقد کیا۔

عابد ابلاغ کے حامی ہیں۔ ادب و شاعری کے لئے ہی نہیں ان کے کہنے کے مطابق ابلاغ ہر اس فن کے لئے ضروری ہے جس کا اطلاق سماعت وبصارت پر ہو۔ ابلاغ کے بغیر لفظ پتھر تو ہوسکتے ہیں آئینے نہیں۔ مگر ابلاغ کے درجات ہیں۔ ضروری نہیں کہ کسی تحریر کا ابلاغ جس قدر کسی ایک پر ہو۔ دوسرے پر بھی اتنا ہی ہو۔ اور ادبی رسائل کی عدم مقبولیت کی وجہ ابلاغ کی نارسائی نہیں اور یہ عمل صرف اردو ادب کے ساتھ نہیں بلکہ دنیا کی تقریباً تمام بڑی زبانوں میں ادب تخلیق کرنے والوں کے احساسات یہی ہیں۔ اس کی بہت سی وجوہ ہیں۔ مثلاً گزشتہ پانچ دہائیوں میں ابلاغ کے دوسرے ذرائع جیسے فلم' ٹیلی وژن' ریڈیو اور ویڈیو وغیرہ نے بڑی ترقی کی ہے۔ ساتھ ہی عالمی جنگوں کے نتائج نے بھی عام لوگوں کی ترجیحات کو بدلا۔ کچھ مجبوریوں نے اور کچھ رزق کی مصلحتوں نے بھی عوام کو ادب سے دور کیا ہے۔ انسان کی زندگی میں اولین ترجیح بہرحال رزق ہے اور بھوک میں تو پیار کے بول بھی تیر ونشتر لگتے ہیں۔ (یہ عابد کا خیال ہے جسے عاشور کاظمی پیار سے کہتے ہیں "صوفی کہیں کا......") چار پانچ دہائیوں قبل اگرچہ حصول رزق کے مواقع کم تھے مگر چونکہ ضرورتیں محدود تھیں۔ (جو اب لامحدود ہوگئی ہیں) اس لئے ایک عام آدمی بھی فنون لطیفہ کے لئے خاطر خواہ وقت دے پاتا تھا۔ جبکہ موجودہ دور میں انسان نے زندگی کی آسودگی سے ادب کو خارج کردیا ہے۔ تیسری دنیا کے سیاسی حالات نے بھی انسان اور ادب کے رشتے کو منقطع کرنے میں بڑا موثر کردار ادا کیا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اہل فکر ونظر کسی ایسے متبادل راستے کو اختیار کریں جس سے ادب کے روٹھے ہوئے قارئین اس طرف توجہ دیں۔ اس ضمن میں رسائل اور کتب سے عدم دلچسپی رکھنے والوں کے لئے آڈیو ویڈیو کتب بڑا موثر کردار ادا کرسکتی ہیں۔

نئی نسل کی اردو سے بیگانگی کے سلسلے میں عابد جعفری کا تجزیہ یقیناً کار آمد ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان کی نسل اپنے آبائی ممالک سے ہجرت کرکے ایک بالکل اجنبی ماحول اور اجنبی ملک میں آبسی تھی اور زیادہ تر لوگ ترقی یافتہ ممالک میں سکونت پذیر ہوئے تھے۔ جس ماحول سے یہ نسل

آئی تھی۔ وہ اس ماحول سے یکسر مختلف تھا جہاں آ بسی تھی۔ ترقی یافتہ لوگوں کے قدم سے قدم ملا کر چلنا اتنا آسان بھی نہ تھا چہ جائیکہ اس ماحول میں اپنا کوئی قابل عزت مقام بنانا۔ ظاہر ہے شدید محنت کی ضرورت تھی اور اس شدید محنت کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں کے معاشرے میں اس نسل نے کسی نہ کسی طرح اپنے قدم تو جمالئے مگر اس عرصے میں ان کی پوری نئی نسل اس دور سے گزر گئی جب ان میں لاشعوری طور پر اپنی تہذیب و زبان سے بھرپور شناسائی پیدا کی جاسکتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب رزق کی مصلحتوں کی بندشیں ڈھیلی پڑیں تو وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا اور نتیجے میں پوری ایک نسل اپنی زبان کے ورثے سے محروم ہو چکی تھی اور لگتا ہے کہ اب یہی نسل نہیں بلکہ آنے والی نسلیں بھی اس نعمت سے محروم رہیں گی۔ اس بے توجہی کا ذمہ دار کون ہے؟ اس سوال کا جواب تو ہمیں اپنے اپنے ملکوں کے اہل سیاست سے لینا چاہئے یا ان حالات سے جنھوں نے ہمیں ہجرت پر مجبور کیا۔ اس مسئلہ کا حل اب تو صرف یہی نظر آتا ہے کہ بہت ہی محبت سے نئی نسل کے ذہنوں میں اپنی زبان اور تہذیب کی اہمیت کو منتقل کیا جائے۔

"تنقید نگار کہتے ہیں کہ آج کا ادب معنوی اعتبار سے زندگی سے دور ہے" اس سوال کے جواب میں عابد جعفری کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے کہ ہمارے دور میں ادب معنویت کھو رہا ہے اور زندگی سے دور ہو رہا ہے۔ جو ادب زندگی کے تجربوں اور جذبوں سے کشید نہ کیا جائے اسے ادب کہنا ہی نہیں چاہئے بلکہ تضیع اوقات کہنا زیادہ بہتر ہے۔ ہر دور میں ایسی تحریروں کو ادب کے کھاتے میں ڈالا جاتا رہا ہے۔ جن کا ادب سے تعلق نہیں ہوتا تھا اور یہ صرف ہمارے ہی دور کا المیہ نہیں ہے ہر دور میں چبائے ہوئے لقمے اگلنے کا فن جاری رہا ہے۔ مگر ایسا ادب قابل اعتنا کب رہا ہے۔ ہمارے دور میں بھی ایسے بہت سے شعراء و ادباء موجود ہیں مگر ان کا نام باقی کہاں رہے گا۔ جو تھوڑی بہت شہرت حاصل ہو بھی گئی تو وہ ناپائیدار ہے۔ اصل حقیقت تو بہت بعد میں سامنے آتی ہے جب وقت کے بے رحم ہاتھ حقیقت کو عیاں کر دیتے ہیں۔ ہمارے عہد کے ادب کی اہمیت کا فیصلہ بھی وقت کرے گا۔ پھر بھی میں اپنے عہد کے ادب سے بڑی حد تک مطمئن ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے بہت سے لکھنے والے تخلیق ادب کو تفریح طبع کا کوئی عمل سمجھتے ہیں مگر اس کے ساتھ ساتھ کچھ سنجیدہ اہل قلم بغیر نام و نمود اور شہرت و ناموری کے ایسا ادب تخلیق کر رہے ہیں جو واقعی ہمارے عہد کی نمائندگی کرتا ہے۔

عابد نے ٹورنٹو میں چند احباب کے ساتھ مل کر ۱۹۸۲ء میں "رائٹرز فورم" کے نام سے ایک ادبی تنظیم کی بنیاد رکھی جس کے وہ تین مرتبہ صدر اور دو مرتبہ سیکریٹری منتخب ہوئے۔ آج کل بھی اس تنظیم کے صدر ہیں۔ یہ تنظیم اپنی افادیت اور فعالیت میں ساری دنیا میں مشہور ہے۔

عابد جعفری

عابد جعفری کو ان کے مجموعے کلام "سپنے جاگتی آنکھوں کے" مطبوعہ ۱۹۹۰ء پر تین ایوارڈز ملے۔

۱۔ ۱۹۹۱ء کی بہترین شاعری کا ایوارڈ "اردو مرکز" انٹرنیشنل لاس اینجلس کی جانب سے۔

۲۔ بہترین مجموعہ کلام کا ایوارڈ "حلقہ فکر و نظر" مانٹریال کی جانب سے۔

۳۔ مغرب کا بہترین شاعر کا ایوارڈ "دی ایسٹرن نیوز ٹورنٹو" کی جانب سے۔

ٹیکہ

جب معالج نے
مرے نوزائیدہ بیٹے کے بازو پر
کئی بیماریوں سے بچ نکلنے کے لئے
ٹیکہ لگایا
میں ہنسا
وہ اس لئے کہ
میرے ہمسائے میں اک جوہری ہتھیار والی
فیکٹری ہے

قتل گاہیں

یہ میرا قبلہ
وہ تیرا قبلہ
یہ میری سرحد
وہ تیری سرحد
یہ میرا مذہب
وہ تیرا مذہب
یہ نسل میری
وہ نسل تیری
(ہیں قتل گاہوں کے نام سارے)
مری زمیں کا ہر اک انساں
زمیں کے قرضے بھلا کے سارے
فلک کا قرضہ چکا رہا ہے

عابد جعفری

عکس فن

نیلسن منڈیلا کے نام

میں کب سے سوچ رہا ہوں تجھے عقیدت سے
سما و ارض کا ہر آفتاب پیش کروں
میں تیرے عزم سے سینچوں خود اپنی گیتی غم
اور اس کے سارے مہکتے گلاب پیش کروں
گہر جو ڈھال دیئے تیری عرق ریزی نے
میں کس طرح تجھے وہ آب وتاب پیش کروں
بس اب کہ عزم کے پیکر وہ صبح دور نہیں
کہ تجھ کو تیری سی تعبیر خواب پیش کروں

(جنوبی افریقہ کے سیاہ فام لیڈر نیلسن منڈیلا کی ۷۰ ویں سالگرہ پر)

تین اشعار

اپنی ہی بینائی گنوا بیٹھوگے رونے سے
کیا حاصل ہے پلکوں میں یوں اشک پرونے سے

○

چھوڑ کے میں بھی جاؤں گا اس مٹی پر پہچان
موج امر ہوجاتی ہے ساحل پر کھونے سے

○

تم کو مبارک آب وہوا ان سائبانوں کی
چاندی جیسی دھوپ مجھے بہتر ہے سونے سے

عابدہ کرامت

ناپنا چاہیے جڑوں کی قامت
گھونسلہ جب بھی شجر پر رکھنا

عابدہ کرامت

Aabida Karamat
P.O.Box 988
SAFAT, 13010 KUWAIT (A.G.)

عابدہ کرامت

(کویت)

ایک دن دوران گفتگو اردو مرکز لاس اینجلس کی نیر جہاں نے مجھ سے پوچھا "آپ نے عابدہ کرامت کو سوالنامہ بھیجا۔ بڑی اچھی شاعرہ ہیں" میں نے نیر کو بتایا کہ عابدہ کے میاں کرامت غوری نے تو تعارف بھیج بھی دیا البتہ عابدہ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ اپنے دوسرے مجموعہ کلام کی تکمیل میں مصروف ہیں۔ پھر عابدہ کا تعارف مجھے کراچی میں ملا۔ اور اگر بروقت نہ ملتا تو یقیناً سخن ور حصہ دوم میں شریک نہ ہو پاتا۔

عابدہ کو میں کم و بیش تیس سال سے جانتی ہوں جب وہ جامعہ کراچی کی طالبعلم تھیں۔ عابدہ نے زولوجی (Zoology۔ علم حیوانات) میں ایم۔ایس۔سی کیا۔ کرامت غوری سے ان کی شادی ہوئی اور یہ ایم ایس سی کی ڈگری طاق پر رکھ کر گھرداری کرتی رہیں اور بچے پالتی رہیں۔ عابدہ کا تعلق ویسے تو جھانسی سے ہے۔ جائے پیدائش بھی وہی ہے لیکن پاکستان بننے کے بعد جس طرح والدین کے زیر سایہ پاکستان آگئیں اسی طرح شادی کے بعد شوہر کے زیر سایہ ملکوں ملکوں گھومتی رہیں کیونکہ کرامت فارین سروس سے وابستہ ہیں چنانچہ عابدہ نیویارک' ارجنٹینا' فلپائن' جاپان' چین اور الجزائر میں رہیں۔ ان دنوں وہ کویت میں ہیں اور امکان ہے کہ جلد ہی کویت سے بھی رخت سفر باندھیں گی۔

عابدہ کی بنیادی وابستگی شاعری سے ہے۔ گو گھر میں کوئی اور شاعر نہ تھا لیکن ان کی دادی اماں کو اردو ادب سے خاصا لگاؤ رہا۔ چنانچہ شاعری عابدہ کی گھٹی میں پڑی۔ یہی وجہ ہے کہ شعر گوئی کے لئے انہیں کسی خاص جذبے یا تحریک کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اچانک ہی آمد کی کیفیت طاری ہوتی ہے جو اکثر ہفتوں قائم رہتی ہے ورنہ تو کئی کئی ماہ بغیر قلم اٹھائے گزر جاتے ہیں۔ بے نیازی کا یہ حال ہے کہ موڈ ہوا تو اپنا کلام کہیں اشاعت کے لئے بھیج دیا ورنہ بیاض آپ ہی ان کے کلام کو داد سخن دے کر حق محبت ادا کردیتی ہے۔ پھر بھی کراچی کے سیپ اور دہلی کے بیسویں صدی میں ان کا کلام شائع ہوتا رہتا ہے۔ بیاض

کا قرض اتارنے کو انہوں نے دو مجموعے جمع کرلئے۔ "حاصل آگہی" پہلا مجموعہ ہے اور دوسرا "رت جگوں کی چاندنی"

"رت جگوں کی چاندنی" جو سال رواں یعنی ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا ہے اس کے دیباچے میں دیال سنگھ کالج لاہور کے پروفیسر اختر شمار لکھتے ہیں کہ "یوں تو بعض شاعرات کے ہاں جذبات نگاری اخلاقی حدوں سے تجاوز کرجاتی ہے۔ ایسی شاعری باعث تلذذ ہونے کی وجہ سے ہاتھوں ہاتھ لی جاتی ہے اور شاعرات راتوں رات شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگتی ہیں۔ مگر عابدہ کرامت کی شاعری میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آتی اور نہ ہی ان کی شاعری میں عورت اپنے نازک احساسات وجذبات کا سہارا لے کر توجہ حاصل کرنے کی شوقین دکھائی دیتی ہے۔ عابدہ کی شاعری عورت کی تقدیس اور علم و آگہی کا خوبصورت نمونہ ہے۔ ان کی شاعری سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ خواتین شاعرات فقط اپنے عورت ہونے اور صرف عورتوں کے جذبات واحساسات کی شاعری نہیں کرتیں بلکہ شعور و آگہی، علم، حقائق اور دردمندی کو بھی موضوع سخن بنا سکتی ہیں۔"

اس حوالے سے عابدہ کا کہنا ہے کہ آج کے شعراء نے اپنی فکر اور سوچ کو لب ورخسار تک محدود نہیں رکھا۔ غزل میں بھی آج کے مسائل کا احاطہ کیا جارہا ہے۔ آج کی شاعری زندگی کی دوسری جہتوں کی بھی ترجمان ہے۔ زندگی کے وہ پہلو اور زاویے جو لب ورخسار سے کہیں زیادہ محترم ٹھہرے، آج کی شاعری کی پہچان بنے ہوئے ہیں۔

بچوں کو اردو زبان سے روشناس کرانے کے سلسلے میں ان کا مشورہ ہے کہ یہ کام صرف والدین ہی کرسکتے ہیں۔ انہیں اگر اپنی زبان سے محبت ہے تو اپنے وقت کی تھوڑی سی قربانی دینی ہوگی اور بچوں کو گھر پر اردو بولنے کا عادی بنانا ہوگا۔ عابدہ کہتی ہیں کہ "خود ہمارے بچوں نے بھی ملک سے باہر رہنے کی وجہ سے انگریزی اور فرانسیسی اسکولوں میں تعلیم پائی مگر میں نے شروع سے ہی ان پر زور دیا کہ وہ گھر پر اردو بولیں، اردو پڑھیں اور اردو لکھیں اور میں اس میں کامیاب رہی۔"

عابدہ کا کہنا ہے کہ "شاعری چھوٹی بڑی نہیں ہوتی کیونکہ ہر شاعر اپنا تجربہ اور نکتہ نظر بیان کرتا ہے۔ ہاں فکر اور مطالعہ شعر کو سقم سے پاک کرتا اور پختہ بناتا ہے۔ گہرائی اور اندر کے موسم ذاتی ہوتے ہیں۔ الگ الگ اسلوب سے ان کو بیان کرنے کا ہنر شاعری میں چار چاند لگادیتا ہے۔" ان کا کہنا ہے کہ موجودہ دور میں بھی بہت اچھے کہنے والے ہیں جیسے رضی اختر شوق، فراز، حمایت، قاسمی صاحب وغیرہ۔

عابدہ کرامت

عکسِ فن

غزل

محبتوں میں عجب رکھ رکھاؤ میرا تھا
کہ تیر ہاتھ میں سب کے تھے گھاؤ میرا تھا

تمام شہر میں روشن تھیں مشعلیں اس کے
جہاں سے روشنی پھوٹی الاؤ میرا تھا

وہ قطرہ قطرہ ترائی کو پی گیا میری
اک ایسے دشت کی جانب بہاؤ میرا تھا

وہ ہمسفر تھا مگر تھا قیام گلشن میں
ہر ایک درد کا صحرا پڑاؤ میرا تھا

مجھے وہ بزمِ طرب کس طرح سے راس آتی
زمانے بھر کے دکھوں سے لگاؤ میرا تھا

زمین پر یہ جبیں یوں بھی جھک نہیں پائی
کہ آسمانوں کی جانب جھکاؤ میرا تھا

مآل یہ رہا موجود اور حاصل کا
گرا ہوا تری نظروں میں بھاؤ میرا تھا

عبدالرحمٰن عبد

مہرباں اب بھی ہے گھر کی وہ پرانی کرسی
جب بھی آتا ہوں مجھے گود میں لے لیتی ہے

عبدالرحمان عبدؔ

Abdul Rehman M.D.
125 Douaglas Road
Staten Island NEWYORK 10304 - U.S.A

عبدالرحمٰن عبد

(نیویارک)

"ڈاکٹر عبدالرحمٰن عبد' اول و آخر "عبد" ہیں اور قلب میں ان کے "رحمٰن" ہے۔ وہ صرف نام کے ایسے نہیں ہیں بلکہ اپنے کام کے اعتبار سے بھی اپنے نام کا بھرم رکھے ہوئے ہیں۔ اچھے انسان اور صاحب ایقان شاعر ہونے کے سبب وہ کھل کر نیکی کی تلقین اور برائی پر تنقید کرتے ہیں۔ ویسے تو شاعری کا منصب ہی روشنی کی ترویج اور ظلمت کی تنسیخ ہے' مگراس شاعری کے برعکس جو شاعر کو "تلمیذ الرحمٰن" بنادیتی ہے' ایسی شاعری بھی ہمارے ہاں مفقود نہیں ہے جو شیطان کی پیروی میں لکھی جاتی ہے اور جس کی مذمت قرآن کریم میں کی گئی ہے۔"

یہ رائے ہے محترم شبنم رومانی کی اور محترم ہے کہ شبنم صاحب مرد مشناس ہیں۔ وہ شاعر بھی ہیں اور صحافی بھی۔ لہٰذا ان کی رائے سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔ اور یوں بھی کہ آپ اگر عبدالرحمٰن عبد سے مل لیں تو ان کا خلوص اور لہجے کی سچائی آپ کا دل موہ لے۔ وہ ایک اچھے شاعر بھی یوں ہیں کہ پہلے وہ ایک اچھے انسان ہیں۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن ۳۰ نومبر ۱۹۴۴ء کو میرپور آزاد کشمیر میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۸۶ء میں ان کی شاعری کا آغاز ہوا۔ تحریک محترمہ ادا جعفری کی شاعری سے ملی۔ ادا جعفری ان کی قریبی رشتہ دار ہیں۔

عبد پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں ڈاؤ میڈیکل کالج سے انہوں نے ایم بی بی ایس کیا تھا۔ اپنی پیشہ وارانہ مصروفیات کے باوجود ادبی خدمات کے لئے خود کو حاضر رکھتے ہیں۔ "نیویارک اردو انجمن" کی بنیاد انہوں نے ڈالی اور انجمن کے تحت بین الاقوامی مشاعروں اور

شعری نشستوں کا انعقاد کیا۔

ان کا پہلا مجموعہ کلام "عرفان عبد" کے نام سے ۱۹۹۰ء میں شائع ہوا۔ نارتھ امریکہ سے شائع ہونے والا حمد و نعت کا یہ پہلا مجموعہ تھا۔ غزلوں اور نظموں کا مجموعہ "صنم کدہ ہے جہاں" سال رواں ۱۹۹۶ء میں شائع ہوگا۔ یہ ان کا دوسرا مجموعہ ہے۔

"نثری نظم کا مستقبل روشن ہے؟" اس سوال کا جواب دیتے ہوئے عبد کہتے ہیں کہ "نثری نظم کے بارے میں میری رائے مثبت ہے مگر شرط یہ ہے کہ نثری نظم کہنے والا دیگر اصناف شعر پر بھی قادر ہو۔ یعنی ایک مستند شاعر نثری نظم کہے تو بجا مگر جو شخص پابند نظم و غزل و نعت وغیرہ میں سے کسی صنف میں شعر نہیں کہہ پاتا۔ وہ اگر کچھ مربوط الفاظ کو نثری نظم کہہ دے تو ایسی شاعری قابل قبول نہ ہوگی۔"

عبد کی شاعری کس طبقہ فکر سے متاثر ہے اس ضمن میں عبد کہتے ہیں کہ شبنم رومانی صاحب میری فکر کی بہتر نمائندگی کر پائیں گے۔ شبنم رومانی کا کہنا ہے کہ

"اب، جبکہ صورتحال کچھ یوں ہے کہ اپنی اقدار اور اپنے اعتقادات کا اظہار کرتے ہوئے ہماری زبان لڑکھڑاتی ہے، "رحمٰن" کا نام لینا "بنیاد پرستی" ٹھہرا ہے اور اپنے "عبد" ہونے کا اقرار "رجعت پسندی" ------- ایسے میں عبدالرحمٰن عبد نے بتکدے میں اذان دینے کی ٹھانی ہے۔ "صنم کدہ ہے جہاں" اسی صورتحال کی شرح صدر ہے، جس میں لا الہ اللہ کی پر جلال صدا ضرب قلب کی طرح جاری ہے۔ یوں وہ معنوی طور پر اقبال" کے شاگرد ہیں۔ عبد اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سائنسی ذہن کے مالک ہیں۔ وہ نیویارک کی ایک خوشحال بستی میں رہتے ہیں جو ایک خوبصورت جزیرہ ہے سو عبد صاحب کی شاعری بھی آج کے ادبی طوفان میں جزیرے کے مانند ہے۔

خدا گواہ کہ ہو آدمی کمال کے عبد
بتوں کے شہر میں تم کو خدا کی سوجھی ہے

سوال یہ ہے کہ کوئی کیوں لکھتا ہے؟ اپنے نفس کی تسکین کے لئے یا انسانی مکاشفے اور مکالمے کے طور پر؟ اور اگر یہ مکاشفہ یا مکالمہ ہے تو اس کے گہرے معانی اور مطالب بھی ہوں گے۔ ایسی شاعری "جنگل کا پھول" نہیں "کیاری کا پودا" ہوتی ہے جس کو کھاد بھی چاہئے، پانی بھی، روشنی بھی، تراش خراش بھی اور مسلسل دیکھ بھال بھی، تاکہ اس کے کانٹوں سے دوسروں کے دامن محفوظ رہ سکیں اور اس کے پھولوں کی خوشبو دوسروں کی مشام جاں تک پہنچ سکے۔ جناب عبد کی تمام شاعری اسی پودے کی مانند ہے۔ وہ حیات و کائنات کے بارے میں سوچتے ہیں،

ماضی اور مستقبل کے بارے میں سوچتے ہیں' اپنے تاریخی اور تہذیبی منظروپس منظر کے بارے میں سوچتے ہیں' مشرق و مغرب کی تہذیبی پیکار کے بارے میں سوچتے ہیں' مادیات اور روحانیت کے ٹکراؤ سے پیدا ہونے والے تناقص کے بارے میں سوچتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ خدا اور اس کی خدائی کے بارے میں بھی فکرمندی کا ثبوت دیتے ہیں۔

یہ دنیا بن چکی' لیکن خدا تو اب بھی خالق ہے
میں اکثر سوچتا ہوں' اب خدا کیا سوچتا ہوگا

غرض یہ کہ وہ اپنی ایک سوچ رکھتے ہیں' اپنی ایک رائے رکھتے ہیں اور اپنے خیالات کی ترسیل کے لئے شاعری کو اوسط بناتے ہیں۔ اقبالؒ ہی کی طرح شاعری ان کے نزدیک مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ ایک ذریعہ ہے ابلاغ فکروخیال کا۔ اس کوشش کو زیادہ سے زیادہ قابل توجہ بنانے کے لئے وہ کبھی کبھی طنزومزاح سے بھی کام لیتے ہیں' مگر ان کی شاعری' سنجیدہ ہو یا طنزیہ' سب کے عقب سے ان کا نقطہ نظر ہی طلوع ہوتا ہے۔ عبد صاحب خود تو امریکہ میں رہتے ہیں مگر ان کا دل پاکستان میں پڑا رہتا ہے اور یہ امرباعث اطمینان ہے کہ مغرب کے موسموں کی گرد مشرق کے خدوخال کو اب تک دھندلا نہیں سکی ہے۔ وہ اب بھی یہی کہتے ہیں۔

عبد جس شہر کی تہذیب سے خوف آتا ہے
پھنس گیا آکے اسی شہر بتاں میں' میں بھی
مجھ کو حق گوئی کی تعلیم ملی ہے' ورنہ
بہہ گیا ہوتا کسی سیل رواں میں' میں بھی

تو عبد کسی سیل رواں میں بہنے کے بجائے استقامت کے ساتھ اپنے خیال پر' اپنی جگہ پر' قائم ہیں۔ وہ سمجھنے سمجھانے والے خود آگاہ اور خدا آگاہ انسان ہیں کہ یہی تقاضائے عبدیت ہے۔ ممکن ہے کسی کو میری اس رائے پر مبالغے کا گمان گزرے' لیکن امریکہ کی معاشرتی غلاظت کے بیچوں بیچ پاک صاف رہنے والا اور مادیت پرستی کے قعردریا میں ڈوب کر بھی دامن کو تر ہونے سے بچالے جانے والا شخص کوئی مرد خود آگاہ وخدا آگاہ ہی ہوسکتا ہے۔

اسی کو عبد مجاہد کا ہے لقب موزوں
دیار کفر میں رہ کر جو پاکباز رہے

ڈاکٹر عبدالرحمٰن عبد اصلاً" پاکستانی اور نسلاً" کشمیری ہیں مگر ان کے لب ولہجہ پر دلی اور لکھنؤ کا سایہ نظر آتا ہے۔ وہ بزم گفتار اور شائستہ مزاج انسان اور شگفتہ خیال شاعر ہیں۔ وہ نہ صرف بات کہنے کا ڈھنگ جانتے ہیں بلکہ اپنی بات کو زیادہ قابل قبول بنا کر پیش کرنے کے گر سے بھی

واقف ہیں' اسی لئے ان کے کلام میں "کوشش" کا نہیں "کشش" کا عنصر نمایاں ہے۔

ویسے ہر شخص یہاں بات بہت کرتا ہے
بات تو جب ہے کہ ہو بات کا معیار بھی کچھ

ادب اور اپنے پیشہ طب کے ساتھ ساتھ عبد سیاسی میدان بالخصوص تحریک آزادی کشمیر میں نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں۔ انہوں نے ایک آل پارٹیز کشمیری تنظیم بنائی ہے۔ وہ کشمیر فیڈریشن آف یو ایس اے کے بانی اور موجودہ چیئرمین ہیں۔ امریکہ کی مقامی سیاست میں بھی انہوں نے اہم کردار ادا کیا ہے۔ میڈیکل سوسائٹی کے سابق صدر ہیں۔ اپنے علاقہ میں مسجد النور کی تعمیر کا کام ان کے ذمہ ہے۔ عبد مسجد بورڈ کے موجودہ چیئرمین بھی ہیں۔

قطعات

عقل بے شک صدائے عالم ہے
عشق سے کائنات میں دم ہے
عقل لاکھوں ثبوت پیش کرے
عشق کی رہبری مُسلّم ہے

○

جہانِ ہست تھا گم سم مری زباں کے بغیر
یہ کارواں تھا خجل میرِ کارواں کے بغیر
زمیں پہ گردشِ شام و سحر تو تھی لیکن
سحَر میں نور کہاں تھا مری اذاں کے بغیر

عبدالرحمٰن عبد نیویارک

عکس فن

غزل

ہوئی جس وقت آدم سے خطا، کیا سوچتا ہوگا
یہ تدبیرِ خدا ہے یا سزا، کیا سوچتا ہوگا

اسے تم پیس کر ہاتھوں پہ مَل کر ناز کرتے ہو
کبھی سوچا بھی ہے برگِ حنا کیا سوچتا ہوگا

کھڑے ہو آئینے کے سامنے تم دیر سے تنہا
ذرا اتنا تو سوچو آئینہ کیا سوچتا ہوگا

ہے کتنا پُرسکوں لیکن اجَل ہے ساتھ ساتھ ان کے
گھڑی بھر کے لئے اک بلبلہ کیا سوچتا ہوگا

جدا کردے سمندر سے جسے سورج کی تابانی
وہ قطرہ آکے بُردوشِ ہوا کیا سوچتا ہوگا

جہانِ اُخر میں واپس چلی ہے رُوح تو لیکن
یہ مِٹی کا بدن ہوکر جدا کیا سوچتا ہوگا

یہ دنیا بَن چکی لیکن خدا اب بھی تو خالق ہے
میں اکثر سوچتا ہوں اب خدا کیا سوچتا ہوگا

خواجہ ریاض الدین عطش
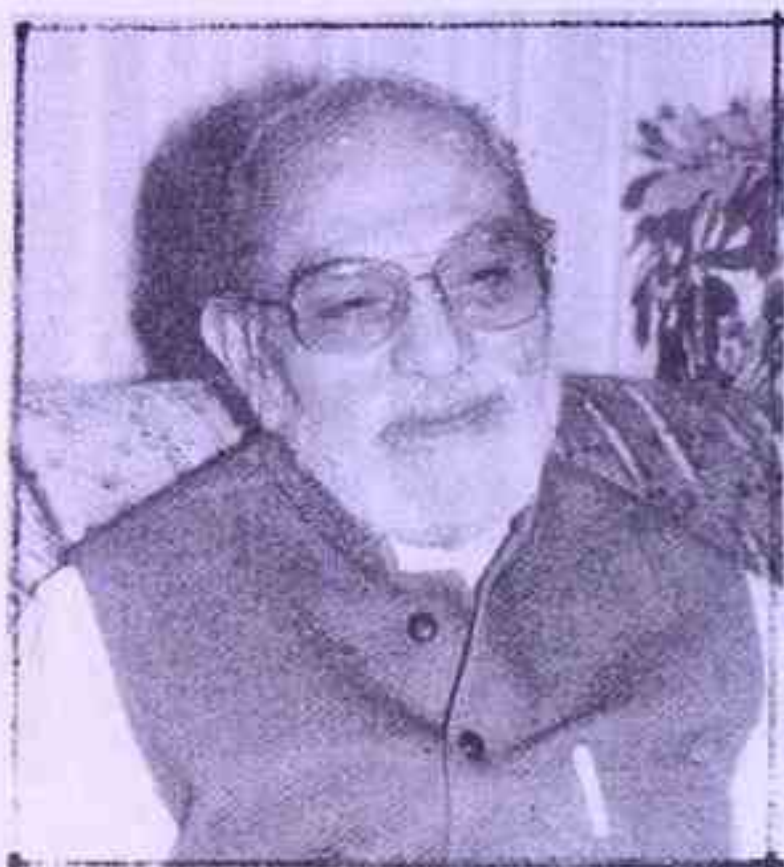
کتنا دشوار ہے اب رنگِ بہاراں رکھنا
زخم کے پھول کھلانا، انہیں خنداں رکھنا
دستِ ہنگامِ تغیّر میں نہ جانے کیا ہو
آئینہ رکھنا تو پتھر کا بھی امکاں رکھنا

خواجہ ریاض الدین عطش

Khawaja Riyazuddin Atash
4633 W. Madison St
APT# 3D SKOKLE - IL 60076 - U.S.A.

خواجہ ریاض الدین عطش

(شکاگو)

کچھ لوگ زندگی کو برتتے ہیں اور کچھ لوگوں کو زندگی برتتی ہے۔ خواجہ ریاض الدین عطش کا شمار بھی انہی لوگوں میں کیا جاسکتا ہے جنہیں زندگی نے برتا۔ ان کی زندگی مسلسل جدوجہد کی آئینہ دار ہے اور ان کی پوری شاعری اس کا پرتو ہے۔ اس کی سچی تصویر ہے۔ ان کا شعر ہے۔

میں مصور ہوں کہ شاعر مجھے معلوم نہیں
میرے اشعار ہیں جذبات کی تصویریں ہیں

ان کی زندگی بڑے نشیب و فراز سے گزری ہے۔ کبھی تیزی سے مہ و سال گزرے ہیں۔ کبھی چپ چاپ کہ ان کے گزرنے کا پتہ بھی نہ چلا اور انہوں نے بے ساختہ کہا۔

وہ عہد طفلی، وہ شباب کے دن، یہ دونوں مجھ سے بچھڑ گئے ہیں
مثال گرد سفر اڑے تھے، غبار بن کر بکھر گئے ہیں
شکستہ خاطر میں اپنے ماضی کے کھوئے لمحوں کو ڈھونڈتا ہوں
جو ایسے آئے گئے نہ جانا کہاں سے آئے، کدھر گئے ہیں

۴ مارچ ۱۹۲۵ء کو عظیم آباد کے علمی و ادبی گھرانے میں پیدا ہونے والے خواجہ ریاض الدین حسین کے والد سید رضی الدین حسین کلکتہ ہائی کورٹ میں مترجم تھے۔ بعد میں زمینداری کی دیکھ بھال کرتے رہے۔ عطش صاحب کے دادا حضرت خواجہ سید فخرالدین حسین سخن دہلوی حضرت اسداللہ خان غالب کے شاگرد تھے۔ ان کی تصانیف میں سروش سخن، تہذیب النفوس کی چار

جلدیں، 'ہنگامہ دل آشوب' 'تنبیہہ صفر' کے علاوہ اردو اور فارسی کے ضخیم دیوان بھی شامل ہیں۔ وہ ۱۸۸۷ء میں اٹھارہ سال کی عمر میں دہلی سے لکھنؤ آئے۔ کچھ عرصہ بعد آرہ منتقل ہوئے۔ تعلیمی مراحل طے کرکے وہ عظیم آباد میں صدر اعلیٰ مقرر ہوئے اور جج ہو کر ریٹائر ہوئے۔

جناب عطش کی شاعری کی ابتدا دوسری جنگ عظیم سے کچھ قبل ہوئی۔ خواجہ عطش میٹرک کے بعد فوج سے وابستہ ہوگئے۔ اسی دوران رائل انڈین آرمی ایجوکیشنل کارپوریشن سے انٹر اور پھر بی۔اے کیا۔ اس زمانے میں بہار میں ہندو مسلم فسادات پھیلے ہوئے تھے۔ انہیں حکومت ہند کی جانب سے محکمہ جنگلات میں اسسٹنٹ رینجر کی ملازمت کی پیشکش ہوئی لیکن یہ اسے مسترد کرکے کلکتہ جاکر ایک انگریز کمپنی میں ملازم ہوگئے۔ ملازمت چھوڑ کر کاروبار بھی کیا لیکن اپنی سادہ طبیعت کی وجہ سے نقصان اٹھایا۔ پھر پٹنہ آگئے اور پھر ہجرت کرکے اپنے اہل خانہ کے ساتھ ڈھاکہ آگئے۔ یہاں بھی ملازمت اور کاروبار کا سلسلہ چلا۔ ۱۹۶۰ء میں سخت بیمار ہوئے۔ دو بڑے آپریشن ہوئے۔ مالی نقصان بھی ہوا۔ پھر ۱۹۶۳ء سے ۱۹۷۱ء تک مشرقی پاکستان واپڈا کی ملازمت میں سینئر آفیسر اور منیجر رہے۔ سقوط مشرقی پاکستان کے دوران کراچی آئے اور گدو تھرمل پاور پروجیکٹ سے وابستہ رہے۔ ۱۹۷۷ء میں ایک کمپنی کے جنرل منیجر ہو کر سعودی عرب چلے گئے۔ آٹھ سال وہاں گزارنے کے بعد ۱۹۸۴ء میں ناسازی طبیعت کی بناء پر کراچی واپس آگئے۔ پھر پاکستان سے ہجرت کا مرحلہ طے کرکے امریکہ آئے اور اب شکاگو میں مقیم ہیں لیکن ان کا ایک گھر پاکستان میں بھی ہے۔

ان کی شاعری کی ابتدا ۱۹۳۸ء سے ہوئی۔ ابتدا ہی سے انہوں نے غزلیں بھی کہیں اور نظمیں بھی۔ قدیم اور جدید شعراء کا بھرپور مطالعہ کیا چنانچہ ان کے کلام میں دونوں رنگ ملتے ہیں۔ لیکن کبھی بھی روایتی ڈگر پر نہیں چلے نہ کسی کا رنگ اختیار کیا۔ اپنی الگ راہ بنائی اور اسی پر گامزن ہیں۔

کہتے ہیں شاعری قدرت کا عطا کردہ بے بہا عطیہ ہے جو شاعر کا فطری عمل بنتا ہے اور اس کی سوچ کا محور۔ خواجہ عطش کہتے ہیں شعر اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے کہا جاتا ہے۔ شعر ہی وہ پیغام محبت ہے جس کے لئے جگر نے کہا ہے کہ "جہاں تک پہنچے" جو بات نثر میں کہی جاسکتی ہے اسے شعر میں نہیں کہنا چاہئے۔ اس لئے کہ نثریات کے پھیلاؤ کو کہتے ہیں اور نظم اس پھیلاؤ کو سمیٹ کر مختصر کرنے کو کہتے ہیں۔ شعر اپنی جگہ قلم رو ہوتا ہے اور نثر اس کی محکوم۔

شاعری ذات کی عکاس ہوتی ہے اس ضمن میں سیمول ٹیلر کا مقولہ دہراتے ہیں جس نے کہا کہ "مصوری کی تخلیق میں موضوع سے زیادہ وہ خود مصور کی اپنی تصویر ہوتی ہے جس نے تصویر

کو تخلیق کیا ہے"۔ یہی کیفیت تمام فن پر لاگو آتی ہے اور یہ ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ تخلیق میں اس کے خالق کی جھلک نمایاں ہوتی ہے۔ تخلیق شعری بھی ایک پر اسرار قدرتی واردات ہے جو چند لوگوں کو ودیعت کی جاتی ہے اور ان چند لوگوں کے چند لمحات ہیں جو اس سے فیضیاب ہوتے ہیں اور ترجمانی محض ذاتی زندگی کی ترجمانی نہیں ہوتی نہ ہی اس سے آفاقی شاعری جنم لیتی ہے۔ شاعر تو واردات عالم کو اپنے نقطۂ نظر کے الگ الگ رنگوں اور خوشبوؤں میں دیکھتا اور محسوس کرتا ہے۔ اس کے دل ودماغ کی ازلی تشنگی اور بے چینی رگ جاں میں بے چین اور بے قرار رہتی ہے جو شعر کی شکل میں وارد ہو کر وجود میں آتی ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ "مشاہدہ اور تجربہ جتنا گہرا ہو گا۔ جذباتی دباؤ جس قدر شدید ہو گا شاعری میں اس کا عکس اتنا ہی گہرا ہو گا۔ اردو شاعری کا موجودہ دور اہل فکر و نظر کا دور یا عہد کہا جا سکتا ہے۔ دور جدید کی شاعری اپنے تمام تر اختلافات کے ساتھ ایک مشترک روح رکھتی ہے۔" چنانچہ انہوں نے بھی نئے ادب کی افادیت کے پہلوؤں کو اپنے رجحان میں سمیٹا اور سمو دیا ہے لیکن عطش صاحب پرانے ادب کے خزانے کو ملیامیٹ کرنے کے حق میں بھی نہیں ہیں ورنہ ادب کا بہتا دریا خشک ہو جائے گا۔ بے شک آج کے شعری ادب کی ضرورتیں آج ہی کی شاعری پورا کر سکتی ہے۔ مگر گزرے ہوئے کل سے منکر بھی نہیں ہوا جا سکتا۔

تنقید کے حوالے سے کہتے ہیں کہ یہ صرف رائے دینے کا نام نہیں ہے نہ ہی زبان اور فن کے بارے میں خارجی فہرست مرتب کر کے دامن چھڑایا جا سکتا ہے۔ تنقید وہ ہے جو شاعر کے وجدانی شعور کو کھول کر رکھ دے۔ اس کے اقتباسات جذبوں اور بصیرت کو پیش کر دے۔ ناقد کی صرف رائے سے نہ بات بنتی ہے نہ بات ختم ہوتی ہے۔ ناقد کی ذمہ داری ہے کہ ایک خاص ضابطے کے تحت نہایت جچے تلے مثبت انداز میں تشریح کرے کیونکہ نقاد کی حیثیت ایک قاضی یا منصف سے کسی طرح بھی کم نہیں۔ چنانچہ نہ اسے طرف داری کرنی چاہئے نہ اختلاف۔ نہ اسے کسی کی ہجو کرنے کا حق ہے نہ رطب اللسانی کرنا ہے۔ وہ تو پتھر کا بنا ہوا ایک بیدار مغز شخص ہوتا ہے اور ادب کی دنیا میں اس کی حیثیت بہت عظیم اور بہت محترم ہوتی ہے۔

خواجہ عطش نے دوران گفتگو موتی رولے ہیں۔ انہوں نے بڑی خوبصورت بات کہی کہ علم کا نصب العین "انسانیت" کا فروغ ہے۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ یہ انسان کی انسانیت کو بیدار اور اجاگر کرے۔ جاہلیت' ناخواندگی اور ناتراشیدگی کی برائیوں کو دور کرے۔ انسانیت کو پروان چڑھائے' اور انسان میں پائے جانے والے تمام جوہری پہلوؤں پر غالب رہے۔ یہی جذبہ بڑی شاعری کو بھی جنم دیتا ہے۔ علم اور انسانیت لازم وملزوم ہیں۔ یہ وسیع وعریض کائنات کی ساخت

اور ترتیب اس بات کی نشاندہی کرتی ہے کہ یہ کائنات کسی خاص قوت جوہر کی مرہون منت ہے اور وہ قوت' طاقت جوہر علم ہے۔

اگست ۱۹۹۲ء میں ان کا شعری مجموعہ "سوغات جنوں" شائع ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے دو شعری مجموعے "جشن جنوں" جو نظموں پر مشتمل ہے اور "ورد نفس" (نعتوں کا مجموعہ) شائع ہو چکے ہیں۔ ایک کتاب "اردو کا نسب نامہ" بھی چھپی ہے جو تاریخ زبان اردو پر لکھی گئی منظوم تحقیقی تصنیف ہے جس میں ایک سو چالیس کتابوں کے حوالے ہیں۔ خواجہ عطش کے ہاں افسانوں کے دکھ درد کو محسوس کرکے ان کے جذبوں کی مختلف سطحوں اور پرتوں تک رسائی حاصل کرنے کی للک شدت سے پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری میں ایک مخصوص شاعرانہ لب ولہجے میں سیاسی' تہذیبی اور ثقافتی المیوں اور طربناکیوں کی داستان پائی جاتی ہے۔ اردو کی تاریخ پر ان کے مضامین نیویارک کے "اردو ٹائمز" اور لاس اینجلس کے "پاکستان لنک" میں سلسلہ وار چھپے ہیں۔ خواجہ صاحب جہاں رہے اردو کی بزم سخن قائم کی۔ اس کے تحت مشاعرے کراتے رہے اور اردو کے پودوں کی آبیاری میں تن من دھن سے لگے رہے۔ آج بھی وہ شکاگو کی ادبی محفلوں کی جان ہیں۔ خود کہتے ہیں اور میر کے لہجے میں کہتے ہیں۔

نوشت عدل بھی' عنوان انقلاب بھی ہے
مرا وجود صحیفہ بھی ہے کتاب بھی ہے

عکسِ فن

برق

وطن کی خشک زمینوں کو اُستوار کریں
رکھیں نہ یوں انہیں بے آب، آبدار کریں
تمام شعبوں کو بجلی کی اب ضرورت ہے
ہمارا فرض ہے حالات سازگار کریں
حدودِ شہر کی زینت گنیں نہ بجلی کو
وقارِ صنعت قومی کو بھی شمار کریں
جو اہل کار ہیں بجلی سے ہل چلاتے ہیں
ہم اپنے صنعتی شعبوں کو پائیدار کریں

متفرق اشعار

وعدوں پہ جو اللہ کے رکھتے ہیں بھروسہ
کشتی کو جلادیتے ہیں ساحل پہ اتر کر

○

دعائیں ابر و باراں کی ہوئی تھیں خانقاہوں میں
گھٹا لیکن ادھر اٹھی جدھر مے خانہ پڑتا ہے

○

نہ دلکشی کے دیے ہیں نہ روشنی کے چراغ
بجھے بجھے نظر آتے ہیں زندگی کے چراغ

عطیہ نیازی

اُڑائیگا نہ عطیہ بھی آج بے پر کی
ہجومِ دیدہ وراں ہے ذرا سنبھلیے گا

عطیہ نیازی

Atiya Niazi
3847 Tilden Ave
APT# 5 Colver City CA 90232 U.S.A.

عطیہ نیازی

(لاس اینجلس)

"سلطانہ مہر صاحبہ کی خواہش ہے کہ میں اپنے شعری سفر کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ چنانچہ عرض ہے کہ میں ہندوستان میں پیدا ہوئی۔ اتفاق سے وہی شہر' وہی محلہ' وہی گلی یعنی بلی ماراں گلی قاسم جان جہاں سے اسد اللہ خان مرزا غالب بن کر اردو شاعری کے افق پر چھا گئے اور میرے شاعری سے شغف نے اس اتفاق کو قابل صد احترام بنادیا اور میں بڑے فخر سے اس گلی کی وابستگی کا ذکر کیا کرتی ہوں۔

میری امی دہلی کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی ہیں ان کے نانا مولوی محمد ابراہیم دہلوی نہ صرف ایک نامور عالم دین تھے بلکہ ایک اچھے شاعر بھی تھے۔ انہوں نے تمام پیغمبران کے قرآنی قصوں کو منظوم کیا تھا ان کی کتابیں قصہ آدم' داستان یوسف' صبر ایوب' وغیرہ اپنے زمانے میں گھر گھر پڑھی جاتی تھیں اور خود میری امی بھی فرصت کے اوقات میں ہم سب بہن بھائیوں کو لے کر بیٹھ جاتیں اور گھنٹوں یہ قصے سنایا کرتیں اور ہم لوگ بڑی دلچسپی سے ان منظوم کہانیوں کو سنا کرتے تھے اور یوں شاعری کا جرثومہ یا Chip میرے دماغ میں بچپن میں ہی پیوست ہو گیا۔

میرے والد مرحوم علی گڑھ کے تعلیم یافتہ اور ایک اعلیٰ درجے کے مصور تھے۔ متعدد بین الاقوامی مقابلوں میں ان کی بنائی ہوئی تصاویر نے انعامات حاصل کئے۔ وہ نہایت باذوق' خوش مزاج اور دوست نواز انسان تھے۔ ان کے دوستوں میں رئیس احمد جعفری' بہزاد لکھنوی' سید ناصر جہاں' جالب' ناگی' چغتائی اور کرنل ملک مجید مرحوم شامل تھے۔ چونکہ یہ سب لوگ

ہمارے ہاں آتے جاتے تھے لہٰذا ان سب کو بہت قریب سے دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔ مجھے اب تک ان چھوٹی چھوٹی نشستوں کے منظر یاد ہیں جن کی وجہ سے میری شاعری کا جرثومہ جڑ پکڑ گیا۔ مجھے یاد ہے کہ میں گھنٹوں مرقع چغتائی لے کر بیٹھی دیکھتی اور پڑھتی رہتی تھی۔ چغتائی صاحب نے یہ بطور خاص میرے والد صاحب کو دیا تھا اور ایک بڑا سا نوٹ جس پر بدست خود دستخط کے ساتھ تحریر فرمایا تھا اور جب کوئی صاحب وہ اٹھا کر لے گئے تو ساری ڈانٹ مجھے پڑی کہ میں ہی سب سے زیادہ اس کو ہاتھ لگاتی تھی۔

میں نے اپنے لکھنے کا آغاز اخبار ''امروز'' کراچی کے بچوں کے صفحے سے کیا تھا اور کافی عرصہ تک نہایت پابندی سے حصہ لیا۔ مضمون نگاری ہو شاعری۔ مصوری ہو یا فوٹوگرافی' ڈرائنگ ہو یا پینٹنگ۔ میں ہر مقابلہ میں شرکت کرتی اور انعام حاصل کرتی۔ یہاں تک کہ ایڈیٹر صاحب نے میری شرکت پر یہ کہہ کر پابندی لگا دی کہ اب دوسروں کو بھی موقع دو۔

مجھے مڈل اسکول میں اردو کی جو استاد ملیں وہ ایک اچھی استاد بھی تھیں اور ایک اچھی شاعرہ بھی۔ نام خورشید بانو اور تخلص شمع تھا میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا اور ان کی صحبت میں رہ کر میری فنون لطیفہ سے دلچسپی بہت بڑھ گئی۔ میرا ان سے ایک قریبی تعلق تھا جو اب تک ہے۔ خورشید بانو شمع شاعرہ بھی ہیں۔

جب میں میٹرک میں تھی تو اس وقت بھی مجھے اردو ادب اور شاعری پڑھنے اور سمجھنے کے لئے اپنے وقت کے ایک عظیم شاعر میسر آگئے ان کا نام بہزاد لکھنوی تھا وہ ہمارے محلے میں رہتے تھے اور میرے ڈیڈی کے دوست تھے۔ ان کی بھانجی صفیہ سے میری بہت دوستی تھی۔ ان سے بھی میں نے بہت سیکھا۔ انہوں نے ہمیشہ میری ہمت افزائی کی اور ان کی راہنمائی سے مجھے شعر کہنے کا حوصلہ ہوا اور سلیقہ آیا۔ ۱۹۵۸ء میں' میں نے کراچی یونیورسٹی میں بی۔اے آنرز میں داخلہ لیا۔ فلسفہ اور سائیکولوجی میرے مضامین تھے۔ اساتذہ کے معاملے میں' میں ہمیشہ خوش قسمت رہی۔ جامعہ کراچی میں بھی مجھے بڑی بڑی ہستیوں سے فیضیاب ہونے کا موقع ملا جن میں ڈاکٹر منظور احمد' ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاری' ڈاکٹر ایم ایم احمد' فادر اے منڈو غیرہ شامل ہیں۔

تعلیم کے دوران میری شادی ہوگئی اور کچھ عرصہ بعد میں نے تعلیم مکمل کرلی۔ اس کے بعد اپنا سارا وقت گھریلو ذمہ داریوں اور بچوں کی دیکھ بھال میں لگا دیا کیونکہ بزرگوں نے ہمیشہ یہ نصیحت کی کہ شادی کے بعد عورت کی سب سے بڑی اور عظیم ذمہ داری گھر اور بچے ہوتے ہیں باقی مصروفیات ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ میں نے بزرگوں کی نصیحت پر عمل کیا یہاں تک کہ آئل پینٹنگ تک چھوڑ دی جو کہ میرا محبوب مشغلہ تھا۔

عطیہ نیازی

دس سال بعد یعنی ۱۹۷۰ء میں، میں نے دوبارہ پڑھنا شروع کیا۔ مونٹیسوری کا ڈپلومہ لیا اور مسز مینوالا کے اسکول میں کچھ عرصہ پڑھایا پھر جب بچے بڑے ہوگئے تو پھر ایک بار دل شاعری کی طرف مائل ہونے لگا۔ لیکن چونکہ درمیانی وقفہ کافی طویل تھا لہٰذا ایک طرح کی **جھجھک** سی محسوس ہونے لگی اور میں نے اپنی شاعری بیاض تک محدود کرلی۔

۱۹۸۰ء میں پاکستان میں علاقائی، لسانی اور فرقہ وارانہ جھگڑے فساد کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا جو کہ آج کل اپنے عروج پر ہے۔ ان دنوں میری شاعری میں پھر ابال آنے لگا اور ایک قومی نغمہ موزوں ہوا۔ ایک اسکول کے پروگرام میں سنایا تو اس قدر ہمت افزائی ہوئی کہ وہ جو **جھجھک** پیدا ہوگئی تھی، ختم ہوگئی۔ میری بڑی خواہش تھی کہ میرا یہ نغمہ اخبار جنگ میں شائع ہو۔ میں بذات خود جنگ کے دفتر میں مرزا سلیم بیگ کے ہاتھوں میں کئی مرتبہ اپنا نغمہ دے کر آئی لیکن میری یہ خواہش پوری نہ ہوئی لیکن پھر شفیق کے ایک دوست کرنل مہدی جو کہ ایک معروف جرنلسٹ بھی ہیں، انہوں نے "نوائے وقت" میں شائع کروادیا۔ یہ نغمہ میں نے جب اپنے استاد نثار بزمی صاحب کو دکھایا تو انہوں نے بھی بے حد پسند کیا اور اس کی ایک خوبصورت دھن بنا کر سکھائی اور ساتھ ہی ساؤنڈ ٹریک بھی بنا کر دیا تاکہ جب میں یہ نغمہ سناؤں تو موسیقی میرا ساتھ دے۔

۱۹۸۷ء میں، میں امریکہ آگئی اور یہاں لاس اینجلس میں یوم آزادی کے موقع پر یو۔ایس۔ سی میں یہ سنایا تو یہاں لوگوں نے دل کھول کر داد دی اور میری اتنی ہمت افزائی کی کہ میں اس پر فخر کرتی ہوں۔ پھر میری ملاقات نیر آپا سے ہوئی۔ یوں میں نے مشاعروں میں باقاعدہ حصہ لینا شروع کیا۔ اس طرح میری شاعری کا ایک نیا دور شروع ہوگیا۔

خدا کا شکر ہے کہ ہمارے لاس اینجلس کا موسم نہایت شاعرانہ ہے اور اچھے اچھے شعراء کی ایک بڑی تعداد یہاں موجود ہے جن کے دم قدم سے اردو شاعری کا گلستان مہک رہا ہے۔ میں فخر اور تشکر سے یہ کہہ سکتی ہوں کہ نیر آپا، رحمٰن صدیقی، شیم رحمٰن، شیم رجز، مہرالنساء مہر اور سلطانہ مہر جیسے پائے کے شعراء کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی میں میں نے بہت سیکھا ہے اور آئندہ بھی سیکھوں گی۔ ان سب کی شفقت اور خلوص نے میری ذات کو ایک اعتماد بخشا ہے۔ جس کے لئے میں ان سب کی ممنون ہوں۔ پاکستان اور ہندوستان سے باہر جس قدر شعراء آباد ہیں اور جس قدر اور جس معیار کا کام وہ سب لوگ کر رہے ہیں۔ چنانچہ اگر یہ کہنا غلط ہے کہ "اردو کے مستقبل کے لئے یہ سب ناکافی ہے" تو کم از کم یہ بات تو یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ ان تمام شعراء اور ادیبوں کے دم سے اردو کو ختم کرنے کی سازش یا اردو کے مستقبل سے ناامیدی کا

عنصر یقیناً ختم ہو گیا ہے اور مایوسی کے بادل چھٹتے نظر آتے ہیں۔

جہاں تک ادب برائے ادب اور ادب برائے زندگی کی بحث ہے میرا خیال ہے کہ دونوں کے اپنے اپنے فائدے ہیں۔ ادب برائے زندگی میں ادب کی نشوونما کی رفتار میں کمی آتی ہے کیونکہ مادیت میں وہ چاشنی نہیں ہے جو خیالات کے پرواز کی وجہ بنتی ہے اور دوسری طرف ادب برائے ادب میں یہ کمی رہ جاتی ہے کہ اس سے مستفیض ہونے والوں کی تعداد بہت کم رہ جاتی ہے کیونکہ صنعتی ترقی کے بعد لوگوں کے پاس پڑھنے پڑھانے کا بہت کم وقت رہ گیا ہے۔

اور آخر میں، میں اپنے شوہر شفیق نیازی کا ذکر کرنا چاہوں گی جنہوں نے ہمیشہ اور میرے ہر شوق میں مجھے نہ صرف حصہ لینے کی آزادی دی بلکہ ہر طرح معاونت کی۔ اگر وہ میرے شوہر نہ ہوتے تو میں ان سے کچھ زیادہ ہی سیکھتی۔ مگر وہ جو مشہور ہے "ٹیڑھے ٹیڑھے اڑنے" والی بات وہ درست ہے۔ ان کی تحریر میں اپنے والد ظفر نیازی کی سی کاٹ ہے اور میں کوشش کرتی ہوں کہ ان کی طرح لکھوں۔ کیونکہ بہرحال وہ کراچی پاکستان کے ماہنامہ "نقاد" کی برسوں ادارت بھی کرتے رہے ہیں۔ ان کا طرز سخن میں کہاں سے لاؤں کہ اس کے پیچھے ایک طویل عرصہ کا تجربہ بھی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی اپنی دین سے محروم نہیں رکھا سو میں اس کی بھی ہر سانس کے ساتھ شکر گزار ہوں۔

آج کل میری توجہ فیشن ڈیزائننگ پر ہے، جو میرا شوق بھی ہے اور میرا فن بھی۔ میں نے یہاں اس میں لاس انجیلس ٹریڈ ٹیکنیکل کالج سے گریجویشن بھی کیا ہے۔ اب میں فیشن ڈیزائننگ کے اعلیٰ ترین کورسز کمپیوٹر پر کر رہی ہوں۔ میں اپنی ٹیچرز کی بہت عزت کرتی ہوں۔ ان کی دعائیں میرے ساتھ ہیں۔ میرے ڈیزائن کئے ہوئے لباس پہن کر امریکن فیشن ماڈلز پریڈ کرتی ہیں تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے مشاعرے میں میری غزل پر داد دی جا رہی ہو۔ اس آرٹ اور کرافٹ میں میری دلچسپی بہت زیادہ ہے۔ شاید اسی وجہ سے شعر گوئی میرا ارادی مشغلہ کبھی نہ بن سکی، یعنی اشعار آج بھی اپنی مرضی سے آتے ہیں تو غزل ہو جاتی ہے۔ اگر فوراً قلم بند نہ کرلوں تو فضا میں تتلیوں کی طرح اڑ جاتے ہیں۔ مجھے کوئی خاص افسوس بھی نہیں ہوتا، کیونکہ جب طبیعت موزوں ہوتی ہے تو اشعار اتنے برستے ہیں کہ میرا دل بھر جاتا ہے۔ میری شاعری میرے لئے اپنے آپ سے باتیں کرنے کا خوبصورت اور مترنم ذریعہ ہے۔ دوسروں سے رابطے کے لئے خطوط نویسی میرے اظہار خیال کا دوسرا بڑا ذریعہ ہے۔

فن شاعری کے اصول علم ریاضی کی طرح اٹل ہیں۔ انہیں دریافت کیا جا سکتا ہے، ایجاد نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً علامہ اقبالؒ کو بھی شاعری کی ٹیکنیک کا اتنا ہی احترام کرنا پڑا جتنا مجھے کرنا

پڑتا ہے۔ یہاں تک کہ آزاد شاعری میں بھی چند اصولوں کی سختی سے پابندی کرنی پڑتی ہے۔ جو شاعر فن شاعری کا احترام نہیں کرتا وہ احمقوں کی جنت میں رہتا ہے۔ اسے لوہے کے چنے نہیں چبانے پڑتے یہاں تک کہ تعلیم بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

شاعری میں فنی مہارت کے بعد حسن اظہار بنیادی شرط ہے۔ یہ حسن اظہار سادگی وبیان میں پوشیدہ ہے۔ میں نے دیکھا ہے کہ جنہیں زبان پر عبور ہوتا ہے وہی لوگ مشکل بات کو آسان الفاظ میں بیان کرسکتے ہیں اور مشکل الفاظ کے پیچھے چھپنے والے بچارے "ادیب اور شاعروں" پر ترس آتا ہے۔

اسی طرح کچھ لوگ تازہ مشہور شعراء کے چبائے ہوئے الفاظ اپنے فن میں استعمال کرتے ہیں اور اپنے اس عمل کو شاعری سمجھتے ہیں، وہ بھی قابل رحم ہیں۔ کسی شاعر سے متاثر ہونے کے یہ معنی نہیں کہ ہم مکھی پہ مکھی مارنے لگیں۔ ہم کو اپنی انفرادیت کا بھی احترام کرنا چاہئے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ ایک ہی زمین میں اساتذہ نے بھی غزلیں کہی ہیں لیکن اپنی انفرادیت کو برقرار رکھا۔

میں اپنی شاعری پر تین ذمہ داریاں عائد کرتی ہوں۔

۱۔ اپنے خیالات سادہ زبان میں نظم کروں۔

۲۔ شاعری کے آرٹ اور کرافٹ، دونوں کو اہمیت دوں۔

۳۔ (مشاعرے میں) سخن فہموں کے حسن سماعت کا بھی خیال رکھوں۔

اس آخری اہتمام کو بعض خوش فہم شعراء اختیاری معاملہ سمجھتے ہیں۔ ایسے شعراء اچھے شعر بھی پیش کرتے ہیں تو ایسے جیسے کوئی خاتون دعوت کا اہتمام کرے۔ بہترین کھانے پکائے لیکن مہمانوں کے سامنے غیر مہذب انداز میں پیش کردے"۔

جو تھک کے بیٹھ رہے گا اسے کچل دے گا
رُواں دُواں یہ جہاں ہے ذرا سنبھلیے گا
اُڑائے گا نہ عطیہؔ جی آج بے پر کی
ہجومِ دیدہ وَراں ہے ذرا سنبھلیے گا

عطیہ نیازی

عکسِ فن

پاکستان کی بیٹیوں کا قومی نغمہ

میں پاکستان کی بیٹی ہوں بنتِ پاکستان ہوں
میں پاکستان کی بیٹی ہوں اور ہر صوبے کی آن ہوں
میں سندھی ہوں نہ پنجابی نہ بلوچ اور پٹھان ہوں
میں پاکستان کی بیٹی ہوں میں بنتِ پاکستان ہوں

○

داتا کی نگری سے حضرت تجّل سَرمَست کے ڈیرے تک
مزدور مزارِع سے تاجر، سردار نواب وڈیرے تک
یہ پرچم سب کی چادر ہے اور میں اس پر قربان ہوں
میں پاکستان کی بیٹی ہوں میں بنتِ پاکستان ہوں

○

ناپاک ارادوں کا سایہ میری سرحد تک کیوں آیا
چادر سے چاردیواری تک ہر ویر جیالا رکھوالا
میں خود اک شعلہ جوالا، دشمن پر کڑی کمان ہوں
میں پاکستان کی بیٹی ہوں میں بنتِ پاکستان ہوں

○

ساری دنیا میں خوشحالی کی کوشش ہردم جاری ہے
پھر بھوک جہالت بیماری کیوں میرے دیس پہ طاری ہے
اب ان سے جنگ ہماری ہے اور میں اس کا اعلان ہوں
میں پاکستان کی بیٹی ہوں میں بنتِ پاکستان ہوں

○

استاد ابراہیم العریض عنایت

انس بھی گردش میں ہیں سب ہی طواف میں
ہے تو خدا کا گھر یہ وہ ملتا ہے کم وہیں

بحرین

٢٦/٩/٩٥ء

(ابراہیم العریض عنایت)
Usad Ebrahim -ul-Urriyed Enayat
C/O Mr.Shahid Ali Khan
P.O.Box 26572 MANAMA - BAHRAIN

استاد ابراہیم العریض عنایت
(بحرین)

۱۹۷۸ء میں میری کتاب سخن ور (حصہ اول) کی افتتاحی تقریب بحرین میں منعقد ہوئی۔ اس سلسلے میں سمیع خان صاحب، نور پٹھان صاحب، مجتبیٰ صاحب، سعید قیس صاحب، شاہد علی خان صاحب اور ملک صاحب مرحوم سرگرم عمل تھے۔ انہی صاحبان کی کوششوں سے وہ یادگار محفل منعقد ہوئی تھی۔ استاد ابراہیم العریض صاحب جو عنایت تخلص کرتے ہیں، مہمان خصوصی تھے۔ میں ان سے پہلی بار ملی تھی۔ یہ ان کا خلوص اور ان کی شفقت تھی کہ میں انہیں بھول نہ سکی۔ چنانچہ سخن ور حصہ دوم کے لئے میں نے شاہد بھائی کو زحمت دی کہ وہ استاد کا تعارف حاصل کریں۔ میں شاہد بھائی کی شکرگزار ہوں کہ ان کی کاوشوں سے آج سخن ور کے قارئین کے لئے میں یہ تعارف کتاب میں شامل کر سکی ہوں۔ تعارف ملاحظہ ہو۔

استاد ابراہیم العریض صاحب ۱۹۰۸ء میں شہر بمبئی بھارت میں پیدا ہوئے اور میٹرک تک تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۲۲ء میں علی گڑھ یونیورسٹی کے طالبعلم رہے۔ بحرین تشریف لاکر ۱۹۲۶ء سے ۱۹۲۷ء تک محکمہ تعلیمات میں رہے۔

۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۲ء تک اپنے قائم کئے ہوئے اسکول کو چلایا۔ ۱۹۳۷ء سے ۱۹۶۷ء تک انٹرنیشنل پیٹرولیم کمپنی کے جنرل سیکریٹری کے معتمد خاص رہے۔ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۵ء تک آل انڈیا ریڈیو کے عربی سیکشن کے مترجم رہے۔ ۱۹۷۲ء میں بحرین کی دستور ساز اسمبلی کے اسپیکر منتخب ہوئے اور وہاں کا دستور تیار کیا، ۱۹۷۴ء سے وزارت خارجہ کے سفیر مقرر ہوئے اور ابھی تک اسی عہدے پر فائز ہیں۔

عربی کے شاعر ہونے کی حیثیت سے چار مجموعہ کلام طبع کرائے۔ العرائس "قبلتان" "شموع" اور "ارض الشہداء" عربی نقد و تحلیل میں "اشعر والفنون الجمیلہ" ۱۹۴۶ء قضیتہ ۱۹۵۳ء اور فن المتنبی بعد الف عام ۱۹۶۳ء مشہور کتب ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں رباعیات عمر خیام کے ترجمے کا پہلا ایڈیشن شائع کرایا جس کا نام رباعیات الخیام تھا اس کا چوتھا ایڈیشن ۱۹۸۴ء میں نکلا ۱۹۸۸ء میں دولت بحرین نے تمغہ افتخار سے نوازا' ۱۹۸۹ء میں مجلس تعاون الخلیج نے مزید تمغہ افتخار عطا کیا۔ آپ اردو میں بھی شاعری کرتے ہیں۔ آپ کا دیوان گلباری طبع ہو چکا ہے۔ آپ کی عربی شاعری محتاج تعارف نہیں ہے آپ چونکہ ۱۹ سال ہندوستان میں رہے اس لئے ان کا عربی نژاد ہوتے ہوئے بھی اردو کو نوازنا اردو پر احسان کرنے کے مترادف ہے۔ استاد کے متعلق شاہد بھائی کہتے ہیں کہ:

"استاد ابراہیم العریض عنایت سے میری ملاقات اب تقریباً تیس سال پرانی ہو چکی ہے۔ ۱۹۶۰ء میں کسی دکان میں کچھ خریدتے ہوئے کسی صاحب نے بڑے شائستہ' لکھنوی لہجے میں مجھ سے کچھ پوچھا۔ "میں نے حیرت زدہ ہو کر اس پاس دیکھا تو مجھے وہاں کوئی شخص لکھنوی انگرکھے' سفید چکن کی دوپلی ٹوپی میں نظر نہ آیا۔ پھر دوبارہ وہی سوال ہوا اس بار میری نگاہیں ایک ایسی شخصیت پر جمی رہ گئیں جو خالص عربی لباس میں ملبوس' شیریں' اردو لہجے میں یہ سوال کر رہی تھی۔ چہرے پر متانت تھی اور ان کے انداز و اطمینان سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ انہیں میری اس حیرت پر کوئی حیرت نہیں ہے۔ شاید اس سے پہلے بھی' وہ اپنے صاف شفاف اردو لہجے میں سوال پر لوگوں کو بھونچکا ہوتے دیکھ چکے تھے۔ میں نے مودبانہ ان کے سوال کا جواب دیا اور اس کے بعد ہی مجھے عوام سے معلوم ہوا کہ استاد العریض ادب و سخن کے لحاظ سے بحرین کی نامی گرامی شخصیت ہیں۔

چونکہ بحرین میں ۱۹۵۹ء میں وارد ہونے کے بعد ہی راقم الحروف نے شعر و ادب کی محافل یا شعری نشست منعقد کرنے کے امکانات پر معلومات حاصل کرنا شروع کردی تھیں' لہٰذا العریض صاحب کی ذات میں مجھے ایک ایسے پل کی صورت نظر آئی جو عربی اور اردو داں' دونوں طبقات کا درمیانی فاصلہ پر کر سکتا تھا اور بعینہ ایسا ہی ہوا۔

استاد العریض کا کلام فلسفیانہ نکات سے پر ہے۔ اس میں اکثر ملت کے لئے پند و نصائح اور باہمی محبت و اتحاد کی طرف اشارے ملتے ہیں۔ ان کا کلام ایسے دل کے احساس کا مظہر ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے سود زیاں سے شناسا کیا ہو اور جس کو ملت کی سرفرازی سے خوشی اور زیاں سے رنج پہنچا ہو۔ ان کے کلام میں نئی تہذیب کے نقائص اور اس کی اندھی پیروی پر طنز بھی وافر مقدار میں ملے گا۔ خاص طور پر اس طبقے پر جو مغربی رسم و رواج کی نقل صرف اس لئے کرتا ہے کہ وہ خود

ماڈرن کہلا سکے۔ اس میں وہ افعال، حرکات و سکنات بھی شامل ہیں جو احساس کمتری کی بناء پر سرزد ہوتے ہیں گو مخرب اخلاق ہیں۔ استاد ابراہیم العریض نے مشہور شاعر عمر خیام کی رباعیات پر اہم تحقیق کام کیا اور پھر وہ رازہائے سربستہ اس سلسلے میں منظر عام پر لے کر آئے کہ تمام دنیا نے عام طور پر اور عربی ادب کی دنیا نے خاص طور پر آپ کا لوہا مان لیا۔ آپ نے عمر خیام کی رباعیات کا عربی میں ترجمہ کیا جو **"رباعیات الخیام"** کے نام سے مشہور و معروف ہے۔ اس کے علاوہ عربی شاعری اور ادب پر متعدد کتب لکھ چکے ہیں جو تمام عربی دنیا میں کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔

بقول خود استاد ابراہیم العریض کے وہ بنیادی طور سے عربی زبان کے شاعر ہیں چونکہ ولادت سے لے کر انیس سال کی عمر تک وہ ہندوستان میں رہے اور تعلیم کے زمانے کا کافی عرصہ وہیں گزرا۔ ۱۹۲۶ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں طالبعلم رہے۔ اس لئے اردو زبان سے ان کا تعلق عام طور پر لسانی سطح تک رہا اور عوام سے ملنے جلنے میں ابتدائی دور میں یہی زبان زیر استعمال آئی۔ ان کی مادری زبان دراصل عربی زبان ہی ہے۔ لہٰذا ان کی اردو شاعری کو ناقدانہ زاویے سے دیکھنا، اور ان کے الفاظ کی بندش و تراکیب، کی موشگافی کرنا مناسب نہ ہوگا۔ عربی کے استاد اور عرب نژاد ہونے کے باوجود اپنے خیالات کو اردو زبان میں پیش کرنا دراصل اردو زبان پر احسان کرنے کے مترادف ہے۔ ہمارے لئے ان کا جذبہ اظہار ہی دراصل قابل احترام اور لائق تبریک ہے جس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔

میں نے پوچھا کہ شعر گوئی کے لئے کونسی کیفیت یا جذبہ آپ کے لئے سب سے بڑا محرک ہوتا ہے؟ تو بولے

ہر شاعر کا اس سلسلے میں الگ الگ زاویہ نظر ہے کسی شاعر میں پھولوں کو دیکھ کر جذبہ شعر و سخن ابھرتا ہے۔ کوئی بہتے ہوئے پانی کے ترنم سے متاثر ہوتا ہے۔ کوئی خوبصورت حسین شکل دیکھ کر اشعار لکھنے پر قائل ہوتا ہے۔ کوئی مئے ناب کے نشے میں وقف ہو کر اشعار لکھنے پر مائل ہوتا ہے۔ میں بذات خود صبح سویرے کے مناظر سے متاثر ہوتا ہوں۔ جب طیور صبح صبح چہچہانے لگتے ہیں۔ ہوا میں اک تازگی کا احساس ہوتا ہے۔ شبنم، سبزے پر موتیوں کا منظر پیش کرتی ہے۔ ہر شے تر و تازہ توانا اور آنے والے دن کو ہشاش بشاش انداز میں گزارنے کا ارادہ رکھتی نظر آتی ہے۔ آفتاب مشرق میں ابھر کر اپنے زیر نگیں خطہ ارض پر نگاہ ڈالتا ہے اپنی اقلیم کا جائزہ لیتا ہے۔ ان ہی تاثرات سے میرے ذہن میں شعریت کروٹ لیتی ہے اور ذہن اظہار احساسات کے لئے الفاظ کو ٹٹولنے لگتا ہے۔ ذہن میں ایک موضوع جنم لیتا ہے اور سب سے پہلے ایک مصرع وجود میں آتا ہے جو اس موضوع کی نشان دہی کرتا محسوس ہوتا ہے پھر جانو کہ اشعار کا چشمہ پھوٹ پڑتا

ہے بعض اوقات خیالات اور اشعار کی آمد کی رفتار اتنی تیز ہوتی ہے کہ قلم اسکا ساتھ نہیں دے سکتا اور میں اشعار کو صفحہ قرطاس پر قلم بند نہیں کر سکتا۔ لہٰذا میں پہلا اور تیسرا شعر لکھ دیتا ہوں پھر واپس دوسرے اور چوتھے مصرعے کی طرف جاتا ہوں اور ان کو تحریر کر دیتا ہوں یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہتا ہے۔ نظم یا غزل پوری ہونے کے بعد اس پر نظرثانی کرتا ہوں' کاٹ چھانٹ کرتا ہوں الفاظ کی نوک پلک درست کرتا ہوں۔ اشعار کی ترتیب کا جائزہ لیتا ہوں اور اس طرح بالآخر وہ نظم مکمل ہو جاتی ہے۔

میرا فلسفہ شاعری یہ ہے کہ شاعر جو لکھے وہ حقیقت (Truth) اور صرف حقیقت پر مبنی ہو اگر شاعر کے کسی بیان میں غیر حقیقت کی آمیزش ہے تو حقیقت اپنے اصلی روپ میں نہیں نظر آئے گی جیسے کہ اگر کسی دوشیزہ کے چہرے کو نقاب نے چھپایا ہوا ہو تو اس کے حسن کی تابناکی کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔

اسی لئے جب میں اپنے اشعار پر نظرثانی کرتا ہوں تو امر کا متلاشی ہوتا ہوں کہ کیا میں نے حقیقت اور صرف حقیقت کا اظہار کیا ہے؟ اگر نہیں تو پھر اس میں آمیزش یا ملاوٹ کو علیحدہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ عمل نظم مکمل کرنے کے بعد بھی کیا جا سکتا ہے لیکن ناگزیر ہوتا ہے عربی زبان میں اسے "الحقیقت العاریہ" یعنی "برہنہ حقیقت" کہتے ہیں۔

میرا اگلا سوال تھا کہ کیا شاعری کا معیار رفتہ رفتہ گرتا جا رہا ہے اور لوگوں کی دلچسپی اس میں کم ہوتی جا رہی ہے؟

انہوں نے فرمایا کہ شاعری ایک مخصوص صفت ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت کی جاتی ہے۔ آپ اس کو Aristocratic Character بھی کہہ سکتے ہیں ہر شخص کو اس صلاحیت سے نہیں نوازا جاتا۔ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ اس خوبی سے نوازتا ہے وہ لوگ اپنی وجدانی کیفیت کے دوران بڑے خوبصورت خیالات کی تخلیق کرتے ہیں اور خیالات کو قلمبند کر کے عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ لوگ ان کو پڑھ کر جھوم جھوم اٹھتے ہیں۔

پرانے زمانے میں شعراء زبان کی ماہیت کا علم' عروض و قواعد' الفاظ کی صحیح تراکیب اور اس سے وابستہ علوم کا بخوبی اور عمیق مطالعہ کرتے ہیں۔ محاوروں' ضرب الامثال کے بنیادی استعمال کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ الفاظ کا ذخیرہ ان کے ذہن میں وافر مقدار میں ہوتا تھا۔ لہٰذا ان کے قلم سے وہ اشعار' غزلیں اور نظمیں ہوتی تھیں جو زبان زد خلائق ہو جاتی تھیں۔

فی زمانہ وہ لوگ جن میں اشعار کہنے کی صلاحیت بھی ہے۔ مطالعے پر کم وقت صرف کرتے ہیں اس لئے ان کے ذہن کو جلا نہیں ملتی۔ ٹیلی ویژن' ویڈیو' کمپیوٹر ہر شخص کا کافی وقت لے لیتے

ہیں۔ پھر اکتساب سامان عیش و عشرت کے لئے بھی ہر شخص کو کافی جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ برخلاف اس کے گزشتہ زمانے میں زندگی کی ضروریات کم تھیں، لوگ قانع تھے۔ عالم کی عزت اسکے علم پر مبنی تھی نہ کہ سامان آسائش پر اور آرائش کی نمائش پر۔ لہٰذا شاعری اور ادب کا معیار موجودہ زمانے کے معیار سے بلند تر تھا۔ آج کل جو کلام طبع ہو رہا ہے معیاری نہیں ہوتا اور موجودہ نسل جو اس کو پڑھتی ہے اس کا معیار اور بلندی خیال اسی سطح پر رہتا ہے جو موجودہ کتب رسائل اور جرائد میں ملتا ہے۔ لہٰذا اکثر موجودہ شعراء کو پڑھ کر قارئین میں وہ جوش وولولہ نہیں پیدا ہوتا جو قدیم شعراء کے کلام کو پڑھ کر ہوتا تھا۔

اس سوال کے جواب میں کہ مشرق الاوسط میں اردو کے فروغ کے لئے کیا کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ اردو شاعری دراصل فارسی شاعری سے خیالات مستعار کرتی ہے اور فارسی شاعری، عربی شاعری کی رہین منت ہے۔ فروغ اسلام کے زمانے میں عربی الفاظ بکثرت فارسی زبان میں داخل ہوئے یہاں تک کہ فارسی میں ۸۰ فیصد الفاظ عربی کے ہیں۔ اس بناء پر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو میں بھی ۸۰ فیصد الفاظ عربی سے متعلق ہیں۔ اس لئے مشرق الاوسط میں بسنے والے تمام لوگ عربی، عجمی، ہندی، پاکستانی وغیرہ براہ راست یا بالواسطہ اردو زبان کی لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔

جب بنیادی طور سے اردو زبان کی موافقت میں اتنے امور موجود ہیں تو اس زبان کو فروغ دینے کے لئے صرف تھوڑی سی اور کوشش کی ضرورت ہے ایک تو یہ کہ ہر شہر میں اردو کی کم از کم ایک لائبریری کھولی جائے جس میں اردو زبان سے متعلق مواد، مثلاً اردو زبان کی تواریخ، پرانے شعراء سے لے کر موجودہ زمانے کے مقبول اور مشہور شعراء کے دواوین، افسانہ نگاروں کی کتب، تاریخی ناول، تنقید و تحلیل، عروض و قواعد پر کتب موجود ہوں۔ مشاعرے تو گاہے گاہے شرق الاوسط کے شہروں میں ہوتے رہتے ہیں۔ اردو غزلیں گانے والے حضرات بھی کافی تعداد میں آتے ہیں جن کا گانا سننے کے لئے لوگ جوق در جوق جاتے ہیں۔

جو عرب لوگ اردو زبان سیکھنے کے خواہاں ہیں ان کو زبان کی تعلیم دینے کے لئے بھی اگر اردو مدارس میں سہولت مہیا کی جائے یہ بھی ایک مبارک اور اہم قدم ہوگا۔

علاوہ بریں اردو زبان کا وجود براعظم ہندوپاک اور دیگر اسلامی اور عربی ممالک کے درمیان ایک معاشرتی اور لسانی رشتے کے مترادف ہے یہاں کے بیشتر لوگ "زلف اردو" کے اسیر اور اس کے عاشق ہیں یہ رشتہ بہت مضبوط ہے وقت کا تقاضا ہے کہ اس رشتے کو مزید پائیدار بنایا جائے اور اس میں کمزوری یا جھول نہ آنے دیا جائے۔

عکسِ فن

متفرق اشعار

کھلتا وہ راز کیسے جو ہے سب پہ آشکار
آتے ہیں یوں تو غیب سے جاتے ہیں ہم وہیں

○

کس کی تلاش میں ہیں یہ سب، ہر طواف میں
ہے تو خدا کا گھر، پہ وہ ملتا ہے کم وہیں
ایمان سے ہے پارۂ دل خود جہاں نما
کھلتا ہے بن سجائے مقام حرم وہیں
ویسے تو ہر چمن میں عنایت کی یاد ہے
بادل گرج کے خوب کھلا، بھر کے دم وہیں

○

بزم میں شعر سے، تو کام چلا
بات دل کی مگر کھلی بھی نہیں

○

کیوں عنایت سے ہم نہ پوچھیں وہیں
جھوٹ اور سچ ہیں دو، یہ کیا سچ ہے
ہم جسے ڈھونڈتے ہیں تاروں میں
پاس سب کے ہے وہ، یہ کیا سچ ہے
آج جو کچھ دکھائی دیتا ہے
کل سے سنتے رہو، کہ کیا سچ ہے

غوثیہ سلطانہ

اصل میں حجاب ہے ورنہ سمجھتے ہیں ہم عشق
جذبۂ احساں کی آنکھوں میں بھر کر تو دیکھو

غوثیہ سلطانہ

آئے گی صبح رنگیلے سپنوں کے جھرمٹ میں رقصاں
اجنبی شہر میں آؤ تلاش کریں گے نئی صبح ہم

غوثیہ سلطانہ

Ghausia Sultana
4140 Bay Side Dr.
Hanover PK - IL 60103 - U.S.A.

غوثیہ سلطانہ
(شکاگو)

حیدر آباد دکن کی آغوش سے نکل کر ۱۹۸۳ء میں شکاگو کے سرد موسم میں بسنے والی غوثیہ سلطانہ زندگی کے ہر محاذ پر سرگرم ہیں۔ گھریلو زندگی ہو یا ادبی میدان ہو یا سماجی بہبود کا کام' غوثیہ ہر ایک کے دکھ سمیٹتی نظر آتی ہیں۔ اور یہ جذبہ جب شعر کی صورت میں ڈھلتا ہے تو یوں رقم ہوتا ہے۔

اک نئی صبح کریں گے سیاہی کے چہرے پہ رقم
اجنبی شہر میں روشن کریں گے نئی شمع ہم

غوثیہ نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے گریجویشن اور نظام کالج حیدر آباد سے اردو میں ایم اے کیا ہے۔ ساتھ ہی ہندی سبھا سے ہندی میں گریجویشن کیا۔ شکاگو سے ڈرافٹنگ' آرٹس اینڈ کرافٹس اور کمپیوٹر میں ڈپلوما لئے۔ طالب علمی کے زمانے سے لے کر اب تک اپنی سماجی و ادبی خدمات پر متعدد ایوارڈ لے چکی ہیں۔ ۱۹۶۷ء میں پہلا مضمون انہوں نے "رہنمائے دکن" کے لئے لکھا تھا۔ ۱۹۷۴ء سے افسانہ نگاری شروع کی۔ سماجی مسائل پر طنزیہ و مزاحیہ ریڈیائی خاکے دو سو کے قریب لکھ چکی ہیں۔ تین سو سے زائد دکنی محاوروں کا مجموعہ بھی جمع کیا ہوا ہے۔ مشہور ادیب سلیمان اریب پر مقالہ لکھا ہے۔ نچلا بیٹھنا آتا نہیں لہٰذا "زندہ دلان حیدر آباد" کے جڑواں ادارے "زندہ دلان شکاگو" کو جنم دیا اور اب اس کی کنوینر ہیں۔ مطالعہ ان کی ضروریات زندگی میں شامل ہے۔ انگریزی شعراء میں شیلے' کیٹس' بائرن اور ورڈسورتھ پسند ہیں اور اردو شعراء میں غالب' اقبال' میر' جوش' فیض' فراق اور ساحر کی رسیا ہیں۔ زندہ دلان

حیدر آباد کے مشاعروں سے وابستگی تھی اور شاعری سے دلچسپی لہٰذا ۱۹۸۷ء سے شعر کہنے کی ابتدا کی۔ کیونکہ نثر کی نسبت نظم اور غزل میں اپنے خیال و فکر کے اظہار کو زیادہ بہتر طور پر ادا کر سکتی ہیں۔

غوثیہ کا کہنا ہے کہ زندگی اجالوں کا شہر ہے۔ انسانی آنکھ میں دیکھنے کے ساتھ گہرائی تک جانے کی صلاحیت ہو تو کائنات میں ہر طرف قوس و قزح کے رنگ بکھرے نظر آتے ہیں۔ ایک سچا فنکار اپنے اطراف کے دکھ اور مسائل کو ان رنگوں سے آراستہ کرتا ہے۔ غوثیہ نظریاتی ادب و شاعری کی قائل نہیں۔ کہتی ہیں شاعر تو خود خالق ہے وہ اپنی دنیا آپ تخلیق کرتا ہے۔ شاعری میں وجدان ضروری ہے۔ وہ اقبال سے متاثر ہیں جن کی شاعری قدیم و جدید رنگ لئے ہوئے ہے۔ عشق اقبال کے شاعرانہ خیال میں محکم حقائق کا ذریعہ عقل نہیں بلکہ وجدان ہے، جو طاقت عشق کی بدولت انسان میں پیدا ہوتا ہے اور کہلواتا ہے کہ۔

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

یہی وجدان ہے، جو بڑی شاعری کو جنم دیتا ہے۔ یہی وجدان غالب کے ہاں بھی پایا جاتا ہے۔ غالب جیسے شاعر صدیوں میں ہی پیدا ہوتے ہیں۔

غوثیہ اس خیال سے متفق ہیں کہ ادب اظہار ذات اور کائنات دونوں ہے۔ فن ادب فنکار کا کل حیاتی رد عمل ہوتا ہے، جو کئی حیثیتوں میں ایک ادیب کی ذات میں یکجا ہوجاتا ہے۔ ادیب کے تحت الشعور میں دبی ہوئی ایک ذاتی کیفیت اظہار کی راہ اپناتی ہے۔ ورڈسورتھ کی شاعری دیکھئے جس کی فکر کی تڑپ اور کیفیت اس کی اپنی ذات سے نکل کر کائنات پر چھا جاتی ہے۔ ایسی شاعری ہی آفاقی شاعری کا درجہ پاتی ہے۔

غوثیہ گروہ بندی سے دور بے لاگ تنقید کو فن کا نکھار سمجھتی ہیں۔ ابلاغ کے لئے آسان زبان کا استعمال ضروری سمجھتی ہیں۔ اردو کے مستقبل سے پر امید نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ آج کے اردو بولنے والے ادیبوں اور شاعروں پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس زبان کی بقاء کے لئے عملی قدم اٹھائیں۔ اپنے بچوں تک اپنا ورثہ زبان منتقل کریں۔ صرف ادبی رسائل کی اشاعت سے کچھ نہ ہوگا۔ علمی ادبی محفلوں کا زیادہ سے زیادہ انعقاد کریں۔ اردو ڈراموں کو مقبولیت دیں۔ آج کی نئی پود جس نے انگریزی زبان ابتدا سے سیکھی ہے وہ بھی اردو فلمی گانوں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ۔

غوثیہ سلطانہ

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

چونکہ آج کے مشاعرے بھی کمرشیل ہو گئے ہیں لہٰذا بچوں کے لئے گھریلو شعری نشستیں منعقد کرنا چاہئیں جن میں وہ خود حصہ لیں اور ان کے ذوق کی چیزیں انہیں ملیں۔ انہیں بیت بازی سکھائی جائے تاکہ ان کا شعری ذوق نکھرے۔ اس سلسلے میں مزید معلومات کے لئے اس پتے پر رجوع کیا جا سکتا ہے۔

National Libarary of Poetry

P.O.Pox 11419. Cauridge DR.

Olonings Mills. M.D 21117. U.S.A

دوسرا پتہ یہ ہے۔

Poets Guide P.O. Box 10900 E

Baltimore M.D 21234 U.S.A

اس ضمن میں غوثیہ چائنا اور کوریا کے لوگوں کی مثال دیتی ہیں جو انگریزی کے ساتھ ساتھ اپنے بچوں کو اپنی زبان سکھانا لازمی جانتے ہیں۔ لہٰذا ہمیں بھی زبان و ادب کے لئے خلوص دل سے کام کرنا ہوگا۔ محض اپنی مصروفیات کا بہانہ بنا کر دامن چھڑا لینے سے تو یقیناً ہم اپنی زبان کے تناور درخت کی جڑیں اپنے ہاتھ سے کاٹ دیں گے۔

ادیب و شاعر کی تخلیقات اس کے عہد کی نمائندہ ہوتی ہیں۔ اس سوال کے جواب میں انہوں نے فیض کا شعر سنایا۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں،

فیض کا یہ شعر اپنے اس دور کا نمائندہ ہے جب آزادی ملی لیکن دولت پھر بھی چند ہاتھوں میں سمٹی رہی۔ بندۂ مزدور کے اوقات نہیں بدلے۔ آج بھی بہت سے شعراء کا کلام اپنے دور کا نمائندہ ہے۔

طنز و مزاح کے سلسلے میں غوثیہ کہتی ہیں کہ مزاح نگار میں بلا کی سیاسی بصیرت اور سماجی شعور کی ضرورت ہے۔ دراصل دانش کی باتوں کو بڑی ہی سنجیدگی سے کہہ جانا اعلیٰ و عمدہ مذاق ہے۔ طنز و مزاح ادب کی سب سے پیاری صنف سخن ہے۔ ایک مسکراہٹ سے ۱۷ اور ایک قہقہے سے جسم کے اسی (۸۰) عضلات متاثر ہوتے ہیں۔ کسی فزیالوجسٹ کے بقول قہقہہ جسم میں ایسا

مادہ پیدا کرتا ہے جو جسم کی کارکردگی کو توانائی بخشتا ہے۔ اس لئے مسائل سے قہقہوں اور ہنسی کے ساتھ نبرد آزما ہونا ہی بڑائی کی دلیل ہے اور اسی لحاظ سے طنزومزاح نگار تو قاری کا مسیحا ہے۔ اور اس فن میں دسترس حاصل کرنا آسان نہیں۔

غوثیہ کا کلام ان رسائل میں شائع ہوتا رہا ہے۔ شمع دہلی، بیسویں صدی دہلی، نوائے ادب، جھلکیاں، اردو دنیا، رہنمائے دکن، دکن کرانیکل اور نارچ۔

غزل

اُٹھتے بھی ہیں گرتے ہیں اور گر کے سنبھلتے ہیں
منزل کے تمنائی ہر حال میں چلتے ہیں

انداز میں جلنے کے کچھ فرق نہیں ہوتا
پروانوں کی صُورت سے دیوانے بھی جلتے ہیں

وہ شمع فروزاں ہے اب غیر کی محفل میں
ہم جس کی محبت میں دن رات پگھلتے ہیں

اُمید پہ قائم ہے دنیائے طلب یارو
کب کس کے یہاں دل کے ارمان نکلتے ہیں

ہم جیسے زمانے میں دیوانے کہاں ہوں گے
جو دار کی جانب بھی ہنستے ہوئے چلتے ہیں

★

غوثیہ سلطانہ

عکسِ فن

بیوی سے محبت

بستر مرگ پہ بیوی تھی پڑی
شوہر تھا بے چارہ سوگوار دنگ
برداشت بھلا اس کو کیسے ہوگا
ستر برس سے ہیں دونوں سنگ
دیکھا جو عزرائیل کو تو
شوہر بول اٹھا
آئیے ادھر ہے مریضہ کا پلنگ

دعا

اے رب دیکھوں تو
ان دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں؟
مسجد دامن کھینچے ہے
مندر پاس بلاتا ہے
ہر اک اپنی اپنی ہی ہم کو راہ دکھاتا ہے
اک دوراہے پہ کھڑی
سوچ رہی ہوں یا رب
انسانوں کا جنگل ہے
بھانت بھانت کی بولی ہے
الگ الگ ہر ٹولی ہے
آپس میں بجسا بجسی ہے
کشمکش کھینچا تانی ہے

نظم

وحشت کے سونے جنگل میں دور دور تک کوئی نہ تھا
بس میں اور میری تنہائی تھی
ایک شام آسمان سے لہو ٹپکا
اور میری تنہائی کے اس سونے جنگل کو
اک نام دے گیا
جسے زندگی کہتے ہیں

سعید قیس

تبرّک

ــے روشنی مجھ کو بلانے مجھے گھر تک آئی
اُس کا سایہ دیوار پہ شمع کا دیا گیا دکھا

سعید قیس
۳/۴/۹۵

Saeed Qais
P.O.Box 26917
MANAMA - BAHRAIN (A.G.)

سعید قیس

(بحرین)

یقیناً لوگوں کو یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ میں کبھی ٹیکسی میں لکھ رہی ہوں کبھی بس میں بیٹھے بیٹھے قلم چل رہا ہے اور کبھی انتہائی شور و شغب والے ماحول میں بھی میں اپنا کام کیے جاتی ہوں۔ صحافت سے وابستگی میں یہ مزاج خاصا معاون رہا۔ ایک زندگی صرف اپنے حصول روزگار میں مصروف رہی۔ نہ اپنی شاعری چھپوانے کی طرف کوئی توجہ کی نہ افسانے جرائد کو بھیجے۔ بس جو چھپ گیا وہ بھی اسی صورت میں کہ کہیں سے فرمائش آگئی۔ لہٰذا پی. آر بڑھانے کی بھی کبھی کوشش نہ کی۔ خاموشی سے اپنا کام کرتی رہی اور اپنے رب کا شکر ادا کرتی رہی جس نے بن مانگے مجھے عزت دی۔ صبر و قناعت کی دولت دی اور لوگوں کی اتنی محبت بھی کہ بعض وقت میں خود کو تہی دامن محسوس کرتی ہوں۔ اور واقعی اگر انسان کو محبتوں کا مرہم میسر نہ ہو تو گرد و پیش سے ملنے والے زخموں کا مداوا کبھی نہ ہو سکے۔

آج ایسی ہی ایک محبت مجھے یاد آرہی ہے۔ آج ۲۷ فروری ۱۹۹۶ء کی تاریخ ہے اور منگل کا دن۔ میں لاس اینجلس کے یو. ایس. سی اسپتال کے کیفے ٹیریا میں ہوں۔ میرے سامنے "دیوار و در" کے صفحات کھلے ہیں۔ یہ سعید قیس کا مجموعہ کلام ہے۔ اس کیفے ٹیریا میں ہر ملک اور ہر قوم کے لوگ نظر آتے ہیں۔ یہ سب لوگ مختلف رنگ و روپ کے باوجود ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے موتیوں کی مانند ہیں۔ انسانیت اور محبت کے موتیوں کی لڑی کی صورت میں۔ رنگ و نسل سے ہٹ کر محبت ہی ایک ایسا آفاقی جذبہ ہے جو انسان کی پہلی پہچان ہے۔

سعید قیس کی شخصیت بھی محبت کے خمیر سے گندھ کر چ کے عمل سے نکھری ہے۔ دیوار و در

کا ایک صفحہ کھلا تو وہ مجسم ہو کر سامنے آگئے۔

لکھنے والو جو بھی لکھنا نام ہوا کے لکھنا
سچی باتیں اپنی ذات سے باہر آکر لکھنا

میں نے سعید قیس کو جب بھی دیکھا ہر بار ان کی شخصیت کا ایک نیا روپ میرے سامنے آیا۔ کبھی اپنے گھر وہ قیمہ پکا رہے ہیں اور ہمیں اصرار سے کھلا رہے ہیں۔ تب یوں لگتا ہے کہ ایک بزرگ کی شفقت سایہ کئے ہوئے ہے۔ کبھی دوستوں کی محفل میں ان کا کلام پوری توجہ اور انہماک سے سن رہے ہیں اور گفتگو کر رہے ہیں تو ایک سچے اور کھرے دوست کا عکس ان کے وجود سے جھانکتا دکھائی دیتا ہے اور جب کبھی انہیں سوچوں میں گم سم اور خاموش دیکھا تو انہیں کا شعر یاد آتا۔

صحرا کی وسعتوں سے بڑا ڈر لگا مجھے
پھیلا جو میں تو اپنے ہی اندر سمٹ گیا

بحرین میں ایک طویل عرصہ ان کا ساتھ یوں بھی رہا کہ میری کتاب سخن ور (اول) کی تعارفی تقریب کے انعقاد کے لئے قیس صاحب اور خالد بٹ مرحوم نے بڑی محنت کی۔ اتنی لگن سے کون کسی کے لئے کام کرتا ہے مگر وہ محبت کا سمندر ہیں۔ میرا شعر ہے کہ

چپ ہیں
ہم یوں کہ ہم ہیں سمندر
اور سمندر ابلتا نہیں ہے

چنانچہ اس شعر کی تصویر بنے سعید قیس دوستوں کے لئے چپ چاپ کام کئے جاتے ہیں۔ شکوے شکایتوں اور موہ مایا کے دام سے دور انہیں میں نے ہمیشہ اپنے حالات میں مگن دیکھا اور تب ان کا یہ شعر گنگناتا ہوا سعید قیس بن کر میرے سامنے آتا رہا۔

قیس جن کو کھا گیا قد کا ملال
ان درختوں پر ثمر کیا دیکھتے

سعید قیس کی شاعری روایتی اسلوب کی پابند نہیں۔ ان کا کلام ان کی ذات کو منعکس کرتا ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری کو جدید لہجے اور جدید طرز احساس سے پوری طرح مربوط کیا ہے۔ اپنی آواز کو جدا اور ممتاز رکھا ہے۔ ملاحظہ ہو شعر

ہر لمحہ میرے ساتھ ہے خوشبو کے سفر میں
وہ شخص کسی رت میں جدائی نہیں دیتا

احساس تنہائی اور رشتوں کی بے ثباتی کا اظہار وہ بڑے دلنواز پیرائے میں کرتے ہیں، کہتے ہیں

سعید قیس

بری عادت ہے لیکن پڑ گئی ہے
خود اپنے گھر میں رہ کر گھر نہ ہونا

لیکن مجلسوں اور محفلوں میں نہ ہوتے ہوئے بھی وہ اپنی ذات میں خود ایک انجمن ہیں۔ سخن ور کے لئے میں نے ان سے تعارف مانگا تو جواب میں انہوں نے لکھا کہ ان کا نام محمد سعید ہے۔ والد محترم کا نام حاجی معراج الدین کاشمیری ہے قیس صاحب نے ۵ مئی ۱۹۴۷ء کو موچی دروازہ لاہور پاکستان کی سرزمین پر جنم لیا۔ تعلیم انٹرمیڈیٹ تک حاصل کی۔ اٹھارہ سال تک آرامکو سعودی عرب میں ملازمت کی۔ بارہ سال تک بحرین کی ورکشاپ اینڈ کمپنی میں ملازمت کی اور اب تیرہ سال سے ریٹائرڈ ہیں۔ غزل ان کی پسندیدہ صنف ہے۔ گذشتہ تین چار دہائیوں سے شعر کہہ رہے ہیں اور ابھی تک اپنی شاعری سے مطمئن نہیں۔ انہیں دکھ ہے کہ اچھا شعر کہنا انہیں اب تک نہیں آیا۔ کہتے ہیں کہ شعر کہنے کی تحریک کسی اچھے شعر سے مجھے ملتی ہے۔ ویسے شاعری کو الہام بھی کہا جاتا ہے لیکن یہ الہامی کیفیت ان پر ہفتوں بلکہ مہینوں میں طاری ہوتی ہے۔ اسی لئے بھی زود گو شاعر نہیں نہ بسیار گو۔ نہ کسی مکتبہ فکر سے وابستہ ہیں۔ ہاں عصر حاضر کے کچھ شعراء سے متاثر ضرور ہیں۔ ان میں محترم احمد ندیم قاسمی' شہزاد احمد' منیر نیازی اور قتیل شفائی کے نام شامل ہیں۔

سعید قیس کے خیال میں نظریاتی شاعری کرنا خود کو پابہ زنجیر کر لینے کے مترادف ہے۔ چنانچہ سوچ کو آزاد رکھ کر شعر کہنے کے حامی ہیں۔ ان کا کلام پاکستان کے تخلیق' معاصر' فنون اور خیال وفن میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ موڈی آدمی ہیں۔ کبھی موج میں آئے تو ان ادبی جرائد میں کلام بھجوایا ورنہ مدتوں خاموش بیٹھے ہیں۔ ان کے کلام کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۹۸۰ء میں ہجر کے موسم اور ۱۹۹۵ء میں دیوار و در۔

کسی بھی تخلیق فن کے لئے ابلاغ کو ضروری قرار دیتے ہیں اور اس کے لئے آسان زبان واسلوب کو پسند کرتے ہیں۔ کہتے ہیں تنقیدی محفلیں شاعر وادیب کے لئے نئی راہوں کے تعین میں رہنما ثابت ہوتی ہیں ورنہ رہنمائی کے بغیر تمام عمر ایک شاعر تک بندی کرے گا یا ہوا میں شاعری کرنا پڑتی ہے۔

سعید قیس آج کے تخلیقی ادب سے مایوس نہیں۔ کہتے ہیں آج ادب کے زندگی سے بھرپور شاعری کی جا رہی ہے اور اس کی پزیرائی بھی ہو رہی ہے۔ ادبی جرائد اور رسائل جو معیاری ادب پیش کر رہے ہیں وہ قابل داد ہیں۔ اس ضمن میں فنون لاہور معیار کراچی اور تخلیق لاہور کے

علاوہ اور بھی کئی جرائد ایسے ہیں جو قابل تعریف کام انجام دے رہے ہیں۔ اردو کے مستقبل سے سعید قیس قطعی مایوس نہیں۔ کہتے ہیں کہ اردو زبان تو آج برصغیر کی سرحدوں کو پار کر کے مشرق وسطیٰ، یورپ اور امریکہ تک پہنچ گئی ہے۔ اور وہاں بھی اب معیاری ادب تخلیق ہو رہا ہے۔ شاندار مشاعرے (چاہے وہ کمرشل ہوں ان کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا) ادبی محفلیں اور موسیقی کی تقریبات یہ سب اردو شاعری اور ادب کو حیات جاوداں عطا کرتی ہیں۔ اور زندگی سے بھرپور شاعری جتنی اس دور میں ہو رہی ہے وہ اتنی توانا پہلے کبھی نہ تھی۔ ماضی میں شاعری گل وبلبل، شمع پروانہ یا رقیب رو سیاہ کے دائرے سے باہر نہیں آسکی تھی۔ آج کے لکھنے والے ہی دراصل وہ شاعری کر رہے ہیں جس کی جڑیں دور تک ہماری زمین میں پیوست ہیں۔

غزل

اک حرف ملامت نے جگر کاٹ دیا ہے
سوچا ہے تو پھر دست ہنر کاٹ دیا ہے

ایندھن کی ضرورت مرے بچوں کو بہت تھی
میں نے وہ صنوبر کا شجر کاٹ دیا ہے

منزل کی طلب میں کبھی منزل نہیں دیکھی
امید سفر میں یہ سفر کاٹ دیا ہے

چیلیں بھی ڈراتی ہیں مجھے شور مچا کر
کس نے مرے شہباز کا پر کاٹ دیا ہے

ہم سے تو جدائی کی گھڑی بھی نہیں کٹتی
لوگوں نے تو پتھر کا جگر کاٹ دیا ہے

اٹھا تھا جو کل میری حمایت کے لئے قیس
خود میرے ہی ہاتھوں نے وہ سر کاٹ دیا ہے

سعید قیس

عکسِ فن

مُتفرق اشعار

ہمارا گھر بہت چھوٹا ہے لیکن
ہماری آرزو کتنی بڑی ہے

○

لے گئے دُکھ خرید کر اس کو
اک کھلونا مری دکان میں تھا

○

کبھی مجھ کو کسی سائے کے حوالے سے بھی دیکھ
سُوکھ جاؤں گا یونہی دھوپ میں رکھا رکھا

○

پتھر سارے شہر پہ برسے تھے لیکن
کانچ کے برتن صرف ہمارے ٹوٹے ہیں

○

ہم پہ یہ الزام بھی رکھا گیا ہے
ہم نے کاٹی ہے تمہاری زندگی
جب کھلونے جوڑنے لگتا ہوں قیسؔ
ٹُوٹ جاتی ہے بچاری زندگی

○

میں بھی بنجر دھرتی ہوں پر پیاسا رہتا ہوں
وہ بھی پتھر ہے پر اس میں جھرنے کتنے ہیں

کرامت غوری

گزار دی ہے کرامت نے زندگی ایسے
کہ جیسے دشت کی آغوش میں گلاب کھلے

۱۵ ۱۰/۹۵ء

Karamat Ghauri
P.O.Box 988 SAFAT, 1310
KUWAIT (A.G)

کرامت اللہ خان غوری

(کویت)

اک پڑاؤ ہے گھڑی دو گھڑی دم لینے کو
وہ گرفتار ہوا جس نے شناسائی کی

شعر کہنے سے بہت پہلے ہی کرامت کو اس سچ کی آگاہی تھی۔ اسی لئے انہوں نے دوستانہ تعلقات محدود رکھے۔ وہ کام کرنے میں یقین رکھتے ہیں۔ اسی لئے ہجوم سے بچ کر وہ چپکے چپکے کام کرتے رہے اور کم وقت میں انہوں نے بہت سا کام کرلیا۔

کرامت اللہ خان غوری کو میں افسانہ نگار کی حیثیت سے جانتی تھی۔ اشعار تو ان کے ہونٹوں سے فقرہ میں خوبصورتی پیدا کرنے کے لئے اچانک پھسلتے تھے اور بہت صحیح جگہ اپنا وزن برقرار رکھ کر ایک گہرا تاثر چھوڑ جاتے۔ پھر پتہ چلا کہ کرامت نے خیر سے شاعری بھی شروع کردی ہے۔ چنانچہ وہ خود اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ

"شاعری کے علاوہ افسانہ، رپورتاژ اور فکاہی مضامین لکھنے سے خصوصی وابستگی ہے لیکن میری پہلی محبت افسانہ ہے۔ اس کے بعد رپورتاژ آتا ہے۔ بدو کے اونٹ کی طرح وہ میرے خیمہ خیال میں حاوی ہوتی گئی۔ شاعری میں اصل عشق غزل سے ہے۔ لیکن نعت، سلام، قصیدہ اور منقبت کہنے سے روح کو تازگی میسر آتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ غزلوں اور نظموں کا مجموعہ مرتب کرنے سے پہلے میں نے اپنے دینی کلام کے مجموعہ "درخانہ اطہر" کو اولیت دی"۔

کرامت اللہ خان غوری کا تخلص کرامت ہے۔ نام کو مختصر کر کے اب کرامت غوری کے نام سے افسانہ لکھتے ہیں۔ ۱۵ فروری ۱۹۴۲ء کو دلی (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۶۳ء میں جامعہ

کراچی سے (پاکستان) سے بین الاقوامی تعلقات میں ایم۔اے کیا۔ ۱۹۶۳ء میں پاکستان فارن سروس (P.F.S) سے وابستگی ہوئی۔ سفارتی زندگی میں اب تک نیویارک (امریکہ) بیونس آئرس (ارجنٹینا) منیلا (فلپائن) کویت (کویت) ٹوکیو (جاپان) بیجنگ (چین) الجزاء (الجزائر) میں سفارتی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ آج کل کویت میں مقیم ہیں لیکن جلد ہی بغداد (عراق) کی طرف روانگی ہے۔ یوں کرامت گزشتہ اٹھائیس برس سے ایک بنجارہ کی مانند خانہ بدوشی کی زندگی گزار رہے ہیں کیونکہ وہ خود کہہ چکے ہیں کہ دنیا ایک مسافرخانہ ہی تو ہے۔

میں نے ان سے پوچھا تھا کہ شعرگوئی کے لئے کون سی کیفیت یا جذبہ محرک بنتا ہے اور شاعری یا ادب کی دوسری صنف سے وابستگی کے بنیادی محرکات کیا تھے ـــــــــ؟

کرامت کا جواب ہے کہ کسی بھی فن کی تخلیق کے لئے بنیادی تحریک اپنے اندر کی آواز ہوتی ہے۔ جب تک یہ آواز نہ اکسائے نہ شعر ہوتا ہے نہ کہانی لکھی جاتی ہے اور نہ ہی کوئی اور تخلیق وجود میں آتی ہے۔ افسانہ لکھنا ہو یا شعر کہنا ایک وجدانی عمل ہے اور یہ اس وقت تک ظہور میں نہیں آتا جب تک روح کے ساز خود بخود نہ بج اٹھیں۔ اندر سے آواز بھی صرف اس وقت اٹھتی ہے جب روح، احساس اور وجدان متاثر ہوتے ہیں۔ یہ تمام تر ایک فطری عمل ہے۔ یہ عمل بننے کی پسینک لکھنے کے مترادف نہیں کہ پہلے اعداد و شمار جمع کئے جائیں اور جو لوگ فیتہ لے کر بیٹھتے ہیں اور زبردستی ناپ تول کر شعر کہتے ہیں۔ ان کا کلام چیخ چیخ کر خود ہی فریاد کرتا ہے کہ یہ الفاظ جوڑے گئے ہیں۔ اپنے آپ ڈھل کر نہیں آئے۔ آخر کو اردو شاعری کے امام مرزا غالب نے غلط تو نہیں کہا تھا کہ۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

کرامت کی آواز ابھی مدھم نہیں ہوئی تھی کہ میں نے پوچھ لیا۔ "کس مکتبہ فکر سے آپ کی شاعری متاثر ہے۔ میرا مطلب ہے ادب اور شاعری کو نظریاتی ہونا چاہئے یا نہیں.....؟

کرامت کا کہنا ہے کہ نہ ان کی شاعری اور افسانہ نگاری کسی مکتبہ فکر سے متاثر ہے کیونکہ وہ مکاتب فکر میں یقین ہی نہیں رکھتے۔ ان کے نزدیک مکتب فکر کی اصطلاح نقادوں اور ادب کے مورخوں نے اپنی سہولت کے لئے وضع کی ہے۔ یا پھر فی زمانہ مکاتب فکر کی ضرورت ان لنگڑے لولے شاعروں اور ادیبوں کو ہوتی ہے جن کا فن خود اپنی ٹانگوں پر کھڑا رہنے سے محتاج ہوتا ہے اور سہارے کے لئے اس یا اس مکتبہ فکر کی بیساکھیاں تلاش کرتا ہے اور سہارے کا محتاج ظاہر ہے صرف "نادار" ہی ہو سکتا ہے۔

"نہیں ہرگز نہیں۔ میرے نزدیک ادب یا شاعری کو قطعاً" نظریاتی ہونے کی ضرورت نہیں

ہے۔ ان محدود معنوں میں جن میں عام طور سے سمجھا جاتا ہے۔" کرامت نے اظہار خیال جاری رکھتے ہوئے کہا کہ "ہمارے ادب میں نظریاتی اور غیر نظریاتی کی طولانی اور لاحاصل بحث اس دور سے شروع ہوئی جب مغرب میں اس بات پر رسہ کشی اور جنگ وجدل ہو رہی تھی کہ کس سیاسی نظریہ یا معاشی فکر کو بطور نظام حکومت رائج کیا جائے۔ میرے نزدیک شاعر اور ادیب نہ ٹریڈ یونین کارکن ہوتا ہے نہ سیاست دان۔ ویسے ہر شاعر اور ادیب کا اپنا ایک نظریہ ہوتا ہے۔ ایک فکر اور شعور ہوتا ہے لیکن وہ سیاست دان یا ٹریڈ یونین کے سرخیلوں کی طرح اپنے نظریہ کو دنیا بھر پر مسلط نہیں کرنا چاہتا۔ شاعر اور ادیب کا نظریہ تو کسی پیغمبر کی تعلیم کی طرح ہوتا ہے۔ اس کا کام صرف بیان کر دینا ہے۔ ماننا نہ ماننا' اس سے متاثر ہونا یا اسے رد کر دینا سننے والے یا قاری کا فیصلہ ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ غالب نے کس نظریہ کا پرچار کیا یا میر نے کون سی تحریک چلائی تھی۔ لیکن کیا کوئی بھی نظریاتی (بزعم خود) شاعر ان کی گرد کو بھی پا سکا؟"

اگلا سوال تھا کہ ادب وشاعری کے لئے ابلاغ ضروری ہے اور کیا اس کے لئے آسان زبان واسلوب اپنانا ضروری ہے؟ کرامت غوری نے کہا کہ فی زمانہ ادب کے لئے ابلاغ ہمیشہ سے زیادہ ضروری ہے۔ یہ دنیا جس تیزی سے ابلاغی طور پر ایک رنگی ہوتی جا رہی ہے اس میں ابلاغ کی اہمیت سے انکار کفر کے مترادف ہوگا اور بلاشبہ سہل زبان اور آسان اسلوب ابلاغ عامہ کے لئے بہت ضروری ہے۔

اس سوال کے جواب میں کہ "تنقید ادب وشاعری کے لئے نئی راہیں متعین کرتی ہے چنانچہ تنقیدی محفلیں کس حد تک شعر وادب کی ترویج کے لئے مفید ثابت ہو سکتی ہیں' کرامت نے مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ "فی زمانہ تنقید یا تو اپنے لوگوں کی دکان چمکانے کے لئے استعمال کی جاتی ہے یا پھر دوسروں پر حرف زنی اور طعن وتشنیع کے لئے۔ زبردستی کی تعریف کرنا یا کیچڑ اچھالنا تنقید نہیں کہی جا سکتی۔ ویسے بھی تنقید نگار اپنے شکار شاعر یا ادیب کے مقابلہ میں علمیت میں بھی کم ہوتے ہیں اور تجربہ میں بھی۔ اور میری نظر میں تنقیدی شعری محافل ادب کی کوئی خدمت نہیں کرتیں۔"

باتیں بے شک طویل ہو رہی ہیں لیکن جب نوعیت اہم ہو تو وقت کا زیاں نہیں ہوتا لہٰذا اس اہم سوال کے جواب میں کہ "ادبی رسائل کی عدم مقبولیت سے شاعری کو نقصان پہنچ رہا ہے نہ ہی ادبی کتب کی پذیرائی ہوتی ہے اور نہ اس نوعیت کے علمی ادبی پروگرام ہوتے ہیں جیسے کہ پہلے ہوتے تھے۔ آپ اس کا کوئی حل پیش کر سکتے ہیں۔" کرامت نے کہا کہ "ادبی رسائل کی زبوں حالی سے شاعری کو اتنا نقصان نہیں پہنچ رہا جتنا افسانہ اور ناول کو پہنچ رہا ہے۔ ادبی رسائل کی کمی

شعری ادب کے حوالے سے بڑی حد تک مشاعروں میں پوری ہو جاتی ہے لیکن نثری ادب البتہ زیادہ غفلت کا شکار ہو رہا ہے۔ حل اسکا یہ ہے کہ "شمع" اور "رابطہ" جیسے کثیر الاشاعت رسالے جن کی آواز دنیا کے کونے کونے میں پہنچتی ہے اور رسائل منظر عام پر آئیں۔ ان میں افسانوی اور شعری ادب کا اعلیٰ معیار بھی برقرار ہے اور وہ چاشنی بھی بافراط ملتی ہے۔ جس کی ایک عام غیر ادبی قاری کو تلاش ہوتی ہے۔ میں اسی لئے شمع، بیسویں صدی اور رابطہ میں اپنی تخلیقات دینا پسند کرتا ہوں۔"

اردو زبان کے سلسلے میں ایک سوال میرا یہ بھی تھا کہ امریکہ اور یورپ میں آج کی پروان چڑھنے والی نسل اردو زبان سے تقریباً نابلد ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ مستقبل میں یہاں اردو زبان ختم ہو جائے گی۔ نہ یہ مشاعرے ہوں گے نہ اردو کی ادبی محفلیں...... کوئی تجویز، کوئی مشورہ!

کرامت کا جواب ہے کہ "بے چاری اردو زبان کا حشر پاکستان میں کیا کم خراب ہو رہا ہے جو آپ صرف امریکہ کا ماتم کر رہی ہیں۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ امریکہ میں اپنے بچوں کو بی بی سی کی اردو سروس کے پروگراموں کی ریکارڈنگ سنوایا کیجئے۔ اس لئے کہ اب سب سے اچھی اردو وہیں بولی جاتی ہے۔ اور امریکہ میں آباد اردو بولنے والے ماں باپ سے کہئے کہ وہ اپنے بچوں سے غلط سلط انگریزی کی بجائے ان سے اردو زبان میں گفتگو کیا کریں۔ بیچارے بچوں کو نہ صحیح انگریزی آتی ہے نہ اردو۔ قصور وار وہ نہیں، ان کے ماں باپ ہیں جن کی آنکھیں مغرب کی روشنیوں سے ایسی چندھیا جاتی ہیں کہ پھر کھلتی ہی نہیں۔"

یہ سوال بھی کم اہم نہیں کہ کیا ہم اردو شاعری کے ذریعے ایسا ادب تخلیق کر رہے ہیں جو زندگی سے بھرپور ہو اور جس کی جڑیں ہماری زمین میں دور تک پیوست ہوں۔ کرامت بولے کہ یقیناً جدید اردو غزل اور نظم کی جڑیں ہماری زمین میں پیوست ہیں اور بہت مضبوطی سے پیوست ہیں اور اسے صرف وہی لوگ محسوس کر سکتے ہیں یا اس کا ادراک کر سکتے ہیں جن کی اپنی جڑیں وطن کی مٹی میں گہرائی کو پا چکی ہوں اور ایسی شاعری یا ادب ہی اس کے خالق کے وجود کا اقرار اور اس کے عہد کی گواہ بن جاتی ہیں۔

"کرامت کیا یہ سچ ہے کہ آج کا ادب بے معنی ہوتا جا رہا ہے۔ تنقید نگار کہتے ہیں کہ آج ادب کا رشتہ ہماری زندگی کے دھارے سے ٹوٹتا جا رہا ہے۔ لفظ سچ نہیں بولتے......" اس ضمن میں کرامت کا کہنا ہے کہ "آج تنقید نگار خود کون سے سچے یا کھرے ہیں جو ادب یا شاعر پر یہ الزام لگا سکیں۔ یہ درست کہ جہاں معاشرہ کا ہر جز اور خود شعبہ حیات روبہ زوال ہے وہاں ادب پر بھی جمود طاری ہے۔ خاصی غنودگی کا عالم ہے لیکن تنقید نگار یا ادب کے نقاد بھی کوئی نئی فکر

اجاگر کرنے میں اتنے ہی ناکام رہے ہیں جتنے کہ ادیب اور شاعر۔؟

سوال ایک یہ بھی ہے کہ بڑی شاعری تب جنم لیتی ہے جب اس کے پس منظر میں شاعر کے وسیع تجربات اور جثبت فکر و مطالعہ بھی شامل ہو۔ کیا آج اس پر عمل ہو رہا ہے؟ کرامت نے کہا کہ اگر عمل ہوتا تو فیض جیسے عظیم شاعر کے بعد فکر انگیز اور غیات پرور شاعری کی مسند سونی نہ پڑی ہوتی۔ فی الحال تو کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو اس پر بیٹھ سکے۔

اور آخر میں طنز و ظرافت کے حوالے سے جو ادب تخلیق ہو رہا ہے اس پر اظہار خیال کرتے ہوئے کرامت نے کہا کہ پاکستان کے تھڑدلے اور غیر روادار معاشرے میں اور حسوں کی طرح حس ظرافت بھی مرتی جا رہی ہے۔ ابن انشاء اور مشتاق یوسفی نے اس میدان میں اپنے قلم کا لوہا منوایا۔ باقی سب ناکمل سفلی عمل کا شکار ہو گئے۔ وہ کرامت کے بچپن کا دور تھا جس میں شفیق الرحمٰن کی بہار تھی اور ہر طرف ان کی ظرافت کی برکھا برسا کرتی تھی۔

تخلیقات :۔

درخانہ اطہر۔ مجموعہ کلام

حرف کرامت۔ ”

قطعہ

ہیں میرے دوست کتنے، کتنے دشمن
میں ان فکروں سے اونچا ہو گیا ہوں

جو بے مانگے بھی دے دیتا ہے اکثر
میں قائل اُس خدا کا ہو گیا ہوں

کرامت غوری

عکسِ فن

غزل

کیا زمانے سے توقع رکھیں اچھائی کی
یہ تو دنیا ہے نہ اپنوں کی نہ ہرجائی کی

جب سے دنیا نے مشینوں سے شناسائی کی
سب کی آنکھوں میں تھکن دیکھی ہے تنہائی کی

جن نگاہوں میں نہیں روشنی بینائی کی
ان سے کیا کوئی توقع کرے دانائی کی

اک پڑاؤ ہے گھڑی دو گھڑی دَم لینے کو
وہ گرفتار ہوا جس نے شناسائی کی

منصب و جُبّہ دستار پہ مَوقوف نہیں
شخصیت اَصل تو ہے قامتِ زیبائی کی

اب الگ ڈھنگ زمانے کے نئے موسم ہیں
اب کہاں بات کوئی کرتا ہے پُروائی کی

بے سبب لوگ مقدّر کا گلہ کرتے ہیں
کب زمانے نے غمِ عشق کی شنوائی کی

وہ تو خوشبو تھی بکھرنا تھا مقدر اس کا
یہ نصیب اس کا کہ گلشن نے پذیرائی کی

(پروین شاکر کے نام)

سیدہ کنیز فاطمہ کرن

ایسے ہی جیسے مجھے اپنے بدن سے ہر دم
تیری خوشبو، تیری چاہت کی مہک آتی ہے

کنیز فاطمہ کرن

Kaneez Fatima Kiran
(Editor Bazme - Urdu)
21,BaulKhan Hills Rd -
Baulkhan Hills N.S.W. 2153 AUSTRALIA

کنیز فاطمہ کرن
(سڈنی۔ آسٹریلیا)

محبت نہ کرتے بڑا کام کرتے
محبت سے لیکن بڑا کام کیا ہے

سڈنی (آسٹریلیا) میں رہنے والی کنیز فاطمہ کرن کی یہ اردو سے محبت کا ہی نتیجہ ہے کہ دیارِ غیر میں وہ اردو زبان کا سہ ماہی شائع کرکے اردو کی آبیاری کر رہی ہیں۔ ۱۹۸۷ء میں انہوں نے یہ پودا لگایا اور اسے "بزمِ اردو" کا نام دیا۔ آج یہ پرچہ کرن کی شناخت ہے اور ان تارکینِ وطن کے لئے جدوجہد کی ایک روشن مثال ہے جو کہتے ہیں کہ فکرِ معاش بڑے بڑوں سے آندھیوں میں چراغ جلائے رکھنے کا حوصلہ چھین لیتی ہے۔

کرن کی جائے پیدائش حیدر آباد دکن (ہندوستان) ہے۔ ایف۔ اے تک تعلیم حاصل کی تھی کہ شادی ہوگئی اور یہ ہجرت کرکے کراچی (پاکستان) آگئیں۔ کراچی سے انہوں نے بی۔ اے اور پھر ایم۔ اے کیا۔ کہتی ہیں شاعری سے دلچسپی بچپن سے تھی پھر جب "بزمِ اردو" شائع کرنا شروع کیا تو سڈنی میں شعر و سخن کی محفلیں بھی سجائیں۔ یہ محفلیں متقاضی تھیں کہ کرن سنجیدگی سے شاعری کی طرف متوجہ ہوئیں۔ محفلیں طرحی بھی ہوتی تھیں اور غیر طرحی بھی۔ ان محفلوں سے کرن کے فن کو جلا ملی لیکن مطالعہ کے بغیر فن میں نکھار پیدا نہیں ہوتا۔ چنانچہ کرن اپنی مصروفیات سے وقت نکال کر کچھ نہ کچھ پڑھتی ضرور رہتی تھیں۔ اب بھی کتابیں ان کا اوڑھنا بچھونا ہیں۔ کرن کو اس حقیقت کا ادراک ہے کہ ادب اور زندگی ایک دوسرے سے قدم ملا کر نہ چلیں تو انسانیت اور شعور سے ان کا رشتہ استوار

نہیں ہو سکتا کیونکہ ادب زندگی کا مرہون منت ہے تو زندگی ادب کی رہین منت ہے۔
شاعری میں ان کا اپنا اسلوب ہے۔ کہتی ہیں کہ ادب اور شاعری کے لئے ابلاغ ضروری ہے ورنہ تو غالب کے الفاظ میں یہ حال ہوگا کہ۔

مگر اپنا کہا وہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

میرا اگلا سوال رسالوں اور کتابوں کی مقبولیت کے بارے میں تھا۔ وہ کہتی ہیں کہ "یہ سوال کہ اس دور میں ادبی رسالوں اور کتابوں کی مانگ کیوں نہیں ہے۔ (پاکستان اور ہندوستان میں) اور اس کا کیا حل ہے، لمبی بحث چاہتا ہے۔ رسالے اور کتابیں تو ۵۰ سال قبل جتنے چھپتے تھے، اور پڑھے جاتے تھے اس سے کہیں زیادہ تعداد میں چھپ رہے ہیں اور لوگ پڑھتے بھی ہیں لیکن ادبی رسائل خسارے میں جا رہے ہیں۔ لوگ ہلکی پھلکی چیزیں پڑھنا چاہتے ہیں اس لئے کہ ان کا وہ ادبی بیک گراؤنڈ نہیں ہے جو پہلے ہوتا تھا۔ ایک چھوٹی سی مثال ہے کہ میں نے اور میرے بھائی نے جو مجھ سے دو سال بڑے ہیں جب ۷۔۸ سال کی عمر میں قرآن شریف ختم کرلیا تو میرے بھائی نے فارسی پڑھنا شروع کی۔ اور ہم دونوں اسکول بھی جاتے تھے۔ اب کراچی میں میرے خاندان کے بچے یا تو اردو یا انگلش اسکولوں میں جاتے ہیں۔ فارسی نہ ہم نے اپنے بچوں کو پڑھائی نہ خاندان میں کسی اور نے پڑھی۔ ہندوستان میں ایسا جما جمایا ماحول تھا وہ بکھر گیا۔ کم از کم ہم لوگوں کے لئے جو ہجرت کر کے پاکستان آئے اور پھر یہاں تو اور بھی غم تھے زمانے میں۔ جہد بقا کا مسئلہ اولیت حاصل کر گیا۔ تو جب بچوں کا ادبی پس منظر نہیں ہے تو انہیں ادب سے کیا دلچسپی ہوگی"۔

"آپ پوچھتی ہیں کہ دنیا کے بیشتر ممالک میں نئی نسل اردو زبان سے تقریباً ناآشنا ہے۔ میں کہتی ہوں کہ پھر بھی ان ممالک میں (میں آسٹریلیا کی بات کرتی ہوں) لوگ اپنے بچوں سے اردو میں بات کرتے ہیں انہیں پڑھانے کی کوشش بھی کرتے ہیں تاکہ وہ اپنی مادری زبان نہ بھولیں۔ ہندوستان پاکستان میں دیکھئے۔ غلط سلط لہجوں میں انگلش بول کر رعب جماتے ہیں اور ماں باپ بچوں سے گھروں میں انگلش میں بات کرتے ہیں۔ خواہ انہیں اپنی مادری زبان آتی ہو یا نہ آتی ہو۔ میں کراچی میں ایک صاحبہ سے ملنے گئی۔ ان کے گھر ٹیلیفون کی گھنٹی بجی تو ان کے ۵۔۶ سالہ نواسے نے فون اٹھالیا۔ جب ان کی نانی نے پوچھا کس کا فون ہے تو اس نے کہا کہ "میری سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ نوکروں کی زبان (اردو) میں بات کر رہے ہیں"۔ دیکھا آپ نے؟ شکر ہے ان ملکوں میں اول تو نوکر نہیں ہیں اور ہیں بھی تو وہ وہی آقا والی زبان بولتے ہیں"۔

کنیز فاطمہ کرن

عکس فن

مہک

تجھ سے جب مل کے میں آئی' مری آنکھوں کی چمک
میرے عارض کی دمک' دیکھ کے نظریں اٹھیں
کتنی پیشانیاں سجدوں کی تمنا میں رہیں
کتنی بانہیں مجھے آغوش میں لینے کو بڑھیں

ان کو کیسے ہوا معلوم کہ دل کی دھڑکن
تیری آہٹ سے ترے نام سے بڑھ جاتی ہے
ان کو کیسے ہوا معلوم کہ ویرانیِ دل
اب تیری یادوں سے آباد رہا کرتی ہے

جیسے مٹی سے اٹھے چھینٹوں کے سنگ سوندھی مہک
پھول کے کھلنے سے گلشن میں رواں جیسے شمیم
شاید ان تک بھی پہنچتی تھی حسیں خوابوں کی آنچ
شاید ان کو بھی مری روح سے آتی تھی لپک
ایسے ہی جیسے مجھے اپنے بدن سے ہر دم
تیری خوشبو' تیری چاہت کی مہک آتی ہے

بلراج کومل

چلا جانا ہے اس کو چھوڑ کر شاید بہت پہلے
ابھی اس شہر میں لیکن مرے کچھ کام باقی ہیں

بلراج کومل

یکم مارچ ۱۹۹۶ء

Balraj Komal
E - 139, Kalkaji
NEW DELHI 110019 - INDIA

بلراج کومل

دہلی (ہندوستان)

بلراج کومل سے میری پہلی ملاقات محترم رفعت سروش کے گھر اپریل ۱۹۹۴ء کی ایک شام میرے ہی اعزاز میں منعقد کی جانے والی نشست میں ہوئی۔ بلراج کومل کا میں نے نام ہی نہیں سنا تھا انہیں پڑھا بھی تھا۔ نثری نظم کے حوالے سے ویسے بھی انہیں کون نہیں جانتا۔ ۱۹۹۶ء یعنی سال رواں میں ان کی نعتوں کا مجموعہ "اگلا ورق" کے نام سے شائع ہوا ہے۔

بلراج سے ملنے کے بعد محسوس ہوتا ہے کہ وہ صرف نام ہی سے کومل نہیں، ان کا لہجہ بھی کومل ہے اور ان کی شخصیت میں بھی کوملتا ہے۔ شاید یہ سیالکوٹ کی مٹی کا اثر ہو جہاں اقبال نے بھی جنم لیا تھا۔ ۲۵ ستمبر ۱۹۲۸ء ان کا جنم دن ہے۔ پنجاب یونیورسٹی سے انہوں نے انگریزی ادبیات میں ایم۔ اے کیا۔ اپنے ادبی سفر کا آغاز انہوں نے ۱۹۴۸ء میں شاعری سے کیا۔ لیکن یہ انکشاف کب ہوا اس کے بارے میں بلراج کومل کا کہنا ہے کہ میں بی۔ اے تک سائنس کا طالبعلم تھا لیکن نصاب کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے علاوہ اردو رسائل اور کتب کا مطالعہ بھی میرے مشاغل میں شامل تھا۔ ۱۹۴۷ء میں مجھ پر یکایک یہ انکشاف ہوا کہ میں شعر کہہ سکتا ہوں۔ افسانہ لکھ سکتا ہوں اور ادبی تخلیقات کو تنقید و تجزیہ کے زاویے سے بھی دیکھ سکتا ہوں۔ میری بیشتر ابتدائی کوششیں شعری نظموں اور غزلوں کی صورت میں تھیں۔ ان میں کچھ کو میں نے احمد ندیم قاسمی، فکر تونسوی اور مخمور جالندھری پر بڑی "دیدہ دلیری" سے "نازل" Inflict کیا۔ ان کے حوصلہ افزا ردعمل سے میری خود اعتمادی کو

استحکام ملا۔ انہی ابتدائی یا اولیں کوششوں میں میری نظم "اکیلی" بھی تھی جو ۱۹۴۸ء میں پشاور سے فارغ بخاری اور خاطر غزنوی کی ادارت میں نکلنے والے ادبی جریدے "سنگ میل" میں شائع ہوئی۔ یہ میرے ادبی سفر کا آغاز تھا بعد میں افسانہ نگاری' تنقید' تراجم بھی میری ادبی کاوشوں کا حصہ بن گئے۔ یہ سفر اب بھی جاری ہے۔

نثری نظم کے حوالے سے میں ان سے گفتگو کرنا چاہتی تھی چنانچہ میں نے پوچھا آپ نثری نظم کے حامی ہیں کیوں؟ "میں صرف شاعری کا حامی ہوں۔ غزل' پابند نظم' معرا نظم' آزاد نظم اور دیگر زبانوں کی اصناف سخن خاص طور پر ہائیکو' تانکا' سڑوکا جیسی جاپانی زبان کی اصناف سخن میں' میں نے ان سب میں طبع آزمائی کی ہے۔ نثری نظم جس کے ساتھ یہ سوال خاص طور پر متعلق ہے محض آزاد نظم کی توسیع ہے۔ اردو زبان میں لکھی جانے والی آزاد نظم آہنگ کے رسمی پیمانوں کا انحراف چونکہ صرف جزوی طور پر کرتی ہے اس لئے مغرب میں مروج Vers Liber کے مماثل نہیں ہے۔ میری آزاد نظمیں چونکہ الفاظ کی ترتیب عام طور پر نثری انداز رکھتی ہیں اس لئے کچھ لوگوں کو شاید یہ گماں ہوتا ہو کہ میں نثری نظمیں لکھتا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ میری ساری کی ساری آزاد نظمیں ارکان اور مصرعوں کی ترتیب میں آزادی برتنے کے باوجود عروض کے آداب کا احترام کرتی ہیں۔ وہ نظمیں جو میں نے نثری نظموں کے طور پر لکھی ہیں اور جو میرے مجموعہ مکرم "نژاد سنگ" میں اور "شہر میں ایک تحریر" میں شامل ہیں اپنا واضح انداز اور تشخص رکھتی ہیں اور ایسے جذباتی اور فکری تجربات پر مبنی ہیں جو اگر آہنگ اور غیر ضروری تزئین کاری اور ناگریز حشو وزائد کے جبر سے گزرتے تو شاید تخلیقی سطح پر اپنا نوکیلا پن کھو بیٹھتے۔

شعر کی بنیادی پہچان استعارہ' علامت' امیج' پیکر اور آہنگ کے دم سے ہے۔ نثری نظم اگر شعر کے یہ بنیادی تقاضے پورا کرنے کی کفیل ہے تو وہ نظم یعنی شعر ہی کے ذیل میں آئے گی۔ اگر میں نثری نظم کا حامی ہوں تو مندرجہ بالا تمام شرائط کے ساتھ! جہاں تک آہنگ کا مسئلہ ہے نثر میں آہنگ کی مطلوبہ صورت تخلیق کرنے کے لئے الفاظ کی ترتیب جملوں کے ارتباط یا جدلیاتی نظام اور درون ساخت کے داخلی جذباتی فکری زیر و بم کے امکانات بہرحال موجود ہیں"۔

میرا اگلا سوال تھا آج کا نقاد اس قدر بدنام کیوں ہے؟ کیا یہ سچ ہے کہ آج کا تنقید نگار سچ نہیں لکھ رہا اور گروہ بندی کا شکار ہے۔ کتابوں کے پیش لفظ اور فلیپ کی تحریروں سے لوگوں کا اعتبار اٹھ گیا ہے۔ ایسا کیوں؟

بلراج کومل

بلراج کا کہنا ہے کہ "پیش لفظ اور فلیپ کی تحریریں سنجیدہ تنقید کی ناقابل تردید مثالیں نہیں ہیں۔ لہٰذا ان کی روشنی میں اور نقاد کے سچ یا جھوٹ کا یا معیار کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ قبائلی وفاداریاں زندگی کا حصہ ہیں۔ ان سے مفر ممکن نہیں۔ معیار کا فیصلہ ہر دور کی اہم تحریروں سے کیا جاتا ہے۔ ناقص تحریروں سے نہیں۔ جہاں تک اہم اور معیاری تنقید کا سوال ہے اس کا ہمارے دور میں نہ تو فقدان ہے نہ ہی کمی ہے۔ محمد حسن عسکری، وزیر آغا، گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی اور کچھ دیگر ناقدین کی تحریریں معیاری، عصری اعلیٰ تنقید کی ایسی مثالیں ہیں جن سے انکار ممکن نہیں ہے۔"

"کیا شاعری میں ابلاغ ضروری ہے؟" اس سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ "میں شاعری میں اور دیگر تخلیقی اصناف میں بلاشبہ ابلاغ کا قائل ہوں لیکن شاعری کے ابلاغ کا مسئلہ حل کرنا اتنا آسان نہیں جتنا بظاہر ہم سمجھتے ہیں۔ نثری ابلاغ میزان الفاظ میں ملفوف، معلومات اور اطلاعات کی ترسیل سے وابستہ ہوتا ہے۔ جب کہ شعری ابلاغ میزان الفاظ سے ماوراء آزاد کیفیات تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش سے عبارت ہے۔ معنی متن میں موجود ہیں۔ ہر قاری اپنی توفیق کے مطابق انہیں دریافت کرتا ہے اور ان کی ہمہ جہت نوعیت تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔"

بلراج کومل کی زندگی دلچسپ ادبی واقعات سے بھری پڑی ہے۔ "میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ "دلچسپ واقعات عام طور پر غیر ادبی ہوتے ہیں۔ اگر میں کبھی اپنی خودنوشت لکھ سکا تو ان کا ذکر تفصیل سے کروں گا۔ میری زندگی کا پہلا ادبی واقعہ جالندھری چھاؤنی میں مخمور جالندھری اور فکر تونسوی سے ملاقات تھی۔ یہ ۱۹۴۷ء کے نومبر یا دسمبر کی بات ہے۔ میں ان دنوں فیروز پور میں بی۔اے کا طالبعلم تھا۔ اور جنون شعر میں گرفتار تھا۔ ایک شام میں گھر سے فرار ہو کر جالندھر پہنچ گیا۔ شام کا وقت تھا۔ مخمور جالندھری فکر تونسوی اور کچھ دوست اس بیکری کے ایک کمرے میں مصروف کاروبار شام تھے جسے مخمور جالندھری ان دنوں ذریعہ معاش کے طور پر چلایا کرتے تھے۔ میں نے کمرے کے اندر پہنچ کر جب اپنے نام اور اپنے شاعر ہونے کا اعلان کیا تو ایک انتہائی تضحیک آمیز قہقہے نے میرا خیر مقدم کیا۔ پھر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا گیا اور میرا جام لبالب بھر دیا گیا۔ میں سراسیمگی کے عالم میں ایک ہی بار میں اس کو خالی کر گیا۔ نتیجے میں چند لمحوں میں، میں اس حوصلے سے سرفراز ہو گیا جس کو انگریزی میں "ڈچ کریج" کہتے ہیں اور میں نے اپنی وہ سب نظمیں سنا ڈالیں جو میں اپنے ساتھ لایا تھا۔ نظمیں سننے کے بعد سب سے پہلا ردعمل مخمور جالندھری کا تھا۔ انہوں

نے رسمی داد دینے کے بعد مجھ سے کہا کہ میں وہ دو مخصوص نظمیں ان کے پاس وہیں چھوڑ دوں اور باقی کی نظمیں پھاڑ کر باہر پھینک آؤں۔ میں نے حکم کی تکمیل کی۔ اور لوٹ کر کمرے میں آگیا۔ جہاں ایک اور لبالب جام میرا منتظر تھا۔ وہ دو نظمیں جو میں مخمور جالندھری کے پاس کمرے میں چھوڑ گیا تھا۔ بعد میں اردو کے اہم ادبی رسائل میں شائع ہوئیں۔ ان میں سے ایک وہ نظم تھی جو "اکیلی" کے عنوان سے ۱۹۴۸ء میں سنگ میل پشاور میں شائع ہوئی۔

ایک اور واقعہ میرے ذہن میں محفوظ ہے یہ واقعہ کم وبیش ۳۰ر۳۵ برس پرانا ہے۔ رفعت سروش نے اپنی خودنوشت میں اس کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ یہ واقعہ پنجاب کے کسی مشاعرے میں ہوا تھا۔ ایک مقامی کالج کا مشاعرہ تھا۔ میں دہلی سے اس مشاعرے میں شرکت کے لئے گیا تھا۔ میں شعر پڑھنے کے سلسلے میں خاصا غیر دلچسپ ہوں۔ پیشکش کے آداب سے آج تک کامیاب انداز سے واقف نہیں ہوسکا۔ میں نے مشاعرے میں جو نظم پیش کی اور جس انداز سے پیش کی اس کا سامعین طلباء نے پرزور "ہوٹنگ" سے خیر مقدم کیا۔ مشاعرہ ختم ہوا۔ ہم لوگ اپنی جائے قیام پر آکر سوگئے۔ صبح اٹھ کر جب میں دہلی لوٹنے کے لئے نکلنے والا تھا تو منتظمین میں سے کچھ لوگ اور مجھے ایک لفافہ پیش کیا۔ میں حیران ہوا کیونکہ مشاعرے میں شمولیت کا معاوضہ تو وہ مجھے پچھلی رات مشاعرے کے اختتام کے بعد دے چکے تھے۔ میرے استفسار پر انہوں نے معذرت کے ساتھ مجھے بتایا کہ کل رات سامعین اور وہ لوگ چونکہ میرا کلام اچھی طرح سن نہیں سکے اس لئے وہ Compensetion کے طور پر کچھ مزید رقم پیش کررہے ہیں۔ وہ بہت شرمندہ تھے۔ میں بھی شرمندہ تھا کیونکہ میں نے رقم قبول کرلی۔ ممکن ہے یہ واقعہ میں نے اپنے دوست رفعت سروش کو بھی سنایا ہو۔ اسی لئے انہوں نے اسے اپنی خودنوشت میں شامل کرلیا۔

بلراج کومل کا کلام ہندوستان اور پاکستان کے سب ہی معیاری رسائل میں شائع ہوتا رہا ہے جن میں ادب لطیف' سویرا' نقوش' ادبی دنیا' اوراق' نیرنگ خیال' ذہن جدید' سنگ میل' سیپ' شاعر' آج کل' شب خون' الفاظ' شعور' افکار' ایوان اردو وغیرہ شامل ہیں۔ ان کی تصانیف درج ذیل ہیں۔

میری نظمیں (شاعری) ۱۹۵۴ء۔ رشتۂ دل (شاعری) ۱۹۶۳ء۔ ناریل کے پیڑ' (منتخب نظمیں دیوناگری حروف میں) ۱۹۶۷ء۔ ہریالی کا ایک ٹکڑا (ناولٹ۔ ہندی) ۱۹۶۸ء' سفر مدام سفر (شاعری) ۱۹۶۹ء۔ انتخابات (منتخب نظمیں) ۱۹۷۱ء' نژاد سنگ (شاعری) ۱۹۷۵ء۔ آنکھیں،

بلراج کومل

اور پاؤں (افسانے) ۱۹۸۱ء۔ پرندوں بھرا آسمان (شاعری) ۱۹۸۴ء۔ ادب کی تلاش (تنقید) ۱۹۸۵ء۔ شہر میں ایک تحریر (شاعری) ۱۹۸۷ء۔ منتخب نظمیں (انگریزی ترجمہ) ۱۹۸۹ء۔ اکیلی (منتخب نظمیں) ۱۹۸۹ء۔ پرندوں بھرا آسمان (شاعری۔ ہندی ترجمہ) ۱۹۸۹ء۔ پرندوں بھرا آسمان (انگریزی ترجمہ' اے اسکائی فل آف برڈز (A Sky Full of Bird) ۱۹۹۴ء۔ تواتر اور تسلسل (تنقید) ۱۹۹۵ء۔ اگلا ورق (شاعری) ۱۹۹۶ء۔

تراجم: خلا کے معجزے ترجمہ ونڈرز آف اسپیس (Wonders of space) از ایم سندر راجن ۱۹۸۰ء توروودت ترجمہ توروودت۔ سوانح از پدمنی سین گپتا ۱۹۸۵ء۔ سانپ اور رسی۔ ترجمہ انگریزی ناول دی سرپنٹ اینڈ دی روپ (The Serpent and the Rope) از راجہ راؤ ۱۹۹۶ء

متفرق اشعار

ذہن میں کوئی خواب رکھ دینا
دشت میں جوئے آب رکھ دینا

○

کچھ تو پڑھ لے گا رُوبرو اس کے
اپنے دل کی کتاب رکھ دینا

○

گر پرستش کا' اس کی وعدہ ہے
پاؤں میں اک گلاب رکھ دینا

بلراج کومل

عکسِ فن

رشتۂ دل

میرا اسالیبِ بیاں
میری جاں!
کیوں کیے ایجاد تو نے آج میرے واسطے
خامشی کچھ کم نہ تھی
تیری پلکیں، تیرے لب اور تیرے گیسو چُوم کر
کیا نہیں میں نے ترے دل سے کہا؟
کیا نہیں میں نے ترے دل سے سنا
قُرب کے شفّاف نکھرے آئینے میں آج تک
دن نکلتا دن رہا
رات ڈھلتی رات تھی
ہم کبھی پابندیِ اظہار کے قائل نہ تھے
یہ ہجومِ لفظ و معنیٰ، یہ اسالیبِ بیاں
میری جاں
کیوں کیے ایجاد تو نے آج میرے واسطے؟

گلزار

Gulzar
91- A, Cozy Home Society
251, Pali Hill - BANDRA BOMBAY 400050
INDIA

گلزار

(بمبئی)

قدیم سے لے کر جدید شعراء تک آپ پڑھ لیں۔ ہر شاعر اپنی علمی بصیرت اور ادبی صلاحیت کے مطابق اظہار کرے گا اور اپنی پرواز فکر سے اپنے قاری کو متاثر کرے گا۔ یہ کہنا کہ شاعری ایک غیر شعوری عمل ہے پرانی بات ہے۔ انسان کی ہر فکر میں اس کے شعور اور ارادے کا بہت بڑا عمل دخل ہے' چنانچہ گلزار کی شاعری پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی فکر اور سوچ کی پرواز بلند ہے۔ گلزار کے پاس واقعات واردات اور کیفیات کا اتنا وسیع ذخیرہ موجود ہے کہ وہ افسانہ نگار اور شاعر کم اور ایک کوزہ گر زیادہ نظر آتا ہے کہ اس کے ہنر مند ہاتھ جب قلم تھام لیں تو احساسات اور کیفیات کے وہ ظروف ڈھلتے ہیں کہ جن کے نقش و نگار کے اثرات انسان کو مدتوں اپنا اسیر رکھتے ہیں۔ (انہیں "کوزہ گر" اشفاق احمد نے کہا ہے)

گلزار نے میرے سوالنامے کا جواب فیکس کے ذریعے بھجوادیا تھا مگر وہ جواب مجھے ادھورا ادھورا سا لگا۔ چنانچہ جب میں بمبئی گئی تو گلزار سے ملنے کا پروگرام بھی دوسرے پروگراموں میں شامل تھا۔ پھر ایک صبح نو بجے میں پالی ہل باندرہ پر ان کے مکان "بوسکیانہ" میں تھی۔ گلزار اپنے روزمرہ کے پروگرام کے مطابق ٹینس کھیل کر آئے تھے اور تازہ دم نظر آرہے تھے۔ ملازم نے چائے اور مٹھائی لاکر رکھی۔ چائے کے دوران میں نے پوچھا کہ آپ نے اپنا نام بتانے سے گریز کیوں کیا؟ میرے سوال کے جواب میں کہ آپ کا پورا نام و تخلص کیا ہے؟ آپ نے فیکس کے ذریعے لکھ بھیجا کہ "یوں پوچھا گیا ہے جیسے کوئی مہرر کچہری کھاتا کھول کر پوچھتا ہے" جبکہ میرے نکتہ نظر سے آپ کے بارے میں جاننے والوں اور پڑھنے والوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ گلزار کا

نام کیا تھا۔ جیسے ساحر کا نام عبدالحئی تھا"۔

گلزار کا جواب سنئے۔ "یہ ایک کلیشے ہے (Cliche) آپ اسے کیوں برباد کرنا چاہتی ہیں۔ کوئی جو کلیشے میں بندھے رہنا چاہتے ہیں انہیں بندھے رہنے دیں۔" میں شاعر گلزار کے احساسات کا مان رکھنے پر مجبور تھی اس لئے دوسرا سوال کر ڈالا۔ "میں یہ نہیں پوچھوں گی کہ آپ کب پیدا ہوئے مگر یہ جاننا چاہوں گی کہ کہاں پیدا ہوئے۔" بولے۔ "پاکستان کے شہر دینہ ضلع جہلم میں پیدا ہوا۔ اس طرح ایک لحاظ سے میں پاکستانی بھی ہوا۔" انہوں نے مٹھائی کی پلیٹ میری طرف بڑھائی اور مزید معلومات فراہم کرتے ہوئے بولے۔ "طالب علمی کے زمانے سے میرا کلام شمع اور بیسویں صدی میں شائع ہوتا تھا۔ اب بابا کی مہربانی سے فنون میں بھی شائع ہوتا ہے۔"

بابا سے ان کی مراد جناب احمد ندیم قاسمی سے تھی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ گلزار ابھی تک قاسمی صاحب سے نہیں ملے۔ یہ ملاقاتیں ٹیلی فونی ہیں۔ ہفتے میں دو تین بار فون پر بات ہوتی ہے۔ آٹھ نو سال سے گلزار اپنے کلام پر قاسمی صاحب سے اصلاح لیتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ "یہ نظر کا رشتہ بھی نہیں ہے یہ تو روح کا رشتہ ہے۔ اپنے آپ جڑ جاتا ہے اور عروض کی غلطیاں پہلے بہت ہوتی تھیں۔ اب بھی کرتا ہوں اس پر بابا صاحب کی ڈانٹ بھی سنتا ہوں اور یہ محبت بھری ڈانٹ ہی ہے کہ میں غلطیاں کم کرنے لگا ہوں۔"

"بابا صاحب سے جان پہچان کیسے ہوئی؟" میں نے پوچھا تو گلزار نے مسکرا کر کہا۔

"میں فلمیں لکھتا بھی ہوں، ڈائریکٹ بھی کرتا ہوں، نغمے بھی لکھتا ہوں، جو کسی حد تک مقبول بھی ہوئے۔ انہیں نغموں کی بدولت پاکستان کی مشہور شاعرہ منصورہ احمد سے رابطہ ہوا اور انہوں نے میرا پہلا مجموعہ شاعری ترتیب دیا اور پاکستان سے "چاند پکھراج کا" کے نام سے شائع کیا۔ بابا احمد ندیم قاسمی نے شفقت کا ہاتھ سر پر رکھا اور اصلاح دی۔ اور "فنون" میں باقاعدہ جگہ دے کر! "چاند پکھراج کا" بعد میں ہندوستان میں بھی اردو اور ہندی رسم الخط میں شائع ہوا۔ پچھلے سال یعنی ۱۹۹۵ء میں منصورہ احمد نے میرے افسانوں کا مجموعہ "دستخط" کے نام سے شائع کیا۔ اس مجموعے میں اشفاق احمد صاحب نے عنایت کی اور میرا تعارف لکھا۔

بابا نے بحیثیت شاعر کے ادب میں میری پہچان کرائی۔ جس کی بدولت طفیل اختر صاحب جیسے دوست ملے اور جن کے ذریعے اب آپ سے رابطہ ہوا ہے۔"

"آپ نے شاعری میں کوئی نیا تجربہ بھی تو کیا ہے، وہ کیا ہے؟ اس سلسلے میں گلزار نے تفصیل سے سمجھاتے ہوئے کہا کہ "میں نے شاعری میں ایک نئی فارم (Form) پیدا کرنے کی

کوشش کی ہے جس کا نام "تروینی" رکھا ہے۔ یہ ہائیکو بھی نہیں، مثلث بھی نہیں، یہ تین مصرعوں کی نظم بھی نہیں، اس میں پہلے دو مصرعے ایک پورا مکمل شعر ہیں۔ خیال پہلے دو مصرعوں میں مکمل ہو جاتا ہے۔ تیسرا مصرعہ روشن دان کی طرح کھلتا ہے۔ اس کی روشنی میں پہلے شعر کا تاثر بدل جاتا ہے۔ تیسرا مصرع Comment بھی ہو سکتا ہے، اضافہ بھی۔ "تروینی" میں ایک شوخی اور Surprise کا رنگ ہے۔"

وہ سلسلہ گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ "اصل میں تروینی نام میں نے یوں رکھا کہ الہ آباد میں گنگا، جمنا اور سرسوتی تین بہاؤ ہیں۔ سرسوتی زمین کے نیچے ہے جن کے نشان پاکستان میں ٹیکسلا کے مقام پر ملتے ہیں۔ میں نے اسی پر یہ نام رکھ دیا۔ میں نے ہندی کے شاعر ہرونش رائے بچن جی (امیتابھ بچن کے والد صاحب) کو اپنی تروینی سنائی تھیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ وہ بھی کوشش کریں گے۔ میری تروینی ہندوستان کے ہندی رسالوں "کملیشور اور سارِیکا" میں بھی چھپتی رہیں۔ ایک بار ریڈیو پر میرا انٹرویو ہوا تو انہوں نے کہا تروینی سنایئے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ ریڈیو تک یہ فارم پہنچی۔ دوسری بار میں روٹری کلب کے مشاعرے میں احمد آباد گیا۔ مجھ سے کہا گیا کہ آپ مشاعرے کے بارے میں دو لفظ کہئے۔ مجمع سے آواز آئی۔ دو نہیں تین لفظ کہئے۔ تروینی سنایئے۔ یوں معلوم ہوا، حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی کہ تروینی نے سفر کیا ہے۔ لوگ اس کے بارے میں نہ صرف جانتے ہیں بلکہ پسند بھی کرتے ہیں۔ لوگوں کو میری تروینی یاد تھیں انہوں نے مجھے یاد دلا کر مجھ سے سنیں۔ میں نے بابا کو بھی بتائیں، انہوں نے بھی پسند کیں اور انہوں نے ایک اور فارم سے متعارف کرایا۔ اسے "ترائیلے" کہتے ہیں۔ اس میں ایک مصرعہ تین بار کروٹ لیتا ہے۔ اس میں سات مصرعہ ہوتے ہیں۔"

"ہندوستان میں اردو کا مستقبل کیا ہے؟ اس سوال کے جواب میں گلزار نے کہا کہ اردو کو باقی رکھنے کے لئے اس میں حالات کے مطابق چلنا چاہئے۔ دیوناگری رسم الخط میں بھی اردو پڑھی جا سکتی ہے۔" انہوں نے شبانہ اعظمی کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ وہ کیفی اعظمی کی بیٹی ہیں۔ بہت خوبصورت اردو بولتی ہیں، مگر اردو رسم الخط نہیں پڑھ سکتیں۔ جس طرح پنجابی کے دو رسم الخط ہیں فارسی اور گورمکھی اسی طرح اردو کے بھی دو رسم الخط ہو سکتے ہیں۔ اگر ہم ضد بحث میں الجھے تو اردو زبان کو بہت نقصان پہنچے گا۔"

آج کی شاعری کا رشتہ اپنی دھرتی سے جڑا ہوا ہے یا نہیں اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ مجروح، شکیل، اختر الایمان، ڈاکٹر بشیر بدر، کیفی اور ندا فاضلی کے بعد اردو شاعری میں جاوید اختر کی آمد نے ایک نیا دریچہ کھولا اور تازہ ہوا سے اردو شاعری کو توانائی بخشی ہے۔ جاوید

کی شاعری پڑھیں تو محسوس ہوگا کہ زندگی کے تجربات اور مشاہدات کی زندہ تصویریں سامنے ہیں۔ ہمارے آج کے بہت سے شعراء بہت خوبصورت اور جیتی جاگتی شاعری کر رہے ہیں۔ یقیناً ان کا رشتہ اپنی دھرتی سے جڑا ہے اور اپنے گرد و پیش کے مسائل کا احاطہ کئے ہوئے ہے"۔

گلزار کی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ ٹورنٹو کی رینا سنگھ نے "سائیلنسز" کے نام سے کیا ہے جسے دہلی کی روپا اینڈ کمپنی نے چھاپا ہے۔ ان کا تیسرا مجموعہ بھی زیر ترتیب ہے جس کا عنوان گلزار نے "پاجی نظمیں" تجویز کیا ہے۔ انگریزی میں آپ اسے Naughty Poems بھی کہہ سکتے ہیں۔

ہندوستانی فلم انڈسٹری کو گلزار نے کئی خوبصورت فلمیں دی ہیں۔ کتاب، اجازت اور خوبصورت۔ ان کی اگلی فلم کا نام ہے "لباس" جس میں شبانہ اعظمی اور نصیرالدین شاہ ہیں۔ گلزار کہتے ہیں۔ "ان ادبی یا تحریری کاموں کے علاوہ ایک سیریل مرزا غالب کی زندگی پر بنایا، جو صرف ہندوستان میں "دوردرشن" پر نشر ہوا۔ کاش یہ خدمت وہاں تک پہنچ جاتی، جہاں جہاں مرزا غالب پہنچے ہیں۔ خدمتگاری کی صورت سہی، میں بھی کہیں پہنچ جاتا۔"

غزل

کاغذ کا اک چاند لگاکر، رات اندھیری کھڑکی میں
دل میں کتنے خوش تھے اپنی فرقت کی آرائش پر
دھوپ اور چھاؤں بانٹ کے تم نے آنگن میں دیوار چنی
کیا اتنا آسان ہے زندہ رہنا اس آسائش پر
شاید تین نجومی میری موت پہ آکر پہنچیں گے
ایسا ہی اک بار ہوا تھا، عیسیٰ کی پیدائش پر

عکسِ فن

تروینی

اڑ کے جاتے ہوئے پنچھی نے بس اتنا دیکھا
دیر تک ہاتھ ہلاتی رہی شاخ فضا میں
الوداع کہنے کو؟ یا پاس بلانے کے لئے؟

○

شعلہ سا گزر جاتا ہے میرے جسم سے ہوکر
کس تو سے اتارا ہے خداوند نے تم کو!
تنکوں کا مرا گھر ہے، کبھی آؤ تو کیا ہو؟

○

سب پہ آتی ہے، سب کی باری سے
موت انصاف کی علامت ہے!
زندگی سب پہ کیوں نہیں آتی؟

غزل

اوس پڑی تھی رات بہت اور کہرہ تھا گرمائش پر
سیلی سی خاموشی میں وہ بولے کچھ فرمائش پر
فاصلے ہیں بھی اور نہیں بھی، ناپا تولا کچھ بھی نہیں
لوگ بضد رہتے ہیں پھر بھی رشتوں کی پیمائش پر
منہ موڑا اور دیکھا کتنی دور کھڑے تھے ہم دونوں؟
آپ لڑے تھے ہم سے بس اک کروٹ کی گنجائش پر
دل کا حجرہ کتنی بار اجڑا بھی اور بسایا بھی
ساری عمر کہاں ٹھہرا ہے کوئی ایک رہائش پر

گلشن کھنہ

سہما سہما موت کے منہ میں
راہِ جہاں میں ہے آوارا

گلشن کھنہ

Gulshan Khanna
92, Grove Road
Hounslow, TW3 . 3PT, U.K.

گلشن کھنہ

(لندن)

وہ اردو کے شیدائی ہی تو تھے جنھوں نے اپنی تیسری نسل کو۔ یعنی اپنے پوتے کو نہ صرف اردو زبان سکھائی بلکہ اپنے ورثے سے بھی محبت کرنا سکھائی اور یہ گلشن کھنہ کی اردو سے محبت ہی تو ہے کہ انھوں نے اردو سیکھنے اور سکھانے کے لئے ایک کتاب بھی تصنیف کرڈالی۔ (نام آپ ان کی تخلیقات کی فہرست میں پڑھ سکتے ہیں۔)

ضلع گوجرانوالہ کے شہر حافظ آباد (پاکستان) میں فروری ۱۹۳۴ء میں ایک لڑکے نے حافظ آباد کے معزز اور امیر ترین کھتری خاندان میں جنم لیا۔ دادا سردار میوا سنگھ کھنہ نے بچے کا نام گورنام کھنہ رکھا۔ دادا انگریزی زبان کے ماہر لیکن اردو کے رسیا تھے۔ چنانچہ گورنام کو ساڑھے چار برس کی عمر میں اسکول میں داخل کرادیا۔ دادا نے بچے کی تعلیم میں بھرپور دلچسپی لینا شروع کی اور ایک سال آگے کے درجہ کی کتابیں خرید کر گورنام کو پڑھا دیتے تھے۔ اس طرح بارہ سال کی عمر میں ہی گورنام نے بہت سی درسی اور غیر درسی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ گھر میں اخبار اور رسائل بھی آتے تھے۔ اس وقت کے ممتاز اور نامور صحافی آن جہانی سردار دیوان سنگھ مفتون ان کے قریبی رشتہ داروں میں سے تھے۔ ان کا ہفت روزہ اخبار سیاست' باقاعدگی سے ان کے گھر آتا تھا۔ گورنام کے دادا' والد' تایا اور دوسرے افراد بڑے شوق سے رسائل اور کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ پھر گورنام کو شوق کیوں نہ ہوتا۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم کے وقت گورنام تیرہ سال کے تھے۔ پاکستان ظہور میں آیا تو وہاں سے قافلے ہجرت کرنے لگے۔ پورے ملک میں فرقہ وارانہ فسادات کا بازار گرم ہو چکا تھا۔ قتل وغارت گری اور آتش زنی کے روح فرسا مناظر تیرہ سال کے بچے نے بھی دیکھے۔ اس آگ برساتے تجربے نے اس کے وجود کو زخمی زخمی کردیا۔ اس سیلاب بلا میں ان کا قافلہ بھی خس

وخاشاک کی طرح بہتا بہاتا امرتسر پہنچا۔ کھنہ کے چار چچا پہلے ہی امرتسر میں آباد تھے۔ ایک مقامی ہائی اسکول میں چچا زاد پڑھتے تھے۔ گورنام کو بھی وہیں داخل کرا دیا گیا پھر انہوں نے ۱۹۵۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ بچپن گزر چکا تھا۔ شعور نے انگڑائیاں لی تھیں۔ اندر کی ٹوٹ پھوٹ نے ایک نئے انسان کو جنم دیا۔ گورنام نے کچھ عرصہ کے لئے تایا کے ہمراہ ان کے کاروباری معاملات میں ہاتھ بٹایا۔ ساتھ ہی ان کے اندر کے نئے انسان نے اپنے احساسات کے لئے قلم اٹھایا۔ ۱۹۵۲ء میں ان کا وہ پہلا افسانہ تھا جو گورنام کھنہ کے نام سے دہلی کے ایک ہفت روزہ میں شائع ہوا۔ عوام سے پذیرائی ملی تو گورنام کھنہ نے اور کئی افسانے لکھے جو بھارت کے مختلف ادبی، نیم ادبی اور فلمی رسائل میں شائع ہونے لگے۔

یہ ۱۹۵۴ء کی بات ہے جب کھنہ نے تایا کا بزنس چھوڑ کر کالج میں داخلہ لیا۔ اسی سال کالج میں ایک مشاعرہ ہوا۔ کھنہ جو کبھی کبھی طبع آزمائی کرتے تھے، ایک غزل لکھ کر بحیثیت میزبان کالج کے مشاعرے میں اسٹیج پر پہلی بار جلوہ گر ہوئے۔ پھر تو یہی کالج کے مشاعرے ان کے رہنما، ان کے استاد بن گئے۔ انہوں نے گلشن تخلص اختیار کیا اور اپنے احساسات کو شعر کی زبان دے دی۔

۱۹۵۸ء میں پنجاب یونیورسٹی سے گریجویشن کے بعد دہلی کے محکمہ وزارت صحت میں ملازمت کرلی۔ ساتھ ہی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ یوں ۱۹۶۲ء میں آگرہ یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم۔اے کرلیا۔ ۱۹۶۳ء کے آخر میں ہندوستان چھوڑ کر جرمنی جا بسے۔ علم کی پیاس بجھانے کو جرمن زبان سیکھی۔ گردش وقت انہیں اور آگے لے گئی اور دوستوں کے بلانے پر جرمنی چھوڑ لندن پہنچ گئے۔ پھر لندن یونیورسٹی سے پوسٹ گریجویٹ سرٹیفکیٹ تدریس میں اور رائل سوسائٹی آف آرٹس سے ٹیچرز ڈپلومہ حاصل کر کے لندن میں درس و تدریس کے پیشے سے منسلک ہو گئے۔

گلشن کے تخلیقی سفر کا پہلا دور ۱۹۵۲ء سے ۱۹۶۲ء تک کا ہے۔ ان دس برسوں میں انہوں نے ڈھیروں افسانے لکھے جو ہندوپاک کے مختلف رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ ان میں شاعر (بمبئی) شمع، بیسویں صدی، فلمی ستارے، چترا ویکلی، اور موی اسٹار دہلی۔ منشور، افکار اور روپ کراچی سہ ماہی ابلاغ پشاور ماہنامہ صدا اور شفیق لندن کا نام قابل ذکر ہے۔

گلشن کے تخلیقی سفر کا دوسرا دور ۱۹۷۳ء سے شروع ہوا۔ جب انہیں غم روزگار سے کچھ فرصت تھی۔ انہی دنوں لندن میں مقیم نامور شعراء اور ادیبوں سے بھی ملاقات رہی اور یوں دوستوں کی صحبت اور مشاعروں کی محفلوں نے ان کے شوق کو مہمیز دی۔ گو کہ گلشن کھنہ کی

گلشن کھنہ
شہرادب میں آمد بحیثیت افسانہ نگار ہوئی لیکن لندن کی ادبی سرگرمیوں میں شاعر کی حیثیت سے زیادہ معروف ہیں۔

گلشن کھنہ اردو کے ساتھ ہندی اور انگریزی میں بھی لکھتے ہیں۔ ان کی انگریزی کی چند نظمیں بی بی سی ٹیلیویژن لندن سے ٹیلی کاسٹ ہو چکی ہیں۔ ان کی وابستگی ترقی پسند تحریک سے بھی ہے۔ صحت مند ادب اور جدید رجحانات کے پرستار ہیں۔ پروگریسو رائٹرز ہونسلو برانچ کے ایک سرگرم رکن بھی ہیں۔

گلشن کھنہ آسان زبان لکھنے کے قائل ہیں۔ وہ ادب میں ابلاغ کو ضروری خیال نہیں کرتے۔ تعمیری اور اصلاحی تنقید کو ادب کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں تاکہ اچھا ادب تخلیق کرنے میں معاونت حاصل ہو۔ ان کے نزدیک ادب اظہار ذات بھی ہے اور اظہار کائنات بھی۔

تخلیقات :۔

اردو زبان میں

۱۔ بارش میں ایک آدمی (افسانوی مجموعہ)
۲۔ بکھرے بکھرے خواب (شعری مجموعہ)
۳۔ نادان ناول (زیر طبع)
۴۔ اکاش وجے (ناولٹ۔ زیر طبع)

انگریزی میں

1- A Help to the Study of English Literary Criticim.
2- Diwali...The Festival of Lights.
3- Six Festivals of India.
4- The Story of Guru Nanak.
5- Teach Jonrsef Urdu (Through English)

عکسِ فن

غزل

ہرے شجر نہ سہی خشک گھاس رہنے دو
زمیں کے جسم پہ کوئی لباس رہنے دو

میں زندگی کی کڑی دھوپ میں اکیلا ہوں
فریبِ ابر مرے آس پاس رہنے دو

اذیتیں ہی محبت کی روح ہوتی ہیں
مرے وُجود میں اتنی سی آس رہنے دو

ہماری پیاس کبھی تو کوئی بجھائے گا
لرزتے ہاتھوں میں خالی گلاس رہنے دو

میں ایک گلشن بے رنگ ہوں، خدا کے لئے
مری فضا میں امیدوں کی باس رہنے دو

مرزا محبوب بیگ

شیخ بے سجدہ دعا رہ جائے ایماں کا بھرم
برہمن کو مستی میں مے رہ جائے بتخانے کی لاج

محبوب دہلوی
15/ستمبر 1995

Mirza Mahboob Beg
4054, W . 141, St
HAWTHORNE . CA 90250 - U.S.A.

مرزا محبوب بیگ
(لاس اینجلس)

مرزا محبوب بیگ نام اور تخلص محبوب دہلوی ہے۔ ۲۲ مئی ۱۹۲۱ء کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ جسے عرف عام میں دلی یا بائیس خواجہ کی چوکھٹ بھی کہتے ہیں۔

تعلیم انٹرمیڈیٹ تک حاصل کی اور پھر چالیس سال ریلوے میں ٹکٹ انسپکٹری کی جس کی وجہ سے ہندوستان کا چپہ چپہ اور پاکستان کا قریہ قریہ گھوما اور کچھ دوسرے ممالک بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ کہتے ہیں کہ لیلیٰ شاعری نے کچھ ایسا اسیر کیا کہ بس اسی کا ہو کر رہ گیا۔ چنانچہ اردو ادب کی دیگر اصناف کی طرف بڑھنے کی کبھی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔

مرزا محبوب نے ایک ادبی گھرانے میں آنکھ کھولی۔ بڑے بھائی مرزا مسعود بیگ، مسعود دہلوی، پھوپھا مرزا محمود بیگ محمود دہلوی۔ اچھے شاعر تھے اور خالو جناب سید ولی اشرف صبوحی دہلوی۔ اردو کی ٹکسالی زبان کے ماہر اور ممتاز انشا پرداز تھے۔

کہتے ہیں "اچھا شعر جب ہی وجود میں آتا ہے جب کوئی چیز دل کو متاثر کرے۔ چاہے وہ خوشی ہو یا غم۔ یا کوئی ہستی دل میں اتر جائے۔ یا کوئی منظر پسند آجائے۔ یا کسی بھی وجہ سے دل پر چوٹ لگے یا پھر وجدانی کیفیت طاری ہو۔ چنانچہ میں نے جب شاعری شروع کی اس وقت غزل میں حضرت جگر مراد آبادی اور نظم میں حضرت جوش ملیح آبادی کا سارے ہندوستان میں طوطی بولتا تھا اور انہی دونوں حضرات سے میں کافی متاثر ہوں۔ میں کسی نظریئے کے تحت شعر نہیں کہتا صرف اور صرف اپنے دل کے جذبات کی تسکین کے لئے الفاظ کا تانا بان بن لیتا ہوں اور بس۔ میں نے شاعری کو کبھی وجہ شہرت نہیں بنایا۔ مجھے غم روزگار نے اتنا وقت ہی نہیں دیا کہ تصنیف

و تالیف کا باقاعدہ سلسلہ جاری رکھتا۔ بس کبھی کبھار ساقی دہلی یا انجام دہلی میں کچھ اشاعت کے لئے بھیجا اور پھر پاکستان میں بھی انہی مصروفیات کی وجہ سے کم ہی اخبارات میں چھپوایا۔ اب یہاں امریکہ آکر فرصت دستیاب ہے تو اپنا شوق پورا کرلیتا ہوں اور اپنی تک بندی "پاکستان لنک" والوں کو بھیج دیتا ہوں۔ یہ ان کی مہربانی ہے کہ وہ چھاپ دیتے ہیں۔ یہ ہی وجہ ہے کہ میں نے اپنا مجموعہ کلام چھپوانے کی آج تک سنجیدہ کوشش نہیں کی۔"

ان کا کہنا ہے کہ ادب اظہار ذات بھی ہو اور اظہار کائنات ہو۔ زبان اور اسلوب دونوں عام فہم ہوں تاکہ زیادہ سے یادہ لوگ اس کو سمجھ سکیں لیکن جو کچھ بھی کہا جائے وہ ادب کے دائرے میں ہو اور بے تکے اور عامیانہ الفاظ سے پرہیز کیا جائے۔ ادب کے فروغ کے لئے ابلاغ بہت ضروری ہے"۔

تنقید کے ضمن میں ان کا کہنا ہے کہ تنقید ادب و شاعری میں جب ہی مفید ثابت ہو سکتی ہے کہ تنقید برائے تنقید نہ ہو بلکہ برائے اصلاح ہو اور تنقیدی شعری محفلیں جب ہی معاون ثابت ہو سکتی ہیں کہ کسی کی ہتک نہ ہو۔ کسی کا ذاق نہ اڑایا جائے اور کسی کی دل آزاری نہ کی جائے۔ بلکہ صحیح سمت کی طرف ہنمائی کی جائے۔ یوں تو مرزا غالب اور علامہ اقبال علیہ رحمتہ پر بھی لوگوں نے خوب خوب تنقیدیں کی ہیں اور اپنی اپنی دکانیں چمکائی ہیں لیکن اردو ادب کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ عیب کس میں نہیں ہوتے۔ دنیا کا کوئی انسان عیب سے خالی نہیں۔ سوائے اللہ کی ذات کے کہ وہ تمام عیوب سے پاک ہے اور دنیا کی ہر کتاب اور ہر کلام نامکمل اور ناتمام ہے۔ سوائے قرآن حکیم فرقان حمید کے کہ جو کلام حق ہے اور مکمل ہے۔ اور رہتی دنیا تک کے لئے ہے۔

موجودہ ادب کے بارے میں کہتے ہیں کہ "گزرتے زمانے میں اہل علم و دانش کی قدر کی جاتی تھی اور ان حضرات کا ایک مقام ہوتا تھا اور وہ اپنی ذمہ داری کو سمجھتے تھے۔ اس لئے اچھا اور معیاری ادب پیدا ہوتا تھا اور لوگ اس سے کچھ سیکھتے تھے لیکن اس زمانے میں یہ باتیں مفقود ہیں۔ یہ علم کی بے قدری کا دور ہے۔ حضرت حافظ شیرازی نے اسی وقت کے لئے شاید یہ شعر کہا تھا۔

طوق زرین ہمہ در گردن خرمی بنیم

علم و ادب کی جگہ سائنس نے لے لی ہے اور اب دنیا مادے کی طرف گامزن ہے۔ لوگوں نے روحانیت سے ناطہ توڑ لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان جو کبھی اشرف المخلوقات کہلاتا تھا اب حیوان بنتا جارہا ہے۔ نہ شرم و حیا ہے نہ شرافت ہے۔ نہ محبت و خلوص ہے اور نہ ادب و آداب

ہیں۔ اسی لئے اب سستا، لچر اور پوچ ادب پیدا ہو رہا ہے کیونکہ لکھنے والا خود صاحب علم و دانش اور صاحب فراست نہیں ہوتا اب اس زمانے میں کون ہے جو حضرت سعدی علیہ رحمتہ کی گلستان و بوستان پڑھے۔ کون مثنوی مولانا روم کی ورق گردانی کرے۔ کون مولانا جامی، حافظ، خیام، فردوسی اور عرفی کو پڑھے۔ اب اردو کی طرف آیئے تو کس کو فرصت ہے کہ میر، غالب، مومن، داغ اور علامہ اقبال کو پڑھے اور سمجھے۔ کون خطوط غالب کو پڑھتا ہے۔ کون علامہ اقبال کے خطبات مدارس کا مطالعہ کرتا ہے۔ کون محمد حسین آزاد کی آب حیات کا مطالعہ کرتا ہے۔ کون علامہ راشد الخیری کی صبح زندگی اور شام زندگی پر نظر ڈالتا ہے۔ آج تو لوگ قرآن حکیم فرقان حمید کو بھی بس پشت ڈالے ہوئے ہیں اور کتب احادیث کی کوئی قدر نہیں ہے تو بیچاری ان معیاری ادب کی کتابوں کو کون پوچھے گا۔ بس میری اتنی مخلصانہ گزارش ہے کہ جو بھی حضرات علم و ادب کے میدان میں اترنا چاہیں، پہلے اچھے اور معیاری ادب کی کتابوں کا مطالعہ کریں۔ اپنے علم و فراست میں وسعت پیدا کریں اور انداز تحریر کو نکھاریں پھر قلم اٹھائیں تاکہ اردو ادب کی کوئی خدمت ہو سکے"۔

اردو کی بقا کے لئے ان کی تجویز ہے کہ والدین کو چاہئے کہ کم از کم گھر میں اردو بولیں۔ اردو پڑھیں اور اردو لکھیں اور بچے کو بھی اردو زبان سیکھنے کی طرف راغب کریں۔ کیونکہ بچے کا پہلا مکتب گھر ہے۔

آج بڑا ادب تخلیق نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ علامہ اقبال علیہ رحمتہ کے بعد ہم ایسا شعری ادب تخلیق کرنے میں ناکام رہے ہیں کیونکہ آج کے شاعر و ادیب کا دامن گہرے مطالعے اور عمیق فکر و نظر کی نعمت سے خالی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ طنز و مزاح اچھی چیز ہے بشرطیکہ یہ دائرۂ ادب میں ہو جیسے مرحوم اکبر الہ آبادی کی رباعیات لیکن اگر یہ ادب کے دائرے سے باہر ہو جائے تو پھر یہ پھکڑپن بن جاتا ہے۔

مرزا محبوب بیگ

عکسِ فن

متفرق اشعار

چلا ہوں میں اب سُوئے مدینہ، اجَل سے کہہ دو ابھی نہ آئے
تمہارے دَر تک پہنچ کے آقا وہاں سے جانا کبھی نہ آئے

○

دعائے محبُوب بس یہی ہے جہاں میں اسلام خوب چمکے
نہ ہوں مسلماں مزید رُسوا زوال ان پر کبھی نہ آئے

○

اپنی نمناک نگاہوں کا یہ طوفان نہ روک
گرد دُھل جاتی ہے بارش کے برَس جانے سے

ان سے ملنے کے مَواقع تو بہت ہیں محبُوبؔ
خوف آتا ہے مگر دل کے بہک جانے سے

نعتیہ قطعہ

بعد اللہ کے نام ہے تیرا
ذکر قرآں میں عام ہے تیرا

خُود خُدا تجھ پہ بھیجتا ہے درُود
کتنا اعلیٰ مقام ہے تیرا

عبداللطیف خان محظوظ

مغرور ہیں سر کو جھکا بھی نہیں سکتے
جو بات ہو معقول چھپا بھی نہیں سکتے

اُن کو تو اُٹھائیں جو عزت سے بلند ہو
عزت کا تقاضہ ہے تو آ بھی نہیں سکتے

محمد عبداللطیف خان محظوظ
مالمو ۱۶ ستمبر ۱۹۹۵

Abdul Latif Khan Mahezooz
Vom Rosens
VAG - 1, 21366 MALMO - SWEDEN

عبدالطیف خان محظوظ

(سویڈن)

یہ بات غلط نہیں کہ ہمارے اکثر بزرگ شعراء نوجوان شعراء کے اشعار پر داد دینے سے گریز کرتے ہیں۔ ایک محفل میں کسی نے کہا کہ وہ ان نوجوانوں کی روشنی طبع کو دیکھ کر خوفزدہ ہیں کہیں یہ مشاعروں سے ان کا نام ہی نہ کٹوا دیں۔

لیکن ایسا نہیں ہے۔ نو آموز شعراء کو داد نہ دینا بخل ہی نہیں نفاق بھی ہے۔ اور پھر جناب محشر بدایونی کتنی سچی بات کہہ گئے ہیں کہ:

اب ہوائیں ہی کریں گی روشنی کا فیصلہ
جس دیئے میں جان ہوگی وہ دیا رہ جائے گا

اس کے علاوہ بزرگ شاعر جوہر سعیدی نے بھی اعتراف (اپنے انٹرویو میں) کیا ہے کہ جدید غزل اور اس کے لہجے (Diction) پر انہوں نے غور کیا تو انہیں ان میں بہت سی باتیں پسند آئیں اور انہوں نے خود بھی وہ لہجہ اپنایا اور ان کی شاعری میں نئے شعراء کو پڑھ کر نمایاں تبدیلی آئی۔ اس ضمن میں انہوں نے قدرے سینئر شعراء میں سلیم کوثر اور جناب جمال احسانی کا نام لیا۔ جونیئر میں عزم بہزاد' راشد نور' لیاقت علی عاصم' احمد نوید' امتیاز ساغر' خالد معین' فیاض وید' شاداب احسانی' حسنین جعفری' عارف امام اور محسن اسرار کے نام لئے۔

سویڈن کے لطیف محظوظ بھی شعروادب کی دنیا میں نوارد ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ "طبعی طور پر میں آرٹسٹ ہوں۔ شاعری سے لگاؤ تو بچپن سے رہا لیکن خصوصی طور پر توجہ صرف تین سال قبل دی ہے۔ ابھی طفل مکتب ہوں اسی لئے کسی نظریئے سے بھی وابستگی اختیار نہیں کی لیکن اتنا کہہ

سکتا ہوں کہ اچھا شعر وہ ہے جو سمجھ میں آجائے۔ دل پر اثر کرے اور یہی اس کا ابلاغ ہے"۔

عبدالطیف خان جن کا تخلص محظوظ ہے ۲۸ دسمبر ۱۹۳۸ء کو پٹیالیہ اسٹیٹ (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔ بی ایس سی پنجاب یونیورسٹی سے کیا۔ پھر لندن سے ایڈمنسٹریشن اور مینجمنٹ میں ڈپلومہ لیا۔ اس کے بعد ڈائٹ اینڈ نیوٹریشن میں (Diet and Nutrition) ڈپلوما لیا۔ حالیہ ملازمت بچوں کو اردو میں تدریس کی ہے۔ ۱۹۷۰ء تک ان کا قیام لاہور پاکستان میں رہا۔ اس کے بعد تین سال تک سویڈن' دس سال ناروے اور چار سال انگلینڈ میں رہے۔ ان دنوں مالمو سویڈن میں مقیم ہیں۔

انہیں شعر کہنے کے لئے کسی تحریک کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کہتے ہیں "بعض اوقات تو پوری غزل ایک نشست میں ہی لکھ لیتا ہوں۔ اور کبھی کئی کئی ہفتے کوئی شعر موزوں نہیں ہوتا۔ لیکن کبھی کبھار یہ ہوتا ہے کہ خواب میں کوئی مطلع زبان پر جاری ہوا اور آنکھ کھلتے ہی اسے لکھ لیا اور پھر اس کے تحت پوری غزل کہہ دی۔"

محظوظ کا کلام ماہنامہ شمع دہلی' روزنامہ جنگ لندن و کراچی اور پندرہ روزہ وقار ڈنمارک میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ دوست احباب ان کی بے حد حوصلہ افزائی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بہت قلیل عرصہ میں یہ آگے نکل گئے ہیں۔ مگر ابھی ان کا کوئی مجموعہ کلام نہیں آیا۔ محظوظ کہتے ہیں "تنقید ادب میں نئی راہیں کھولے نہ کھولے مگر ادب میں ایک رنگ ضرور پیدا کرتی ہے"۔ محظوظ اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں۔ ان کے خیال میں یہ عالمی مسئلہ ہے کیونکہ جب پرنٹ میڈیا کا دور الیکٹرانک میڈیا کی طرف گیا تو یہ مسئلہ پیدا ہوا ہے۔ اس لئے شاعری اور ادب کے لئے بھی الیکٹرانک میڈیا کو استعمال کرنا چاہیے۔ کہتے ہیں "اردو زبان ایک آفاقی زبان ہوتی جا رہی ہے لیکن جہاں تک کتب اور رسائل کی عوام میں مقبولیت کا تعلق ہے تو میرے خیال میں آج کل کے دور میں مغربیت بہت حد تک سرائیت کر چکی ہے۔ عام لوگ بالخصوص نوجوان طبقہ مغربی موسیقی سننے اور فلمیں دیکھنے میں اپنا وقت صرف کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ادبی رسائل (خاص طور پر اردو) کتب یا اخبار کے لئے وہ بہت ہی کم وقت دیتا ہے۔ یورپ اور امریکہ وغیرہ میں جو بچے پروان چڑھے ہیں وہ اگرچہ گھر میں اردو زبان کے بولے جانے کی وجہ سے اردو بولنا تو سیکھ لیتے ہیں مگر پڑھنا اور لکھنا نہیں جانتے۔ لہٰذا وہ اردو ادب کو کیا پڑھیں اور سمجھیں گے۔ اس لئے انہیں اردو لکھنا اور بولنا سکھانا بہت ضروری ہے"۔

محظوظ کہتے ہیں "تنقید نگار ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ آج کل چبائے ہوئے نوالے اگلے جا رہے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کل شاعر اور ادیب سچی محنت سے جی چراتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں

کہ چند پرانے اور بڑے شعراء کے کتابچے پڑھ کر ان کے اشعار کے ہم وزن اور ہم قافیہ شعر گڑھ کر چند لمحوں میں غزل یا نظم کہہ دی جائے۔ اور جلد سے جلد ایک اپنی کتاب چھپوا کر صاحب دیوان کہلانے لگیں۔ اس طرح شاعری کو دوام کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ جب کہ ایک اچھے شاعر کے لئے شاعر کا نکتہ نظر واضح، تجربہ اور مثبت فکر و مطالعہ بہت ضروری ہے جس پر عمل آج کل کم ہو رہا ہے"۔ کہتے ہیں میرا اپنا مطالعہ کیونکہ بہت کم ہے۔ اس لئے ان خوبیوں کے مالک شعراء کے نام گنوانا تو بہت مشکل ہے۔ البتہ چند شعراء جن کو سنا ہے اور چند شعراء سے ملاقات بھی ہوئی ہے وہ ہیں جون ایلیا، عبید اللہ علیم، (ان سے ملاقات بھی ہوئی ہے پچھلے سال مالمو سویڈن تشریف لائے تھے۔ اور ایک روز میرے ہاں قیام فرمایا تھا۔ پھر ان کی شام بھی منائی گئی تھی اور وہاں اطمینان سے کلام سننے کا موقعہ بھی ملا) اسی طرح دو سال قبل اوسلو کے عالمی مشاعرہ میں مجھے بھی بلایا گیا تھا۔ وہاں اپنی غزل پڑھنے کے علاوہ جن شعراء کو سنا اور جن سے طویل ملاقاتیں رہیں اور جن کی شاعری نے متاثر کیا ان میں حمایت علی شاعر، انور شعور، پروفیسر انعام الحق جاوید، احمد ندیم قاسمی، دہلی کے ڈاکٹر خورشید عالم الہ آبادی، تاجور سلطانہ اور ہرچرن چاؤلہ (اگرچہ وہ شاعر تو نہیں افسانہ نگار ہیں لیکن اوسلو کے مشاعرے میں میری غزل ترنم سے سننے کے بعد مداحوں میں شامل ہو گئے ہیں اور اس کے بعد سے اب تک خطوط اور آڈیو کیسٹس کا سلسلہ جاری ہے۔) پروین شاکر جو اب ہم میں نہیں ہیں اور شہناز نور وغیرہ۔ مجھے یقین ہے اور امید بھی کہ بہت سے نئے کہنے والے بھی انشاء اللہ محنت کریں گے تو ایک دن اردو ادب میں اپنا مقام ضرور پیدا کر لیں گے۔

عبداللطیف محظوظ

عکس فنون

غزل

انداز ان کا ہم کو سب سے جدا لگا
فرمایا جو انہوں نے ہم کو بجا لگا

گلشن میں صرف لالہ گل ہی حسین نہ تھے
ہر پھول جو کھلا تھا وہ ہم کو بھلا لگا

آنکھوں میں اعتبار کا منظر عجیب تھا
سوکھا ہوا تھا پیڑ جو ہم کو ہرا لگا

ہم نے تو ایسی ویسی کوئی بات کی نہ تھی
نہ جانے ان کو پھر بھی وہ سب کیوں برا لگا

یکساں سلوک ہم نے ہر اک سے روا رکھا
اس سے غرض نہ تھی کہ کوئی میرا کیا لگا

محظوظ ہیں کہ مارے خوشی کے اچھل پڑا
آکے جو میرے سینے سے دشمن مرا لگا

ڈاکٹر مختار الدین احمد

یقیں کی آگ میں تپ کر ڈھلے تھے ہم مختار
ہمارے کاسے سے وہم و گمان جلتا تھا

مختار الدین احمد

Dr. M.U. Ahmed
Springfield Houl. Farm
Moorland NDRTH, Raven Field ROTHERHAM
5654, L2 - U.K.

ڈاکٹر مختار الدین احمد

(لندن)

مختار الدین احمد پیشے کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں مگر ادب لطیف پر نظر رکھتے ہیں۔ اگر شخصیت فرد کی نفسیاتی تعبیر کا نام ہے تو ڈاکٹر مختار الدین اس تعریف پر پورے اترتے ہیں۔ مجھے ان کے کلام کے گہرے مطالعہ کا موقع نہیں ملا مگر انہیں میں نے جتنا پڑھا اور سنا ہے اس سے اندازہ کیا ہے کہ ڈاکٹر مختارالدین نے اپنے مشاہدات اور واقعات کے نتائج کے ارتباط کو شاعری کے روپ میں ڈھالا ہے۔ ان کے کلام میں سوچ کے مختلف زاویے ملتے ہیں۔ عمر رفتہ کے تجربات نے انہیں وہ تجربہ بخشا ہے کہ ان کی شاعری لب و رخسار کے لمس سے نکل کر مظاہر فطرت اور سوز دوراں کی مظہر بن گئی ہے۔

سخن ور حصہ دوم کے لئے میں نے ان سے چند سوال پوچھے۔ انہوں نے بالترتیب اس کے جواب عنایت کئے ہیں۔ آیئے آپ بھی شریک محفل ہوکر اس تعارف کا حصہ بن جایئے۔

ڈاکٹر صاحب کیا آپ اپنا تعارف کرائیں گے؟ وہ ہنس کر بولے۔

"میرا تاریخی نام مختار علی تھا۔ والد اور بھائیوں کے نام سے مماثلت رکھنے کے لئے اسکول میں مختارالدین لکھوایا گیا احمد کا اضافہ میں نے کرلیا اس طرح مختارالدین کہلاتا ہوں۔ رہا تخلص تو بچپن میں تخلص بھی اختیار کیا تھا اور محلّہ کی دیواروں پر چاک یا کوئلے سے اپنی تک بندی اور تخلص لکھتا پھرتا تھا والدین یا بڑے بھائیوں کو میرے تخلص کا علم نہیں تھا ورنہ اس حرکت کی سزا ملنی ضروری تھی۔

ڈاکٹر مختار الدین احمد

میری تاریخ پیدائش شاہجہاں آباد بھوپال جو وسط ہند کی مسلم ریاست تھی مغلیہ دور کی یادگار جہاں کئی نسلوں تک بیگمات کی حکومت رہی تھی۔ میں نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ محلہ کے مکتب میں بٹھایا گیا اور پھر وہاں سے ماڈل ہائی اسکول میں داخل ہوا جہاں اسد محمد خان میرے ہم جماعت تھے ابتدائی اور ثانوی تعلیم وہیں حاصل کی۔ سلسلہ جاری تھا کہ ۱۹۴۹ء میں ریاست کو ختم کرایا گیا اور میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ پاکستان آگیا۔ یہاں آکر چند سال آوارہ گردی اور بے یارومددگاری میں گزر گئے جس کے بعد منقطع شدہ سلسلہ تعلیم کا پھر شروع ہوا۔ بالاخر ڈاؤمیڈیکل کالج کراچی سے میڈیسن کی ڈگری لے کر فارغ التحصیل ہوا اور ملازمت کے لئے کوئٹہ چلا گیا وہاں سے ۱۹۶۶ء میں بیرون ملک ملازمت اختیار کرلی اب انگلستان میں مقیم ہوں۔

شاعری سے میری دلچسپی پیدائشی یا موروثی سمجھئے۔ دادا شاعر تھے اور ماموں بھی شعر کہتے تھے۔ دادا کا انتقال میری پیدائش سے بہت پہلے ہوچکا تھا اور ماموں ریوا میں رہتے تھے۔ اس طرح میں گھر میں اکیلا تک بند تھا۔ اب ادب کی تمام اصناف سخن سے دلچسپی ہے۔ خصوصیت سے تاریخ فلسفہ اور علم الکلام میرا خاص موضوع ہے۔

میرے خیال میں ابلاغ کے بغیر ادب ہو یا شاعری قطعی بے معنی ہوجاتے ہیں۔ بدقسمتی سے ہمارے دور میں ذرائع ابلاغ میں زبردست تبدیلی واقع ہوئی ہے جس سے پروپیگنڈے کو تو بہت فائدہ ہوا اور ادب کو نقصان۔ اب ریڈیو کا زمانہ بھی ختم ہورہا ہے ٹیلی ویژن اور کیسٹ کا زمانہ ہے لہٰذا ادب کا انحطاط لازمی ہے اور ادب کو اس سے بہت نقصان پہنچا ہے حتیٰ کہ ڈرامے جیسی صنف کو جس کو ٹیلی ویژن پہ خوب پھولنا پھلنا چاہیے تھا لیکن زوال کا سامنا ہے جس کی مثال مغرب میں سوپ اوپیرا اور سٹ کومز ہیں اور پاکستان میں تو ڈرامے اور ٹیلی ڈرامے کا حال ان سے بدتر ہے۔ مغرب میں پرفارمنس شاعری ٹیلی کی پیداوار ہے۔ جس کا شاعری کے معیار پر کوئی اچھا اثر نہیں ہوا ہے۔ ہمارے ہاں مشاعروں کی صدیوں پرانی روایت کو کمرشلز کر دیا گیا ہے نتیجہ ظاہر ہے۔

اب آیئے مطالعہ کی طرف۔ ادبی رسالے اور کتابیں اس قدر مہنگی ہوچکی ہیں کہ عام قاری کی پہنچ سے باہر ہیں اس لئے یہ فرض روزانہ اخبارات کا ہے کہ وہ سنجیدگی سے ادب کی جانب مائل ہوں اور ادیب کا رشتہ دوبارہ پڑھنے والے سے قائم کریں۔ اس کے ساتھ ٹیلی ویژن والے بھی اپنی ذمہ داریوں کو نبھانے کے لئے تیار ہوں تو وہاں بھی سنجیدہ ادب کو جگہ مل سکے۔

ڈاکٹر مختار الدین احمد

اردو زبان کے مستقبل کے سلسلے میں دوسرے ممالک کا کیا ذکر خود پاکستان میں نئی نسل کو اردو سے محروم رکھنے کا پورا انتظام کرلیا گیا ہے۔ اردو اگر اتنی سخت جان نہ ہوتی تو اب تک دفنائی جاچکی ہوتی اس وقت بھی سیاسی اکھاڑے میں پانچ سو پہلوان اس کو دبوچے ہوئے ہیں۔ کھینچا تانی ہورہی ہے۔ تکہ بوٹی کی نوبت آنے والی ہے۔ چالیس سال قبل ہندوستان میں اردو کا جو حشر ہوا تھا اب وہی ہمارے ہاں بھی ہو رہا ہے اللہ اس کو اپنی امان میں رکھے۔ حالات سازگار نہیں ہیں۔ ملک سے باہر نئی نسلیں اردو سے صرف علمی طور پر تعلق رکھ سکتی ہیں یعنی اسکولوں اور کالجوں میں اردو بحیثیت خارجی زبان کے پڑھائی جائے جس طرح فرنچ اٹالین یا اسپینش زبانیں پڑھائی جاتی ہیں ان میں اردو شامل ہو سکے تو اردو زندہ رہ جائے گی ورنہ مشکل ہے۔

نقادان ادب کے سلسلے میں عرض ہے کہ یہ مشکل اردو اور اردو ادیب کی نہیں ہے' تنقید نگار کی ہے۔ ہمارے تنقید نگار منفی رویہ رکھتے ہیں ادب یا ادیب نہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو پاکستانی ادب کو مغربی کسوٹی پر کھ کر دیکھتے ہیں۔ اردو کی کتابیں انگریزی کی عینک سے پڑھتے ہیں۔ نظریاتی سودے بازی میں ہم کو پہلے بھی بیچا جا چکا ہے اب پھر بیچے جا رہے ہیں لیکن ہمارے ادیب زمان ومکاں کے تقاضوں سے بےخبر نہیں ہیں نہ ہی تنقید نگار۔ البتہ خود کو زمان ومکاں سے بالاتر سمجھ لیتے ہیں۔ رہی لفظ کی سچائی اور دل میں اترنے والی بات تو جیسے ہی آپ نے نقاد کے نام نہاد کمٹ منٹ سے آگے نکلنے کی کوشش کی وہ واویلا مچانے لگتا ہے کہ لفظ میں سچائی نہیں ہے اور دل میں اترنے والی بات تو یہ ہے کہ اگر قاری کا پیٹ خالی ہوگا تو جو کچھ وہ پڑھے گا وہ پیٹ ہی میں اترے گا دل میں نہیں۔ پانی نشیب میں ہی اترتا ہے۔ خود ہمارے نقاد اپنے پیٹ سے سوچنے کے عادی ہوچکے ہیں اس میں لکھنے والے کا قصور ہے نہ پڑھنے والے کا۔ ہمارے ہاں غزل کے ساتھ نقادوں نے جو سلوک روا رکھا ہے اس کے کون واقف نہیں ہے۔ اس موضوع پر میں پہلے بھی کافی لکھ چکا ہوں۔

ڈاکٹر مختار الدین احمد

عکس فن

غزل

ترے خیال سے ہے میرے خواب کا رشتہ
کہ قافلوں سے رہا ہے سَراب کا رشتہ

مجھے بھی تجھ سے تعلق تو ہے مگر اتنا
ہو سطحِ آب سے جیسے حُباب کا رشتہ

ہے تیری یاد و تبسّم کہیں، کہیں آنسو
کرن کرن میں گندھا، ماہتاب کا رشتہ

ملا ہے رنگ سے، خوشبو سے، برگ و شبنم سے
دماغ و چشم و دہان و گلاب کا رشتہ

زمیں کا ہے نہ زباں کا نہ رنگ و نسل کا ہے
مرے لئے ہے مقدس کتاب کا رشتہ

یہ بات چاند ستارے نے کل کہی مجھ سے
ہوائیں توڑ نہ دیں خاک و آب کا رشتہ

نہ کیوں زمانے میں مختار سَر اٹھا کے چلے
مری زمین سے ہے آفتاب کا رشتہ

مخمور سعیدی

میں، کہ ہوں مخمورؔ اپنے روز و شب سے بے خبر
آنے والے وقت کی مجھ کو خبر دیتا ہے کون؟

مخمور سعیدی

۹؍اپریل ۹۶ء، دہلی

Makhmoor Saeedi
117, Ghlib Apartment, Pervana Road
Peetam Pura, DELHI 110034 - INDIA

مخمور سعیدی
(دہلی، ہندوستان)

اخوند زادہ احمد نازش اور نواب زادی انیس النساء بیگم کے ہاں ۳۱ دسمبر ۱۹۳۸ء کو جنم لینے والے بچے کا نام والدین نے سلطان محمد خاں رکھا۔ جائے پیدائش ریاست ٹونک (ہندوستان) ہے۔ آگرہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم۔اے کی سند لینے والے طالب علم نے جب ادب اور شاعری سے ناطہ جوڑا تو اپنا تخلص مخمور سعیدی اختیار کیا۔ راجستان اردو اکیڈمی جے پور کے چیرمین جناب انعام الحق کا کہنا ہے کہ "مخمور سعیدی آج کی صدی کے شاعر ہیں جن کے مقدر میں قرون اولیٰ کے شعراء کی طرح صرف جدائی فرقتیں اور ہجر ہی نہیں۔ آج کا شاعر ماضی کے شعراء کی طرح اپنے عشق کو حسن اور نسوانیت کا زیر نگین و ماتحت نہیں سمجھتا وہ حسن عشق کے رشتوں میں برابری کا درجہ رکھنا چاہتا ہے۔ وہ عشق کی تصویر عین انسانی فطرت کے مطابق پیش کرتا ہے"۔ یہ شعر ملاحظہ ہو۔

کوئی گنہ بھی گنہ نہیں جو روحوں کو سرشار کرے
وہ میرے ہاتھوں کی عبادت تیرا بدن جب چھولوں میں

مخمور سعیدی تقریباً دو دہائیوں سے کل ہند اور بین الاقوامی مشاعروں کے روح رواں ہیں۔ پاکستان، دبئی، ابو ظہبی، سعودی عرب، ناروے، ڈنمارک، عمان وغیرہ کے مشاعروں میں شرکت کی ہے۔ تحت اللفظ پڑھتے ہیں اور داد حاصل کرتے ہیں کیونکہ ان کی شاعری کا ایک اپنا آہنگ و اسلوب ہے۔

اپنے بارے میں مخمور سعیدی کا کہنا ہے کہ وہ کسی مکتبہ فکر سے وابستہ نہیں رہے۔ آج کے

دور میں "نقد سخن" کی کسوٹی کتنی معتبر ہے اس سلسلے میں ان کا کہنا ہے جب نقد سخن کا پیمانہ صرف فنی محاسن اور مصائب تھے۔ کس نے کہا یا کہا سے زیادہ سروکار نہ رکھتے ہوئے اصل توجہ "کیسے کہا" پر دی جاتی تھی۔ اقبال یا سیماب کی کیفیات مزاج داغ سے یکسر مختلف تھیں لیکن دونوں نے داغ کی شاگردی قبول کی کیونکہ داغ سے یہ گر سیکھا جاسکتا تھا کہ جو کچھ کہا جائے کیسے کہا جائے۔ جو ادیب اور شاعر اس کسوٹی پر پورے اترتے تھے' ان کی ادبی و شعری حیثیت نہ صرف یہ کہ آج بھی مستحکم اور مسلم ہے بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زیادہ مستحکم اور زیادہ روشن ہوتی جارہی ہے۔

تنقید ادبی بنیادوں پر ہونا چاہئے۔ اس سلسلے میں آج کے نقاد کا رویہ کیا ہے؟ اس مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے انہوں نے کہا کہ "غیرادبی بنیادوں پر ادبی فیصلے صادر کرنے کا سلسلہ ترقی پسند تحریک کے ساتھ شروع ہوا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین عالمی اشتراکی تحریک کا ایک محاذی ادارہ تھی اور یہ ادب کو اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کرنا چاہتی تھی۔ ترقی پسند ناقدوں نے ایسے ادیبوں اور شاعروں کو آگے بڑھایا جو اپنی فنکارانہ ذمہ داریاں بھلا کر "کلینا" ان کے ہم نوابن گئے۔ فنی پیمانے پس پشت ڈال دیئے گئے اور سیاسی نعرہ زنی کو شعروادب کی کسوٹی قرار دے دیا گیا۔ اب "کیسے کہا" پر کسی کی توجہ نہیں تھی۔ صرف "کیا کہا" سے سروکار تھا۔ مثال کے طور پر رد آزادی میں فیض کی نظم جس کا یہ شعر بعد میں ضرب المثال کی صورت اختیار کر گیا۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

اس لئے قابل رد ٹھہری کہ فیض نے براہ راست انداز بیان اختیار نہ کر کے تشبیہوں اور استعاروں کی زبان میں بات کی تھی جس سے شاعر کی "بورژوا" ذہنیت ظاہر ہوتی تھی۔ دوسری طرف مظفر شاہجہاں پوری جیسے شاعروں پر اس قسم کے اشعار کے لئے داد و تحسین کے پھول برسائے گئے۔

اس طرف روس ادھر چین' ملایا' برما
اب اجالے مری دیوار تک آپہنچے ہیں

سوال یہ ہے کہ جب ان اجالوں کا بھرم پاش پاش ہوگیا ہے۔ تو اجالوں کی نقیب شاعری کو جو فنی قدر و قیمت سے عاری ہے۔ ایوان شعروادب کے کس گوشے میں جگہ دی جائے گی؟ ترقی پسندوں نے ادبی قدر شناسی کی جس روش کو فروغ دیا اس کی پیروی میں بہت سے شعراء وادبا گمراہ ہوئے۔ یہ درست ہے کہ ان کا طریق کار سیاسی مفادات کا تابع تو تھا لیکن اس میں ذاتی مفادات

زیادہ دخیل نہیں تھے۔ اب انجمن ترقی پسند مصنفین کا شیرازہ بکھر چکا ہے اور ترقی پسند ناقدوں کا دبدبہ بھی باقی نہیں رہا چنانچہ اس کا سہرا جدید ادیبوں اور شاعروں کے سر بندھنا چاہئے جو اپنے پیش رووں کے برعکس فکروخیال کی آزادی سے دستبردار نہیں ہوئے"۔

"اس حوالے سے تو ہماری آج کی شاعری اور ادب کو خاصا نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ اس ضمن میں آپ کیا کہیں گے؟ مخمور سعیدی فرماتے ہیں کہ "یقیناً موجودہ ادبی صورت حال کا یہ پہلو نہایت افسوسناک ہے کہ کچھ لوگ جدید شعروادب کی قدر شناسی کا قرعہ اپنے نام نکالے ہوئے ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک فن کی کسوٹی یہ ہے کہ "کس نے کہا"۔ ان لوگوں کو اس سے غرض نہیں کہ کیا کہا اور کیا لکھا یا کیسے لکھا۔ نتیجتاً" پچھلے چند برسوں میں ایسے کئی قلم کاروں کے سروں پر عظمت وفضیلت کے تاج رکھے گئے ہیں جن کی بطور ادیب یا شاعر فرومائیگی اور بے بضاعتی اظہر من الشمس ہے۔ لیکن وہ چونکہ صاحب ثروت اور صاحب اقتدار ہیں چناچہ اپنے کاسہ لیسوں کو ان کی کاسہ لسی کی منہ مانگی قیمت ادا کرسکتے ہیں۔ ان حالات میں کھرے اور سچے Geniuine شاعروں اور ادیبوں کا بددل ہوجانا ایک قدرتی امر ہے۔ حافظ شیرازی صدیوں پہلے کہ گزرے ہیں۔

زاغ چوں شرم نداند کہ نہد پا برگل
بلبلاں را سبز دار دامن خارے گیرند

مخمور سعیدی ۱۹۵۳ء سے دہلی میں مقیم ہیں۔ ان کی کئی مقتدر ماہناموں سے وابستگی رہی ہے۔ انہوں نے انجمن ترقی اردو ہند کے ہفت روزہ ترجمان "ہماری زبان" میں بھی کام کیا۔ ان دنوں دہلی اردو اکادمی کے رسالے "ایوان اردو" کے مدیر اور اکادمی کے اسسٹنٹ سیکریٹری ہیں۔ ان کے شعری مجموعے یہ ہیں (۱) گفتنی' ۱۹۶۰ء (۲) سیہ برسفید' ۱۹۶۹ء (۳) آواز کا جسم ۱۹۷۲ء' (۴) سب رنگ ۱۹۷۵ء' (۵) واحد متکلم' ۱۹۷۹ء (۶) آتے جاتے لمحوں کی صدا' ۱۹۷۹ء (۷) بانس کے جنگلوں سے گزرتی ہوا' ۱۹۸۳ء (۸) پیڑ گرتا ہوا' دیوناگری حروف میں' ۱۹۸۶ء (۹) دیواروں کے درمیاں' ۱۹۹۴ء ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ بازدید' ۱۹۸۹ء میں شائع ہوا۔

مخمور سعیدی کئی کتابوں کے مولف اور مترجم ہیں۔ جن کتابوں کا ترجمہ کیا ہے ان میں غالب کی فارسی تصنیف "دستنبو" بھی ہے جو ۱۸۵۷ء کے چشم دید حالات کے بیان پر مشتمل ہے۔ انہیں ان کی کتابوں پر مختلف صوبائی اردو اکادمیوں کی طرف سے کئی انعامات ملے ہیں۔ انہیں راجستھان اردو اکادمی اور دہلی اکادمی کا سالانہ ایوارڈ اور راجستھان تھاپنا دوس کمیٹی کی طرف سے "فخر راجستھان" کا خطاب بھی ملا ہے۔

عکسِ فن

مخمور سعیدی

ہندوستان

ہندوستان
نئی دلی کے راشٹرپتی بھون میں نہیں
پرائم منسٹر ہاؤس
اور اس کا طواف کرتی ہوئی
ان کوٹھیوں میں بھی نہیں
جہاں آئے دن
ہندوستان کی قسمت کے سودے ہوتے رہتے ہیں
ہندوستان
پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کی عمارتوں میں بھی نہیں،
ان کاسموپولیٹن شہروں کی سڑکوں پر بھی نہیں
جہاں یہ عمارتیں سر اٹھائے کھڑی ہیں،
اور ہندوستان کی باز آبادکاری کے ان منصوبوں میں بھی نہیں
جو ان عمارتوں کی چھتوں کے نیچے جنم لیتے ہیں،
اور وہیں دفن ہو جاتے ہیں
ہندوستان
اپنا لہو جلا کر
ان مضافاتی کارخانوں کی بھٹیاں روشن کر رہا ہے
جن کی چمنیاں دھواں اگلتی ہیں
تو آسمان سیاہ ہو جاتا ہے
ہندوستان
اپنے کھیتوں اور کارخانوں سے نکل کر،
پیدل یا سائیکل پر
چل پڑتا ہے
شراب کی سستی دکانوں کی طرف،
یا ان گھروں کی جانب
جن کی دہلیز پر
بیماری اور بے چارگی،
منتظر رہتی ہے آنے والوں کی۔
ہندوستان
ٹی وی اسکرین پر نہیں،
ریڈیو سے سنائی جانے والی سرکاری خبروں میں بھی نہیں،
ہندوستان میری آنکھوں میں ہے۔
نو وارد مہمان!
ہندوستان کی تلاش میں
پانچ ستارہ ہوٹلوں کا رخ نہ کرنا،
ہندوستان
میری آنکھوں سے تمہیں دیکھ رہا ہے،
اور میری آواز میں تم سے مخاطب ہے
ہندوستان
شہر کے گنجان فٹ پاتھ
اور گاؤں کی سنسان چوپال سمیت،
ان فساد زدہ علاقوں میں
خاک و خون میں لت پت پڑا ہے،
جہاں میں اب آ کھڑا ہوا ہوں
ہندوستان
میری خوف زدہ آنکھوں میں سانس لے رہا ہے،
اور میری کراہتی، ٹوٹتی سانسوں میں مر رہا ہے۔

جمشید مسرور

غلط گمان نہ کر میری خشک آنکھوں پر
سمندروں میں جزیرے ضرور ملتے ہیں

—ہ—

جمشید مسرور

11.11.95

اوسلو

Jamshed Masroor
Lindebergase. 46 A.
1068 OSLO - NORWAY

جمشید مسرور
(ناروے)

اوسلو ناروے کے شاعر جمشید مسرور نے لکھا ہے کہ وہ شاعر ابن شاعر ہیں۔ یعنی ان کے والد محترم ڈاکٹر مسرور کپور تھلوی اور دادا محترم پروفیسر مولوی جناب رنجور کپور تھلوی دونوں شاعر اور صاحب کتاب تھے۔ تقسیم ہند کے بعد جمشید کا بچپن اور لڑکپن گجرات میں گزرا۔ (جمشید نے اپنا سن اور جائے پیدائش نہیں لکھے) ۱۹۶۶ء میں جمشید لاہور چلے آئے۔ اسٹیٹ بینک آف پاکستان لاہور سے منسلک رہے۔ ان کی تحریریں مختلف ادبی رسالوں فنون' اوراق' اور لکیریں وغیرہ میں چھپتی رہیں۔ ریڈیو پاکستان لاہور کے مشاعروں میں انہیں عبدالحمید عدم' احسان دانش' ایوب رومانی اور صوفی تبسم جیسے شعراء کے ساتھ مشاعرے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔

۱۹۷۵ء میں ناروے آئے تھے پھر یہیں کے ہو رہے۔ یہاں بھی انہوں نے اپنی ادبی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ۱۹۹۱ء میں نارویجین زبان کی تحریروں کے اجتماع (Anthology) میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے۔ جس میں ان کا کلام نارویجین زبان میں شائع ہوا۔ ۱۹۹۳ء میں نارویجین زبان میں شائع ہونے والے افسانوں میں ان کے افسانے کو کتاب کا بہترین افسانہ کہا گیا۔ ۱۹۹۴ء میں ناروے کے سب سے بڑے پبلشر Norsk Gyldendal Forlag نے نارویجین اور اردو دونوں زبانوں میں ان کا کلام "لمحوں کے سمندر" کے نام سے شائع کیا۔ نارویجین زبان میں اسکا نام Oseaner Av Qyeblikk ہے۔

ناروے کے نقادان ادب نے ان کے کلام کو بے حد سراہا۔ تمام بڑے اخباروں میں ان کے کلام پر تبصرے اور ان کے انٹرویو شائع کئے۔ جمشید نارویجین زبان کے مشاعروں میں بھی

شریک ہوتے ہیں۔ نارویجین مصنفین یونین کے علاوہ نارویجین صحافیوں کی یونین کے ممبر بھی ہیں۔ ۱۹۹۵ء میں انہیں نارویجین ادیبوں کی انجمن نے ایک لاکھ روپے کے انعامی وظیفے سے بھی نوازا۔

رائل نارویجین کلچرل کونسل نے ٹرانسپورٹ کے محکمہ کے تعاون سے ادب کو ہردلعزیز بنانے کی تحریک چلائی اور سب سے پہلے جن تین شعراء کی نظمیں منتخب ہوئیں ان میں جمشید مسرور کی نظم "ایک منظر" کے اردو اور نارویجین دونوں روپ تھے۔ اس نظم کو ایک نہایت خوبصورت رنگین پلے کارڈ کی شکل میں تمام ٹرینوں، ٹریموں اور بسوں میں ایک ماہ تک آویزاں رکھا گیا۔

جمشید مسرور کا کلام ناروے کے کالجوں کے نصاب میں شامل کرلیا گیا ہے۔ یہ درسی کتاب "Kolon" کے نام سے بازار میں دستیاب ہے۔

چند سال قبل اوسلو کی مرکزی لائبریری میں "جمشید مسرور کا مہینہ" منایا گیا۔ جمشید نے ارلنگ کللسن کی داستانوں کا نارویجین سے براہ راست ترجمہ کیا جو ۱۹۹۵ء میں "راکا۔۔۔ داستان گو" کے نام سے سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے شائع کیا۔ جمشید کے کریڈٹ پر ۵۶۰ صفحات کا ۱۹۹۶ء کا ضخیم عالمی اردو ادب نمبر بھی ہے۔ ان کے کلام کے مجموعے "شاخ نظر" ۱۹۸۹ء۔ میری خوشبوئیں میرے پھول ۱۹۹۱ء۔ شاخ نظر ۱۹۹۳ء (دوسرا ایڈیشن) دیوار ہوا پر آئینہ، ۱۹۹۳ء میں پاکستان سے شائع ہوچکے ہیں۔ جمشید کے افسانے خاکے کے مضامین اور مکتوبات کے مجموعے زیر ترتیب ہیں۔ وہ اوسلو سے سائع ہونے والے مضامین ماہنامہ "بازگشت" کے مدیر اعلیٰ بھی ہیں۔ گویا کہ جمشید مسرور کے شب وروز تخلیقی مصروفیات کی نذر ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بدیس میں اردو کے مستقبل قریب سے جمشید مایوس نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ "ناروے میں پاکستانی افراد کی کثیر تعداد کا تعلق پنجاب سے ہے۔ تمام پرچوں کے مدیر بھی پنجابی الاصل ہیں لیکن اردو کے لئے بھی تن من دھن سے لگے ہوئے ہیں کیونکہ اردو زبان سے انہیں پیار ہے۔ وہ پاکستان کی قومی زبان ہے۔ دو تین نسلوں تک اردو کا راج رہے گا لیکن اس کے بعد کا کام مشکل ہے۔ کیونکہ وہ بچے جو ان ممالک میں تعلیم حاصل کرتے ہیں ان کی مجبوری ہے کہ وہ مقامی زبان اختیار کریں لہٰذا اردو سے ان کی شدبد واجبی سی ہوگی اور یہ واقفیت بھی کسی ایک مقام پر آکر ختم ہوجائے گی"۔

جمشید اپنی زندگی کی خوبصورت یادوں کی مالا پروتے ہوئے کہتے ہیں کہ "لڑکپن میں بہار کا وہ روشن دن مجھے کبھی نہیں بھولتا جب اچانک یوں محسوس ہوا جیسے دور کہیں اوپر سے کوئی پیغام

آرہا ہے۔ مجھے بس ادراک ہوا۔ میں نے کاغذ قلم سنبھالا اور یہ پیغام صفحے پر اتار لیا۔ یہ نو اشعار کی ایک غزل تھی جس کے لکھنے میں میری کوئی شعوری کوشش شامل نہ تھی۔ نہ میں نے شعر کہنے کا کبھی قصد کیا تھا۔ تب سے اب تک یہ پیغام مجھے وقفے وقفے سے موصول ہوتا رہتا ہے۔ یوں بھی ہوا ہے کہ نیند سے کسی سرگوشی نے جگا دیا۔ کاغذ، قلم اٹھایا تو اشعار کی لڑی ہاتھ آتی چلی گئی۔ شعر مجھ پر پورے اترتے ہیں اور حیرت کی بات یہ ہے کہ پہلی غزل میں بھی وزن کا کوئی سقم نہ تھا۔ آج بھی مجھے فطرت اپنے آپ سے سرگوشیاں کرتی محسوس ہوتی ہے۔ راتوں کو سڑکوں پر آوارہ گردی کرنے والی گہری دھند' اندھیرے' کنجوں سے لپکتی ہوئی پھولوں اور پتوں کی خوشبوئیں اور آدھی رات کے بعد چلنے والی ہوا مجھے اشعار کی دولت دے جاتی ہے۔ کبھی کبھی مجھے کائناتی حسن مجسم بھی نظر آنے لگتا ہے۔ نیم گرم اور روشن دھوپ میرے دل کے بہت قریب سے ہو کر گزرتی ہے اور احساسات کے سارے تار جھنجھنا اٹھتے ہیں۔ گنگنانے لگتے ہیں"۔

ابلاغ کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے جمشید نے کہا۔ "ابلاغ کی میری نظر میں دو سطحیں ہیں۔ ایک ابلاغ وہ ہے جو عام انداز میں گلی میں دی جانے والی گالی کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ بے حد مکمل لیکن لغو اور بے کار۔ دوسرا ابلاغ پھول کی سطح کا ہے۔ پھول خوشبو کی مدد سے اپنے ہونے کی سمت کا پتہ دیتا ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ سارے دیکھنے والے اس پھول کی شبیہہ بنا سکیں یا اس کے رنگوں کو صحیح نام دے سکیں۔ پھر بھی سب کو یقین ہوتا ہے کہ بات پھول ہی کی ہے اور میں ابلاغ کی اسی سطح کا قائل ہوں۔ "کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا۔ مگر سب دیکھتے رہ گئے۔"

ادب کی افادیت کے سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ ادب تجارت نہیں۔ کوئی مرئی شے نہیں اور اتنا مفید بھی نہیں ہونا چاہئے کہ آدمی اس کو صابن کی طرح جسم پر مل سکے یا اس سے داڑھی میں خلال کر سکے۔ کیونکہ اگر ادب مفید اور غیر مفید ہونے لگا تو پھر حلال اور حرام ادب کا سوال بھی اٹھ کھڑا ہوگا۔ اب بھی جب کبھی میں غالب' بیدل' اور ناروے کے رالف پا کوب سن کو پڑھتا ہوں تو مفید اور غیر مفید کی تکرار بہت بے معنی لگتی ہے۔ ایک شعر سنئے۔

وہ چیز لیں گے جسے دل قبول کرے گا
کہ بے کسی میں بھی اپنی پسند رکھتے ہیں

عکسِ فن

متفرق اشعار

شوق کی دستکِ بے تاب سے کھل جائیں گے
اسی امید میں شاید کوئی جھونکا آئے
اور چپکے سے کوئی درز کوئی چاک کھلے!
چاندنی دل کے کواڑوں سے لگی بیٹھی ہے

○

وہ چیز لیں گے جسے دل قبول کر لے گا
کہ بے کسی میں بھی اپنی پسند رکھتے ہیں
حَذَر کرو کہ رفیقانِ گل بکف جمشید
دلوں میں لاکھ طرح کے گزند رکھتے ہیں

○

جمشید سوالِ دلبراں پر
پھولوں نے دیئے جواب میرے

○

کوئی تو ہے جو فصلِ سَراں کاٹتا ہے روز
یعنی مرا قیام ہے زندوں کے شہر میں

وہ حرف جس پہ نطق و زباں کا مدار ہے
زندوں پہ ہی حرام ہے زندوں کے شہر میں

منبر پہ بھی وہ مسندِ اعلیٰ پہ بھی وہی
لاشوں کا اِحترام ہے زندوں کے شہر میں

کچھ سائے چند ہاتھ لپکتے ہیں دُور سے
جمشید زیرِ دام ہے زندوں کے شہر میں

خضر مسیحا

چھوڑ کر بستی درندوں کی مسیحا چل دیا
ہو میسر کچھ جہاں انسانیت انسان کو

خضر مسیحا

KIZAR MASEEHA
7506 Radford Ave
North Hollywood, CA 91605
U.S.A.

خضر مسیحا
(لاس اینجلس)

سید خضر نام ہے اور تخلص مسیحا کرتے ہیں۔ ۸ جولائی ۱۹۴۸ء کو ہندوستان کے شہر حیدر آباد دکن میں پیدا ہوئے۔ امریکہ میں شکاگو اور پھر کیلیفورنیا آئے۔ مختلف مقامی اور عالمی مشاعروں میں شرکت کر چکے ہیں۔ شاعری کے علاوہ صحافت، نثرنویسی اور مضمون نگاری سے بھی دلچسپی ہے جس میں مذہبی وغیرمذہبی مضامین شامل ہیں۔ ان کے والد ماجد قوم کے جید عالم و مقرر تھے۔ لہٰذا گھر کا ماحول جس میں تربیت پائی ہے، اردو، عربی اور فارسی زبانوں کا گہوارہ تھا۔ ان ہی کی ترغیب پر انھوں نے جامعہ نظامیہ حیدر آباد دکن سے بصد شوق "قاری القرآن" کی سند حاصل کی۔ ادب اور شاعری سے لگاؤ ماحول کے علاوہ فطری اور پیدائشی رہا ہے۔ خضر مسیحا نے ایک حساس دل و دماغ پایا ہے جو مسلسل مطالعہ کائنات و فطرت سے متاثر رہتا ہے۔ یعنی ادراک احساسات خارجی، جذبات اندرونی کو متحرک کر دیتے ہیں اور یہی احساسات، مشاہدات اور جذبات جیسے شاعر کی مصوری کے لئے اشعار کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔

خضر کہتے ہیں "آج کا شاعر ذہنی طور پر بیدار ہے اور اعلیٰ ذہنی شعور سے مزین بھی۔ آج کے شاعر کی کوشش داستان حسن و عشق، حکایت گل و بلبل اور شمع و پروانہ تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ وہ اپنے اشعار کے ذریعے حقیقتوں کا انکشاف ایسے کرتا ہے جیسے کہ وہ عینی شاہد ہو۔ میری نظر میں شاعری اور ادب کو بامقصد اور نظریاتی ہونا چاہئے"۔ کہتے ہیں جس نظریہ کے تحت شاعری کرتا ہوں اس کا مقصد مایوسیوں اور محرومیوں کی جگہ امید کو جلانا ہے۔ چند اقتدار کے بھوکے، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے ہاتھوں کروڑوں انسانوں کے سفاکانہ استحصال اور ظلم و جبر کے خلاف

ایک مہم چلانا چاہتا ہوں۔ بے کسی و بے بسی کی جگہ عوام کو ان کے جائز حقوق ملیں۔ انہیں مذہبی شاعری سے بھی خاصا لگاؤ ہے۔

خضر کہتے ہیں کہ "علامہ اقبال کو اگر نفرت تھی تو عوام کی غلامی سے۔ خوش قسمتی سے وہ انیسویں صدی میں پیدا ہوئے۔ اگر وہ پندرہویں سولہویں صدی میں پیدا ہوتے تو شاید ہم ان کی شاعری میں کچھ اور رنگ پاتے۔ انیسویں صدی کا زمانہ وہ زمانہ تھا جبکہ نہ صرف ہندوستان بلکہ سارا عالم اسلام بلکہ سارا جہان مشرق معاشی' سیاسی اور ذہنی حیثیت سے مغرب کی غلامی کی لعنت میں گرفتار تھا۔ اقبال کا حساس دل اپنے ماحول کی ان کیفیات سے تڑپ اٹھا اور وہ اپنی قوم کی اس غلامی کا نوحہ پڑھنے لگے۔ پیام اقبال روح انسانیت کی آزادی ہے اور یہی اقبال کا اصلی پیام تھا۔ میرا ذہن بھی اسی مکتبہ خیال سے زیادہ متاثر ہے۔ جو نظریاتی اور بامقصد شاعری سے وابستہ ہے۔ ان کا کلام ہندوستان میں کالج میگزین میں شائع ہوتا تھا۔ یہاں امریکہ میں اردو کلچرل سوسائٹی کے "کارواں" پاکستان لنک' پاک نیوز وغیرہ میں ان کی تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ابھی کوئی مجموعہ کلام شائع نہیں ہوا ہے۔ انہوں نے تفنن طبع کے لئے افسانے بھی لکھے ہیں۔

ابلاغ کے متعلق کہتے ہیں ادب اظہار ذات بھی ہے اور اظہار کائنات بھی۔ چنانچہ ابلاغ کے لئے آسان زبان اور اسلوب کو ترجیح دینا چاہئے۔ اساتذۂ متقدمین نے مختلف زبانوں میں نقطہ خیال کے مطابق رائے زنی کی ہے۔ **اصمعی** ابن احمد فرماتے ہیں کہ اچھا اور سادہ شعر وہ ہے جس سے سامع کو اس کے شروع ہوتے ہی معلوم ہو جائے کہ یہ فلاں کا "قافیہ" ہوگا۔ صاحب عقد الفرید فرماتے ہیں۔ جب پڑھا جائے تو لوگ کہیں کہ سچ کیا ہے۔ ابن رشیق کی نگاہ میں جب شعر پڑھا جائے تو ہر شخص کو یہ خیال ہو کہ میں بھی ایسا کہہ سکتا ہوں۔ اور ملٹن کے الفاظ میں۔ سادہ ہو' جوش سے بھرا ہوا اور اصلیت پر مبنی ہو اور مولانا حالی فرماتے ہیں کہ خیال کیسا ہی بلند اور دقیق ہو مگر اس کا اظہار پیچیدہ اور ناہموار نہ ہو"۔

ان تمام نظریات میں انہیں ملٹن کا نظریہ پسند آیا۔ یعنی ایک اچھا شعر سادگی کے ساتھ اصلیت اور جوش سے مزین ہو۔ یعنی سادہ کلام اسی صورت میں احسن سمجھا جا سکتا ہے جبکہ وہ عام فہم ہونے کے ساتھ ساتھ خاص پسند بھی ہو۔ انہوں نے کہا کہ سادہ زبان کے مندرجہ ذیل اشعار اس بحث کی تصدیق کرتے ہیں۔

یار کی کوئی خبر لاتا نہیں
دم لبوں پر ہے نکل جاتا نہیں

(میر)

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی
موت آتی ہے پر نہیں آتی

(غالب)

آیا تھا ایک بار مسیحا خیال یار
لیکن ہزار بار ستا کر گیا مجھے

(مسیحا)

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

(مومن)

مرزا غالب نے زین العابدین خان عارف کی جوانی کی موت پر کہا ہے۔

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

یا

وہ اس پہ اڑے ہیں اب ملنا' ہوگا تو قیامت میں ہوگا
ہم بھی تو نہیں کچھ کم ضدی رو رو کے قیامت کرلیں گے

(سلطانہ مہر)

لہٰذا یہ نتیجہ اخذ ہوا کہ شاعری وادب کے لئے ابلاغ ضروری ہے۔ ادبی رسائل کی عدم مقبولیت کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ جو طبقہ ادب سے دلچسپی رکھتا تھا وہ ادب نواز تھا اب وہ اس سے غفلت برتنے لگا ہے۔ ماحول کے زیر اثر مشینی زندگی اسے فرصت کے لمحات مہیا نہیں کرتی کہ وہ اس جانب توجہ دے سکے اور اس حقیقت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہوگا کہ یہی طبقہ اپنی موجودہ اور آنے والی نسل اور زبان اردو کے مستقبل سے غافل ہے۔ بچے اردو زبان کی بجائے گھر میں انگریزی فصاحت سے بولتے ہیں تو ماں باپ فخر محسوس کرتے ہیں۔ ایسے ماحول میں ادبی کتابوں کی پذیرائی تو کجا ہمارے بعد زبان اردو زندہ اور باقی رہے تو یہ معجزہ ہوگا۔ اب اس کا حل یہی ہے کہ ہم اپنے بچوں سے گھر میں اردو زبان میں گفتگو کریں۔ اردو اسکولز قائم کریں۔ بچوں کو اردو کے ابتدائی آسان قاعدے فراہم کریں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب والدین خود اردو سے دلچسپی لیں۔ اردو اخبار اور رسالوں محفلوں کے علاوہ اردو اسکول میں زبان اردو سکھانے کا معقول انتظام کیا جائے۔ ''آج کا ادب اپنے عہد کی ترجمانی کررہا ہے یا نہیں''۔ اس سوال کا

جواب دیتے ہوئے خضر نے کہا کہ یہ اسی وقت ممکن ہے جب شاعر یا ادیب مطالعہ کائنات وفطرت ومناظر قدرت کے علاوہ قوت اظہار کا حامل ہو۔ جس قدر عمیق اور وسیع مطالعہ ہوگا اسی قدر اس کا ذخیرۂ معلومات اور اسلوب وطاقت بیان اس کے وجود اور اس کے عہد کی تفسیر و تاویل بن سکتی ہے۔ مشاہدات' احساسات' مطالعہ کائنات کا فقدان یقیناً ادب کو بے معنی کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لفظ دل میں نہیں اترتا عامیانہ طرز فکر اور اظہار خیال دل کی گہرائیوں میں نہیں اتر سکتا اور نہ سامع کے دل دماغ کو متاثر کر سکتا ہے۔ اگر ادب زندگی اور حقائق کی عکاسی نہ کرے تو ایسے مشاہدات کا اظہار حساس دل ودماغ سے وابستگی پیدا نہیں کر سکتا۔ ایسے ہی الفاظ دل ودماغ میں اتر سکتے ہیں جو جذبات اور احساسات کی صحیح اور حقیقی رہبری کرتے ہیں اور دور حاضر کے نوجوان شعراء کسی ایک نقطہ نظر کی بجائے زندگی کے ہر شعبے میں طبع آزمائی کی کوشش کر رہے ہیں۔ جس کی وجہ سے اچھی شاعری کے باوجود منزل تو کجا اس کی کوئی راہ تک متعین نہیں ہو رہی ہے۔ مثبت فکر و عمیق اور مطالعہ میرے مذکورہ بالا خیالات کی حمایت کریں گے۔

خضر فیض احمد فیض' مخدوم محی الدین' مجاز' احمد فراز' مجروح سلطانپوری اور پروین شاکر کے کلام سے متاثر ہیں اور کہتے ہیں کہ "میں بزلہ سنجی' خوش مزاجی' مزاح اور ظرافت کا قائل ہوں۔ کیونکہ یہ بھی ادب کے اجزائے لاینفک ہیں اور انہی کے دم سے زبان اور ادب میں رنگینی' لطافت اور تنقید و تبصرہ کی رنگارنگی نظر آتی ہے۔" مزید کہتے ہیں کہ طنز و ظرافت کا اثر سامعین پر دیرپا اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ طنز و ظرافت کا مقصد ماحول کی عکاسی کے ساتھ ساتھ اس کی اصلاح بھی ہو۔ سفلی عمل کے اثر کا میں قائل تو ہوں لیکن رشید احمد صدیقی صاحب کے اس قول سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ اس عمل کے کئی مشاہدات میں نے کیے ہیں لیکن رشید احمد صاحب کے قول کی تصدیق کے لئے میرے پاس کوئی مشاہدہ نہیں ہے۔

عکسِ فن

قطعہ

حیرت سے دیکھتے ہو کیا تصویرِ کائنات
پوشیدہ لفظ "کن" میں ہے تغیرِ کائنات
ہر ذرہ دے رہا ہے صدا غور سے سنو
یعنی کے ہستِ وبُود ہے تقدیرِ کائنات

○

یا محمدؐ آپ کی تعلیم کا صدقہ ہے یہ
صدق دل سے جو خدا کی بندگی ہونے لگی

○

ناکام تمنائیں میرے گرد وپیش ہیں
تنہائی میں بھی شامل محفل کی طرح ہوں
ملتی ہے ہر طرف سے مجھے دادِ مسیحا
اہلِ سخن میں شمعِ محفل کی طرح ہوں

○

خطائیں ہو گئیں ہم سے جواب کیا دینا
جو بے حساب ہوں ان کا حساب کیا دینا
یہ کہہ کے چھوڑ دیا ہے مجھے سرِ محشر
مَرا ہے ہجر کی شب میں عذاب کیا دینا
مریضِ عشق کا درماں نہ ہو سکا مجھ سے
میں سوچتا ہوں مسیحا جواب کیا دینا

موناشہاب

ہاتھ بڑھا کے وہ چلیں دامن بچا کے میں چلوں
اتنا تو ہونا چاہیئے میرے بھی اختیار میں

مونا شہاب
۲۵/۱۰/۹۵

Mona Shhab
9. Begonia Court
Baltimore MD 21234, U.S.A.

موناشہاب

(میری لینڈ)

یہاں بحث عورت اور مرد کی شاعری سے نہیں مگر اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ کبھی کبھی کوئی شعر سر پر چڑھے جادو کی طرح بول اٹھتا ہے کہ اس کا خالق کون ہے۔ ملاحظہ ہو یہ شعر۔

ہاتھ بڑھاکے وہ ملیں' دامن بچاکے میں چلوں
اتنا تو ہونا چاہئے' میرے بھی اختیار میں

نسائیت سے بھرپور یہ شعر موناشہاب کا ہے۔ امریکہ کی ریاست میری لینڈ میں رہنے والی مونا ۳۱ دسمبر ۱۹۵۸ء کو کراچی پاکستان میں پیدا ہوئیں۔ اسلامک ہسٹری میں ایم۔اے کیا۔ پانچ سال تک اسی شعبے سے وابستہ رہیں اور اب ------- اب شاعری کرتی ہیں۔ نیویارک کے اخبار عوام اور پاکستان پوسٹ کے لئے کالم' مضامین اور تقریبات کی رپورٹس لکھتی ہیں۔ ماہنامہ "شاعر" بمبئی کے علاوہ کئی معیاری ماہناموں میں ان کا کلام اور افسانے شائع ہوتے رہے ہیں۔ میاں کی ملازمت کی وجہ سے دبئی اور ہانگ کانگ میں بھی خاصا وقت گزار چکی ہیں۔

مونا کے والد صحافی تھے اور شاعر بھی۔ والدہ شعبہ تعلیم سے وابستہ تھیں۔ گھر کا ماحول ادبی تھا لہٰذا مونا کا رجحان بھی شاعری اور افسانہ نگاری کی طرف لڑکپن سے ہی تھا۔ مگر مونا نے کسی خاص مکتبہ فکر سے استفادہ نہیں کیا۔ ان کا کہنا ہے کہ سب سے بڑا مکتبہ فکر انسانیت ہے اور نظریہ "حقوق انسانی"۔ اقبال کی شاعری سے متاثر ہیں کیونکہ ان کی شاعری ایک نئی دنیا کے دروازے کھولتی ہے۔ سچا شعر جب ہی وارد ہوتا ہے جب قلم کار اپنی ذات کے حصار سے باہر نکلے اور اپنے ارگرد پھیلے ہوئے دکھوں کو محسوس کرے۔ جیسے مونا نے محنت کش بچوں کے دکھ کو محسوس کیا اور "دھول کے پھول" کے عنوان سے نظم تخلیق کی۔

مونا کا کہنا ہے کہ ایک اچھے شعر کی خوبی یہی ہے کہ وہ آسان فہم ہو اور شعر اس طرح دل میں اتر جائے کہ جیسے شاعر نے پڑھنے والے کے لئے ہی کہا ہو۔ آج کل بعض شعراء جدت کے چکر میں پڑ کر اچھے خاصے شعر کو مبہم کردیتے ہیں اور بعض مشکل گوئی میں ایسا کمال رکھتے ہیں کہ

شعر سمجھنے کے لئے "فرہنگ آصفیہ" ساتھ رکھنا ضروری ہو جائے۔ بلاشبہ نئی اصطلاحات کا استعمال صحت مندانہ ہے لیکن وہ عام فہم بھی ہوں۔

مونا کا خیال ہے کہ "شعر و ادب کے لئے صحت مند تنقید ضروری ہے اور تنقیدی نشستیں اور محفلیں برپا ہونی چاہئیں۔ مونا کہتی ہیں "برپا" کا لفظ میں نے اس لئے استعمال کیا ہے کہ یہ محفلیں ایک حشر کا سماں پیش کرتی ہیں۔ اچھے اچھے چہروں کے جغرافیہ بگڑنے کا خدشہ ہر گھڑی رہتا ہے۔

ادبی رسائل و کتب کی عدم مقبولیت کی وجہ بتاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اس کی ایک وجہ تو یہ بھی ہے کہ ہاتھوں سے قلم اور کتاب چھین کر ہتھیار تھما دیئے گئے ہیں۔ آج ہم بچوں کو تحفے میں اچھی کتابیں کم اور کھلونا پستول اور گن زیادہ دیتے ہیں۔ بقیہ ذہنی تھیراپی کا کام ٹی وی اور فلمیں پورا کر رہی ہیں۔ اور اس زہر کا تریاق انہی ابلاغ عامہ کے ذرائع سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں ادیب و شعراء حضرات بھی گروہ بندی میں بٹنے کی بجائے اپنا اپنا کردار ادا کریں تو حالات تبدیل ہو سکتے ہیں۔ مونا کہتی ہیں کہ ادب کے نام پر بے ادبی کے چند مناظر میں نے نیویارک کی ادبی محفلوں میں دیکھے ہیں جس سے خاصی مایوسی ہوئی۔ پاکستان کا حال معلوم نہیں۔

مونا اس سے بھی متفق ہیں کہ ادب اور شاعری اس کے خالق کے وجود کا اقرار اور اس کے عہد کی گواہ بن جاتی ہے اور آج کی اور پاکستان کے حوالے سے جو شاعری ہوئی ہے وہ انسانی حقوق کا پرچار کرتی ہے لیکن بڑی شاعری کے لئے تحریک ضروری ہے۔ تحریک دینے کا عمل ابھی شروع نہیں ہوا۔ کچھ شعر و ادب کے کاروبار نے بھی شاعر کو صرف اسٹیج کا ڈرامائی کردار بنا دیا ہے۔ سب نہیں لیکن اکثر شعراء کا رویہ یہ ہے کہ وہ اسٹیج پر اپنی شاعری سے عوام کو بے حسی کی نیند سے جگا تو دیتے ہیں لیکن پھر اسٹیج سے اتر کر معاوضے کا لفافہ وصول کر کے کسی اور اسٹیج کی رونق بن جاتے ہیں۔ بالکل اس فلمی ہیرو کی طرح جو ایک لوکیشن سے دوسرے لوکیشن کے درمیان بھاگتا ہے۔ یوں دہرا کردار اس کی شاعری کے امیج کو برقرار نہیں رکھ پاتا۔ پھر بھی میں کہوں گی صورتحال مایوس کن نہیں۔ امجد اسلام امجد، جون ایلیا، جمیل الدین عالی اور حمایت علی شاعر کا نام لیا جا سکتا ہے۔ حمایت صاحب کی کتاب "ہارون کی آواز" ایک برقی لہر کی مانند ہے۔ کینیڈا اور امریکہ میں بھی اچھے شعراء ہیں جیسے عابد جعفری، نسیم سید اور صبیحہ صبا۔ ان کی شاعری توانا ہے۔

کچھ دیر مونا نے توقف کیا اور پھر بولیں کہ یہ کہنا ادب کے ساتھ ناانصافی ہے کہ وہ آج بے معنی ہو گیا ہے اور لفظ سچ نہیں بولتے۔ حقیقت یہ ہے کہ آج کا ادیب اور شاعر اپنے قلم میں سیاہی کی جگہ خون کا استعمال کر رہا ہے۔ اپنے اردگرد پھیلا ہوا ہر منظر اسے خون میں ڈوبا نظر آتا ہے۔

ملاحظہ ہو۔

سیاہی سے نہیں خون جگر سے آج لکھی ہے
تقاضا وقت کا یہ تھا کہ رنگ داستاں بدلے

البتہ کہیں کہیں یہ بھی ہوا ہے کہ۔

یہ سچ ہے کہ سچائی کو اٹھے ہیں علم بھی
یہ سچ ہے کہ سہتے رہے ہر جور و ستم بھی
لیکن کبھی بازار میں جب دام بڑھے ہیں
تو بیچ دیئے حرص کے ماروں نے قلم بھی

"اس سے انکار نہیں کہ بڑی شاعری کے لئے وسیع تجربات اور مثبت فکر اور مکالمہ بہت ضروری ہے۔" مونا نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا۔ "جس معاشرے میں ادب اور شعر کی قیمت طے کی جائے تو وہاں ادب ادب نہیں رہتا۔ لفظ کھوکھلے ہوجاتے ہیں۔ پاکستان میں چند ادیب اردو ادب کی ترویج واشاعت کے لئے یقیناً کام کررہے ہیں اور وہ شعراء بھی جیسے احمد فراز' افتخار عارف' پیرزادہ قاسم اور شان الحق حقی۔

اردو زبان کی بقاء کے لئے مونا کی تجویز ہے کہ والدین احساس کمتری کی زنجیروں کے حلقے سے نکلیں۔ یہ عذاب صرف ہم برصغیر کے لوگوں پر آیا ہے کہ اپنی زبان بولتے ہوئے احساس کمتری محسوس کرتے ہیں ورنہ آپ دوسری اقوام کو دیکھیں وہ کیسے اپنی زبان کے ورثے کی حفاظت کرتے ہیں اس کے باوجود کہ دوسری سرزمین پر بستے ہیں مگر انگریزی کے رعب سے آزاد ہیں۔

مونا نے کچھ مزاحیہ خاکے بھی لکھے ہیں۔ ایک بعنوان "جدید غزل اور نظم کا مکالمہ" اور دوسرا "بلقیس بانو عرف مس نیلی" بالترتیب ٹیلی کاسٹ ہوا اور اسٹیج پر کھیلا گیا۔ ان کا کہنا ہے کہ اپنا مذاق اڑانا بہت بہادری کا کام ہے اور مزاح کی دنیا میں ایسے جی داروں کی کمی نہیں جن میں شوکت تھانوی اور شفیق الرحمٰن کا نام سرفہرست ہے۔

قطعہ

عادی تھے میرے پاؤں خار سفر کے
پھولوں سے بھری راہ پہ چلنا نہیں آیا

یا کچھ تو ترے پیار میں ٹھنڈک ہی بہت تھی
یا مجھ کو ہی اِس آگ میں جلنا نہیں آیا

عکسِ فن

غزل

شہرِ وفا میں آج نئی بات ہو گئی
شامِ وصال، نذرِ فسادات ہو گئی

چاروں طرف سے چلنے لگیں سُرخ آندھیاں
اور ناؤ غرقِ بحرِ طلسمات ہو گئی

کچھ ہم بھی ناشناسِ زمانہ تھے اور کچھ
نازک تھا دل کا کھیل ہمیں مات ہو گئی

بے چھت مکیں ہیں ہم کو کہاں موسموں کا خوف
آندھی گزر گئی کبھی برسات ہو گئی

ٹوٹا ہے جب سے شیش محل اعتبار کا
میرے لئے ہی غیر مری ذات ہو گئی

موناؔ یہ رحمتوں کا سلیقہ بھی خُوب ہے
ہم نوحہ لکھ رہے تھے مُناجات ہو گئی

غزل

فلک کی گردشیں بدلیں نجُوم و کہکشاں بدلے
مگر تقدیر کے لکھے کہاں اے جانِ جاں بدلے

چلو ہم مان لیتے ہیں نصیحت گو پُرانی ہے
مگر ناصح کو سمجھاؤ کہ اندازِ بیاں بدلے

ہمیں ہر زخم سہنے کا سلیقہ آگیا موناؔ
کوئی اس سے کہے جا کے کہ وہ تیر و کماں بدلے

افشاں مہرین

سمجھا جسے زمانہ مہرین نے
وہ نئی تصویر میں ڈھل گئے

افشاں مہرین

Afshan Zaki
P.O.Box No 2102
Al Khober - (Saudi Arabia)

افشاں ذکی مہرین
(سعودی عرب)

نام ہے ان کا افشاں انجم۔ تخلص ہے مہرین۔ شادی کے بعد یہ افشاں انجم سے افشاں ذکی بن گئیں کہ یہ ہماری پرانی روایت ہے۔ ۱۹۶۵ء میں حیدر آباد دکن (ہندوستان) میں پیدا ہوئیں۔ چار بھائی اور دو بہنوں میں سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے اماں کی چہیتی تھیں۔ ابو کی جدائی کا غم کم عمری میں ہی سہنا پڑا تھا اس وقت سے بھی ماں کے آنچل میں پناہ ڈھونڈتی رہیں۔ پھر جب امی حج کے لئے گئیں تو عدم تحفظ اور تنہائی کے احساس نے غم کی شدتوں میں اضافہ کیا۔ یہی وہ لمحات تھے جب شاعری نے انہیں سہارا دیا۔ انہوں نے اپنے دکھ اور اپنا کرب اپنے اشعار میں سمودیا تو دل کو یک گونہ راحت سی محسوس ہوئی۔ اس موقع پر انہوں نے ایک نظم کہی "ماں" اصلاح دینے والا گھر میں تو کوئی نہ تھا۔ کسی سے ذکر کرتے بھی شرم آرہی تھی۔ کسی استاد کو تلاش کرنے والے حالات نہ تھے۔ یوں بھی لڑکیوں کا مردوں سے خط و کتابت کرنا ہمارے معاشرے میں قابل قبول نہیں۔ چنانچہ افشاں نے دہلی کے ماہنامہ "پاکیزہ آنچل" میں یہ غزل بھیج دی۔ جس کا عنوان تھا۔ "ماں"

ماں تو اک ایسی ہستی ہے
جو خدا کی طرح دلوں میں بستی ہے
ساری دنیا کے بدلے گر ملے ممتا
میرے لئے تو بہت ہی سستی ہے

اور یوں افشاں نے دشت شاعری میں قدم رکھا۔ ان کا کلام رہنمائے دکن حیدر آباد'

سیاست حیدر آباد' دوشیزہ ڈائجسٹ کراچی (پاکستان) اور دوسرے رسائل میں چھپتا رہا۔ ستمبر ۹۵ء کے شمع دہلی میں بھی ان کی ایک غزل شائع ہو چکی ہے۔ آج بھی جب افشاں کسی کے بھی دکھ سے متاثر ہوتی ہیں تو شاعری میں پناہ ڈھونڈتی ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ادب اظہار ذات بھی ہے اور اظہار کائنات بھی۔ ابلاغ کے لئے ضروری ہے کہ زبان آسان ہو اور اسلوب دلنشیں۔

افشاں کہتی ہیں کہ تنقید ادب و شاعری کے لئے نئی راہوں کا تعین کرتی ہیں اور کلام میں نکھار آتا ہے۔ تنقید کو کھلے دل سے قبول کرنا چاہئے اور تنقیدی محفلیں منعقد کرنے کا اہتمام کرنا چاہئے۔

افشاں کہتی ہیں "ادبی کتب و رسائل کی عدم مقبولیت کی وجہ علمی و ادبی محفلوں کی کمی ہے۔ صرف گھریلو شعری نشستیں منعقد کرنا کافی نہیں۔ افسانوی اور تنقیدی نشستیں بھی ہونا چاہئیں جس سے کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہو۔ موجودہ دور میں اردو زبان کو وسعت دینے کے لئے اپنے بچوں کو اردو زبان کی تعلیم ضرور دیں۔ یہ مسئلہ امریکہ اور یوروپ کا ہی نہیں ہندوستان کا بھی ہے۔ لوگ تن آسان ہوگئے ہیں۔ زبان کی بقاء کا صرف زبان سے چرچا کرنے سے کامیابی نہیں ہوگی۔ اس کے لئے عملی قدم اٹھانا بھی ضروری ہے۔

ادیب اور شاعر کی تحریر اس کے وجود کا اقرار اور عہد گی گواہ بن جاتی ہے لیکن آج ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا ادب کم تخلیق ہو رہا ہے۔ کچھ شعراء تو سنجیدگی سے اس پر توجہ دے رہے ہیں مگر شعراء کی بھرمار نے شاعری کا وہ معیار برقرار نہیں رکھا جو کبھی تھا۔ آج تو بس جس نے قلم تھامنا سیکھا شاعری شروع کردی' چاہے شاعری معیاری نہ بھی ہو۔ اچھی شاعری کے لئے مطالعہ ضروری ہے اور کتنے لوگ سنجیدگی سے کتنا مطالعہ کرتے ہیں یہ ہم اور آپ بھی جانتے ہیں"۔

شاعری کے علاوہ افشاں افسانے اور مضامین بھی لکھتی ہیں۔

شریک حیات کی ملازمت کی وجہ سے ان دنوں الخبر سعودی عرب میں مقیم ہیں۔

افشاں مہرین

عکس فن

روٹھا بچپن

آ کے جوانی کے موڑ پر لگتا ہے مجھے
چھوڑ آئی کہاں وہ بچپن کو
نہ فرق تھا غم اور خوشی میں کوئی
نہ لگتا تھا اپنا پرایا کوئی
نہ فکر تھی آنے والے لمحوں کی
یاد ستاتی نہ تھی کسی کی بھی
نہ بوجھ تھا کبھی دل پر
نہ غم تھا کسی کے جانے کا
بس جانتے تھے اتنا ہم
کونسا کھیل آج کھیلیں گے
ملے گی جو چیز بھی لے لیں گے
گڈے گڑیا کے کھیل میں جب بھی
لکڑے سکھیوں سے ؟ مل بھی جاتے تھے
پھول کی طرح پھر سے کھل بھی جاتے تھے
کل کی تصویر کو بھلاؤں کس طرح میں
پھر سے محفل سجاؤں کس طرح میں
روٹھے بچپن کو پھر مناؤں کس طرح میں

ناصر نظامی

(ہالینڈ)

سخن ور حصہ دوم کے لئے ناصر نظامی کا نام مجھے ہالینڈ میں بسنے والے اردو زبان کے شیدائی محمد اشرف سے ملا۔ محمد اشرف سے میری خط وکتابت ماہنامہ "شمع" دہلی کے توسط سے ہوئی۔ اشرف کا پتہ "شمع" سے لے کر میں نے انہیں خط لکھا کہ وہ ہالینڈ میں بسنے والے شعراء یا شاعرات تک میرا سوالنامہ پہنچادیں۔ اشرف صرف ناصر نظامی کو جانتے تھے۔ ایک طویل انتظار کے بعد مجھے ناصر نظامی کا جواب ملا۔ جو جوں کا توں "سخن ور" کے قارئین کی خدمت میں حاضر ہے۔ جو بہرحال ناصر نظامی کی فکر وسوچ کی چند جھلکیاں لئے ہوئے ہے۔ لیکن اس سے قبل ہالینڈ میں بسنے والے اردوداں حضرات کے متعلق مختصراً معلومات ملی ہیں ان کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔

ہالینڈ میں بسنے والے پاکستانیوں کی تعداد مختلف اداروں کے اعداد وشمار کے مطابق کل بارہ ہزار بنتی ہے جن میں سے پاکستانی پاسپورٹ پر قانونی طور سے ہالینڈ میں رہنے والوں کی تعداد تقریباً چار ہزار دو سو ہے۔ ڈچ شہریت کے حامل پاکستانیوں کی تعداد تین ہزار سے ساڑھے تین ہزار ہے دیگر یورپی ممالک کی شہریت کے حامل پاکستانی جو ہالینڈ میں رہ رہے ہیں وہ تقریباً دو ہزار ہیں۔ ان لوگوں میں سے اکثریت کے پاس برطانوی پاسپورٹ ہیں۔ جبکہ بقایا پاکستانی ایسے ہیں جو بغیر ویزے کے ہالینڈ میں قیام پذیر ہیں۔ پاکستانیوں کی اکثریت ہالینڈ کے چار بڑے شہروں ایمسٹرڈیم' روٹرڈیم' دی ہیگ اور اترخ میں رہتی ہے یہاں پر مقیم ایک پاکستانی اسکالر وقاص بٹ نے کچھ عرصہ قبل ایمسٹرڈیم کی یونیورسٹی کے شعبہ انتھروپولوجی اونان ویسٹرن سوشیالوجی کی طرف سے "دی لائف آف پاکستانیز ان دی نیدرلینڈ" کے عنوان سے ایک مقالہ قلمبند کیا تھا جس میں ہالینڈ میں موجود

پاکستانیوں کی زندگیوں اور ان کے مختلف لسانی و سماجی مسائل کے بارے میں تحقیق کی گئی تھی۔ اس مقالے کے مطابق ہالینڈ بھر میں کسی بھی کالج یا یونیورسٹی می اردو باقاعدہ مضمون کے طور پر نہیں پڑھائی جا رہی۔ البتہ لائیڈن یونیورسٹی ایمسٹرڈیم یونیورسٹی میں ایک اضافی مضمون کے طور پر لوگ اسے پڑھ سکتے ہیں۔ ایمسٹرڈیم میں اردو کا "سیلف اسٹڈی کورس" ہے جو کہ صرف وہی حضرات استعمال کرتے ہیں جن کو کسی تحقیق یا کسی منصوبے پر کام کرنے کے لئے پاکستان جانا ہو۔ اس کے علاوہ کچھ لوگ ذاتی حیثیت سے بھی اردو کی کلاسیں لیتے رہے ہیں جن میں قابل ذکر نام Dick Plukker کا ہے۔

اردو کے بارے میں لائیڈن یونیورسٹی میں سب سے زیادہ کام ہوا ہے۔ مگر ہالینڈ میں اردو چیئر تا حال قائم نہیں ہو سکی۔ مساجد میں یا ان سے ملحقہ جگہوں پر اردو کی تدریس کا کام البتہ ہو رہا ہے جہاں اردو زیادہ تر مذہبی اقدار سے متعلق ہے پاکستانی سفارتخانے اردو میں کچھ کتابیں بھی شائع کر رہے ہیں جن میں علامہ اقبال پر بھی کتاب شامل ہے۔

اردو سے ڈچ زبان میں ترجمہ ہونے والی کتابوں میں پاکستان کے معروف ناول نگار فاروق خالد کے پاکستان رائٹرز گلڈ انعام یافتہ ناول "سیاہ آئینے" کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ ڈچ زبان میں ترجمہ شدہ اس کتاب کی تقریب رونمائی ۱۹۹۰ء میں منعقد ہوئی جس میں سفیر پاکستان جناب اظہار الحق نے بطور مہمان خصوصی شرکت کی تھی۔ "سیاہ آئینے" اردو کی پہلی کتاب ہے جو براہ راست اردو سے ولندیزی زبان میں ترجمہ ہوئی ہے اس سے قبل ریڈیو وائس آف ایشیا کے فرسٹ پریذیڈنٹ اور معروف شاعر ناصر نظامی کے مجموعہ کلام "صلیب گر" کی چیدہ چیدہ نظموں کا اگرچہ ترجمہ ہو چکا تھا لیکن یہ ترجمے چند صفحات پر مشتمل تھے جو سائیکلو اسٹائل کر کے پمفلٹ کی صورت میں یکجا کر دیئے گئے تھے۔ ۱۹۸۳ء اور ۱۹۸۵ء میں ترجمہ ہونے والی ان نظموں کو پروفیسر Dick Plukker نے ڈچ زبان میں منتقل کیا تھا اور یہ مقامی جرائد میں بھی شائع ہوتی رہیں۔

جہاں تک اردو کے رسالوں کا تعلق ہے تو یہاں سے نکلنے والے رسالے زیادہ تر سیاسی ہی رہے ہیں جن میں "جدوجہد" راجہ مظہر کا۔ "پردیس" اسد مفتی کا۔ "نیا سویرا" اور وقاص بٹ کا "آزادی" وغیرہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔

ریڈیو سے شروع شروع میں کبھی کبھار ایک پروگرام Hil Vergum کے نام سے نشر ہوا کرتا تھا یا سری نامی ریڈیو سے ہندی اردو گانے پیش کئے جاتے تھے مگر یکم اکتوبر ۱۹۹۰ء سے ایمسٹرڈیم سے ریڈیو وائس آف ایشیا کا آغاز ہو چکا ہے جس میں خالصتاً اردو اور پنجابی کے پروگرام نشر کئے جا رہے ہیں۔

یہاں پر کچھ ادبی تنظیمیں بھی موجود ہیں جو اردو زبان وادب کے فروغ کے لئے کام کررہی ہیں۔ ناصر نظامی نے "تحریک فکر نو" کے عنوان سے ۱۹۸۳ء میں ایک تنظیم قائم کی جس کے تحت ادبی وعلمی نشستیں منعقد کیں۔ اس سے کچھ عرصہ قبل "لٹریچر اینڈ آرٹ سوسائٹی" کے نام سے ایک تنظیم معرض وجود میں آئی تھی جو اس وقت سے لے کر اب تک مہینے میں دوبارہ اجلاس منعقد کررہی ہے۔ ان نشستوں میں ادبی تخلیقات پر تنقید بھی کی جاتی ہے۔

ناصر نظامی صاحب لکھتے ہیں۔

ایمسٹرڈم

۱۷ اکتوبر ۹۵ء

محترمہ سلطانہ مہر صاحبہ! والسلام

شکر ہے "لاس اینجلس" سے مجھ ایسے بے نام شخص کی طرف باد مہر کا معطر جھونکا آیا۔ آپ کے خط کا شکریہ ادا نہیں کروں گا چونکہ شکریہ ادا کرنے سے احساس ختم ہوجاتا ہے۔

آپ نے مجھے تلاش کیا ---------- میں آپ کا مفتوح ٹھہرا اور اس اعتبار سے مجھ پر خراج کی ادائیگی بھی واجب ٹھہری ---------- آپ کا کہنا درست ہے کہ آپ ایسے انسان دیار غیر میں اردو زبان کا چراغ جلانے کی کوشش جاری رکھے ہوئے ہیں لیکن یہ بھی توسچ ہے کہ انسان اپنی زبان کے دم سے ہی سنہرے سنہرے اجلے اجلے خواب دیکھتا ہے۔ اپنی ذات کا اظہار کرتا ہے اور اپنے وجود کو برقرار رکھتا ہے۔

انسان دراصل زندہ ہی زبان کے دم سے رہتا ہے۔ جس طرح درخت کی جڑیں زمین کے اندر ہوتی ہیں اسی طرح انسان کی جڑیں اس کی زبان کے اندر ہوتی ہیں۔ موسیقی کو فنون لطیفہ کی ماں کہا جاتا ہے ---------- لیکن تہذیب کی ماں ---------- زبان ہوتی ہے۔ ماں کے قدموں سے جڑ کر رہنے ہی میں انسان کی سرخروئی کا راز پوشیدہ ہے۔ باقی دنیا میں ہر چیز تلاش کرنی پڑتی ہے' ڈھونڈنی پڑتی ہے' بغیر تسخیر کے کچھ حاصل نہیں ہوتا میرا ہی ایک مصرع ہے۔

گوہر یکتا بنا ڈھونڈے کبھی ملتے نہیں

زمین کی تہہ میں پانی تو موجود ہوتا ہے لیکن سطح پر نظر نہیں آتا لیکن بعض جگہ کم گہرا اور زیادہ گہرا ضرور ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر پھول میں خوشبو ہوتی ہے۔ آپ نے خوب بات کہی۔ "جب انسان کے دل کی دنیا اجڑتی ہے تو وہ خود کو لٹانے لگتا ہے۔" ندیاں' نالے' جھیلیں اور دریا بھی تو ایسا ہی کرتے ہیں ان کے دامن میں گرداب اٹھتا ہے تو ان کے کنارے بھی کرچی کرچی ہونے لگتے ہیں۔ آگ کوئلے کو اس وقت تک نہیں چھوڑتی جب تک سیاہی کے آخری نکتے تک

کو نہ مٹادے۔ پھر ستارہ بھی تو اندر ہی سے ٹوٹنا شروع ہوتا ہے اور بالآخر ستارے کے وجود کی بیرونی حدوں کو بھی راکھ کر دیتا ہے۔

شعر سے تو شعور ہی حاصل ہو گا' گلاب کا پھول ہمیں انگور نہیں دے سکتا!

مجروحوں سے مرہم کا تقاضا! بعض اوقات درخت تو ہوتا ہے مگر اس پر پھل نہیں ہوتا۔ زرخیزی اور بانجھ پن اسی کیفیت کا نام ہے۔ میرے ساتھ بھی عجب ہوا ہے۔ میں نے اپنی پہلی کتاب (صلیب گر) پر سارا پیسہ خود خرچ کیا۔ آخر میں مجھے اپنی ہی کتاب پچاس روپے میں خریدنی پڑی جبکہ دوسرے لوگوں نے تیس روپے میں خریدی۔ یہ کتاب (مکتبہ دانیال کراچی سے ۸۸ء میں شائع ہوئی) اب تک پانچ کتابیں لکھ چکا ہوں ایک چھپی ہے چار چھپی ہیں۔

پنجابی' سرائیکی' ہندی' اردو میں لکھتا ہوں۔ گیت' نظم' غزل' مضامین' سیاسی' ادبی' خود ہی طرز نگاری بھی کرتا ہوں۔ یہاں کے مقامی سنگرز میرا کلام گاتے ہیں۔ ویسے نصرت فتح علی اور ایک غزل مہدی حسن صاحب نے بھی گائی ہے۔ موسیقی کا بھی تھوڑا سا علم رکھتا ہوں۔ یہاں (ریڈیو وائس آف ایشیا) پر بطور براڈ کاسٹر بھی خدمات انجام دیتا رہا ہوں۔ (تہذیب) کے عنوان سے پروگرام کرتا رہا ہوں۔ ہالینڈ میں پہلے (تحریک فکر نو) کی بنیاد ڈالی پھر لٹریچر اینڈ آرٹس سوسائٹی ہالینڈ کی تنظیم کی اور پہلا بانی صدر بنا۔ تنقیدی نشستیں بھی کرتے رہے۔ عشائیہ پروگرام اور ڈرامے بھی کئے۔ آج کل یہاں (انڈین انسٹیٹیوٹ ایمسٹرڈیم) میں اردو کا استاد ہوں۔ خالی لفظ ہی لفظ ہیں پیسہ ایک بھی نہیں-------- آخر یہ راستہ میں نے خود ہی چنا ہے۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکا آپ کی مدد ضرور کروں گا۔ (آپ کے علمی اور ادبی کام میں) ملاقات کا اشتیاق ہے۔ میرا نام محمد حنیف ناصر چوہان ہے۔ تخلص ناصر نظامی۔ جائے پیدائش فیصل آباد (پاکستان) گریجویشن سیاسیات۔ بعد میں اردو لٹریچر پڑھا۔ مگر سیاسی وجوہ کی بناء پر ملک چھوڑ کر ہالینڈ آنا پڑا۔

(اشرف صاحب کا احسان مند ہوں کہ انہوں نے آپ کا خط خود مجھ تک پہنچایا) تمام اہل خانہ اور احباب کو سلام۔ تحریر تو آپ نے بھیجی۔ تصویر بھی بھیجئے۔

ناصر نظامی

عکسِ فن

گیت

لاوا یادوں کا جب پگھلتا ہے
دیر تک دل کا شہر جلتا ہے

اب تو چاہت کے نام کو سن کر
جاں لرزتی ہے جی دہلتا ہے

عشق کے کوچۂ خرابی میں
جو بھی جاتا ہے ہاتھ ملتا ہے

جو ترے گیسوؤں سے کھیلا ہے
وہ کھلونوں سے کب بہلتا ہے

زخمِ دل پھوٹ پھوٹ جاتے ہیں
چاند جب جب افق میں ڈھلتا ہے

شب کی تیرہ شبی یہ کہتی ہے
شب کے پہلو سے دن نکلتا ہے

نہ لٹا دولتِ وفا ناصر
کھوٹا سکہ بھی کہیں چلتا ہے

واجد ندیم

بدگمانی بھی عجیب شے ہے کہ بیٹھے بیٹھے
دل کے آئینے میں تصویر بدل جاتی ہے

واجد ندیم

Wajid Nadeem
2528 W.Berteau
CHICAGO, IL 60618 - U.S.A.

واجد ندیم
(شکاگو)

واجد ندیم شاعر بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی۔ افسانوں میں ان کا طرز بیان بڑا دلکش ہے۔ تحریر میں روانی ہے۔ سو میں نے چاہا کہ واجد ندیم کا تعارف ان کی زبان میں ہی پیش کیا جائے تاکہ محسوس ہو کہ ہم ایک افسانہ نگار سے اس کی کہانی، اس کی آپ بیتی سن رہے ہیں۔ تو آیئے واجد سے ان ہی زبانی سوالات کے جواب لیتے ہیں۔ واجد کہتے ہیں۔

"میرا خاندانی نام سید واجد حسینی ہے۔ تخلص ندیم اور قلمی نام واجد ندیم اختیار کیا۔ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن سے بی۔ ایس۔ سی اور ایل۔ ایل بی کیا۔ کمپیوٹر پروگرامنگ کی تعلیم شکاگو میں حاصل کی۔ سن و تاریخ پیدائش ۶ جون ۱۹۳۶ء حیدر آباد دکن (آندھرا پردیش) ہے۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ زندگی کا بیشتر حصہ مختلف کھیلوں کی نذر ہوا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس عمر میں بھی چاق و چوبند ہوں اور اپنی عمر سے دس سال کم لگتا ہوں۔ عثمانیہ یونیورسٹی کی نمائندگی فٹ بال، والی بال، باسکٹ بال اور ٹیبل ٹینس میں سارے ہندوستان میں کی اور تعلیم کے بعد بھی کھیلوں میں حصہ لینے کا سلسلہ چلتا رہا۔ میں نے آندھرپردیش اسٹیٹ کی نمائندگی بین الریاستی ٹورنامنٹس، نیشنل گیمس اور نیشنل والی چیمپئن شپس میں کی۔ پنجاب سے لے کر کرالا، آسام سے لے کر گجرات تک ہندوستان کے تمام بڑے شہروں میں ان مقابلوں میں حصہ لیا۔ ۱۹۵۵ء میں روسی والی بال ٹیم سے انٹرنیشنل مقابلے میں حصہ لیا اور کئی سرٹیفکیٹس حاصل کئے۔ کھیلوں میں بہترین معیار کا مظاہرہ رہا جس کے نتیجے میں ہر محکمہ سے ملازمت کی پیشکش ہوتی رہی۔ چنانچہ سینٹرل ریلوے میں ۵۶ء سے ۵۹ء تک کام کیا اور پھر آندھراپردیش پولیس نے اپنی ٹیمیں بنانا

شروع کیں تو میں نے اس پیشکش کو قبول کیا۔ اس طرح ریلویز پھر اس کے بعد آندھرا پردیش پولیس والی بال کی ٹیموں کی نمائندگی سارے ہندوستان میں کی اور کئی تمغے اور سرٹیفکیٹس حاصل کئے۔ انسپکٹر پولیس کی حیثیت سے ملازمت کا سلسلہ چل رہا تھا کہ ۱۹۷۲ء میں امریکہ کی ریاستوں میں شکاگو کا رخ کیا۔ یہاں سے کمپیوٹر پروگرامنگ کا کورس پورا کیا۔ اور اب گذشتہ ۱۸ سال سے بہ حیثیت آڈیٹر اور ایڈمنسٹریٹو اسسٹنٹ سٹی کالجز آف شکاگو بر سر روزگار ہوں۔

ادبی ذوق مجھے طالب علمی کے زمانے سے ہی رہا۔ کھیلوں کے علاوہ کوئی اور ذوق تھا تو وہ شعری اور ادبی ذوق ہی تھا۔ دوستوں میں شعراء (شمس نیازی جو آج کل پاکستان میں ہیں عامر موسوی جو گذشتہ کئی سالوں سے لندن میں مقیم تھے۔ گذشتہ سال ان کا انتقال ہوگیا۔ ان کا ایک مجموعہ کلام "تار نفس" چھپ چکا ہے) اور ادبی ذوق رکھنے والے حضرات شامل تھے۔ جس کے نتیجے میں خود میں نے بھی گاہے گاہے کہانیاں اور غزلیں لکھیں۔ لیکن سوائے دو ایک کہانیوں کے جو ہندوستان سے نکلنے والے رسائل میں شائع ہوئیں' باقی نظم اور نثر کہیں چھپنے کے لئے نہیں بھیجیں۔ دراصل کھیلوں اور ملازمت کی مصروفیت کی وجہ سے سنجیدگی سے لکھنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن ادبی ذوق کی چنگاری گو کہ مصروفیت کی راکھ میں دبی رہی' بجھی نہیں۔ مشاعروں اور ادبی اجلاس میں خصوصاً زندہ دلان حیدر آباد کی شعری اور ادبی محفلوں میں پابندی سے شرکت کرتا رہا۔

ادب اور شاعری کے محرکات میں سب سے پہلے تو بچپن سے اپنا ذوق ہی محرک بنا کیونکہ مزاج اپنا لڑکپن سے ادیبانہ تھا۔ پھر دوسرا محرک یہ ہے کہ یہاں ابتداء میں (۷۲ء'۷۳ء میں) مشاعروں کے عنوان سے جو محفلیں جمتی رہیں وہ عموماً کسی بھی فنکشن کے بعد تبدیل ذائقہ کے لئے منعقد کی جاتی تھیں۔ یہ ہوتا تھا کہ احباب مختلف شعراء کا کلام سناتے خصوصاً خوش گلو اور مترنم آواز میں پڑھنے والوں سے لوگ محظوظ ہوتے بعض لوگ پڑھتے تو دوسروں کا کلام تھے لیکن تاثر یہ پیدا کرتے تھے جیسے وہ اپنا ہی کلام پڑھ رہے ہوں۔ یہ سب کچھ دیکھ کر چونکہ ادبی ذوق پہلے سے تھا (پہلے میں نے غزلیں کہی بھی تھیں ۷۷ء'۷۸ء) میں نے غزلیں کہنی شروع کیں۔ چنانچہ ۱۹۸۰ء کے شکاگو کے پہلے مشاعرہ میں اپنا کلام سنایا جس میں کیفی اعظمی' اختر الایمان' علی سردار جعفری' بیکل اتساہی' مینا قاضی' حسن کمال' عزیز قیسی اور واجدہ تبسم (بہ حیثیت شاعرہ) نے شرکت کی تھی۔ ۱۹۷۴ء میں یونیورسٹی آف شکاگو میں اردو کے پروفیسر جناب نعیم چودھری صاحب نے پروفیسر جناب افضل محمد کے تعاون سے جو حیدر آباد دکن سے اپنے کسی پروجیکٹ کی تکمیل کے سلسلے میں آئے ہوئے تھے' ایک ادبی اجلاس منعقد کیا جس میں' میں نے اپنا طنزیہ و مزاحیہ مضمون "امریکہ دریافت" سنایا۔ اس کے بعد سے افسانے اور مضامین لکھنے کا سلسلہ جاری ہوگیا۔

واجد ندیم

شعر گوئی کے لئے کوئی ایک جذبہ یا کیفیت محرک نہیں بن سکتی۔ کئی کیفیات اور محرکات ہیں جس میں سے ایک کیفیت تو کائنات، عالم انسانیت، اپنا ماحول، اپنا خاندان، اپنا حلقہ احباب یا پھر اپنی ہی ذات سے تاثر لیتا ہے جیسے یہ شعر۔

ملے جوان بیٹی کا رشتہ ہو تو سمجھو جیسے
گھر کی گرتی ہوئی دیوار سنبھل جاتی ہے

دوسرا محرک جیسا کہ میں نے پہلے بیان کیا ہے مشاعروں میں سنانے کی دعوت اور طرحی مشاعروں میں شرکت ہے۔ دراصل طرحی مشاعروں کے انعقاد نے بڑی تحریک پیدا کی۔ اور لکھنے پر مجبور کیا آمد نہ سہی آورد ہی سہی۔ لیکن لوگوں نے لکھا۔ کم لکھنے والوں نے زیادہ لکھا اور نہ لکھنے والوں نے لکھنے کی کوشش کی۔

کس مکتبہ فکر سے میری شاعری متاثر ہے؟ اس کا اندازہ تو قارئین ہی لگا سکتے ہیں۔ دانستہ تو میں کسی مکتبہ فکر سے متاثر نہیں ہوں۔ بنیادی طور پر میں میر و غالب سے لے کر اقبال، فیض، مخدوم، ساحر وغیرہ اور آج کل کے شعراء میں قتیل شفائی، بیکل، کیفی، کلیم عاجز اور حمایت علی شاعر۔ ایسے کئی نام ہیں جن سے میں متاثر ہوں۔ میری نظر میں وہ شاعری جو عوام کے دلوں کو نہ چھولے وہ ضائع ہی جائے گی۔

میری تحریریں عموماً شمع، بیسویں صدی اور بعض ہندوستان سے نکلنے والے رسائل شگوفہ (حیدر آباد) اخبار سیاست (حیدر آباد) اردو ٹائمز (نیویارک) پاکستان لنک (لاس اینجلس) اور پاکستان "ٹوڈے" میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ میرا مجموعہ کلام اور افسانوں و کہانیوں کا مجموعہ زیر ترتیب ہے۔ میں مذہبی اور دینی اداروں سے بھی وابستہ ہوں سینٹرل ممبر کمیٹی شکاگو کا چیئرمین ہوں۔

ابلاغ کے سلسلے میں، میں کہوں گا کہ آسان زبان اور اسلوب کو اپنایا جائے تو ابلاغ میں دشواری نہیں ہوتی۔ میں اس بات سے سو فیصد متفق ہوں اور اس کو ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ ادب یا شاعری جو ایک عام آدمی کے دل میں اتر جائے اس سے بہتر ہے جو صرف چند اہل علم اور دانشوروں کے ہی پلے پڑ سکے۔ ایسی شاعری بھی آج کل دیکھنے میں آتی ہے جسے تجریدی (Abstract) شاعری ہی کہا جا سکتا ہے جسے صرف وہی شاعر سمجھ سکتا ہے جس نے لکھا یا پھر وہ جسے شاعر سمجھا دے۔ ایسی شاعری صرف کتابوں میں بند رہ جائے گی۔

میں اس بات سے متفق ہوں کہ تنقید، ادب اور شاعری کے لئے نئی راہیں متعین کرتی ہے۔ لیکن تنقید صحتمند ہو اور تنقید برائے تنقید نہ ہو بلکہ نئی راہوں کی طرف رہبری کرتی ہو۔ اور پھر

ناقد کے لئے بھی بہت ضروری ہے کہ وہ خود اس فن پر خاطر خواہ عبور رکھے اور خود اس میں تخلیقی صلاحیت بھی ہو۔ تنقید ادب کی ایک مشکل صنف ہے اور ہر کس وناکس کے بس کا یہ روگ نہیں۔ تنقیدی شعری محفلیں نئی راہوں کے تعین میں یقیناً ممدومعاون ثابت ہوں گی اگر وہ ذاتیات کے راگ الاپنے سے بالا تر ہوں۔

ادبی کتابوں اور رسائل کی عدم مقبولیت کی وجہ سے یقیناً نقصان ہو رہا ہے۔ اس مسئلہ کا حل یہ ہے کہ کم از کم ایک عرصہ کے بعد (کسی بھی رسالہ یا اخبار کے شروع کرنے کے) رسائل یا اخبار کی مفت تقسیم بند کی جائے۔ اور لوگوں کو اس بات کا عادی بنایا جائے کہ خرید کر پڑھیں۔ یہاں لاکھوں کی تعداد میں روزانہ اخبار چھپتے ہیں۔ ہزاروں رسائل مختلف موضوعات پر مارکیٹ میں نظر آتے ہیں اور آئے دن نئی نئی کتابیں شائع ہوتی ہیں اور عوام انہیں خرید کر پڑھتے ہیں۔ اس جذبہ کا ابھارنا ضروری ہے۔ اس ضمن میں میرا ایک قطعہ ملاحظہ کیجئے۔

کہنے کو تو ہم سب کو ہے اردو سے بڑا پیار
پر مفت جو ملتا ہے تو پڑھ لیتے ہیں اخبار
ہے پیار کا دعویٰ تو کریں اتنا کم از کم
اردو کے جرید کے بنیں ہم بھی خریدار

امریکہ ہی میں نہیں بلکہ ہندوستان میں (پاکستان کے بارے میں حتمی طور پر نہیں کہہ سکتا) نئی نسل اردو سے نابلد ہے۔ بول چال کی اردو باقی ہے اور اس کا کریڈیٹ بھی فلموں کو جاتا ہے لیکن لکھنے پڑھنے کی اردو ختم ہوتی جارہی ہے۔ سب سے پہلے تو گھروں میں اردو بول چال کو عام کیا جائے۔ پھر بچوں کو کم عمری ہی سے لکھنے اور پڑھنے کی طرف مائل کیا جائے۔ اگر کسی اسکول میں اردو بولنے کی خاطر خواہ تعداد ہو تو بورڈ آف ایجوکیشن سے نمائندگی کر کے اسکول میں اردو کھولی جاسکتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

جنم جس دیس میں اس نے لیا تھا
وہیں اب ہوگئی مہمان اردو

یقیناً اردو شاعری کے ذریعہ ایسا ادب تخلیق ہو رہا ہے جو زندگی سے بھرپور ہے اس کے لئے کئی شعراء کے حوالے دیئے جاسکتے ہیں۔ جو دو ایک اس وقت یاد آرہے ہیں۔

ہمارے سر کی پھٹی ٹوپیوں پہ مت جاؤ
ہمارے تاج عجائب گھروں میں رکھے ہیں
(راحت)

واجد ندیم

یہی معیار تجارت ہو تو کل کا تاجر
برف کے باٹ لئے دھوپ میں بیٹھا ہوگا

آج کی شاعری اس قول کی ترجمان ہے کہ ادیب اور شاعر کی تحریریں اس کے وجود کا اقرار اور اس کے عہد کی گواہ بن جاتی ہیں۔

تنقید نگار اگر کہتے ہیں کہ آج کی شاعری زندگی سے رشتہ نہیں جوڑے ہوئے تو وہ اپنے بیان میں غلو سے کام لیتے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں۔ آج کا ادب بامعنی ہے۔ لفظ سچ بول رہے ہیں اور دل میں بھی اتر رہے ہیں۔ اور آج ادب کا تعلق جیسا ہماری چاروں طرف کی زندگی سے ہے' پہلے نہیں رہا۔ کیا آج کا شاعر یہ نہیں کہتا کہ۔

مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ (فیض)

خود صنف غزل کو دیکھئے۔ زلف و رخسار' ابروئے خمدار اور گیسوئے یار کی بندشوں کے حصار سے نکل کر آج کل کے سارے مسائل کو غزل کے وسیع دامن میں پناہ ملی ہے۔ بے شمار مثالیں اور ان گنت شعر پیش کئے جاسکتے ہیں۔ ہاں کچھ چبائے لقمے ضرور اگلے جارہے ہیں لیکن شاعر جب کوئی نئی بات کہتا ہے تو اسے سمجھنے والے کم ہوتے ہیں اور پھر عام طور پر سمجھے جانے میں وقت لگتا ہے۔ اس کے بعد وہی بات کوئی اور شاعر کسی اور انداز میں کہے تو فوراً سمجھ میں آجاتی ہے اور سننے والا یا پڑھنے والا بے اختیار واہ واہ کہہ اٹھتا ہے۔ اس لئے ان کہی ہوئی باتوں کا دوبارہ کہنا مگر الگ انداز میں میرے خیال میں کوئی بری بات نہیں۔

شاعری میں نئے نئے تجربات ہو رہے ہیں نئی باتیں کہی جارہی ہیں۔ حمایت علی شاعر کی ثلاثیاں اور رحمان جامی (حیدرآباد) کے مرقعے (بیسویں صدی) جولائی ۱۹۹۵ء اس بات کی دلیل ہیں۔ دو مرقعے بطور نمونہ پیش ہیں۔

(۱)

سچائی کے ساتھ ہی
منہ پہ کڑوی بات ہی کہتا ہے اک شخص
ہر دم مجھ کو ٹوکتا رہتا ہے اک شخص
سہتا ہے اک شخص

(۲)

دل اپنا لگتا نہیں
آؤ مل بیٹھیں کہیں کرلیں دل کی بات
کب جانے پھر تم ملو کب ہو ایسی رات
جانے کب ہو برسات

اسی طرح اگر شاعر کے نقطہ نظر میں وسیع تجربات اور مثبت فکر و مطالعہ ہو تو یقیناً بڑی شاعری جنم لیتی ہے۔ میں نے طنزیہ و مزاحیہ مضامین بھی لکھے ہیں جو شگوفہ (حیدرآباد دکن) میں شائع ہو چکے ہیں۔ چنانچہ میں رشید احمد صدیقی کے قول سے متفق ہوں۔ میں نے مزاحیہ شاعری بھی کم۔م

واجد ندیم

عکسِ فن

نذرِ پاکستان

نسلِ سابق نے لگایا ہے یہ نازک پودا
بادِ ظلمت سے یہ مرجھائے تو پھر کیا ہوگا
گر نہ رکھا اسے محفوظ تو اے نسلِ رواں
نسلِ نَو آپ سے پوچھے گی تو پھر کیا ہوگا

○

کسی بھی شعر میں آزاد ہو یا ہو پابند
اگر خیال کی ندرت نہیں تو کچھ بھی نہیں
سجاؤ کتنا ہی الفاظ کے نگینوں سے
اگر بیان پہ قدرت نہیں تو کچھ بھی نہیں

پردیس میں اردو سے محبت ہے بہت ہے
پڑھ لیتے ہیں اردو کا جریدہ یہ بہت ہے
کیا سوچ کے بل بھیج دیا آپ نے صاحب
اخبار پڑھیں چندہ بھی دیں یہ تو بہت ہے

○

ایک ہلچل سی مچی جب یہ صدا سب نے سنی
شاعران محترم اسٹیج پر تشریف لائیں
میں ہوا حیران کہ میرے دیکھتے ہی دیکھتے
بھر گیا اسٹیج سارا ہال خالی رہ گیا

افتخار نسیم

میں ان لوگوں سے مختلف ہوں
اس لئے کہ میرے اندر
عورت بھی ہے
اور مرد بھی ہے
میں کالا بھی ہوں
اور گورا بھی ـــــ
میں زرد بھی ہوں
اور سبز بھی ـــــ
میرے اندر طاقت ہے
عورت کی
اور حساسیت ہے
مرد کی
میری قوت سے یہ لوگ خوفزدہ ہیں
نفرت کرتے ہیں !
کہ میں اپنے جیسوں سے پیار کرتا ہوں
اور یہ لوگ جس کے ساتھ سوتے ہیں
اسے گالیاں دیتے ہیں
حقیر سمجھتے ہیں
دوسرے درجے کا شہری

افتخار نسیم

Iftikhar Naseem
Loeber, 111 North Clark Street
CHIGAGO, IL 60610 - U.S.A.

افتخار نسیم

(شکاگو)

سخن ور (حصہ دوم) کے شعراء کے تعارف کے لئے میں نے جو فہرست مرتب کی اس میں شکاگو کے شاعر افتخار نسیم کا نام بھی تھا لیکن میرے پاس ان کا پتہ نہ تھا۔ لہٰذا میں نے شکاگو کے حسن چشتی صاحب اور غوثیہ سلطانہ سے رابطہ کیا کہ میری مدد کریں اور سوالنامہ ان تمام شعراء تک پہنچادیں جن کا تعارف "سخن ور" میں آنا چاہیے۔ حسن چشتی صاحب نے مجھے تمام شعراء کے پتوں کی فہرست بھجوادی۔ مگر بہت سے پتے بدل چکے تھے۔ میں نے غوثیہ کی ڈیوٹی لگائی کہ افتخار نسیم سے رابطہ کریں۔ انہوں نے سوالنامہ بھجوادیا اور فون بھی کردیا مگر افتی صاحب (انہیں یہاں اسی نام سے پکارا جاتا ہے) ایک چپ سو سکھ' کے مصداق شاعرانہ بے نیازی اختیار کئے رہے۔ پھر شمع دہلی میں ان کا پتہ دیکھ کر میں نے براہ راست انہیں خط لکھا اور سوالنامہ دوبارہ ارسال کیا۔ اس قسم کی خط و کتابت' یاددہانی اور پھر یاددہانی کے لئے میں نے بلا مبالغہ ڈیڑھ سو کے قریب خطوط لکھے ہوں گے۔ فون اور فیکس اس کے علاوہ تھے۔ افتخار صاحب وہ بھی ہضم کر کے بیٹھ رہے۔ پھر خالد خواجہ صاحب سے پتہ چلا کہ افتخار مشاعرے میں آرہے ہیں۔ مگر مشاعرے کے بعد افتخار کے گھومنے کا پروگرام بنا اور کام دھرا رہ گیا۔ مگر اچھی بات یہ ہوئی کہ افتخار نے آدھا ادھورا تعارف بھیج کر اپنی کتاب "نرمان" کا حوالہ دے دیا کہ ڈاکٹر فیروز عالم کے پاس کتاب ہے۔ ڈاکٹر فیروز عالم واقعی ہر مرض کی دوا ہیں۔ ذہنی جسمانی امراض سے لے کر "ادبی امراض" تک کی دوا دے ڈالتے ہیں۔ اسی کے لئے مشاعرے بھی منعقد کرتے ہیں اور بڑے خوبصورت ادبی مضامین بھی لکھتے ہیں کیونکہ ان کا مطالعہ طب سے لے کر ادب تک اور ادب سے لے کر موسیقی تک ہر میدان میں وسیع ہے۔ اسی طرح دل کا دامن بھی دوست تو دوست دشمنوں کے لئے بھی وسیع

رکھتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے مجھے "نرمان" فراہم کردی۔

"نرمان" کے گردپوش کے آخری صفحہ پر (Back Title) انجم سلیمی نے نرمان اور افتخار نسیم کا تعارف کراتے ہوئے اور نرمان کے معنی بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ "افتخار نسیم کی نرمان اسی لئے اپنے موضوع کے حوالے سے اردو ادب میں پہلی اور اہم کتاب ہے جس میں شاعر نے بڑی دردمندی اور اپنے پورے سچ کے ساتھ نہ صرف اپنے آپ کو "نرمان" (جدید فارسی کا لفظ ہے جس کا مطلب یونانی دیوتا Hermaphrodite ہے جو آدھا مرد اور آدھی عورت تھا) Own کیا ہے۔ (یعنی اپنایا ہے) بلکہ بڑی جرات مندی اور بہادری سے ایک "گے پرسن" (Gay Person) کی چیخ بن کر آئینہ بدست سامنے آن کھڑا ہوا ہے۔ چیخ...... شاید میں غلط کہہ گیا ہوں۔ یہ تو ایک ہم جنس پرست کا احتجاج ہے۔ (چیخ تو اس وقت ہو سکتی تھی کہ جب اس کا لکھنے والا پاکستان میں رہ رہا ہوتا) تو کیا پاکستان سے باہر رہنے والے Gays اپنے مختلف ہونے کا احساس رکھنے کے باوجود اس بات پر مطمئن ہیں کہ وہ اپنی مرضی کی زندگی گزار رہے ہیں اور اگر یہ مرضی کی زندگی ہے تو کیا اگر انہیں انتخاب کا حق دیا جائے تو وہ دوبارہ ایسی زندگی گزارنا پسند کریں گے؟ یقینی طور پر افتخار نسیم کے پاس بھی اس سوال کا جواب موجود نہیں ہے اور نہ ہی اس نے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ اس نے تو صرف اپنا کرب بیان کرنے کی سعی کی ہے...... اس کتاب میں شامل تمام نظمیں ایسی ہیں جو ہر Gay کو جذباتی طور پر دکھی کرتی ہیں۔ یہ دکھ افتخار نسیم کے ہی نہیں اس جیسے ہزاروں کے ہیں جو ایسی کرب انگیز زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ افتخار نسیم کا کمال یہ ہے کہ اس نے انہیں بیان کرنے کی جرات کرلی ہے۔ یا یوں کہہ لیں کہ اس نے "نا جنس" کے گونگے پن کو زبان دے دی ہے۔ ایک ایسی زبان جو اپنے کتھارسس کے آغاز میں ہی نہ توتلی ہے اور نہ ہی اپنے اظہار و بیان میں کہیں لکنت کا شکار ہوتی ہے۔ اسی جرات اظہار اور مکمل سچ نے افتخار نسیم کو "تیسری دنیا" کی پہلی نمائندہ اور توانا آواز بنا دیا ہے"۔

انجم سلیمی کے مضمون کے اقتباس سے "نرمان" کی وضاحت ہو چلی ہے۔ افتخار نسیم اپنے بارے میں لکھتے ہیں کہ ان کی پیدائش لائلپور پاکستان میں ہوئی ہے۔ انہوں نے سولہ سال کی عمر سے باقاعدہ شاعری شروع کی ہے۔ والد صاحب خلیل قریشی مشہور و معروف شاعر تھے۔ وہ نثر بھی لکھتے تھے۔ افتخار کو بچپن سے ادبی ماحول میسر رہا۔ حمایت علی شاعر، سید محمد جعفری اور جگن ناتھ آزاد سے ملاقاتیں رہیں۔ یوں ان کی شاعری نکھرتی رہی۔ علامہ اقبال کی شاعری نے انہیں بہت متاثر کیا۔ پھر غالب کو پڑھا۔ ہر شاعر کا اپنا ایک اسلوب ہوتا ہے' ایک انداز ہوتا ہے۔ کچھ لوگ اپنی تحریروں کے ذریعے بڑے سلو موشن میں دل کے قریب آجاتے ہیں اور ذہن و دل پر ان کی

ایک چھاپ رقم ہوجاتی ہے۔ سو آج بھی افتخار جب بہت ہی اکیلاپن محسوس کرتے ہیں تو اقبال کا "شکوہ" پڑھنا شروع کردیتے ہیں جس سے انہیں ایسا سہارا ملتا ہے گویا انہوں نے "اسم اعظم" پڑھ لیا ہو۔ اسی طرح غالب کو پڑھ کر سرور ملتا ہے۔ نثر میں کرشن چندر، عصمت اور قرۃ العین حیدر سے بہت متاثر ہیں۔ افتخار کی بہن اعجاز نسرین بھی افسانے لکھتی رہی ہیں۔ افتخار نے انہیں بھی بڑے شوق سے پڑھا ہے۔ اور کہتے ہیں کہ اگر وہ مسلسل لکھتی رہتیں تو اردو ادب میں بہت نام پیدا کرتیں۔

اردو زبان و ادب کے مستقبل کے حوالے سے افتخار کا کہنا ہے کہ مطالعہ بنیادی چیز ہے اور مطالعہ کا مطلب کتاب خوانی ہرگز نہیں ہے۔ یہ کتاب خوانی تجربہ میں ڈھل کر آپ کی زندگی کا حصہ اور دل کا روگ جب تک نہ بن جائے اچھی شاعری نہیں ہوسکتی۔ یوروپ اور امریکہ میں اس کے لئے ضروری ہے کہ ورکشاپ (Work shop) ہو۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ محفلوں اور نشستوں میں بڑے بڑے شاعر اور ادیب گفتگو کرتے تھے اور لوگوں کو رہنمائی ملتی تھی۔ اب یہ مواقع نہیں رہے۔ زندگی میں مصروفیات بڑھ گئی ہیں۔ خط لکھنے کا رواج ختم ہوگیا۔ فون پر گفتگو ہوجاتی ہے اس سے تربیت نہیں ہوپاتی۔ آج کے مشاعرے کمرشل ہوگئے ہیں۔ ترنم اور گروپ بندی نے بھی ادب کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ پھر بھی شمالی امریکہ میں چند نام ایسے ہیں جن کا کلام سامنے آیا ہے اور متاثر کن ہے جیسے فیاض الدین صاحب، خالد خواجہ، حمیرا رحمان، ڈاکٹر صبیحہ صبا، فرحت زاہد، آصفہ نشاط، کینیڈا میں نسیم سید، نزہت صدیقی وغیرہ۔

افتخار نسیم کی غزلوں کا مجموعہ "غزال" ہے۔ "زمان" نظموں کا مجموعہ ہے۔ یہ پہلی کتاب ہے جس میں Gay نظمیں ہیں۔ "ایک تھی لڑکی" افسانوں کا مجموعہ ہے۔ افتخار نسیم کو ورلڈ پیس اکیڈمی ڈیلاور World Peace Academy Delaware سے رابندر ناتھ ٹیگور ایوارڈ ملا ہے۔ حال ہی میں انہیں ڈاکٹریٹ آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری بھی ملی ہے۔

افتخار نسیم اردو کے علاوہ انگریزی اور پنجابی میں بھی لکھتے ہیں۔ ان کے پنجابی کلام کا مجموعہ زیر ترتیب ہے۔

افتخار نسیم

عکسِ فن

وحی

یاد ہے تم نے کہا تھا پڑھو
یاد ہے تم نے کہا تھا لکھو
یاد ہے تم نے بھلا کب یہ سب سکھایا تھے مجھے
اور میں اس سوچ کی اس غارِ حرا کے اندر
کب سے بیٹھا ہوا
مالکِ کون و مکان
ہست اور بُود کے بارے میں پریشان رہا
اور پھر اندھی گھُپا کے اندر
روشنی پھوٹی تو ظاہر یہ ہوا
آنسوؤں کے لئے دامن ہو ضروری تو نہیں
دید کے واسطے آنکھیں ہوں ضروری تو نہیں

متفرق اشعار

بارشوں کے بعد ست رنگی دھنک آجائے گی
کھُل کے رو لو گے تو چہرے پر چمک آجائے گی

○

کچھ نہیں سمجھے گا کوئی لاکھ تم کوشش کرو
جب دلوں کے درمیاں دیوارِ شک آجائے گی

○

روز ملنا بھی نہیں اچھا نسیم اس شخص سے
ورنہ اک دن تجھ میں بھی اس کی جھلک آجائے گی

نسیم سید

مرے پاس بھی ہیں سوال کچھ ۔ تو بتا تو یوم حساب کر

کوئی فلسفہ نہیں عشق کا ۔ جہاں دل جھکے وہیں سر جھکا

وہیں زانو موڑ کے بیٹھ جا ۔ نہ کوئی سوال و جواب کر

نسیم سید

Naseem Syed
606, Counter St
Kingston ONT K 7M 3 L6 - CANADA

نسیم سید
(کینیڈا)

نسیم سید سے میری پہلی ملاقات خواتین کے مشاعرے میں ہوئی۔ یہ ۱۹۹۱ء کی بات ہے۔ اردو مرکز کے تحت نیر جہاں نے خواتین کا ایک مشاعرہ منعقد کیا تھا۔ صدارت غالباً مرحومہ مہرالنساء مہر کی تھی۔ نیو جرسی سے رشیدہ عیاں آئی تھیں اور کینیڈا سے نسیم سید۔ باقی مقامی شاعرات تھیں۔ اس دھنک رنگ فضا میں نسیم نے مرحوم ضیاء الحق کے مارشل کے خلاف ایک آتشیں نظم سنائی اور فضا میں چاندنی جیسی ٹھنڈک کے باوجود تپش سی محسوس ہونے لگی۔ مشاعرے کے اختتام پر گفتگو کرتے ہوئے نسیم سے باتیں ہوئیں تو اس کی آنکھوں میں زندگی کی ایک چمک اور حوصلے نے مجھے اس سے اور قریب کر دیا۔ پھر تو جب نسیم کا تصور میرے ذہنی افق پر ابھرتا قربت اور بڑھ جاتی۔

۱۹۹۵ء میں وہ اپنی شاعری کا مجموعہ "آدھی گواہی" لے آئیں اور "اردو مرکز" لاس اینجلس کی جانب سے ایوارڈ لے گئیں۔ میں نے انہیں "سخن ور حصہ دوم" کے لئے مکالمے کی دعوت دی۔ نسیم نے بڑی فراخدلی سے یہ دعوت قبول کی اور خوب کھل کر گفتگو کی۔

آیئے دوستوں کی دوست نسیم سید سے اس کی اپنی زبانی اس کی ادبی زندگی کا حال سنتے ہیں۔

میرا پہلا سوال تھا کہ کیا تمہارا تخلص ہی تمہارا اصلی نام بھی ہے؟

"اسکول سے یونیورسٹی تک "غزالہ نسیم" تھی۔ سب پرانے ساتھی غزالہ کے نام سے جانتے ہیں۔ پھر غزالہ سے رشتہ ٹوٹ گیا اور میں صرف نسیم رہ گئی والد سید تھے۔ ان کی محبت میں اب تک سید ہوں۔ یعنی "نسیم سید"۔ وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "ایم اے میں نے کیا

تھا کراچی یونیورسٹی سے لیکن یہاں اس کی اہمیت ردی کاغذ جیسی ہوگئی۔ اب سوشل ورک میں یونیورسٹی آف واٹرلو سے ڈگری پر کام کر رہی ہوں۔"

"نسیم یہ بتاؤ کراچی سے کینیڈا تک......." میرا سوال سمجھ کر میری بات کاٹتے ہوئے نسیم کہنے لگیں۔

"مسلسل سفر میں ہوں۔ کوئی بھی زمین قیام کی اجازت نہیں دیتی۔ اسی احساس کے تحت تو کہا تھا میں نے کہ۔

ہر شہر کو اک ضد سی رہی گھر نہ بنا پائیں
کس شہر کے دامن سے لپٹ کر نہیں دیکھا!

شاعری کے علاوہ ادب کی اور کس کس صنف سے وابستگی ہے اور شاعری سے وابستگی کے بنیادی محرکات کیا تھے؟ نسیم کا جواب تھا۔

"پڑھنے کی حد تک ادب کی ہر صنف سے وابستگی ہے۔ میرا پسندیدہ مضمون فلسفہ اور نفسیات ہے۔ شاعری کے علاوہ انشائیے لکھتی ہوں۔ مختلف موضوعات پر مضامین لکھے ہیں اور بس۔ اور رہے بنیادی محرکات! تو ٹھہریئے۔ مجھے سوچنے دیجئے۔ شاید ------ شاید میرے اندر کا شور ------ اور باہر کا سناٹا تھا جو محرک بنا اور یہ بھی بتادوں کہ شعر گوئی کے لئے کوئی ایک کیفیت یا جذبہ نہیں جس پر میں انگلی رکھ کے اس کی وضاحت کرسکوں کہ میں اس کے تحت شعر کہہ سکتی ہوں۔ کبھی مجھ پر سے ٹرک کا پہیہ بھی گزر جائے تب بھی شعر نہیں ہوگا۔ کبھی کنکر بھی چبھ جائے تو اندر ایک کہرام سا بپا ہوجاتا ہے۔ خوشیاں، غم، حیرتیں، محبتیں، نفرتیں جب تک کھال سے اندر نہ اتر جائیں حالات ٹھیک رہتے ہیں اور لمبی تان کے سوتی ہوں لیکن جب یہ لہو میں تیر جائیں تو چاہے پی پی کے جاگتی ہوں اور جاگ جاگ کے نظم لکھتی ہوں۔ پھر شاعری میں، میں کسی مکتبہ فکر سے متاثر نہیں۔ میرے خیال میں کسی بھی مکتبہ فکر سے متاثر ہونا ضروری بھی نہیں۔ ہر اچھی تحریر خواہ وہ کسی مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے کی ہو، مجھے متاثر کرتی ہے۔ میری سوچ ہر اس فکر اور ہر اس مکتبہ فکر سے متاثر ہوتی ہے جس میں میرے لئے کچھ ہو۔ میری کچھ جاننے کی بھوک اور پیاس ایک کٹورا بھر پانی جیسا یا ایک روٹی جیسا کوئی تازہ تازہ، سوندھا سوندھا شہ پارہ، کوئی ورق کوئی جملہ، کوئی سطر۔ میرے دکھوں کی ساتھی جیسی کوئی تحریر، میری خوشیوں جیسی کوئی نظم، کوئی غزل کوئی افسانہ مجھے کچھ سکھانے والی کوئی کتاب ہی مجھے متاثر کرتے ہیں۔ میں ادب میں اس ملا ازم کی قائل نہیں کہ اگر کسی مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والوں میں سے اکثر کی تحریریں پسند ہوں اور اپنے نظریات اور اپنی سوچ سے بہت قربت کا احساس بخشیں،

ہوں تو اس مکتب کے ہاتھ پہ بیعت کرکے باقی سب کے نام پہ "اللہ ھم مالھن" کا ورد شروع کردیا جائے۔ (جیسا کہ ہمارے ادبی ماحول میں رواج ہے) اس طرح میں سراسر اپنا نقصان کروں گی۔ مجھے اس سوال میں ذرا گڑبڑ نظر آتی ہے کہ شاعری کو کیا ہونا چاہئے۔ گویا آپ یہ پوچھ رہے ہیں انسان کو کیا سوچنا چاہئے------- یہ فیصلہ آپ کیسے کرسکتے ہیں؟ انسان کبھی اپنے نظریات کی وضاحت کرتا ہے، کبھی خاموشیوں کے گلدستے بناتا ہے۔ کبھی پھول چنتا ہے۔ کبھی سوکھے پتوں کے ڈھیر بٹورتا دکھائی دیتا ہے۔ کبھی زندگی کو زندگی کی طرح بسر کرتا ہے۔ کبھی زندگی میں موت کے تجربے سے گزرتا ہے۔ اور ان تمام احساسات، تجربات، مشاہدات کے بیان کا نام ہی شاعری ہے۔ میں کسی بھی نظریہ کے تحت شعر نہیں کہتی۔ بس جس وقت جو محسوس کرتی ہوں وہ یادداشت کے طور پر لکھ لیتی ہوں۔ شاعری نہ صرف نظریاتی ہوسکتی ہے، نہ صرف جمالیاتی۔ بلکہ گوناگوں احساسات کے اظہار کا نام شاعری ہے۔ ہاں اس اظہار میں سلیقہ نہ ہو۔ تو پھر شاعری نہیں۔"

میرا اگلا سوال تھا کہ "آسان زبان اور اسلوب اپنایا جائے تو ابلاغ میں دشواری نہیں ہوتی اور کیا ادب و شاعری کے لئے ابلاغ ضروری ہے؟" نسیم نے کہا۔

"آپ کی بات درست ہے اگر زبان و بیان میں سادگی نہ ہو تو ذہن معنی کی تلاش میں بھٹکنے لگتا ہے۔ اور طبیعت ذرا سی دیر میں اچاٹ ہوجاتی ہے------ اب دیکھئے نا اگر میں آپ سے یوں گفتگو شروع کردوں کہ "تنگنائے غزل میں ہرچند کہ گنجینہ معنی کے طلسمات، لفظوں سے قائم ہوسکتے ہیں لیکن مافی الضمیر کی ادائیگی کے لئے لفظوں کی یلغار متخیلہ پر اس شدت سے ہوتی ہے کہ معنی و مفاہیم کے تعین کے بعد لفظوں کو فوری متخیلہ سے خارج کرنا پڑتا ہے۔" تو آپ کو شاید مرعوب کرنے میں تو کامیاب ہوجاؤں لیکن بات آپ تک پہنچ پائے گی یا نہیں، اس کی کوئی ضمانت نہیں۔ ایسا طرز تحریر اختیار کرنے والے ادیبوں کے کسی مخصوص گروہ سے شاید مخاطب ہوتے ہیں اور اپنی فکر صرف اور صرف مخصوص لوگوں تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ یا ان کے پیش نظر صرف اور صرف اپنی قابلیت کی نمائش ہوتی ہو۔ وجہ جو بھی ہو۔ لیکن ایسی تحریر کی اثر پذیری ایک محدود حلقہ میں ہوتی ہے اور عوام اس سے استفادہ نہیں کرپاتے۔ کیونکہ وہ ایسے گھمبیر الفاظ و تراکیب سے واقفیت نہیں رکھتے۔ بات جب سمجھ میں آئے تب ہی اثر بھی کرے گی۔ اگر بات پلے ہی نہ پڑے تو تحریر سے استفادہ کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہ ابلاغ ہی کا احسان ہے کہ ہم گھر بیٹھے دنیا بھر کے ادیبوں شاعروں اور تمام عظیم لکھنے والوں کی تحریروں سے مستفید ہوتے ہیں۔ جی ہاں ابلاغ بہت ضروری ہے اور تنقید سے متعلق آپ کے سوال کے

جواب میں عرض ہے کہ تنقید ذہن کے دروازے کھولتی ہے۔ اچھے برے کی شناخت بتاتی ہے۔ تنقید خامیوں کی نشاندہی کرتی ہے اور بہتری کی راہ بجھاتی ہے۔ لہٰذا مجھے آپ سے پورا پورا اتفاق ہے۔ رہا تنقیدی شعری محفلوں کا سوال تو ان محفلوں میں اکثر بے لاگ تنقید کے بجائے ذاتی پسند یا ناپسند کا جذبہ کارفرما نظر آتا ہے۔ اکثر نقاد اپنے گروہ سے تعلق رکھنے والے کی تحریر کو ذرہ ہے تو آفتاب بنا دیتے ہیں اور کسی سے کوئی کد ہے تو آفتاب پر بھی مٹی کے چراغ کا الزام دھر دیتے ہیں۔ لہٰذا تنقیدی محفلیں کسی حد تک معاون ہو سکتی ہیں ورنہ تو کوئی افادیت نہیں سوائے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کے"۔

ادبی رسائل و کتب کی پذیرائی کے اسباب کا جائزہ لیتے ہوئے ان کا کہنا ہے کہ "آج ادبی کتابوں کی وہ پذیرائی نہیں ہوتی اور نہ ہی اس نوعیت کے ادبی علمی پروگرام ہوتے ہیں جو پہلے ہوتے تھے۔ اس کے دو اسباب ہیں ایک تو یہ کہ رسالہ نکالنا ہی عزت کی بات ہے تو سب ایرے غیرے ایک ایک عدد ادبی رسالہ نکال بیٹھتے ہیں اور جو انہیں رسالہ کا چندا بھیج دے۔ اس کی غزل شائع کر دیتے ہیں۔ جتنا بڑا ہدیہ پیش کرے' پھر اتنا ہی اس ہدیہ بھیجنے والے کا رسالے میں چرچا ہوتا ہے۔ اس کی تحریر کیا ہے' اس سے انہیں کوئی غرض نہیں۔ اس لئے ان رسالوں کا خود معیار گر گیا ہے اور لوگ پیسے خرچ کر کے بے تکی شاعری' اور بے مقصد مضامین پڑھنا پسند نہیں کرتے۔ ادبی کتابوں کی پذیرائی نہ ہونے کا بھی یہی سبب ہے سو (۱۰۰) میں ایک آدھ کتاب ہی واقعی اچھی تخلیق کہلانے کی مستحق ہوتی ہے۔ دوسرا بڑا سبب یہ ہے کہ ہمارا آج کا ماحول اور ہماری نئی نسل اپنے آپ سے اس قدر شرمندہ ہے (اس شرمندگی کے بھی اسباب ہیں) کہ وہ اپنا لباس' اپنی زبان' اپنی تہذیب سب اپنے گلے سے اتار پھینکنا چاہتے ہیں۔ خواتین انگریزی کے رسالے خریدتی ہیں---- کیونکہ ہاتھ میں تھاما ہوا انگریزی کا رسالہ شخصیت کو نکھارتا ہے اور پھر اس رسالے میں صرف کپڑوں کے ڈیزائن والے اوراق دیکھتی ہیں------ بچے اسکول میں داخل ہوتے ہی رٹنے لگتے ہیں۔ سیب کو ایپل کہتے ہیں' خالہ کو آنٹی کہتے ہیں۔ گھر کو ہاؤس کہتے ہیں۔ یہ سب کیا ہے؟ کبھی کسی چائینز بچے کو مدرسے میں اپنی چیزوں کے نام انگریزی میں رٹتے دیکھا ہے آپ نے؟ یا تو پوری طرح انگریزی کو بھی اپنا لیا جائے اور اسی زبان کو سرکاری زبان بنا دیا جائے لیکن ایسا بھی نہیں ہوتا۔ قومی زبان اردو ہے اور قوم کی زبان انگریزی۔ جب پوری قوم کے حواس پہ انگریزی سوار ہو تو اردو رسائل کو کون پوچھے اور اردو کی ادبی کتابیں کون پڑھے؟ لہٰذا ادبی رسائل کی عدم مقبولیت سے شاعری کو نقصان نہیں پہنچ رہا بلکہ اردو شاعری اور اردو کی عدم مقبولیت سے یہ رسائل متاثر ہو رہے ہیں۔ اور اس کا حل یہ ہے

کہ ہمارے میڈیا یعنی ریڈیو اور ٹی وی کو ذہنوں کی تربیت کا کام اپنے ہاتھ میں لینا ہوگا۔ جیسا کہ مغربی ممالک میں رواج ہے۔ سوچ اور فکر کے پورے نظام کو بدلنے کی ضرورت ہے اور میرے خیال میں کوئی بھی زبان اگر بول چال کی نہ ہو۔ اگر اس زبان میں علم حاصل نہ کیا جائے بلکہ صرف اس سے جذباتی تعلق ہو تو اس تعلق کو کب تک نبھایا جاسکتا ہے۔ آپ مغرب میں اردو کے مستقبل کی بات کررہی ہیں۔ اس زبان کا تو اپنے گھر میں کوئی مستقبل نظر نہیں آتا ہمیں۔

میرے اگلے سوال کے جواب میں نسیم کا کہنا ہے کہ "آج کی شاعری سے اگر یہ مطلب ہے کہ تمام کی تمام آج کی شاعری اپنے عہد کی ترجمان ہے تو ایسا نہ آج ممکن ہے نہ کبھی کسی دور میں ایسا ہوا کہ تمام کی تمام شاعری اس عہد کی گواہ بن جائے۔ لیکن ہر عہد میں چند ادیب، چند شاعر ہی ہوتے ہیں جو اس قول پر پورے اترتے ہیں۔ آج کے دور میں بھی ہمارے ایسے شعراء کے نام موجود ہیں جن کی تحریر ان کے عہد کی گواہ بھی ہے اور ان کے نام کو آنے والے زمانوں میں بھی زندہ رکھے گی۔"

نسیم کا کلام فنون، افکار، تخلیق، منشور، طلوع افکار، ارتقاء اور دنیائے ادب میں شائع ہوتا رہتا ہے۔

غزل

میں جب بھی خوف کے لشکر کو زیر کر آئی
نئی زمیں مرے پیروں تلے ابھر آئی

یہ سوچ کر کہ زمانہ ہوا دعا بھی نہ کی
دعا کو ہاتھ اٹھائے تو آنکھ بھر آئی

کبھی جو یاد سے اس کی پناہ چاہی بھی
تو بے بسی کی تھکن روح تک اتر آئی

نہ جانے کون سی تعمیر میں خرابی ہے
کہ اپنے گھر کی جب آئی بری خبر آئی

شکل کے خلد سے ان کو ملی خلافت ارض
نکالے جانے کی تہمت ہمارے سر آئی

نسیم سید

عکسِ فن

عظیم منصف!
ہماری قسمت کی ہر عدالت کا فیصلہ ہے
کہ ہم
جب اپنے بدن کی
بے حرمتی کی
فریاد لے کے جائیں
تو اپنا کوئی گواہ لائیں
"گواہ" ایسی گھڑی کا
جب وحوں سے
وحشت پناہ مانگے
"گواہ"
ایسے گناہ کا
جس کے تذکرے سے
گناہ کانپے
ہمیں کوئی ایسا معجزہ دے
کہ... گونگی، اندھی، سیاہ شب کو
گواہیوں کا ہنر سکھائیں
بصیر ہے تو
خبیر ہے تو ---- تجھے خبر ہے
کہ آج تک
موت کے علاوہ

کوئی نہ اپنا گواہ پایا
ہمیں پہ ٹوٹیں قیامتیں بھی
ہمیں نے ذلت کا بار اٹھایا
کتابِ انصاف کے مصنف
ترے صحیفے
زبور و انجیل ہوں کہ تورات
عورتیں سب کی ذی شرف ہیں
سب اپنی اپنی کتاب کی رو سے
اپنے بارے میں باخبر ہیں
فہیم ہیں.... بالغ النظر ہیں
گواہیاں سب کی معتبر ہیں
تو پھر ہمارے ہی پشت پر ہاتھ کیوں بندھے ہیں
ہماری ہی سب گواہیوں پر
یہ بے یقینی کی مہر کیوں ہے
سبھی صحیفوں میں یہ لکھا ہے
ترے ترازو کا کوئی پلڑا جھکا نہیں ہے
تو کیا یہ سمجھیں......؟؟
ہمارا کوئی خدا نہیں ہے.....؟

نسیمہ کلثوم

ایک شعر

تم جلائے رکھو آنکھوں میں امیدوں کے چراغ
کہ ابھی گجرے کے پھولوں میں مہک باقی ہے

نسیمہ کلثوم
19 اکتوبر 1995ء

Nasima Kulsoom
C/O Ghousia Sultana
4140 Bay Side Dr Hanover PK, IL 60103, U.S.A. 1-12-95

نسیمہ کلثوم

(شکاگو)

"نسیمہ ہم اللہ کے پاک وبابرکت نام سے یہ گفتگو شروع کرتے ہیں۔ (میں اپنی تحریر بھی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کرتی ہوں کہ میں اس میں بڑی برکت پاتی ہوں) میں آپ کا پورا نام اور تخلص جاننا چاہوں گی۔"

"میرا نام نسیمہ کلثوم ہے اور تخلص نسیم ہے۔ جائے پیدائش خورجہ ضلع بلند شہر یو۔پی بھارت ہے۔ میں ۷ دسمبر ۱۹۲۶ء کو پیدا ہوئی۔"

"کچھ اپنی تعلیم کے بارے میں بتائیں گی؟"

نسیمہ بولیں۔ "میں نے ۱۹۴۰ء میں لکھنؤ یونیورسٹی سے فارسی کے امتحان "دبیر ماہر" کی سند حاصل کی۔ ۱۹۴۲ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے "اردو اعلیٰ قابلیت" (Advance Urdu) پاس کیا اور ۱۹۴۴ء میں علیگڑھ سے میٹرک اور ۱۹۵۷ء میں کراچی سے ٹیچرز ٹریننگ لی۔ بیس سال کراچی میں "کاسموپولیٹن گرلز سیکنڈری اسکول" میں تدریس کی خدمت انجام دی۔ ۱۹۴۴ء سے فروری ۱۹۵۰ء (لاہور پاکستان ہجرت کرنے تک) کی مدت تک لکھنؤ میں قیام رہا۔ دو سال لاہور میں گزارے اس کے بعد مستقل قیام کراچی میں رہا۔ ۱۹۷۴ء میں شکاگو امریکہ آئی اور ڈیڑھ سال قیام رہا۔ ۱۹۷۹ء میں پھر امریکہ شکاگو آئی اور چھ ماہ قیام رہا۔ ۱۹۸۱ء سے مستقل شکاگو میں قیام پذیر ہوں۔"

"لکھنا کب سے شروع کیا؟"

ابتدا میں کچھ افسانے بھی لکھے اور مضامین بھی مگر کبھی کچھ شائع نہیں کرایا۔ میرے بچپن ہی

میں میری والدہ محترمہ وفات پا چکی تھیں' لہٰذا ماں کے پیار سے محرومی کے سبب ایک تشنگی سی تو شروع سے ہی تھی۔ سن شعور کو پہنچ کر جب دنیا اور زندگی کے نشیب و فراز سے واسطہ پڑا تو بڑے تلخ حقائق کا سامنا ہوا۔ اندرونی طور پر ہستی چور چور ہو گئی۔ اپنی ریزہ ریزہ ہستی کو سمیٹنے کے لئے نفسیات کا سہارا لیا۔ نفسیات کے مطالعہ کے دوران ایک ماہر نفسیات کا یہ قول نظر سے گزرا۔ "جب کسی سے دردِ دل بیان نہ کر سکو تو سکون دل کے لئے اپنے جذبات و احساسات کو لکھو اور بار بار لکھو۔" لہٰذا تسکین قلب کی خاطر پہلے نثر کو اپنایا اور پھر نظم کو۔ یعنی واردات قلب کو مناسب الفاظ کی ترتیب کے ساتھ منظم کرنے کی کوشش کی۔ اپنے خیال سے تو تک بندی رہی مگر کچھ مہربانوں اور کرم فرماؤں نے اس کی پذیرائی کی اور مجھے شاعروں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ ایک محترم کرم فرما جناب احمد علی قدوائی صاحب نے تو مہربانی کی انتہا کی کہ میرا مجموعہ کلام شائع کر دیا۔ شعر بھی میں اس وقت کہتی ہوں جب اندرونی طور پر کوئی ٹوٹ پھوٹ ہو' یہ آمد ہوتی ہے اور اگر کسی طرحی مشاعرے میں مدعو کیا جائے تو اس میں شرکت کے لئے آورد ہوتی ہے۔ میں کبھی کسی سے ارادتاً" متاثر نہیں ہوئی لیکن غیر اختیاری طور پر اگر متاثر ہو گئی ہوں تو اسکا احساس نہیں۔ ویسے میر اور مومن ہمیشہ میرے پسندیدہ شاعر رہے۔"

"آپ کا کلام جن جرائد میں شائع ہوا' اس کی تفصیل بتائیں گی۔"

نسیمہ بولیں۔ "جیسا کہ پہلے عرض کر چکی ہوں کہ جو کچھ تحریر کیا صرف سکون قلب کی خاطر۔ شائع کرانے پر کبھی طبیعت مائل نہیں ہوئی۔ ہاں اگر کوئی خود اصرار کر کے لے گیا اور شائع کر دیا تو دوسری بات ہے۔ جیسے صائمہ خیری نے میری ایک غزل رسالہ "عصمت" میں شائع کر دی اور میرے ایک عزیز جن کا تعلق اخبار "جنگ" کراچی سے تھا انہوں نے "جنگ" میں شائع کرا دی۔ شکاگو آنے کے بعد اردو کے ماحول سے دوری بڑی تکلیف دہ تھی اور ادبی حلقہ سے متعارف ہونا چاہتی تھی تو "نیا دور" کا ایک شمارہ نظر سے گزرا۔ "نیا دور" سہ ماہی تھا اور اسے سہیل جالبی اوہائیو سے نکالتے تھے لہٰذا انہیں اپنی غزلیں بھیجیں اور اس کے دو شماروں میں شائع ہوئیں۔ اب یہاں "پاکستان لنک" لاس اینجلس میں میری کچھ غزلیں اور ایک مضمون شائع ہوا اور آج کل کچھ نثری تحریریں "اردو ٹائمز" نیویارک میں شائع ہو رہی ہیں۔ میرا مجموعہ کلام "افکار نسیم" کے نام سے شائع ہوا ہے جس کی حال ہی میں جنابہ غوثیہ سلطانہ غیاث الدین اور کچھ کرم فرماؤں نے تقریب رسم اجرا منائی۔"

"آپ ادب میں ابلاغ کی قائل ہیں؟"

"جی ہاں! میں اس سے بالکل متفق ہوں اور میں نے اپنی شاعری میں یہی اسلوب اپنایا ہے۔

اور میں یہ بھی کہوں گی کہ ادب و شاعری کے لئے تعمیری تنقید بہت ضروری ہے۔ اسی لئے تنقیدی محافل منعقد کرنا بہت مفید رہتا ہے۔ کیونکہ آج کے دور میں اکثریت ادب سے دور اور ناواقف افراد کی ہے، دوسرے اچھے اچھے رسائل و کتب کی قیمتیں بھی اتنی ہوتی ہیں کہ اس گرانی کے دور میں ان کا خریدنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ صرف انتہائی ادبی ذوق رکھنے والے ہی ان کی پذیرائی کرسکتے ہیں۔ پہلی جیسی فارغ البالی نہیں۔ یہ انتہائی مصروف دور ہے جس سے علمی اور ادبی پروگرام بھی متاثر ہوتے ہیں۔ لہٰذا ادبی اور تنقیدی محفلیں کچھ متبادل ثابت ہوسکتی ہیں۔ اب رہا اردو کی بقاء کا سوال تو اس ضمن میں، میں کہوں گی کہ امریکہ میں اردو زبان کی بقا کے لئے والدین کو سنجیدگی اپنی اولاد پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ جو بچے یہاں پرورش پاتے ہیں ان کے اطراف میں انگریزی بولنے والے ہوتے ہیں، بچوں کو کھیلنے کے لئے لازمی ساتھیوں اور دوستوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا اپنے ساتھیوں سے قربت کے لئے وہ ان کی زبان سیکھتے اور اس میں گفتگو کرتے ہیں، پھر جب اسکول میں جاتے ہیں تو وہاں اس زبان کا استعمال لازمی ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ اسی زبان کو ضروری اور بہتر سمجھتے ہیں اور پھر اتنے عادی ہوجاتے ہیں کہ گھر میں بھی انگریزی زبان ہی میں گفتگو کرتے ہیں اور وہ والدین بھی جو پہلے ان سے اردو میں گفتگو کرتے تھے انگریزی میں شروع کردیتے ہیں۔ کچھ والدین تو ایسے بھی ہوتے ہیں جو انگریزی میں گفتگو ہی باعث فخر سمجھتے ہیں اور یہ بھی سوچتے ہیں کہ ہمارا بچہ اسکول میں کہیں سب سے پیچھے نہ رہ جائیں حالانکہ بچے بڑے ذہین ہوتے ہیں اور بیک وقت دو تین زبانیں سیکھ سکتے ہیں۔ یہاں کے ماحول میں رہتے ہوئے اور اسکول جاکر انگریزی تو ہر حال میں سیکھ ہی لے گا سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ اپنی زبان سے نابلد نہ ہوجائے۔ لہٰذا والدین کو گھر میں بچوں سے ہمیشہ اردو ہی میں گفتگو کرنی چاہئے۔ یہاں میں نے چند گھرانے ایسے دیکھے ہیں کہ ان کے بچے جتنی اچھی انگریزی بولتے ہیں اتنی ہی اچھی اردو بھی بولتے ہیں۔

"کیا آج کا ادب ہمارے دور کی نمائندگی کررہا ہے؟ اور کیا شاعری کو نظریاتی ہونا چاہئے؟"

"یوں تو میں ادب برائے زندگی کی قائل ہوں لیکن اپنی شاعری میں اس راہ سے خود بھٹکی ہوئی ہوں اس لئے میں کوئی تنقید کرنے کی مجاز نہیں لیکن یہ بات یقیناً غلط ہے کہ چبائے ہوئے لقمے اگلے جارہے ہیں۔ ہمارے اکثر شعراء کے کلام میں عصر حاضر کے مسائل کی نمایاں جھلک ملتی ہے۔ وہ آج کے دور کی ترجمانی کررہے ہیں اور سچ پوچھئے تو وہی زندہ ادب بھی ہے جو سماج کو بدل دینے کی صلاحیت رکھتا ہے۔"

نسیمہ کلثوم

عکسِ فن

غزل

بساطِ دہر پہ ہم زندگی کو ہار آئے
کہ دل گرفتہ و دلگیر و دلفگار آئے

انہیں جو میری وفاؤں پہ اعتبار آئے
مجھے پھر ان کی جفاؤں پہ کیوں نہ پیار آئے

سنا ہے موسمِ گل ہر طرف ہے چھایا ہوا
پر اپنے دل کو بھلا کیسے اعتبار آئے

جب اپنا دامنِ اُمید تار تار ہوا
مری بلا سے خزاں آئے یا بہار آئے

بڑے حسیں تھے وہ لمحات زندگانی کے
جو تیری جلوہ گہِ ناز میں گزار آئے

درِ حبیب ہی جب چھٹ گیا تو پھر دل کو
کہاں سکوں ہو میسر کہاں قرار آئے

بقدرِ ظرفِ تمنّا بقدرِ ظرفِ طلب
کسی کے حصّے میں گُل اور کسی کے خار آئے

مری حیات میں پوچھا کبھی نہ حال مرا
بھرے وہ آنکھوں میں آنسو سرِ مزار آئے

خوشی کا ذکر ہی کیا ہے ترے بغیر کبھی
تری نسیمؔ کو غم بھی نہ سازگار آئے

آصفہ نشاط

[illegible]

جنوری ۲۰ - ۱۹۹۶ء

Asifa Nishat

Asifa and M.M. Zaman
10960 Whitaker Ave.
Granada Hills
CA 91344

~~90039~~ - U.S.A.

آصفہ نشاط

(لاس اینجلس)

آصفہ نے کسی اخبار میں خبر پڑھی کہ جو چھوٹے بچے اغواء کئے جاتے ہیں ان کا ایک مصرف یہ بھی ہے کہ وہ مشرق وسطیٰ کے رئیسوں کے ہاتھ فروخت کردیئے جاتے ہیں اور وہ بھی ایک خاص مقصد کے لئے۔ یعنی اونٹوں کی ریس کے لئے۔ خلاصہ اس اجمال کا یہ ہے کہ وہاں رئیسوں کی تفنن طبع کے لئے اونٹوں کی لمبی دوڑ میں یہ ننھے معصوم اونٹوں کی ٹانگوں سے باندھ دیئے جاتے ہیں۔ جب اونٹ دوڑتے ہیں تو یہ بچے چلاتے ہیں اور ان کی چیخوں سے اونٹوں کو تیز بھاگنے کی تحریک ملتی ہے۔ اس طرح وہ رئیس محظوظ ہوتے ہیں۔ وہ دولتمند ہیں۔ جیسی تفریح اپنے لئے چاہیں خریدیں۔ انہیں کون روکتا ہے۔ اب آپ یہ سوال مت کرو بیٹھے گا (میری طرح) کہ اونٹوں کے پیروں سے باندھنے کے لئے ان کے اپنے بچے نہیں؟ ہوں گے۔ مگر اپنا لہو بہانے میں وہ لطف کہاں جو دوسروں کا بہتا خون دیکھ کر حظ ملتا ہے۔ ہیں تو "ہم" ازلی وحشی۔

تو آصفہ نے یہ خبر سنی اور پھر کراچی پاکستان کی کسی چورنگی پر اپنا بچہ بیچنے والے باپ سے بھی اس کی ملاقات ہوگئی۔ تب آصفہ نے ایک نظم کہی۔ بعنوان "کیمل کڈ" میں نے لاس اینجلس کے مشاعروں میں آصفہ نشاط سے یہ نظم سنی۔ اس کا پس منظر بھی جانا اور دہل کر رہ گئی ——— پھر آصفہ نشاط کی اس نظم نے بہتوں کو حوصلہ دیا ہوگا کہ وہ دنیا کے کسی بھی حصے میں ہونے والے ظلم کے خلاف احتجاجی شاعری کریں۔ انسانی استحصال کے خلاف آواز اٹھائیں جیسے آصفہ نشاط نے اپنی آواز بلند کرتے ہوئے کہا کہ

میں کیمل کڈ ہوں

مفاد کے بے شمار اونٹوں نے
اپنی ٹانگوں سے باندھ رکھا ہے
یہ میرا خوں پی رہے ہیں دیکھو
مزے سے یہ جی رہے ہیں دیکھو
مرا لہو جو لذیذ بھی ہے، وہ ہے بھی ارزاں
مرے لہو میں بھگو کے انگلی، لکھیں گے اب یہ کوئی فسانہ
اور اس فسانے کا ایک عنواں
"میں کیمل کڈ ہوں"

آصفہ لاہور پاکستان میں پیدا ہوئیں لیکن والد کی ملازمت چونکہ صوبہ سرحد میں تھی اس لئے انہوں نے بنوں سے میٹرک کیا۔ فرنٹیئر کالج سے گریجویشن اور پشاور یونیورسٹی سے انگریزی میں ماسٹر کی ڈگری لی۔ سول سروس کا امتحان دیا۔ گیارہ منتخب امیدواروں میں دس لڑکے تھے اور ایک آصفہ۔ پھر شادی ہو گئی، یوں اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے کے مصداق آصفہ نے گھرداری سنبھالی۔ شاعرانہ مزاج پایا تھا لیکن باقاعدہ شاعری انہوں نے کراچی کے سیاسی حالات سے متاثر ہو کر کی۔

سول سروس میں نہ آسکیں تو سوچا ایل ایل بی کر لوں لیکن بچوں کی پیدائش نے دوسری مصروفیات میں گھیر لیا۔ پھر کراچی کے حالات بد تر ہونے شروع ہوئے۔ میاں نے ہجرت کا مشورہ دیا مگر آصفہ امریکہ نہیں آنا چاہتی تھیں۔ اپنے وطن سے انہیں بہت پیار تھا اور ہے۔ چنانچہ ٹکی رہیں لیکن جب ان کو خبر ملی کہ ان کے بچے جس اسکول میں پڑھتے ہیں وہاں دہشت گردوں نے بم رکھ دیا ہے۔ تو آصفہ حواس کھو بیٹھیں۔ بھاگم بھاگ اسکول پہنچیں۔ بچوں کو رکشہ میں بٹھایا۔ ویزا کے فارم بھرے اور سیدھی قونصلیٹ پہنچیں۔ امریکہ کا ویزا لگ گیا تو آصفہ نے وطن کو خیرباد کہہ دیا۔

یہاں آکر انہوں نے بینکنگ اور میڈیکل انشورنس کا کورس کیا۔ بچوں کی تعلیم اولین ترجیح تھی لہٰذا اب وقت کے انتظار میں ہیں کہ مہلت ملے تو انگریزی ادب میں پی ایچ ڈی کریں۔

آصفہ شاعری کے علاوہ افسانے بھی لکھتی ہیں۔ بے لاگ اور کھری تنقید کے حق میں ہیں کیونکہ اس سے ادب کو توانائی اور زندگی ملتی ہے۔ ادب میں ابلاغ کو ضروری سمجھتی ہیں۔ لابی اور گروپ بندی سے بیزار ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ "ادب" کے لئے زہر قاتل ہے۔ آج ادب کو ادیب سے زیادہ کوئی اور نقصان نہیں پہنچا رہا۔ آج بڑا ادب تخلیق نہ ہونے کی وجہ بتاتے ہوئے

کہتی ہیں کہ ہمارے اپنے ملک میں ریڈیو اور ٹی وی پر ادب کی ترویج کے لئے وقت نہیں۔ کتنے ادبی پروگرام ہوتے ہیں؟ کتابیں چھپوانا اور خریدنا کاروارد۔ پڑھنے کے لئے وقت نکالنا اس سے زیادہ مشکل۔ سرکاری سرپرستی حاصل نہیں۔ جن ادیبوں کو سرکاری وظیفہ مل جاتا ہے وہ سچ لکھ نہیں سکتے۔ پھر وہ دن تو آئے گا جب ہم اپنے ہاتھوں اپنی زبان اور ثقافت کا ورثہ کھودیں گے تو معلوم ہوگا کہ وقت بہت آگے نکل گیا۔ آج تو چبائے ہوئے لقمے اگلنے تک پہنچ چکے ہیں مگر آثار ایسے نظر آرہے ہیں کہ "کام" یہ بھی نہ ہوپائے گا۔

اردو کی بقاء کے سلسلے میں آصفہ کہتی ہیں کہ "دنیا کے بیشتر ممالک کے دکھیاروں کو تو آپ معاف ہی کردیں کہ حصول معاش نے ویسے ہی ان کو نچوڑ رکھا ہے۔ صرف یہ بتادیں کہ جہاں کی زبان اردو ہے کیا وہاں کی زبان اردو ہے-----؟

ہے کوئی جو اس سوال کا جواب دے!

ہائیکو

جھیل شام اور تو
ڈوبتے سورج سے پوچھو
وہ خوشبو وہ جادو

○

میری تقدیر اور عمل نامہ
تھوڑا پہلے کا تھوڑا بعد کا ہے
پرسشوں سے بری ہوں میں بالکل

○

عمر سمندر کڑوا پانی
پی کر بھی مرجانا ہے
جینا ہو تو پینا ہے

○

میں کھری صاف اور سچی تھی
میرا کوئی مگر گواہ نہ تھا
اب میری اہمیت مسلّم ہے

عکسِ فن

غزل

طلب طلب سی نہیں ہے عطا عطا سی نہیں
مرے یقیں میں کمی ہو یہ سلسلہ بھی نہیں

دعا کو ہاتھ اٹھاؤں تو ہونٹ سلنے لگیں
میں مانگنے سے تھکوں ایسا ماجرا بھی نہیں

مرے بدن پہ سجا ہے تو اس کو میرا کہو
وہ داغ جس سے مرا کوئی واسطہ بھی نہیں

عجیب قرب ہے دریا کے دو کناروں سا
عجیب دوری ہے جس میں کہ فاصلہ بھی نہیں

مرے وجود کو جو کھا گیا ہے گھن کی طرح
قسم خدا کی وہ میرا تو مسئلہ بھی نہیں

میں اپنے عیب سے نظریں نہیں چراؤں، مگر
میں کیا کروں کہ مرے گھر میں آئینہ بھی نہیں

کبھی کبھی مجھے تکیہ لگے ہے بھیگا سا
ذرا سی بات ہے کچھ ایسا سانحہ بھی نہیں

نشاؔط کیسی ہے؟ کچھ لوگ پوچھ لیتے ہیں
میں کیا بتاؤں کہ اس سے تو رابطہ بھی نہیں

نعیمہ ضیاء الدین

ایک خوشی کی رُت ہی نہ آئے جیون بھر کے موسم میں
آتی جاتی کتنی رُتوں میں گو کہ ساری عمر کٹی

Naeema Ziauddin
AM - Kalbskopf -1
63263 NEU-1 SENBURG - GERMANY

نعیمہ ضیاء الدین

(جرمنی)

پنجاب (پاکستان) کی مٹی سے جنم لینے والی نعیمہ شاعرہ بھی ہیں اور افسانہ نگار بھی۔ ایف۔اے تک تعلیم حاصل کی اور مطالعہ جاری رکھا۔ پاکستان سے ہجرت کر کے جرمنی جا پہنچیں لیکن اردو سے ناطہ نہ توڑا۔ کتابوں اور نعیمہ کا چولی دامن کا سا ساتھ ہے۔ ان کی تخلیقات چاہے افسانہ ہو، غزل یا نظم اوراق، منشور، فنون، تخلیق، انشاء، شاعر، شمع اور ہندوستان میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔

مزاجاً" نعیمہ کی قربت ترقی پسند تحریک سے ہے لیکن ان کا کہنا ہے کہ شاعری یا ادب نظریاتی نہیں ہوا کرتے ہاں نظریے یا تحریک سے متاثر ہو کر تخلیق کئے جا سکتے ہیں لیکن کوئی بھی فن کسی خاص نظریے یا عقیدے کی پیداوار نہیں ہو سکتا کیونکہ فن ایک فطری صفت ہے جو اپنی افتاد کے تحت جتیں استوار کر لیا کرتی ہے۔ انسانی شعور و ادراک کا بہترین اظہار فنون لطیفہ ہیں۔ نعیمہ کیٹس کا حوالہ دے کر اسے یوں واضح کرتی ہیں کہ "عظیم ترین شاعری وہ ہے جو قریبی دوست کا کردار ادا کر سکے۔" یعنی دل کے نزدیک جا پہنچے۔ یہ بھی سچ ہے کہ نظریہ ایک برمحل خارجی قوت ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ خاص خاص مکتبہ فکر کے ہاں ادبی بصیرت اور لفظی اہتمام و انصرام ہر دور میں نظریاتی روش سے بہر طور متاثر دکھائی دیتے ہیں اور نظریاتی تحریکیں پورے دباؤ کے ساتھ تخلیقی عمل پر اثرانداز ہونے کی بھرپور قوت بھی رکھتی ہیں لیکن پھر بھی اسے "کل" کا درجہ حاصل نہیں۔ شاعری دراصل شاعر کے اپنے داخلی اضطراب، آگہی اور وجدان کا عکس ہے۔ بے شک خارجی رویے اس کے ذہنی آئینے پر منعکس ہو کر اپنا پرتو ظاہر کرنے میں کامیاب

رہتے ہیں۔

اس سوال کا کہ شعر گوئی کے لئے کون سی کیفیت یا جذبہ محرک بنتا ہے۔ نعیمہ نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ وقت اور لمحوں کی بات ہوتی ہے کہ جب ذات کی شناخت اور باطنی واردات کا انکشاف ہو وہی شعر کی تخلیق کا اصل لمحہ ہے۔ اس لمحہ مجھے نعیمہ کا یہ شعر یاد آگیا۔

گو ترک تعلق سہل نہیں، سب لیکن بھول ہی جاتے ہیں
پھر اپنے دل کی ریشوں میں کیوں درد پرانا باقی ہے

اس شعر نے جانے کن یادوں کے ساتھ نعیمہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ نعیمہ کا کہنا ہے کہ فنی صلاحیتیں ہر فنکار میں پیدائشی طور پر ہوتی ہیں جنہیں وہ اپنے ذہنی رجحان اور افتاد طبع کے مطابق تخیل کے آئینے میں اسی رنگ میں پیش کرتا ہے جس میں وہ اس پر منعکس ہوتی ہیں اور یہی عکس بیشتر تحریک کا سبب ٹھہرتے ہیں۔

ادب اور شاعری میں ابلاغ کے حوالے سے بات چھڑی تو نعیمہ نے کہا کہ ادب بلاشبہ وسیلہ اظہار ذات و کائنات ہے۔ ربع صدی پیشتر ادیب کا رشتہ جس طور قاری سے جڑا تھا اور منٹو، کرشن چندر، بیدی، خواجہ احمد عباس اور عصمت چغتائی کو جس شوق اور دلچسپی سے پڑھا جاتا تھا اور ان کی نگارشات کا جس بے چینی سے انتظار رہتا تھا اب وہ ربط باہم ٹوٹ چکا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ادب میں تجریدی اور علامتی تجربات اور مغرب کی اندھادھند تقلید۔ جس نے ادیب اور قاری کے بندھن پر ضرب لگائی۔ ادب سے متن اور افسانے سے کہانی کو خارج کردیا گیا۔ نتیجتاً" ثقیل، مہمل اور بے مطلب تجرباتی تحریروں نے تحریر کو غیر موثر کردیا۔ تحریر اثرانداز اسی وقت ہوتی ہے جب اس کا اسلوب عام فہم ہو۔ ابلاغ کے بنا آپ کا رشتہ قاری سے کیسے برقرار رہے گا۔

اسی طرح تنقید کی اہمیت اپنی جگہ لیکن ادب میں تنقید سے نئی راہیں متعین نہیں ہوسکتیں۔ نئی راہوں کی دریافت کی حامل وہ داخلی اور خارجی کیفیات ہی ٹھہرتی ہیں جو فرد کے ماحول سے مربوط ہوتی ہیں۔ اسی طرح تنقیدی محفلیں شعر و ادب کو نکھارنے، سنوارنے میں ایک صحت مندانہ فضا میسر کرسکتی ہیں لیکن نئی سمتوں کا تعین نہیں کرسکتیں۔

ادبی پرچوں کی غیر مقبولیت کی وجہ بتاتے ہوئے نعیمہ نے کہا کہ ادب کے اجارہ داروں نے تجربات کے حوالے سے ادب کو پیچیدہ، مہمل اور بے معنی تحریروں کا ایسا مجموعہ بنا کر سامنے لاتے گئے کہ اس سے دلچسپی کا عنصر غائب ہوگیا۔ اس طرز عمل کا شکار صرف مشرق کا ہی نہیں مغرب کا ادب بھی ہوا ہے۔ اس کے علاوہ خود عوام کا رویہ بھی روز بروز سہل پسندی کی جانب گامزن ہے۔

کم وقت میں زیادہ دلچسپی کے حصول والے رجحان نے ادب کی غیر مقبولیت پسندی کو ہوا دی۔ ایسی صورتحال سے نجات پانے کا حل اس وقت تک ناممکن ہے جب تک اس کی اصل وجہ کو تسلیم نہ کیا جائے۔ اس حوالے سے دیکھا جائے تو اردو شاعری بھی ان دنوں نثر کی مانند تجربات اور لغویات کی زد میں ہے لیکن مہمل اور بے معنی چیزیں دیرپا نہیں ہوتیں۔ یہ بے معنی تجربات بھی اپنی موت آپ مرجائیں گے۔ شاعری کی بھٹکی ہوئی گاڑی بھی پھر سے اپنے اصل پٹری پر لوٹ آئے گی اور اس میں معانی کو تخیل کے ساتھ ہمرنگ کرکے زندگی کی اصل سے مطابقت بحال کرنے کا عمل پھر سے شروع ہوجائے گا اور یوں پھر وہ سے وہ ادب تخلیق ہوگا جس کی جڑیں اپنی زمین سے پیوستہ ہوتی ہیں۔

اس سوال کا جواب دیتے ہوتے نعیمہ کا لہجہ قدرے تلخ بھی ہوا کہ "تنقید نگار کہتے ہیں کہ آج کا ادب بے معنی ہوتا جارہا ہے۔" نعیمہ کہتی ہیں ادب کی ناقدر شناسی اور اس کی جڑیں زندگی کی اصل سے اکھاڑنے کا اصل مجرم خود ہی تنقید نگار ہے۔ یہی قدر آور ادبی کلیسا ہیں جن کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے' اب خود واویلا بھی کررہے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بگڑا ہوا ادیب اور تخلیقی یا فکری بانجھ پن تنقید نگار کی پیدائش کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ تنقید کی صحت مندانہ روش جب محض خودستائی یا خودنمائی جیسی بیمار ذہنیت کی عکاسی کرنے لگے تو ادب کا گلشن پامال ہوجاتا ہے۔ بہرحال لفظ بھی سچ بولنے لگیں گے کیونکہ زندگی کی فطری سچائی اور تحریری مساعی اپنی اساس کی جانب بہرحال لوٹنے لگی ہے۔

بڑی شاعری آج کیوں نہیں جنم لے رہی ہے اس سوال کے جواب میں نعیمہ کا کہنا ہے کہ آج کا دور چونکہ نظریہ یا تحریکات کی ٹوٹ پھوٹ اور انتشار کا دور ہے چنانچہ کوئی مثبت فکر اپنی جہت واضح نہیں کرپارہی۔ ماضی میں جو شاعرانہ انقلابی شعور ہمیں جوش' فیض یا ساحر کے ہاں ملتا ہے اور جس نے اپنے زمانے میں بھی اور اگلی نسلوں میں بھی اپنے مضبوط اور توانا عکس بھرپور انداز میں ابھارے۔ وہ اسی انقلابی فکر کے ماحول سے ٹکراؤ کا نتیجہ تھا اور اس کے ردعمل کے طور پر ترقی پسند تحریک کا عکس جو شاعری کے سانچے میں ڈھلا تو طلسماتی تاثیر کا حامل ہوگیا۔ ساحر نے کہا تھا کہ۔

دنیا نے واقعات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

تو یہ اپنے دور کی عکاسی ہے۔ اپنی ذات کا بھی اظہار ہے کیونکہ شاعر کی ذات بہرحال کسی نہ کسی فلسفے' نظریئے اور داخلی وخارجی دباؤ سے مغلوب ہوکر ہی باہر آتی ہے۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ

نعیمہ ضیاء الدین

ان نظریات کا عمل دخل کسی وقت قدرے مدہم ہو جائے لیکن اس لو کا بجھ جانا ممکن نہیں۔ وہ بہرحال روشن رہتی ہے۔ ترقی پسند تحریک کے منتشر ہو جانے سے اور اشتراکی نظریات پر ٹھوس ضرب عائد ہونے کے سبب خیالات کے ارتکاز میں بحران کا دخل بڑھ گیا ہے اس بناء پر ہو سکتا ہے کہ بڑی شاعری کے حوالے سے شاعرانہ افق پر تحریر اس طور نمایاں ہونے میں کامیاب نہ رہی ہو جتنی توقع کی جا رہی تھی۔

امریکہ اور یورپ میں اردو زبان کے مستقبل کے حوالے سے نعیمہ نے کہا کہ جرمنی کے شہر فرینکفرٹ میں ہونے والے ایک مقابلے کے نتائج کے تحت چھ سے چودہ برس تک کے بچے اپنی زبان سے نا آشنا ثابت ہوئے ہیں۔ پڑھنا لکھنا تو کجا وہ اسے بولنا تک نہیں جانتے اور تاسف کا مقام یہ ہے کہ ان بچوں کے والدین اس امر پر متفکر نہیں کہ ان کے بچے اپنی مادری زبان اردو نہیں جانتے بلکہ مقابلے کا نتیجہ سن کر ان کی گردنیں فخر سے تن گئیں جیسے ان کے بچے یوروپ کے بچے ہوں۔ بلاشبہ یہ والدین کی صریح بے توجہی اور احساس کمتری کا نتیجہ ہے۔ ابتدا میں انہوں نے پیسہ کمانے کو ہی وقت اور زندگی کا مصرف جانا اور اپنی اگلی نسل کو ماحول کے سپرد کر کے چین سے بیٹھ گئے۔ اب بھی بہتری کا امکان ہے اگر والدین اپنے بچوں کو اپنی ثقافت' زبان اور روایات کا اثاثہ دیں اور ان تک منتقل کرنے کے لئے تھوڑی سی تکلیف اٹھائیں۔

نعیمہ کے کلام کا مجموعہ زیر ترتیب ہے۔

غزل

اب جادہ ہو یا منزل' غربت کے مکینوں سے
چھوٹا جو وطن اپنا پھر کس سے رہے نسبت

بے تاب ہو دَم بھر میں بیزار ہو پُل بھر میں
ہر چیز سے بھر جائے دل کی بھی عجب عادت

احساسِ شجر چاہے مٹی کی نمی لازم
ہر ذہن سے فصلِ گُل پھوٹے نہ کسی صورت

نعیمہ ضیاء الدین

عکس فن

غزل

دیرینہ مراسم ختم ہوئے بس رسم نبھانا باقی ہے
وہ ڈور کچھ ایسے الجھی ہے اب توڑ کے جانا باقی ہے

گو ہم بھی وہی ہیں اور تم بھی پر وقت نہیں اب وہ جاناں
دیں موڑ نیا اس قصے کو اب کیا دہرانا باقی ہے

آنکھوں کے دریچوں پر اترے اک عمر ہوئی ان کو لیکن
ان یادوں کے ہر منظر میں وہی آنا جانا باقی ہے

گو ترکِ تعلق سہل نہیں سب لیکن بھول ہی جاتے ہیں
پھر اپنے دل کے ریشوں میں کیوں درد پرانا باقی ہے

دل والوں کی تحریروں میں تو واعظ کی تصویر نہیں
پھر دل کی سنیں یا واعظ کی جھگڑا یہ چکانا باقی ہے

○

آ کھیل کھیلیں ہم
پہلے قتل کریں سب آنکھیں
پھر آئینے بانٹیں
آگ کا دریا پھیلا کر پھر
آؤ سفینے بانٹیں
آ کھیل کھیلیں ہم
پہلے گھر گھر مرگ اتاریں
پھر جا کر دفنائیں
کھیتوں کھیتوں بھوک اگا کر
نان جویں پہنچائیں
آ کھیل کھیلیں ہم

سرفراز نواز اعظمی

پڑھنی ہے غزل تم کو تنقید نگاروں میں
غزلوں کا نوازؔ اپنی دیوان لئے جاؤ

سرفراز نوازاعظمی

Serfraz Nawaz Azmi
P.O.Box 2852 Madina Munawwara
Saudi Arabi

سرفراز نواز اعظمی

(مدینہ منورہ)

سرفراز نواز اعظمی شعر تو بڑے دلنشین کہتے ہیں لیکن شاید انہیں خود یہ نہیں معلوم کہ کہانی نما نثر بھی بڑے پیارے انداز میں لکھتے ہیں۔ زبان آسان اور لہجہ دھیما۔ سو میں نے چاہا کہ وہ اپنا تعارف خود کرائیں۔ خود بتائیں کہ انہوں نے شعری سفر کب شروع کیا اور آج جس مقام پر ہیں وہاں تک کیسے پہنچے۔ سرفراز نے جو کچھ جس طرح کہا ہے وہ بعینہ آپ تک پہنچا رہی ہوں۔ دیکھئے تو کہ سرفراز کیا کہتے ہیں۔

"میں ہندوستان کے صوبہ اتر پردیش میں ضلع اعظم گڑھ موضع سنوارہ کا رہنے والا ہوں۔ نام سرفراز اور تخلص نواز اعظمی رکھتا ہوں۔ میرے والد محترم کا نام ابو محمد تھا جو کہ ۱۹۷۲ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اللہ ان کی مغفرت کرے۔ آمین۔ اس وقت میں ہندی اور اردو کا طالب علم تھا والد صاحب کی وفات کے بعد حالات ایسے نہیں رہے کہ مزید تعلیم کا سفر جاری رکھا جاتا پھر اپنوں کی بے اعتنائیوں نے بھی سب کچھ درہم برہم کر دیا۔ چنانچہ یوں ہوا کہ نامرادی وقت نے گاؤں کی شاداب وادی سے اٹھا کر روشنیوں کے شہر بمبئی میں لا کھڑا کیا۔ بچپن کا زمانہ تھا پہلی بار گھر چھوڑا تھا ہر وقت دل میں ہوک اٹھتی اور ہر وقت آنکھیں نم رہتیں۔ نہ کوئی دست شفقت' نہ سر پر ممتا کا آنچل۔ بیچارگی' مجبوری' بے بسی اور بے چرگی ان سبھوں نے مل کر اتنا حساس کر دیا کہ دوسروں کو روتا دیکھ کر خود رونا بھول جاتا۔ بچپن کی کچی عمر اور وہ بھی بمبئی جیسے شہر میں ایک ڈگر پر چلتے رہنا بہت مشکل کام تھا مگر میں چلتا رہا اور ناہموار راہوں کو ہموار کرتا رہا۔ بزرگوں کی دی ہوئی تربیت کام آئی۔ لیکن ایک مقام ایسا بھی آیا جہاں مجھے ٹھٹھک کر رک جانا پڑا اور وہیں سے ذہن

سرفراز نواز اعظمی

و دل کی وادی میں پھول کھلنے لگے اور جب پھر سفر شروع ہوا تو ہر قدم پر دل پر اثر انداز ہونے والی رنگینیوں نے اپنا کام شروع کردیا۔ چونکہ مزاج بچپن ہی سے شاعرانہ تھا بمبئی آکر دل کی امنگوں میں بھونچال آگیا۔

کہتے ہیں بچپن کا شوق جوانی میں مزید زور پکڑتا ہے اور یہی میرے ساتھ بھی ہوا۔ کچھ تو مزاج شاعرانہ کچھ جذبہ والہانہ پھر کیا تھا شاعری کا شوق میری حیات کا جز بن گیا' حسرتیں کیا جوان ہوئیں کہ دل نے راہ شوق میں ایسی قلابازی کھائی کہ سب کچھ بکھر کر رہ گیا۔ سب کچھ اتھل پتھل ہوگیا اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ میں اپنی ذات میں گم ہوکر سب کچھ بھلا بیٹھا۔ ۲۰ دسمبر ۱۹۸۲ء میں بمبئی سے سعودی عرب کا سفر شروع ہوا اور میں سعودی عرب کے دارالحکومت شہر ریاض میں آگیا' یہاں آنے کے کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا کہ یہاں بھی کچھ لوگ ہیں جو شعروشاعری کی ادبی محفلیں سجاتے ہیں' ایک دن وطن کے ایک شاعر جناب حقیق الزماں صاحب سے ملنے کا اتفاق ہوا جو کہ ضلع اعظم گڑھ سے تعلق رکھتے ہیں ان سے مل کر اور ان کی کچھ خوبصورت غزلیں سن کر دل بے حد خوش ہوا۔ انہوں نے کافی لوگوں سے متعارف کرایا۔ میں نے محسوس کیا کہ عرب کی زمین میں عربی کے ساتھ ساتھ اردو کی بھی آبیاری ہورہی ہے اور شاخ اردو پر ننھی ننھی کونپلیں آنی شروع ہوگئی ہیں چونکہ میرا بھی میدان غزل کا ہی تھا لہٰذا میں ان کی محفلوں میں شرکت کرنے لگا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ نہ صرف میں پیاسا ہوں بلکہ میرے اشعار بھی تشنہ ہیں۔ میری غزلیں پوری طرح سنوری ہوئی نہیں ہیں اور اس کے لئے ضروری تھا کہ میں کسی اچھے شاعر سے رجوع کروں چنانچہ عرفان اعظمی جو کہ ایک منجھے ہوئے شاعر ہیں اور مدینہ منورہ میں مقیم ہیں ان سے رابطہ قائم کیا۔ میں یہ بتا تا چلوں کہ عرفان صاحب سے میرے تعلقات گزشتہ دو دہائیوں سے ہیں میں نے انہیں خلوت و جلوت دونوں میں دیکھا ہے۔وہ جتنے اچھے شاعر ہیں اتنے اچھے انسان بھی ہیں۔ میرا ذاتی عقیدہ ہے کہ وہ شخص اچھا فنکار ہو ہی نہیں سکتا جو اچھا انسان نہ ہو۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ سعودی عرب کے شہر ریاض سے میں نے مدینہ منورہ عرفان اعظمی صاحب سے رابطہ قائم کیا اس طرح اصلاح سخن کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ فن شاعری کے متعلق انہوں نے مجھے بڑی کارآمد باتیں بتائیں ان کی شاگردی میں میں نے ان سے کافی کچھ سیکھا میں ان کا تہہ دل سے ممنون و مشکور ہوں کہ انہوں نے میری بے حد حوصلہ افزائی اور رہنمائی کی۔ عرفان اعظمی صاحب میرے ہم وطن اور استاد ہیں لیکن سب سے بڑھ کر میرے دوست ہیں۔ ۱۹۹۳ء میں ان کا شعری مجموعہ "ارض دل" نشاط پریس فیض آباد ٹانڈہ سے میری زیر نگرانی شائع ہو چکا ہے۔

ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب میں اردو اور ہندی جڑواں بہنوں کی طرح ہیں اور مجھے دونوں

سے پیار ہے۔ حالانکہ اردو زبان نے جنم ہی ہندوستان میں لیا ہے اور متعدد ہندو ادیب وشاعر اس زبان میں لکھتے رہے ہیں اور لکھ رہے ہیں۔ یوں بھی کسی بھی زبان سے نفرت کا جواز نہیں۔ زبانیں ابلاغ اور اک دوسرے کو سمجھنے کا ذریعہ ہوتی ہیں نفرت اور خونریزی کا سبب نہیں۔ زبان کوئی بھی ہو بری نہیں ہوتی۔ ہمارے خیالات صحیح اور پاکیزہ ہوں تو سارے مسائل حل ہو جائیں۔ اس گنگا جمنی تہذیب اور زبان کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر میں نے ۲۲ فروری ۱۹۹۲ء میں اپنے گاؤں موضع سنوارہ میں ایک خوبصورت کل ہند مشاعرہ اور کوی سمیلن منعقد کیا جس میں ملک کے معروف ہندی اردو کے شعراء کرام نے شرکت کی۔ اس مشاعرہ کی کامیابی کا یہ عالم تھا کہ اس علاقے میں پچھلے دس برسوں میں ویسا مشاعرہ نہیں ہوا تھا۔ لوگ کہتے ہیں وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک کامیاب مشاعرہ تھا۔

اردو ادب کے کچھ تنقید نگار جو اردو ادب کا جھنڈا لئے پھرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اب پہلی جیسی شاعری نہیں رہی۔ اور نہ ہی وہ پہلی سی فکر اور پہلی سی چاشنی ہے۔ اس ضمن میں میں کہوں گا کہ ایسا نہیں ہے۔ ورنہ نہ تو بشیر بدر کو کوئی جانتا اور نہ احمد فراز کا نام بام عروج پر رہتا۔ بہت سے نئے شعراء ہیں جنہیں دنیا جانتی ہے ان کی غزلیں گائی جاتی ہیں۔ ان کے نغمے نشر کئے جاتے ہیں۔ تنقید نگار حضرات کا کام ہی کیا ہے۔ دلوں کا خون کرنا ہے اور بس۔ میں تو کہتا ہوں پہلے کے مقابلے میں موجودہ دور کی شاعری زیادہ نکھر کر سامنے آئی ہے۔ پہلے کے شعراء اپنی ذاتی زندگی پر زیادہ روتے دھوتے نظر آتے ہیں جبکہ آج کے ادیب وشاعر اپنی آنکھیں کھلی رکھے ہوئے ہیں، اپنے اطراف کا بغور جائزہ لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ کولہو کے بیل کی طرح ایک دائرے میں ہی گھومتے نہیں ہیں بلکہ ہرن کی طرح چوکڑی بھرتے ہوئے ان کے خیال دنیا کے ہر خطے کی خبر لاتے ہیں۔ یہ گل وبلبل سے ہٹ کر بھی سوچتے ہیں ان کی غزلوں میں اگر شبنم کی ٹھنڈک ہے تو شعلوں کی آنچ بھی محسوس کی جاسکتی ہے۔ پہلے کے شعراء میں بہت کم ایسے نظر آئیں گے جنہیں فکر معاش بھی ستائے رکھتی تھی زیادہ تر فکر شاعری میں مبتلا رہتے تھے۔ چاہے گھر کا چولہا جلے نہ جلے لیکن قلم میں روشنائی کا رہنا ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ کوئی کسی کے در پہ پڑا ہے تو کسی کا وظیفہ کہیں سے جاری ہے ان کی زندگی شعر کہنے کے لئے تھی نہ کہ کمانے کے لئے۔ چند ہی ملیں گے جنہیں شعروشاعری کے علاوہ گھر کے چولہے کی بھی فکر رہتی تھی، تنقید نگار حضرات یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ آج کا شاعر وظیفے پر گزارہ نہیں کر رہا ہے بلکہ شعر کہنے کے ساتھ ساتھ اسے اپنے کنبے کو پالنے کی فکر بھی کرنی پڑتی ہے۔ آج کا شاعر نہ جانے کتنے مسائل، کتنی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھائے اردو ادب کی خدمت میں لگا ہوا ہے۔ کل کا شاعر شعر کہنے کے لئے جب قلم اٹھاتا تو

سرفراز نواز اعظمی

ایک غزل کی جگہ کئی کئی غزلیں صفحہ قرطاس پر بکھیر دیا کرتا تھا جبکہ آج کا شاعر ایک غزل کے لئے کئی کئی دن سر کھپاتا رہتا ہے پھر جا کر خیالات کی کڑیاں یکجا ہو پاتی ہیں۔ کل کا شاعر شعر کہنے کے لئے خود کو دنیا سے الگ تھلگ کرلیا کرتا تھا مگر آج کا شاعر دنیا کے ہنگاموں میں گھرا ہوا ہے پھر بھی اپنے بزرگوں کی اگائی ہوئی فصلوں کو سوکھنے نہیں دے رہا۔ آج کا شاعر اس ہنگامہ خیز دنیا میں بہت مصروف ہے پھر بھی اردو کی دولہن کا گیسو سنوارنے کا کام جاری رکھے ہوئے ہے۔

آج اردو ادب کی شاعری میں جو نیاپن آیا ہے آج کے باہمت اور باحوصلہ شعراء اور ادیبوں کی اردو ادب سے ازحد محبت کا نتیجہ ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ پرانے شعراء نے کچھ نہیں کیا ہے بلکہ انہوں نے ہی اردو شاعری کا بیج بویا تھا اور جب وہ پودے کی شکل میں بار آور ہوا تو نئی نسل کے ادیب و شعراء نے اپنے خون دل سے اسے سیراب کیا اور آج خدا کے فضل سے نہ صرف اس کی جڑیں اندر ہی اندر کافی مضبوط ہیں بلکہ اس کی شاخیں بھی ہندوستان و پاکستان کے ساتھ دنیا کے تقریباً ہر گوشے تک پھیل چکی ہیں۔

اب کچھ اپنے بارے میں بتاتا چلوں پچھلے دو برس سے میں بھی مدینہ منورہ میں برسر روزگار ہوں۔ عرفان صاحب بھی یہیں رہتے ہیں۔ مدینہ منورہ میں باقاعدہ ایک شعر و سخن کی بزم جو کہ (بزم سخن) کے نام سے جانی پہچانی جاتی ہے۔ بزم سخن کے زیر اہتمام ہر ماہ ایک خوبصورت شعری نشست کا اہتمام کیا جاتا ہے اس میں شرکت کرنے والے شعرائے کرام ہندوستان اور پاکستان دونوں جگہوں کے ہوتے ہیں۔ اس طرح یہاں جناب عرفان اعظمی کی سرپرستی میں شاعری اپنا سفر طے کر رہی ہے۔

ادبی سفر میں میری پہلی منزل پاکستان کا ادبی ماہنامہ (آداب عرض) تھا جس میں ۱۹۸۶ء میں پہلی بار جو غزل شائع ہوئی اس کا مطلع یہ تھا۔

عالم میری حیات کا زیر و زبر رہا
اچھا ہوا کہ تو نہ میرا ہمسفر رہا

اور جب سے اب تک یہ سفر جاری ہے ہندوپاک کے مختلف اخبار و رسائل میں اب تک ڈیڑھ سو ۱۵۰ سے زیادہ غزلیں اور چند نظمیں شائع ہو چکی ہیں' میں یہ نہیں کہتا کہ میں نے شاعری میں بڑا تیر مارا ہے میں تو ابھی طالب علم ہوں اور علم کا سفر جاری ہے ایک شعری مجموعہ کا مسودہ تیار کر رہا ہوں انشاء اللہ عنقریب ہی شائع کرانے کا خیال ہے جس کا نام "آئینے میں پھول" رکھا ہے اور اگر ادب نواز دوستوں نے حوصلہ افزائی کی تو ممکن ہے سفر آسان ہو جائے۔

عکس فن

متفرق اشعار

تم اپنی عنایت کا تاوان لئے جاؤ
یک جان ہوئے کیوں تھے اب جان لئے جاؤ
تاعمر ستائے گی ہر وقت رلائے گی
دو چار گھڑی کی یہ پہچان لئے جاؤ

○

مجھ کو گمنامی کی دیمک کھاگئی
دوستو میں بھی کبھی مشہور تھا
آگ بھی ان کو نہ راس آئی نواز
آگ میں جلنا جنہیں منظور تھا

○

یار تو کیوں ببول بوتا ہے
خار قسمت سے پھول ہوتا ہے

○

داؤ چلتے نہیں مداری کے
کھیل تقدیر جب دکھاتی ہے
دن قریب آئے تیرے آنے کے
گھر کی دہلیز گیت گاتی ہے

نورجہاں نوری

۱۸ ستمبر ۱۹۹۵ء

جرمنی

ہر سمت جلوے دیدنی نوری کے ہو گئے
رم جھم ہو، یا دھنک ہو سرِ شام کچھ بھی ہو

نورجہاں نوری لندن
۱۵ دسمبر ۱۹۹۵ء

Norrjahan Noori
4, Leander Court, North Acre Graham Park
LONDON - NW9 5GQ - U.K.

نور جہاں نوری

(لندن)

۲۵ دسمبر ۱۹۵۹ء کو پاکستان کے شہر پشاور میں پیدا ہونے والی شاعرہ نور جہاں نوری کا تعلق میر بہاء الدین کے خاندان سے ہے جو افغانستان کے آخری حکمران آغا سید محمد خانفشاں پغمان کے پوتے تھے اور اٹھارویں صدی کے نصف میں اپنے خاندان کے ساتھ میرٹھ آکر آباد ہو گئے تھے۔

نور جہاں نے علامہ اقبال کراچی سے گریجویشن کیا ایس ایم کالج کراچی سے لاء کی ڈگری لی اور کراچی یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ طالب علمی کے دور سے ہی سرگرم کارکن رہیں۔ چنانچہ کالج اسٹوڈنٹ یونین کی یکے بعد دیگرے جوائنٹ سیکریٹری اور صدر کے علاوہ ینگ جرنلسٹ کراچی کی صدر بھی رہیں۔ انہوں نے کچھ عرصہ اندرون سندھ ملازمت کی۔ پبلک سروس کمیشن اسلام آباد میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہوئیں۔ ۱۹۸۹ء میں انگلستان آئیں۔ یہاں وہ اپنے شوہر بیرسٹر محمد رشید شیخ کے ساتھ ساتھ آل لندن میں لیگل ایڈوائزر رہیں۔ انہیں زمانہ طالبعلمی میں بے شمار ایورڈ ملے۔ ایک موقع پر صرف ایک سال کے دوران قومی نظموں پر اکیس فرسٹ کلاس انعامات حاصل کیئے۔

۱۹۷۶ء میں انہیں علامہ اقبال کالج میں وائی۔جی۔اے کی جانب سے "پاکستان کی بہترین نوجوان مشاعرہ" کا خطاب ملا۔ ۱۹۹۲ء میں بہترین شاعری کا ایورڈ لیا۔ ایم اے جناح ہاؤس لندن کی جانب سے انہیں "دختر پاکستان" کا خطاب ملا۔ ایم۔اے جناح شیلڈ بھی انہیں اسی سال ملی۔ اسی سال یورپ کی بہترین شاعرہ عمر شیخ فاؤنڈیشن کی جانب سے "نظم بوسینا" پر تمغہ وخلعت حاصل کیا۔ ۱۹۹۲ء میں ملکہ تعلیم کا خطاب "راوی" بریڈ فورڈ کی جانب سے حاصل کیا۔ ۱۹۹۳ء میں برٹش اتھنک براڈ کاسٹنگ ایسوسی ایشن ریڈیو (BIBA) شانتی کیمونی کشن کی جانب سے اور انٹرنیشنل اردو پوئٹری ایورڈ اور برطانیہ کی بہترین شاعرہ کا خطاب ملا۔

نور جہاں نوری

کراچی کی بے شمار شعری نشستوں اور بعض بین الکلیاتی مشاعروں میں دھوم مچانے والی شاعرہ نور جہاں آج برطانیہ کے ادبی حلقوں میں بے باک انقلابی شاعرہ کے طور پر پہچانی جاتی ہیں۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ "ماہ وسال کے موسم" ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا۔ جب کہ دوسرا شعری مجموعہ "لمحوں کے موسم" جون ۱۹۹۳ء میں منظر عام پر آیا۔ نعتیہ کلام پر مشتمل آڈیو کیسٹ "عقیدتوں کے موسم" جلد ہی کتابی شکل میں بھی شائع کی جائے گی۔ اگلا مجموعہ کلام "خواب و خیال کے موسم" طباعتی مراحل میں ہے۔

نور جہاں نوری نے بچپن میں ہی علم عروض کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ اپنے کلام کی پختگی میں بہت پر اعتماد ہیں۔ کہتی ہیں "میری شاعری میں آپ کہیں بھی وزن کا جھول نہیں پاسکتیں"۔ نویں جماعت میں پڑھتی تھیں جب پہلے مشاعرے میں شریک ہوئیں۔ کالج اور یونیورسٹی کی جانب سے جہاں گئیں انعام لے کر ہی لوٹیں۔ قلبی واردات اور غم زمانہ ساتھ ساتھ لے کر چلنے والی نور جہاں نوری نے غزل کی روایتی زمین میں جدید انداز سے بات کہنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

سارے چمن میں نفرت و تحقیر اگ گئی
خود رو یہ پودے کاٹ دو ورنہ یہ گھر گیا

دنیا بھر میں مسلمانوں کے قتل عام پر غضبناک ہونے والی شاعرہ کے لہجے میں وقت کی للکار ہے۔ خصوصاً پاکستان کی حالت ابتر پر اگر وہ خون کے آنسو بہاتی ہے تو گرج کر احتجاج بھی کرتی ہے۔ انقلاب کا رستہ بھی دکھاتی ہے۔

نور جہاں نوری نے غزل، نظم، رباعی، قطعات، نعت، قصیدہ، گیت حتیٰ کہ سہرے اور رخصتی بھی لکھی ہیں۔ اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ ہر موسم کی شاعرہ ہے۔ نوری کی دونوں کتابوں کے انتساب ان کی "اماں" اور "شوہر رشید" کے نام خوبصورت اشعار سے موسوم ہیں۔ جن کے متعلق وہ کہتی ہیں کہ یہ انتساب ان کی ہر کتاب میں شامل رہیں گے۔ نوری کی کتابوں کی ایک منفرد بات یہ بھی ہے کہ ان میں مختلف شعراء اور ادیبوں کی آراء شامل نہیں ہیں۔ ان کا کہنا ہے میں اس کو جھوٹ سمجھتی ہوں۔ جب کہ میری شاعری جھوٹ نہیں ہے۔ مجھ پر جیسے جیسے واردات گزرتی ہے وہ بغیر کسی بناوٹ کے شعری قالب میں ڈھل جاتی ہے۔ لہٰذا میں نہیں چاہتی کہ میری سچی کتاب میں کوئی جھوٹ آئے۔ اکثر مشاعروں میں جب میں پاکستان کے موضوع پر پڑھتی ہوں تو لوگ رو پڑتے ہیں یہی آنسو میرے کلام کی آراء ہیں۔ لوگ مجھے فون کرتے ہیں، خط لکھتے ہیں حتیٰ کہ بچے بھی۔ مجھے ان کی باتیں سچی لگتی ہیں میری آنے والی کتاب میں البتہ عوام کی آراء شامل

ہیں جو میرے لئے بہت خاص ہیں۔ میں شاعری اپنی تسکین کے لئے کرتی ہوں۔ میں سوچتی ہوں کہ اگر میں اپنی شاعری سے ایک آدمی کے دل میں بھی پاکستان کی محبت جگا دوں، وہی میرا انعام ہے۔ میں خدا کے بعد سب سے زیادہ محبت اپنے ملک سے کرتی ہوں۔

یہ حوصلہ بھی بڑا دلنواز ہے نوری
میرا وطن ہے میں اپنی زمین رکھتی ہوں

میرا وطن میرا غرور ہے۔ اگر لوگ میری باتیں ناپسند کریں یا اس پر تنقید کریں تو میری سوچ نہیں بدلے گی۔ میں اپنے دیس اپنی مٹی سے محبت کرتی رہوں گی مجھے فخر ہے کہ میں پاکستانی ہوں۔

آپ گل و بلبل اور لب و رخسار کے پیچ و خم سے کس طرح باہر آئیں؟

یہ تو تشبیہات ہیں مگر آپ کا سوال سمجھ گئی ہوں۔ اور اس کے لئے ایک شعر سے بات واضح کر دوں۔

میں اندھیروں کو اجالوں میں سمونے کے لئے
حلقہ زلف پریشاں سے نکل آئی ہوں

ساری بات اس چیز پر منحصر ہوتی ہے کہ شاعر کا ادراک کیا ہے، وہ کس زاویہ نگاہ سے اپنے اطراف دیکھتا ہے۔ اس کے محسوسات اس کی شاعری ہے۔ آپ اسے ترقی پسند شاعری کا نام دے لیں۔ انقلابی کہہ لیں یا عشقیہ رموز میں ڈوبی ہوئی۔ میری تو یہ حالت ہے کہ کراچی میں ایک لڑکا مرتا ہے تو میں سارا دن روتی ہوں اور شام کو ایک نظم تیار ہوتی ہے۔ میں نے بوسنیا سے متعلق ایک فلم دیکھی جس میں مائیں نامعلوم منزل کو جانے والی گاڑیوں میں اپنے بچوں کو سوار کرا رہی ہیں انہیں نہیں معلوم کل ان کا بچہ کہاں ہوگا۔ مائیں حسرت سے اپنے بچے کو دیکھ رہی ہیں۔ کچھ اور منظر کچھ اور نقشے۔ میرا دل کٹ گیا میں فلم دیکھ دیکھ کر روتی رہی۔ اس پر میں نے ایک نظم "وادی دینوب میں حالات کی تصویر دیکھ" بے ساختہ لکھی تھی۔ جس پر عمر شیخ فاؤنڈیشن کی جانب سے "یورپ کی بہترین شاعرہ" کا ایوارڈ ملا تھا۔

نور جہاں آزاد نظم کی قطعی طور پر قائل نہیں۔ وہ کہتی ہیں "یہ تو میرا من کی اردو ہوئی۔ اس سے اچھا آپ نثر لکھ لیں۔ آزاد شاعری دراصل سہل پسندی ہے۔ علم و عروض سے واقف آزاد شاعری پر مائل ہی نہیں ہو سکتا۔ مگر آج کل جو شعراء آزاد شاعری کا استعمال کر رہے ہیں وہ فیشن اور اسٹائل سے متاثر ہیں۔ میں ذاتی طور پر اسے اپنے لئے پسند نہیں کرتی"۔

نور جہاں برطانیہ میں اردو کا مستقبل بڑا صاف اور واضح دیکھتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ "آج سے تیس برس پیچھے کسی اردو بولنے والے کی شکل شاذ و نادر ہی نظر آتی تھی۔ آج جگہ جگہ اردو بولنے

والے موجود ہیں۔ اسکولوں کالجوں میں اردو زبان پڑھی لکھی جارہی ہے۔ اخبارات وسائل شائع ہورہے ہیں۔ اپنے ریڈیو موجود ہیں اور کیا چاہئے۔ کیا یہ چیزیں آسان ہیں مٹ جانا۔ اردو ترقی کی دوڑ میں بھاگ رہی ہے۔ دراصل پچھلے سالوں میں جب لوگ یہاں آکر آباد ہوئے تھے تو سمجھتے تھے کہ ان کے بچوں کو مشکلات پیش آئیں گی لہٰذا ان کا زیادہ سے زیادہ زور انگریزی پر ہوتا تھا۔ مگر آپ آج ایک عام پڑھے لکھے گھرانے میں دیکھ لیں بچہ بہت اچھی اردو بولتا ہے۔ ہماری مسجدیں ہیں جگہ جگہ جہاں وہ اردو دینیات اور قرآن پاک کی تعلیم لیتا ہے۔ انگریزی ماحول میں اردو کا اپنے لئے جگہ پیدا کرلینا ہی اس کے بہتر مستقبل کی ضمانت ہے۔ یہاں کے مشاعروں میں دیکھیں' جدھر اینٹ اٹھائیں ایک شاعر نکلتا ہے یہ کون ہیں جو اردو سے اظہار دلچسپی دکھا رہے ہیں۔ اچھا برا ٹوٹا پھوٹا جیسا بھی لکھ رہے ہیں' کوشش کررہے ہیں اور میں ان کی کوششوں کو سراہتی ہوں۔ کم ازکم یہ ان سے بہتر ہیں جو یہاں بیٹھے بیٹھے کراچی سے دس پونڈ میں ایک غزل خرید کر دیوان بغل میں دبائے پھرتے ہیں"۔

نوری کہتی ہیں کہ "ابلاغ ہر علم کے لئے ضروری ہے۔ اگر آپ لکھ لکھ کر ایک طرف ڈالتی جائیں تو وہ آنے والے کل میں آپ کے ساتھ ہی ختم ہو جائے گا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ فلمی رسائل اور ڈائجسٹوں نے ادبی رسائل پر منفی اثرات مرتب کئے ہیں۔ اس کا بہت بڑا سبب تعلیم کا فقدان ہے۔ یہاں پر زبان کا فرق' ادب کی زبان ذرا ثقیل ہوتی ہے---- مگر یہ اپنی جگہ بناتی جائے گی---- میری دونوں کتابوں کا اجراء ہیڈن پاول میں ہوا جہاں برطانیہ کی ادبی دنیا میں تاریخی مجمع تھا۔ چھ سات سو لوگوں کا جمع ہو جانا معمولی بات نہیں۔ کم وبیش اتنی ہی تعداد میں میری کتابیں نہ صرف فروخت ہوئیں بلکہ مقررہ قیمت سے کئی کئی گنا زیادہ رقم دے کر لوگوں نے اسے خریدا۔ یہ کس جذبہ کا اظہار تھا۔ ہم نے اردو کو اپنے خون سے سینچا ہے۔ یہ زندہ رہے گی اور ہمیشہ رہے گی"۔

نورجہاں نوری اپنے شوہر بیرسٹر رشید شیخ کو بہت سراہتی ہیں جنہوں نے زینہ بہ زینہ نوری کا ساتھ دیا۔ نوری کہتی ہیں کہ ان پر تقریباً روزانہ ہی آمد ہوتی ہے۔ وہ پہلے کاغذ کے ٹکڑوں' سگریٹ کی ڈبیوں' حتیٰ کہ ٹشو پیپر پر اپنا کلام لکھ لیا کرتی تھیں جو ضائع ہو جاتا تھا۔ رشید صاحب نے گھر میں جگہ جگہ رجسٹر رکھ دیے ہیں۔ آفس میں بھی' گاڑی میں بھی۔ نوری کا کلام ہمیشہ ایک ہی نشست میں ہوتا ہے' ادھوری رہ جانے والی نظمیں غزلیں ادھوری ہی رہتی ہیں۔ اس ذکی الحس شاعرہ کے کلام کو علامہ اقبال کے صاحبزادے جاوید اقبال نے بھی سراہا۔ انہوں نے نورجہاں کو خط لکھا کہ نورجہاں نوری کی شخصیت اور اس کا کلام ایک دوسرے کے آئینہ دار ہیں۔

عکسِ فن

غزل

میرے لئے سلام کہ دشنام کچھ بھی ہو
دستِ صبا سے بھیجئے پیغام کچھ بھی ہو

خوشبو ہے، جلترنگ ہے، شعلہ ہے برق ہے
مجھ کو نہیں غرض کہ ترا نام کچھ بھی ہو

میں رہ نوردِ شوق ہوں چلتی ہی جاؤں گی
منزل ملے نہ مل سکے انجام کچھ بھی ہو

رنگوں میں ایک رنگ محبت کا رنگ ہے
رنگوں کے اِمتزاج پہ الزام کچھ بھی ہو

افسردہ زندگی ہو کہ آسودہ زندگی
لیتی رہوں گی نام ترا کام کچھ بھی ہو

زہرآب ڈال کر بھی پلادے وہ پیار سے
پی لوں گی میں خوشی سے تہہ جام کچھ بھی ہو

ہر سمت جلوے دیدنی نوری کے ہوگئے
رم جھم ہو، یا دھنک ہو، سرِ شام کچھ بھی ہو

نوشاد علی

ہر زمانے کے لئے تھے مرے نغمے نوشاد
ہر زمانہ مرے نغمات کو گاتا ہی رہا

فقط خادم نوشاد علی

Naushad Ali "ASHIANA"
Carter Road. Bandra
BOMBAY 400050 - INDIA

موسیقار نوشاد علی

(بمبئی)

میں نے دیکھا ہے اور ممکن ہے آپ میں سے بھی بہت سوں نے دیکھا ہو کہ ضرورت مند آدمی اگر اپنی دھن کا پکا ہے تو کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سے بھی تلاش کر کے "کام کی چیزیں" نکال ہی لیتا ہے۔ یہ ہی محنت نوشاد صاحب نے کی ہے۔ میں نے جب نوشاد صاحب کا کلام پڑھا تو محسوس ہوا کہ انہوں نے انسانی فطرت و مزاج کا اتنا گہرا مطالعہ کیا ہے کہ ان کا ہر مشاہدہ ایک ترشے ہوئے ہیرے کی صورت ان کے کلام میں سما گیا ہے۔ ہیرے کی یہ چمک اور جگمگاہٹ بلاشبہ قاری کے ذہن کو روشن اور منور کرتی رہتی ہے۔ نوشاد صاحب کا یہ شعر اس دلیل کا عکاس ہے۔

اچھی نہیں نزاکت احساس اس قدر
شیشہ اگر بنو گے تو پتھر بھی آئے گا

ان سے رابطے کے لئے میں نے بمبئی میں لیفٹیننٹ زین العابدین خان (جو افسانہ نگار بھی ہیں) سے رابطہ کیا کہ میرا سوالنامہ نوشاد صاحب تک پہنچا دیں اور جیسا کہ میں نے سنا تھا کہ وہ اپنے پرستاروں کو کبھی مایوس نہیں کرتے نوشاد صاحب نے اپنے ہاتھ سے اپنا کلام لکھ کر عنایت کیا۔ (سخن ور کے انہی صفحات میں آپ ان کا عکس تحریر ملاحظہ کریں گے) گو اس کے لئے مجھے خاصا انتظار کرنا پڑا کہ ان سے گفتگو کا موقع ملے لیکن انتظار کے لمحات میں، میں انہی کا شعر یاد کر لیتی تھی۔

اس واسطے اٹھاتے ہیں کانٹوں کے ناز ہم
اک دن تو اپنے ہاتھ گل تر بھی آئے گا

نوشاد علی

۱۹۱۹ء میں لکھنؤ کی ادب اور سخن نواز مٹی سے نوشاد علی کا خمیر اٹھا۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم کی حد تک درسی کتابوں سے استفادہ کیا کیونکہ ان کا رجحان موسیقی کی طرف تھا۔ چنانچہ اس طبعی میلان کا کمال تھا کہ سترہ سال کی عمر کے نوجوان نے لکھنؤ کے استادوں سے موسیقی کے فن میں توقع سے زیادہ مہارت حاصل کرلی۔ اور پھر فن کی وہ منزلیں طے کیں کہ نوشاد علی سے وہ موسیقار اعظم نوشاد کہلائے۔

درسی کتابوں سے علم حاصل کرنے کا مقصد اگر محض ڈگریوں کا حصول ہے تو ہمارے بہت سے شعراء ڈگریوں سے محروم ہونے کے باوجود ادب وشاعری کی دنیا میں اپنا نام کرگئے اور دلوں میں یوں جاگزیں ہوگئے ہیں کہ ان کے اشعار زبان زدعام ہیں۔ جیسے جگر اور جوش۔ قدیم شعراء میں آتش، ناسخ، انشاء اور غالب کی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔ نوشاد فطری طور پر موزوں طبع ہیں۔ شیخ سعدی نے کہا ہے کہ کسی کے عیب وہنر کو جاننے کے لئے اس کی لمبی لمبی تقریروں کی ضرورت نہیں اس کی گفتگو کا ڈھنگ ایک جملے سے بھی اس کی شخصیت کو منعکس کردیتا ہے۔

نوشاد کے لئے شاعری کی محرک جو فضا بنی اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ "میں نے جس لکھنؤ میں آنکھیں کھولیں اس کی فضا غزل کی روشنی سے منور اور شاعری کی خوشبو سے مہکی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں بیدم، وارثی، عزیز، صفی، ثاقب، سراج اور قدیر کی شاعری کے چرچے تھے۔ اس وقت نہ ریڈیو تھا نہ ٹی وی۔ حتیٰ کہ لاؤڈ اسپیکر بھی نہیں تھے لیکن سخن فہم اور قدردان موجود تھے۔ ایسے ماحول میں شعروسخن سے کوئی کور ذوق ہی بیگانہ رہ سکتا تھا۔ یہ محفلیں ہی میرے لئے شاعری کا محرک بنیں لیکن میں کسی کی رہنمائی کے بغیر آگے بڑھنا نہیں چاہتا تھا چنانچہ میرے اسی زمانے کے رفیق عمر انصاری صاحب کو میں نے شعرگوئی کے میدان میں اپنا استاد اور اپنا رہنما مانا۔ وہ دولت سخن اور دولت زر دونوں سے مالا مال تھے۔ ذرا اس ماحول کا تصور کیجئے جب جگر، جوش، سراج اور آسی لکھنوی جیسے نامور شعراء ان کے آستاں پر سخن گو ہونے کا شرف حاصل کرتے تھے اور ہم جیسے نوآموز ان کی گلستان شاعری کے خوشہ چیں ہونے کا فخر حاصل کرنے کی کوششوں میں لگے رہتے تھے۔ بس یہ کسب کمال وفیض وہیں سے حاصل ہوا۔

نوشاد صاحب اپنے حالات زندگی تفصیل سے سناتے ہوئے کہنے لگے۔ "موسیقی کا جنون مجھے کشاں کشاں بمبئی لے آیا۔ سر میں سات سروں کا سودا ضرور تھا، لیکن دل میں لکھنؤ کی چھوڑی ہوئی محفلیں آباد تھیں۔ تنہائی میں جب یادوں کی بادبہار دل کو چھوجاتی تو اکثر شعر کی کوئی نہ کوئی کونپل ضرور پھوٹ اٹھتی تھی۔ اتفاق سے بمبئی میں آتے ہی مجھے ڈی۔ این مدھوک اور پی۔ ایل سنتوشی جیسے باکمال اصحاب کی صحبتیں نصیب ہوگئیں۔ دونوں کا فلمی نغمہ نگاری کے

میدان میں طوطی بول رہا تھا۔ دونوں موزونی طبع کے اعلیٰ شاہکار اور کلام موزوں کے پرستار تھے۔ مدھوک صاحب میرے بزرگ اور سنتوشی صاحب میرے ہمسایہ اور دوست تھے۔ ان دونوں حضرات کا فیض تھا کہ شاعری سے محبت کے لئے دل ہمیشہ جوان رہا۔

اس کے بعد تو جیسے برکتوں کا نزول شروع ہوگیا۔ کاردار اور محبوب خاں کی رفاقت ملتے ہی شعر و سخن کی ادبی قدروں سے شناسائی میسر آئی۔ جگر مراد آبادی کے توسط سے اردو ادب کے تین بیش قیمت نگینے میرے ہاتھ آگئے۔ تینوں قدر و قیمت کے اعتبار سے نایاب اور یکتائے روزگار مجروح، شکیل اور خمار تھے۔ جن کے بغیر نہ اردو کی شعری تاریخ مکمل ہو سکتی ہے اور نہ فلمی نغمہ نگاری کا حسن۔

یہ سب میرے گھر ہی مقیم ہوئے۔ یہ بھی قسمت کی بات ہے، جو ہر کسی کو کہاں نصیب ہوتی ہے۔ یعنی اب میرا خاندان شاعروں کا خاندان تھا۔ میں نے تینوں سے جی بھر کے فائدہ اٹھایا۔ اب اگر شعر کہتا تو اس شعر کے حسن و صحت کے تین تین ضامن بلکہ نگہبان موجود تھے۔ اس طرح شعر گوئی کی دبی ہوئی چنگاری وقتاً ''فوقتاً'' شعلوں کا روپ دھارتی رہی۔ بعد میں حسن کمال صاحب کا بھی اضافہ ہوا۔ شکیل اور خمار کلاسکیت کے شیدا تھے، مجروح ترقی پسندی کے مرد میداں اور حسن کمال آج کی غزل کے نشہ میں چور۔ میں نے میکدوں سے جتنے بھی گھونٹ میسر آئے پی لئے اور جتنی بھی تشنگی بجھا سکتا تھا، بجھالی۔

ان تمام باتوں کے باوجود نہ تو کبھی خیال آیا نہ ہمت پڑی کہ جگر لخت لخت کو جمع کروں اور ترتیب دے کر مجموعہ کی شکل دوں، کیونکہ خود کو مکمل شاعر مانتے تو کیا، کہتے ہوئے بھی ہمیشہ ڈر لگا۔ شاید اللہ کو یہ کام بزم فکر و فن بمبئی اور خصوصاً اس کے سرگرم کارکن جناب قتیل راجستھانی سے کرانا تھا۔ میرے گریز کے باوجود ان کا اصرار جیت گیا اور میرا مجموعہ ''آٹھواں سر'' کے نام سے قارئین کے ہاتھوں تک پہنچ گیا، جسے میں اب بھی کسی لائق نہین سمجھتا۔

اب اگر آپ کو اس میں کچھ اچھا نظر آجائے تو اسے باکمال اصحاب کی صحبتوں کا عکس سمجھئے۔ اگر کسی شعر پر نگاہ ٹھہر جائے تو اسے لکھنؤ کی محفلوں کے نور کی چھوٹ جانئے۔ اگر کوئی مصرعہ پسند آجائے تو اسے اس پیاری اردو زبان کا صدقہ جانئے کہ جس میں اگر معمولی بات بھی کہی جائے تو بھی سجائی دلہن کی طرح حسین لگتی ہے۔

نوشاد اپنی شاعری کے حوالے سے کسی مکتبہ فکر سے وابستہ نہیں رہے۔ انہوں نے کبھی ان نظریات کو سامنے رکھ کر شاعری کی ہی نہیں۔ ان کی نظر میں شاعری کی صرف دو اصطلاحیں رہیں۔ ایک فلمی اور ایک علمی۔ وہ شاعری کو خانوں میں بانٹے جانے کے قائل نہیں۔ کہتے ہیں

نوشاد علی

اگر شعر اچھا ہے تو اچھا ہی رہے گا۔ آپ چاہے اسے کسی خانے میں جگہ دیں۔ اب چاہے وہ ایک نوجوان شاعر کے دل کی آواز ہو یا کسی ذی عمر اور قادر الکلام شاعر کی تخلیق اور یہی ان کے استاد محترم کی بھی رائے ہے جسے وہ مقدم سمجھتے ہیں۔

نوشاد صاحب کا بیشتر کلام ان کی موسیقی کی مصروفیات کی وجہ سے ضائع ہو گیا۔ بہت سا کلام ایسا بھی ہے جو لوگوں نے گایا بھی لیکن کسی کو معلوم نہیں کہ اس کا خالق نوشاد ہے۔

ان کی لاس اینجلس (امریکہ) آمد کے موقع پر نیر جہاں نے ۷ اگست ۱۹۹۳ء کو اردو مرکز انٹرنیشنل کی جانب سے ان کے اعزاز میں ایک تقریب منعقد کی۔ جس میں "پاکستان لنک" کے مدیر جناب رحمٰن صدیقی نے یہ قطعہ نذرانہ عقیدت کے طور پر پڑھا۔

سر کے ماحول پہ چھانے آیا
روح کی پیاس بجھانے آیا
شعر اور ر کا خزینہ نوشاد
پھول ہی پھول کھلانے آیا

اس موقع پر لاس اینجلس کے معروف شاعر فضل الضیاء سحر نے نذرانہ محبت پیش کرتے ہوئے کہا۔

ساز و آواز کی دنیا ہے انہی سے آباد
موسیقی کے یہ پیمبر ہیں جناب نوشاد
مسند شعر و ادب کی بھی انہی سے زینت
شعر و نغمے کے صنم گر ہیں جناب نوشاد

نوشاد علی

عکس فن

نعت

بحضور رسول اکرمؐ

گل عشق محمدؐ دل کے کاشانے میں رکھ دینا
جلاکر شمع ایماں اس سیہ خانے میں رکھ دینا

فراق مصطفیؐ میں اشک جو آنکھوں سے بہتے ہیں
انہیں مئے جان کر شیشے میں پیمانے میں رکھ دینا

فرشتے خود ہی پڑھ لیں گے غلام شاہ والاؐ ہے
نبیؐ کا نام لکھ کر میرے افسانے میں رکھ دینا

مٹانا بھی تو مٹی سے مری کونین کے خالق
بناکر جام مئے یثرب کے میخانے میں رکھ دینا

بجز تائید حق کب تھا کسی انسان کے بس میں
خدا کے گھر کی بنیاد ایک ویرانے میں رکھ دینا

نہ پوچھو' دے گیا مجھ کو اچانک عظمتیں' کیا کیا
وہ ان کا پاؤں میرے سر پہ انجانے میں رکھ دینا

جزا کے روز جب وابستگاں کی درجہ بندی ہو
شہاؐ نوشاد کو خدم کے خانے میں رکھ دینا

نیرّ جہاں

شکست و ریخت کا یہ لمحہ گر اندر اُتر جائے
تو پھر تعمیر کی دیکھو کوئی صورت نہیں رہتی

نیر جہاں

Nayer Jahan
721 Hill St.
111 Santa Monica, CA 90405 - 4425 - U.S.A.

نیرؔ جہاں
(لاس اینجلس)

میرے وطن پاکستان میں جس کی آبادی بارہ کروڑ سے تجاوز کر گئی ہے اردو ادب کے قارئین کی تعداد (ایک جائزے کے مطابق) ایک یا ڈیڑھ لاکھ کے قریب ہوگی۔ اس محدود حلقے میں ادب کتنا پڑھا جاتا ہوگا اس کا اندازہ ہر سخن فہم کو ہوگا۔ ادب کی نشوونما کی رفتار ہمیشہ پڑھنے والوں کی تعداد سے مربوط ہوئی ہے اور جوں جوں پڑھنے والوں کا حلقہ تنگ ہوتا ہے توں توں ادب کی سانس گھٹتی جاتی ہے۔ ایسے میں اگر گھر کے باہر سے تازہ ہوا کا جھونکا آجائے تو زندگی کو نمو مل جاتی ہے۔

نیرؔ جہاں نے بھی اسی پاکستان کی خاک سے جنم لیا ہے۔ دیارِ غیر میں بسنے کے بعد انہوں نے نہ تو اپنی زبان سے ناطہ توڑا نہ ادب سے بلکہ اسے مستحکم بنانے کے لئے انہوں نے "اردو مرکز" کی بنا ڈالی۔ یہ بھاری پتھر اٹھانا آسان کام نہ تھا اور نیرؔ جہاں ان میں سے نہیں جو اس سنگِ گراں کو چوم کر چھوڑ دیتیں چنانچہ اب یہ کہنا مشکل نہیں کہ اردو مرکز سے نیرؔ جہاں کی پہچان نہیں بلکہ نیرؔ جہاں سے اردو مرکز کی پہچان ہے کیونکہ اردو مرکز انٹرنیشنل لاس اینجلس کے بینر تلے ایک سالانہ عالمی مشاعرہ تو لازمی تھا ہی' اب سال میں کئی بار ادبی و ثقافتی پروگرام بھی ہوتے ہیں۔ سونے پر سہاگہ ۱۹۸۸ء سے پاک و ہند سے باہر تخلیق پانے والے شعری ادب پر ہر سال ایک معقول رقم بھی انعام کے طور پر اردو مرکز انٹرنیشنل کی جانب سے دی جاتی ہے چنانچہ ابتک برطانیہ' سویڈن' کینیڈا اور امریکہ کے سات شعراء یہ ایوارڈ حاصل کر چکے ہیں۔

اللہ کرے زورِ بازوئے نیرؔ اور زیادہ

تو آیئے ہم اسی نیرّ جہاں سے ملتے ہیں۔ نیرّ اپنے بارے میں کہتی ہیں۔ (میرا نام نیرّ جہاں ہے' ہمیشہ سے) کبھی اس میں تبدیلی نہیں آئی شاید لاشعوری طور پر نام کی تبدیلی سے لاحاصلی کا احساس منسلک تھا۔ تعلیم پیدائش سے جو شروع ہوئی ہے تو یہ سلسلہ اب تک جاری ہے گریجویشن کی تاریخ کا علم نہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جس اکیڈیمی سے حصول علم میں مشغول ہوں وہاں کسی بھی طالب علم کو اپنے گریجویشن کی تاریخ کا علم نہیں ہوتا۔ ہرچند کہ تاریخ کا یہ تعین بہت پہلے ہو جاتا ہے۔ سو اپنا کام ہم کئے جا رہے ہیں آگے کی خبر اللہ کو۔ مزید ذاتی پس منظر یہ ہے کہ والد مرحوم کو موسیقی سے اور والدہ محترمہ کو ادب سے بہت گہرا لگاؤ تھا اس لئے بچپن سے میر اور غالب کی غزلیں سنتے اور پڑھتے ہوئے پتہ ہی نہیں چلا کہ کب ہندوستان سے پاکستان ہجرت کی اور کب اس ایک ہجرت کے راستے سے کئی ہجرتوں کی شاخیں پھوٹتی گئیں۔ زندگی میں اس قدر روانی تھی کہ اس کے تیز بہاؤ نے کبھی اتنا موقعہ ہی نہیں دیا کہ رک کر دم لے کر اطراف کا جائزہ لے سکتی۔ ایک طویل عرصے تک قدم جمانے کی کوششوں کے بعد اب قدرے ٹھہراؤ کا احساس ہے اور اسی احساس کے ساتھ یہ بھی دیکھ رہی ہوں کہ اب تمام موسم بدل چکے ہیں۔ جگنو' بیوٹیاں اور قوس و قزح اب موسم کا حصہ نہیں رہے۔ موسم اب دل نہیں لبھاتے ان سے اب صرف مدافعت کی جاسکتی ہے وہ چاہے سرد ہوا کے خنجر ہوں یا گرم ہوا کی آتشیں پھنکاریں۔ اور ایک بات تو سبھی جانتے ہیں کہ موسم کا اثر رہنے والوں پر بھی بہت ہوتا ہے۔

میری ذاتی زندگی عام لوگوں کی طرح ہے۔ چار نہایت نفیس بچے عظمیٰ' صبا' طاہرہ اور شارق ہیں۔ جن کو ادب سے اتنا ہی لگاؤ ہے جتنا مجھ کو ہے اور جو ہر وقت دامے درمے قدمے سخنے میرے ساتھ ہیں۔ بھائی بہنوں میں سے دو بھائی ڈاکٹر متین احمد اور ڈاکٹر رزاق امریکہ میں ہیں۔ جو میرے ادبی سفر میں میرے معاون ہیں جن پر میں فخر کر سکتی ہوں۔ میری زندگی کے ہر ہر لمحے پر میری والدہ نور جہاں بیگم کی شفقت اور تربیت کی مہریں ہیں۔ میں ان کا جتنا شکریہ ادا کروں کم ہے۔ رہی ذہانت صاحب کی بات تو یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ اگر میں چراغ ہوں تو اس میں جلنے والا تیل ذہانت صاحب ہیں۔ میں اپنے آپ سے بددیانتی کروں گی اگر اپنے پہلے شوہر عرفی مرحوم کا ذکر نہ کروں۔ میرے وجود میں عرفی وہ بنیاد کا پتھر ہیں جس کا علم صرف اور صرف عمارت کو ہوتا ہے۔ زندگی نے ایک بہت بڑا عطیہ ہمیشہ دیا اور وہ ہے مخلص بے لوث محبت کرنے والے دوست احباب۔ ۱۹۸۷ء سے ذہانت صاحب کی رفاقت میں "اردو مرکز" کے لئے کام کر رہی ہوں اس سے پہلے ظفر عباس فرحت شہزاد اور الیاس حیدر بیگ کے ساتھ مل کر "بزم سخن" کی بنیاد ڈالی تھی مگر ان تمام اراکین کے بکھرنے سے وہ ادارہ قائم نہ رہ سکا۔ اب "اردو مرکز" خدا کے فضل سے ادبی

دنیا میں خاصا جانا پہچانا ادارہ بن چکا ہے۔ اس ادارے کا سب سے بڑا کارنامہ ادبی انعام کا سلسلہ ہے۔ آج کے ادبی ماحول میں جہاں مشاعروں میں شرکت کے دعوت ناموں سے لے کر رسالوں اور اخبارات میں شائع ہونے تک ہر ہر قدم پر Who Knows Who کی سیڑھیاں ایک لازمی جزو بن چکی ہیں "اردو مرکز" کا دیانتداری سے شاعروں کو انعام دینا بہت بڑی بات ہے۔ ہندوپاک سے باہر جو ادب تخلیق ہو رہا ہے وہ ہر اعتبار سے Main Land سے مختلف ہے خصوصاً اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ یہاں کی زندگی کی تیز رفتاری اور Stress میں اتنا وقت فراہم کرلینا یقیناً ادیبوں اور شاعروں کو تحسین کا مستحق قرار دیتا ہے اور اسی خیال کے تحت یہ انعام شروع کیا گیا ہے۔

آپ نے جوان نسل کی اردو سے نسبت اور لگاؤ کے سلسلے میں پوچھا ہے تو مجھے نئی نسل سے کوئی شکایت نہیں جو ہم نے انہیں دیا ہے وہی وہ ہم کو لوٹا رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہم نے انہیں کیا دیا تھا؟ رک کے، تھم کے اپنا جائزہ لینے کی ضرورت زیادہ نظر آتی ہے بہ نسبت شکایت کرنے کے۔

آپ نے ادب کے مختلف ادوار کے سلسلے میں پوچھا ہے تو میرا خیال ہے کہ ہر دور اپنی ایک خوبصورتی رکھتا ہے اگر کہیں جمود یا ابہام کا رنگ نظر آتا ہے تو میں سمجھتی ہوں وہ دور بھی ایسا تھا کہ زندگی نے لکھنے والوں کو صرف یہی تحفے دیئے۔ ادب کو جو پاتا ہے وہ لوٹا دیتا ہے اس آئینے میں تو صرف عکس ہی نظر آتے ہیں اگر زندگی خوبصورت ہے تو عکس بھی خوبصورت ہوگا ورنہ زندگی اپنی تمامتر بھیانک حقیقتوں کی طرح نظر آئے گی۔

میں کن ادیبوں شاعروں سے متاثر ہوں تو ہر اچھا شعر اچھا لگتا ہے میں فن دیکھنے کی قائل ہوں فنکار دیکھنے کی نہیں۔ میرا ذاتی Contribution کچھ بہت زیادہ نہیں ہے ایک کتاب "پس چہرہ" چھپ چکی ہے اب اتنا ذخیرہ نثر اور نظم میں جمع ہوگیا ہے کہ دو کتابیں آسکتی ہیں۔ خدا توفیق دے کہ اس پر دھیان دے کر پوری توجہ اور دلجمعی سے کام کرسکوں۔

نیر جہاں

عکسِ فن

اپنے بچوں سے

صحیفوں میں یہ لکھا ہے
شکست و ریخت کے لمحے ہر اک موسم میں آتے ہیں
بہاریں جب شگوفوں سے لپٹ کر الوداع کہہ دیں
مسافر زرد پتے جب سفر آمادہ ہو جائیں
بگولے ٹہنیوں سے ان کا جوبن چھین لے جائیں
ہوائیں تیز سے بھی تیز تر ہوتی چلی جائیں
تو اتنا جان لینا تم، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے
کہ آندھی سے فضاؤں کی کثافت دور ہوتی ہے
شکست و ریخت کے موسم ازل سے آتے رہتے ہیں
ہراساں تم نہ ہو جانا
شکست و ریخت کے موسم میں اک لمحہ ہے بس ایسا
اس اک لمحے سے تم ڈرنا
کہ جس میں پیڑ زندہ ہوں، مگر مالی کو گھن کھائے
سفینہ راہ پر ہو، ناخدا گمراہ ہو جائے
کہ جس میں گھر سلامت ہو، مکیں بے جان ہو جائے
کہ جب الفاظ زندہ ہوں، مگر مفہوم مر جائے
اس اک لمحے سے تم ڈرنا
شکست و ریخت کا یہ لمحہ گر اندر اتر جائے
تو پھر تعمیر کی دیکھو کوئی صورت نہیں رہتی

نیاز جیراج پوری

کچھ نشانے چھوڑ دیں راہِ وفا میں اے نیازؔ
ہم نہ جانے زیست کے کس موڑ پر کھو جائیں گے

Niaz Jairaj Puri
Shobra Enterprises
90, Feet Road, Tilak Nager
SAKI NAKA, BOMBAY 400072 - INDIA

نیاز جیراجپوری
(بمبئی، ہندوستان)

نیاز جیراج پوری کی دو نظمیں میری نظر سے گزریں۔ کالی یادیں اور حادثہ۔ ہندوستان میں جمہوریت تو ہے لیکن ہندوستان جیسے جمہوری ملک میں رہتے ہوئے اتنا سچ بولا جا سکتا ہے؟ یہ سوال ان تمام تحریروں اور خبروں پر بھاری تھا جو ہندوستان کے سیاسی سسٹم پر میں اپنے ملک کے اخباروں اور رسالوں میں پڑھتی تھی۔ میں نے سوچا یا تو وہ خبریں جھوٹی تھیں اور تحریریں سچ نہ تھیں یا نیاز جیراجپوری پاگل ہیں۔ مگر نہیں وہ پاگل بالکل نہیں ہیں اور ایک نیاز ہی ہوش مند نہیں ہیں جو "کالی یادیں" جیسی نظمیں لکھ رہے ہیں اور جو ہندوستان ہی کے جرائد میں چھپ بھی رہی ہیں۔ نیاز جیسے جری نڈر اور بے باک شاعر اور ادیب اور بھی ہیں جو حکومت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا تیار رکھتے ہیں۔ یہ اعتماد اور یہ جرات بھی ان کے ملک کی جمہوری روایات نے انہیں بخشا ہے اور جب شاعر اور ادیب کا قلم تلوار بن جاتا ہے تو جلد یا بدیر ان کا قلم سچ کی فتح کا علم بلند کر ہی دیتا ہے۔

میں نے نیاز سے رابطہ قائم کیا۔ انہیں سوالنامہ بھیجا۔ پھر خاصی مدت کے بعد نیاز کا خط آیا اور ان سے فون پر بھی گفتگو ہوئی۔ ۱۲ مئی ۱۹۶۰ء ان کی تاریخ پیدائش ہے۔ موضع جے راج پور ضلع اعظم گڑھ یوپی ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ شبلی نیشنل انٹر کالج اعظم گڑھ سے ہائی اسکول پاس کیا۔ ایم۔ اے اور پھر ایل۔ ایل بی اور ایل۔ ایل۔ ایم کی تعلیم علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے حاصل کی۔ وابستگی ان کی شاعری سے ہی ہے ویسے ابتداء میں کچھ کہانیاں بھی لکھیں جو مختلف رسائل میں شائع ہوئیں۔ اب فلمی دنیا سے بھی وابستہ ہو گئے اور فلموں کے لئے گیت لکھ رہے ہیں۔

نیاز جیراج پوری

اپنی شاعری کے ذریعے اپنی زمین سے رشتہ استوار رہے اور اردو زبان کی آبیاری ہو اس سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ آزادی حاصل کر لینے کے باوجود ذہنی طور پر آج بھی ہم غلام ہیں۔ ہم اس قدر Westernize ہوتے جا رہے ہیں کہ اپنی زبان لکھنے پڑھنے بولنے میں صرف توہین ہی نہیں محسوس کرتے بلکہ اپنی ریت رواج کے مطابق زندگی نہ گزار کر Western culture کو اپنانے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

ہمیں اپنے آپ کو پہنچاننے' اپنی پہچان بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اپنی زبان اور اپنے ادب کی اہمیت کو سمجھنا چاہیے۔ اس کی قدر کرنی چاہیے۔ اس سے جڑے رہنا چاہیے۔ اس کو عام کرتے رہنا چاہیے۔ اپنی وراثت' علم وادب' طور طریقہ' ریت رواج' دیرینہ قدروں کے اتھاہ سمندر سے چمکتے دمکتے موتی تلاش کر کے لوگوں کے سامنے لانا چاہیے۔

اردو کو روزی روٹی سے جوڑنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اپنی بول چال میں اردو کا استعمال کرنا چاہیے۔ ڈیڈی پاپا وغیرہ کے بجائے ابا ابو کہنا اور کہلوانا چاہیے۔ وغیرہ وغیرہ۔ جہاں تک اردو زبان کے مستقبل کا سوال ہے میں اس سے مایوس نہیں ہوں۔ انشاء اللہ اردو کا مستقبل کبھی تاریک نہیں ہو گا۔ ہم نہیں تو' تو اور تو نہیں تو وہ' وہ نہیں تو وہ' کوئی نہ کوئی اردو کو اپناتا ہی رہے گا۔ جس کا ثبوت غیر ملکی یونیورسٹیوں میں شعبہ اردو کا قیام اور گائیکی کی دنیا میں اردو کا بول بالا ہمارے سامنے ہے"۔

نیاز جیراجپوری

عکسِ فن

کالی یادیں

چشمِ غور و فکر میں دُکھ کا سمندر آگیا
چھ دسمبر' بانوے' کا یاد منظر آگیا
موت کے سائے مُسلط تھے بساطِ زیست پر
کالی یادوں کا وہ سایہ پھر سے سر پر آگیا
نام پر مذہب دھرم کے ایسی بھی سازش ہوئی
رام کی دھرتی پہ راون راج کی کوشش ہوئی
ایکتا امن و اماں کے دیس میں چاروں طرف
چھائی نفرت کی گھٹا اور خون کی بارش ہوئی
ظلم و اِستحصال و شور و شر کا موسم آگیا
دوستی' اخلاص و الفت کا چمن مُرجھا گیا
جو ہمیشہ سے تھا اپنا وہ پرایا ہوگیا
ذہن و دل کے شیشے میں اک بال ایسا آگیا
رنج و غم سے ہر بشر بیزار کر ڈالا گیا
ایکتا کی راہ کو دشوار کر ڈالا گیا
جو نشانی تھی ہماری عظمتِ اَسلاف کی
اس عبادت گاہ کو مسمار کر ڈالا گیا
کیا ہوا تھا چھ دسمبر کو سنانا چاہیے
آنے والی نسلوں کو بھی یہ بتانا چاہیے
ہند کی مریادا اور عظمت بچانے کے لئے
نام سب فرقہ پرستوں کا مٹانا چاہیے

رشید نیاز

لگتا مجھے ہے کہ عمر بھر کیسے
ہم تم سے رہیں گے گھر کیسے

رشید نیاز

۲۷/۱/۹۵

Rasheed Niaz
P.O.Box 3963
DOHA - QATAR (A.G.)

رشید نیاز

(دوحہ قطر)

بھگوال اعوان ضلع سیالکوٹ کے رہنے والے چودہری رشید کا تخلص نیاز ہے۔ سن پیدائش ۱۹۴۷ء (ہندوستان) ہے اور یہی سن پاکستان کی ولادت کا بھی ہے۔ سیالکوٹ کے اسلامیہ کالج سے تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۲ء تک کراچی الیکٹرک سپلائی کارپوریشن سے وابستہ رہے۔ ۱۹۷۷ء سے ۱۹۷۸ء تک ملازمت کے سلسلے میں سعودی عرب میں ۱۹۸۰ء سے قطر کی وزارت امور بلدیہ وزراعت کے سول انجینئرنگ کے شعبے سے وابستہ ہیں۔ شعروسخن کی محفلوں میں باقاعدگی سے شرکت کرتے ہیں کیونکہ یہ محفلیں اور شعراء سے تبادلہ خیال شاعری کے محرک ہیں۔ پاک یوتھ سوسائٹی دوحہ قطر اور پاک رائٹرز فورم کے تحت شعروسخن کی محفلوں کے ذریعے اردوزبان وادب کی آبیاری بھی ہوتی ہے اور سخن وروں اور سخن فہموں کے ذوق کی تسکین کا باعث بھی۔

رشید نیاز اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ پہلے کے مقابلے میں آج اردو کے رسائل زیادہ نکل رہے ہیں۔ کتابوں کی اشاعت بھی زیادہ ہے۔ ادبی کتب کی رسوم اجراء پہلے کے مقابلے میں اعلیٰ پیمانے پر ہورہی ہیں۔ آج کے دور میں مشاعروں کا بجٹ ہزاروں میں نہیں لاکھوں میں ہوتا ہے۔ سال گزشتہ یعنی ۱۹۹۴ء میں "جشن محشر" (محشربدایونی) کا بجٹ ایک لاکھ ریال سے زیادہ کا تھا۔ اردو کے مراکز پاکستان اور بھارت کے علاوہ یوروپ' اسکنڈے نیویا اور خلیج کے ممالک میں قائم ہوئے ہیں جن کے تحت سال بھر میں کئی چھوٹی اور بڑی ادبی تقریبات منعقد ہوتی رہتی ہیں۔ یہاں اس کا اعتراف کرنا چاہئے کہ ادب کے قارئین میں اضافہ نہیں ہوا۔ مزید بہتری کے لئے اجتماعیت کو انفرادیت پر ترجیح ملنی چاہئے۔ ہم اردو کے فروغ کے

لئے مستقبل مزاجی سے کام کرتے رہیں گے تو ناکامی نہیں ہوگی۔ یہ شعر اس کا ترجمان ہے۔

عشق وہ کار مسلسل ہے کہ ہم اپنے لئے
ایک لمحہ بھی پس انداز نہیں کرسکتے

اسی طرح ممالک غیر میں اردو زبان کی بقا کے سلسلے میں نیاز کا کہنا ہے کہ امریکہ ہو یا کوئی اور ملک' اردو نے جہاں ڈیرے ڈال دیئے وہاں سے اسے دیس نکالا نہیں دیا جاسکتا۔ اردو سے جنہیں محبت ہے وہ چاہیں تو اس کی بقا کے لئے ٹی وی پروگرام شروع کریں کیونکہ ٹیلیویژن وہ موثر ذریعہ ہے جو گھر کے ہر فرد کو متاثر کرسکتا ہے۔

آج کے عہد میں جو ادب تخلیق ہو رہا ہے رشید نیاز اس سے بھی پرامید ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس میں تنوع بھی ہے اور کشش بھی۔ آج ادب آنے والے کل کی تاریخ میں اپنے وجود کا احساس دلائے گا۔ آج نقاد اگر تحریر کو بے معنی قرار دے رہے ہیں تو کیا وہ خود اس میں شامل نہیں' حالانکہ آج ادب میں نئے تجربات ہو رہے ہیں۔ کئی صاحب علم وفن ایسے ہیں جو ادب اور زندگی کے رشتے کو نہ صرف قائم رکھے ہوئے ہیں بلکہ ان کی کاوشوں نے ادب کی جڑوں کو اس کی زمین میں گہرائی دی ہے۔ اس سلسلے میں وہ جناب احمد ندیم قاسمی کے شعر کا حوالہ دیتے ہیں۔

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہل وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

ان کا کہنا ہے کہ اس حوالے سے پاکستان میں حکیم سعید' دبئی میں سلیم جعفری اور قطر میں جناب محمد عتیق اور مصب الرحمٰن قابل ستائش ہیں کہ انہوں نے کئی شعراء کو ان کی زندگی میں ہی ان کے جشن منعقد کرکے اور ضخیم مجلوں کی صورت میں ادب کی تاریخ کے لئے مواد محفوظ کردیا ہے۔ اس ضمن میں پاکستان کے مقتدرہ قومی زبان کے ارباب اقتدار بھی اس رسم کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ ذیل کے چند اشعار بھی اس صورتحال کے عکاس ہیں۔

فراز تونے اسے مشکلوں میں ڈال دیا
زمانہ صاحب زر اور صرف شاعر تو
(احمد فراز)

اب ہوائیں ہی کریں گی روشنی کا فیصلہ
جس دیئے میں جان ہوگی وہ دیا رہ جائے گا
(محشر بدایونی)

واعظ تنگ نظر نے مجھے کافر بنایا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں
(جگن ناتھ آزاد)

وست نادیدہ کی تحقیق ضروری ہے مگر
پہلے جو آگ لگی ہے وہ بجھادی جائے
(پیرزادہ قاسم)

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغ آخر شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اجالا ہے
(ظہیر کاشمیری)

وہ ترے نصیب کی بارشیں کسی اور چھت پہ برس گئیں
دل بے خبر مری بات سن اسے بھول جا اسے بھول جا
(امجد اسلام امجد)

دل سلگتا ہے مرا سرد رویے سے ترے
دیکھ اس برف نے کیا آگ لگا رکھی ہے
(انور مسعود)

رشید نیاز ویسے تو کسی بھی مکتبہ فکر سے وابستگی ضروری نہیں سمجھتے۔ لیکن پھر بھی قاسمی مکتبہ فکر سے متاثر ضرور ہیں۔ شاعری میں سچے اور کھرے جذبات کی ترجمانی کو ضروری اور اہم خیال کرتے ہیں۔ شاعر یا ادیب کی فکر کا پرتو اس کی شخصیت میں ضرور نمایاں ہونا چاہئے۔ ان کا کہنا ہے کہ ابلاغ کے بغیر کسی بھی تحریر کا مقصد کیا؟ اسلوب سادہ اور الفاظ کی صحیح نشست و برخاست شعر کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہے۔ محسن بھوپالی کا یہ شعر فصاحت و بلاغت کی ایک روشن مثال ہے۔

بات بین السطور ہوتی ہے
شعر میں حاشیئے نہیں ہوتے

خالق کی تخلیق اپنی ذات کے علاوہ روح عصر کی بھی عکاس ہوتی ہے۔ مگر ان دنوں صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ وسائل اور پبلک ریلشنگ یعنی تعلقات عامہ نے بھی خاصی اہمیت اختیار کرلی ہے۔ پھر بھی صاحب کمال شاعر اور ادیب آج بھی پورے جاہ و جلال کے ساتھ ادبی

منظرنامے کی زینت بنے نظر آتے ہیں۔ چند نام جو اوپر دیئے گئے ہیں ان میں جون ایلیا' گوپی چند نارنگ' کیفی اعظمی' منیر نیازی' انتظار حسین' جوگندر پال' ڈاکٹر انور سدید' مشفق خواجہ اور ڈاکٹر انعام الحق جاوید کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

رشید نیاز کا کلام کراچی کے ہفت روزہ معیار' اخبار جہاں' رابطہ' روزنامہ جنگ اور روزنامہ نوائے وقت کے ادبی صفحات' یاران وطن اور ید بیضا کے علاوہ ادبی ڈائجسٹ کویت میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ لاہور کے ادبی پروگرام صدف اور ریڈیو قطر کی اردو سروس میں ان کا تعارف نشر ہو چکا ہے۔ حال ہی میں پاکستان ٹی وی کے پروگرام دیس پردیس میں بھی ان کی غزلیں ٹیلی کاسٹ ہوئیں۔ گلف ٹائمز اور جنگ لاہور میں بھی ان کے انٹرویوز شائع ہوئے ہیں۔

متفرق اشعار

جھلسا تھا جب چہرہ اُس کا
پھر موسم کو سمجھا تھا وہ
نقشِ محبت ڈھونڈ رہا تھا
کس دنیا میں رہتا تھا وہ
ہر محفل کی جان تھی لیکن
گھر میں کتنا تنہا تھا وہ

○

تجھ کو اللہ سلامت رکھے
مجھ کو دشمن کی ضرورت کیا ہے
اُس نے قصداً نہیں دیکھی شاید
سرِ دیوار عبارت کیا ہے

رشید نیاز

عکسِ فن

غزل

موسم کتنے بدلے ہیں
ہم ویسے کے ویسے ہیں

آنکھوں میں دو چشمے ہیں
ایک ہی جانب بہتے ہیں

تعبیروں پر کیا پچھتائیں
خواب ہی ایسے دیکھے ہیں

سورج کی قربانی دی ہے
تب یہ تارے نکلے ہیں

اس کی بات ہی اور ہے ورنہ
لوگ تو ملتے رہتے ہیں

نیاز گلبرگوی

وہ سخن نخلِ بے ثمر ہے نیاز
جس کے پیچھے کوئی عقیدہ نہیں

نیاز گلبرگوی

Niaz Gulburgvi
5445 North Artesion
CHICAGO - IL 60625 - U.S.A

نیاز گلبرگوی

(شکاگو)

ریاست حیدر آباد دکن کا شہر گلبرگہ جسکے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسودراز نے اردو کی پہلی نعت کہہ کر اور اردو کی اولیں نثری کتاب ''معراج العاشقین'' لکھ کر دکن کی ادبی تاریخ کا آغاز کیا۔ (جدید تحقیق غالباً اس سے متفق نہیں) اسی مقدس خاک سے اس نیاز نے جنم لیا جو اسم بامسمی یعنی واقعی سراپا نیاز ہیں۔

ان سے میری ملاقات اس صدی کی چھٹی دہائی میں ہوئی۔ چھوٹا سا ایک گروپ تھا ہمارا جس میں محترمہ سعیدہ عروج' عروج بھائی' میمونہ غزل' ڈاکٹر اختر' فضل گلبرگوی' تحسین سروری' عشرت انجم' بدر جعفری (سید صابر علی جعفری) اور فضا جلالوی (استاد قمر جلالوی کے شاگرد) اکثر اس طرح کی نشستیں ہمارے گھر سعید رضا سعید کے ایما پر منعقد ہوتیں۔ ہر فرد باقاعدگی سے شریک ہوتا۔ مصرع طرح دیا جاتا اور یوں نئی غزلوں کی تخلیق ہوتی۔ مسعود جاوید اور نیاز گلبرگوی ان نشستوں میں گاہے گاہے شریک ہوتے۔ ان احباب میں میری ذہنی قربت سب سے زیادہ فضل بھائی سے تھی اور وہ بھی مجھے چھوٹی بہن کی طرح چاہتے تھے۔ ہمیشہ کہتے تھے کہ ہمارے گروپ میں مہر سب سے کم عمر ہے۔ وہ چھوٹی بہن ہی کی طرح میرا لاڈ بھی کیا کرتے۔ پھر طویل عرصے تک ہم نہیں ملے۔ ۱۹۹۴ء میں جب میں کراچی گئی تب ان سے ملاقات ہوئی۔ مسعود جاوید کے گھر نشست میں ان کی وہی محبت پیار اور خلوص۔ اور بس یہ ہی ان سے آخری ملاقات تھی۔ یہاں آنے کے بعد ان کے انتقال کی خبر ملی اور انہی دنوں برسوں کے بچھڑے نیاز گلبرگوی صاحب سے ان کی لاس اینجلس آمد پر ملاقات ہوئی تو یوں لگا میرا بچھڑا ہوا بڑا بھائی اور رہنما پھر سے آگیا ہو۔ نیاز کا روپ

دھار کر۔ گو وہ شکاگو میں ہیں اور میں لاس اینجلس میں لیکن خطوط اور فون کے ذریعے تجدید ملاقات ہوتی رہتی ہے۔ نیاز گلبرگوی سے میں نے جب پوچھا کہ "گو یہاں بھی آپ کے شعر کہنے کی رفتار سست تو نہیں لیکن کیا اب بھی آپ نظریاتی شاعری کے حق میں ہیں" تو بولے کہ "شاعری بغیر نظریہ کے ابتک ہوئی ہے اور نہ آئندہ ہو سکے گی۔ گل وبلبل سے لے کر مزدور تک سب نظریاتی شاعری ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ شاعری چاہے کسی نظریہ کی ہو اپنے فن اور اپنی خوبی میں ایسی ہو کہ "دل برخیزد" کے دائرے میں آتی ہو تو بس وہ شاعری ہے اور بڑی شاعری ہے۔ اس ضمن میں میرا یہ شعر حاضر ہے۔

وہ سخن نخل بے ثمر ہے نیاز
جس کے پیچھے کوئی عقیدہ نہیں

اور اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہر شاعر کسی نہ کسی مکتبہ فکر سے متاثر ہوتا ہے۔ البتہ وابستہ ہونا یا اس مکتبہ فکر سے خود کو باندھ رکھنا یہ علیحدہ بات ہے جس پر بحث ہو سکتی ہے اور اس کی مختلف آراء بھی ہو سکتی ہیں۔ میں نئے رجحان کی شاعری سے جسے آپ ترقی پسند شاعری کہہ سکتی ہیں، زیادہ متاثر ہوا ہوں۔ مخدوم محی الدین کی شاعری سے دکن کا ہر باشعور نوجوان متاثر ہوا ہے۔ حیدر آباد دکن کی ادبی زندگی کا انقلابی دور مخدوم کے نام سے عبارت ہے۔ مخدوم کی انقلابی فکر نے نہ صرف ان کے ہم عصروں کو متاثر کیا ہے بلکہ نوجوانوں میں بھی ایک نئے زاویئے سے دیکھنے کی تحریک پیدا کر دی۔ اور دیکھئے صدیوں کا جمود آن واحد میں ٹوٹ کر رہ گیا"۔

نیاز جب گفتگو کرتے ہیں تو جی چاہتا ہے کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ اپنا تعارف کراتے ہوئے بولے "میں یکم جون ۱۹۲۴ء کو گلبرگہ میں پیدا ہوا۔ والد نے نیاز علی خان نام رکھا اور میں نے اسی کو تخلص کے طور پر اپنایا۔ میٹرک تک گلبرگہ کالج میں تعلیم پائی۔ ۱۹۳۹ء میں والد وظیفہ پر ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو مجھے اپنی تعلیم ترک کر کے پندرہ سال کی عمر میں ایک دینی مدرسہ میں تحتانی جماعتوں (ابتدائی جماعتیں) کا مدرس بننا پڑا کیونکہ ہمارے خاندان کی خودسری کا واحد ذریعہ میرے والد کی ملازمت سے منسلک تھا۔ دوسری عالمی جنگ کی وجہ سے گرانی زوروں پر تھی پھر ۱۹۴۳ء سے ۱۹۴۸ء تک میں سرکاری مدرسہ تحتانیہ کا صدر مدرس رہا۔ ملازمت کے دوران میں نے منشی (فارسی) اردو عالم اور اردو فاضل کے امتحانات پاس کئے۔ ادب وشاعری سے وابستگی کے بنیادی محرکات کا تعلق میرے گھر کے ماحول سے ہے۔ والد صاحب اردو اور فارسی ادب سے شغف رکھتے تھے۔ نانا حضرت شیخ علی اردو کے علاوہ فارسی اور عربی کے عالم تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں چوتھی جماعت میں تھا تو نانا جان مشکل مشکل مسودے (خطوط کی شکل میں جوان

کے دوستوں اور عزیزوں کے نام ہوتے تھے) مجھ سے املاء کرواتے تھے۔ جن الفاظ کے معانی اور ہجے سمجھ میں نہ آتے وہ نانا بتا دیتے۔ اس طرح تحریر کا شغف اور الفاظ کی نشست و برخواست سے واقفیت ہوتی گئی۔ تختی بھی لکھوائی گئی تھی جس سے خوشخط بنے۔ کتابیں پڑھنے کا شوق بھی تھا۔ چنانچہ پانچویں جماعت میں آئے تو والد صاحب نے گھر پر گلستان' بوستان پڑھا کر فارسی زبان سے روشناس کرایا۔ آٹھویں میں پہنچے تو فارسی زائد زبان کے طور پر میٹرک تک پڑھی۔ ڈاکٹر محی الدین قادری نے ادارہ ادبیات اردو کی بنیاد رکھی تو میں نے اردو فاضل وہیں سے کیا۔ اردو فاضل کا کورس ایم۔اے اردو کے کورس سے زیادہ وسیع تھا۔ اردو اساتذہ کے سارے دیوان' فن تنقید پر متند اول (مروج) کتب' علم عروض' صنائع بدائع' دکنی قدیم شعراء سے لے کر دبستان لکھنؤ اور دلی کے شعراء' ۱۹۳۶ء کا ترقی پسند ادب' اقبال' سرسید اور ان کے رفقاء کے کارنامے و تحریرات پر محیط یہ امتحان تھا جو میرے ادبی سفر میں بڑا مددگار ثابت ہوا۔

۱۲ ستمبر ۱۹۴۸ء کو ہندوستان نے حیدر آباد دکن پر فوجی کارروائی کی اور ۱۷ ستمبر کو ان کی فوجیں ریاست دکن پر قابض ہو گئیں۔ گلبرگہ ہندوستان کی سرحد کے قریب تھا۔ یہاں فوجی در آئے۔ ہم لوگ اپنی جانیں بچا کر ریاست کے دارالخلافہ حیدر آباد پہنچے۔ گھر لٹ گیا۔ گھر کا اثاثہ جلا دیا گیا۔ برسوں کی جمع پونجی آتش و آہنگ کی نذر ہو گئی۔ جس کے جہاں سینگ سمائے نکل پڑا۔ میں دکن سے ہجرت کر کے ۲۴ جنوری ۱۹۴۹ء کو کراچی پہنچا۔ دکن میں جب تک رہے کبھی باہر جھانکا تک نہیں اور جب نکلے تو دکن کی صورت کو ترس گئے۔

میری ادبی زندگی کا آغاز بہ یک وقت افسانہ نگاری اور شاعری سے ہوا۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ ابتداء میں نظم کی طرف زیادہ رجحان تھا۔ میرے افسانے حیدر آباد دکن کے روزنامہ "میزان" اور ماہنامہ "ہندوستانی ادب" میں چھپتے تھے۔ ابراہیم جلیس جو اس وقت تک اپنی پہلی کتاب "زرد چہرے" کے مصنف بن چکے تھے میری تحریر کی بہت تعریف کرتے اور ہمت افزائی کرتے۔ اپنی ابتدائی عمر میں ہی مجھے بڑی پذیرائی ملی۔ مگر وہ زمانہ پر لگا کر اڑ گیا۔ خواب تھا سہانا جو ٹوٹ گیا اور معلوم ہوا سندھ کے ریگستانوں کی دھول میں اٹے ہوئے ہیں۔ مگر نئے وطن کی مٹی نے جس کے لئے سب کچھ تج دیا تھا' گلے لگایا۔ وہ سب کچھ دیا جو اس کے بس میں تھا۔ قیام پاکستان کے ابتدائی ایام ہرچند افراتفری کے تھے' مگر بڑے سہانے تھے۔ ادیب شعراء اور دانشوران دکن جو وہاں چیدہ چیدہ بکھرے ہوئے تھے سب حیدر آباد کالونی میں اکٹھے بود و باش کرتے نظر آئے۔ ان میں ابراہیم جلیس' تحسین سروری' خواجہ معین الدین' نظر حیدر آبادی' فضل گلبرگوی' مظفر الدین مظفر' رضی اختر شوق' عبدالرؤف عروج' محمد عمر مہاجر' جلال الدین اشک'

مرزا اظفرالحسن' بدر شکیب' حمایت علی شاعر' مہدی علی صدیقی' ماہرالقادری اور حضرت علی اختر وغیرہ دکن کے وہ درخشندہ ستارے تھے جو پاکستان کے آسمان ادب پر اپنی پوری آب و تاب سے روشن تھے۔ پچاس کی دہائی کی ابتداء میں "محفل علم و ادب" کا قیام عمل میں آیا۔ ہر ہفتے سارے ادیب اس محفل میں جو بہادر یار جنگ ہائی اسکول کے لکچر ہال میں منعقد ہوتی تھی' جمع ہوتے' اپنی نگارشات پیش کرتے۔ نقد و نظر کے سلسلے چل نکلتے۔ ادبی مباحثہ کا جو معیار اس محفل میں پیش کیا گیا وہ مدتوں دوسری انجمنوں کے لئے نشان راہ ثابت ہوا۔

پھر یہ سہانے خواب بھی ٹوٹے۔ استبداد کا زمانہ آیا اور سارا ادب اور تمام ادیب جانے کہاں کھو گئے۔ اس ٹوٹ پھوٹ نے بہت سوں کو ادب بیزار بنا دیا۔ ہم نے بھی چپ سادھ لی اور ۳۴ سال تک اس راہ سے دور رہے۔ ادب میں نامرادانہ زیست کرتے رہے۔

اگست ۱۹۸۱ء میں جب والدہ صاحبہ کی وفات کی خبر ملی تو گلبرگہ جانا ہوا۔ یہ بھی اتفاق تھا کہ والدہ ہمیشہ ہم لوگوں کے ساتھ رہیں۔ ان کی شفقت کے سائے میں ہمارے سارے بچے پاکستان میں پرورش پاتے رہے۔ وہ ۳۴ سال بعد اچانک چند دنوں کے لئے گلبرگہ اپنے بھائی سے ملنے گئیں اور وہاں انتقال کر گئیں۔ وہاں پہنچنے کے بعد معلوم ہوا کہ ہمارا وہ کلام جو وطن میں ۱۹۴۸ء تک کہا گیا تھا اور جو ناسازگار حالات کے ہاتھوں ادھر ادھر بچا ہوا تھا ہمارے کچھ عزیزوں اور دوستوں نے جمع کیا ہے اور اسے شائع کرنا چاہتے ہیں کتنی عجیب بات تھی کہ ہم جو وطن سے منہ پھیر گئے تو یاران وطن کو بھولے سے بھی یاد نہیں کیا تھا بلکہ شاید بالکل ہی بھول بیٹھے تھے مگر وہ تھے کہ اپنے غریب الوطن "بے وفا" کو ابھی تک اپنے دل میں بسائے بیٹھے تھے۔ آنکھیں امنڈ آئیں' دل بھر آیا اور یوں میری کتاب "حرف وفا" گلبرگہ سے انجمن ترقی اردو اور انجمن حیات نوشاہ پور کی مشترکہ کوششوں کے باعث ۱۹۸۳ء میں شائع ہوئی۔

پاکستان میں سرمایہ کاری محکمہ اکاؤنٹنٹ جنرل سندھ کے محکمے میں ملازمت ملی۔ ۳۶ سال کی ملازمت کے بعد بحیثیت اکاؤنٹ آفیسر یکم جون ۱۹۸۴ء کو ملازمت سے سبکدوش ہوا۔ اور مارچ ۱۹۹۳ء کو دوسری ہجرت کرکے شکاگو اپنے بچوں کے پاس پہنچا۔ تب سے اب تک یہیں مقیم ہوں"۔

اس طویل مگر دلچسپ آپ بیتی کے بعد ان سے شعر گوئی کی تحریک ملنے کے بارے میں پوچھا تو بولے کہ اساتذہ کے کلام کے مطالعہ کے دوران اکثر آمد ہوتی ہے۔ ایک اچھا شعر یا کوئی مترنم بحر بھی شعر گوئی پر اکسا دیتی ہے۔ لیکن یہ کوئی لگا بندھا اصول نہیں۔ بعض دفعہ یوں بھی شعر نازل ہوتے ہیں"۔

نیاز گلبرگوی

نیاز گلبرگوی شاعری پر نہیں ہر صنف سخن کے لئے ابلاغ ضروری خیال کرتے ہیں۔ ابلاغ سے عاری سخن کی ادب میں کوئی وقعت نہیں۔ اب رہا اسلوب اور آسان زبان کا استعمال تو شاعری میں ایک صنف ہے سہل ممتنع۔ اس کا جواب نہیں۔ اگر کوئی شاعر اس پر قادر ہے تو واقعی وہ بڑا شاعر ہے۔ میر تقی میر اسی لئے بڑے شاعر ہیں اور غالب بھی۔ ہر چند ان کا ابتدائی کلام بیدل کے رنگ میں پہیلیاں بجھواتا ہے۔

"ادب میں تنقید نے کیا فیض پہنچایا"۔ اس سوال کے جواب میں ان کا کہنا ہے کہ تنقید ہر زمانے میں ادب کو صحیح راہ پر رکھنے کے لئے ضروری سمجھی گئی۔ "مقدمہ شعرو شاعری" ہو کہ اس سے پہلے کے تذکرے جو شاعری پر اساتذہ نے لکھے۔ سبھی سے شاعری نے اکتساب فیض کیا۔ شاعری کی سمت کو متعین کرنے، ادب کو راستہ دکھانے اور راستہ بدلنے کے لئے تنقیدی ادب نے، خصوصاً ترقی پسند تنقید نے بہت کام کیا ہے۔ ہاں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس تنقید نے جہاں شاعری کو نئے افق، نئے رجحانات اور نئی راہیں بخشیں وہاں آزاد اور معری نظم اور بے مقصد و بے مغز شاعری کا در وا کر کے ادب میں بہتروں کو گمراہ کیا ہے۔

نیاز صاحب بھی اس بات سے متفق ہیں کہ زمانے کی تیز رفتاری نے کتب اور رسائل کو غیر مقبول بنا دیا ہے۔ آڈیو، وڈیو اور کمپیوٹر کا دور ہے۔ انسان مشین میں ڈھل گیا ہے۔ وقت کہاں ہے۔ مطالعہ کے لئے ۔۔۔۔

پردیس میں پروان چڑھنے والی نسل کو اردو کا ورثہ منتقل کرنے کے سلسلے میں ان کا مشورہ ہے کہ "والدین اپنی شناخت اور اپنی زبان کے تحفظ کی خاطر ایک متحدہ پلیٹ فارم بنائیں۔ وقت نکال کر بچوں کو اپنی زبان کی ابجد سے واقف کرائیں۔ ان سے اردو میں بات کریں اور کمیونٹی میں سنڈے اسکولوں کا قیام عمل میں لائیں"۔

نیاز کا یقین ہے کہ اردو ادب آج یہ دعویٰ کر سکتا ہے اور کرنے میں حق بجانب ہے کہ وہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے ہم پلہ ہے۔ اقبال، حالی، میر، غالب، مومن، مودودی، شبلی، سلیمان ندوی، شرر، ڈپٹی نذیر احمد اور جانے کتنے قد آور مصنف، فلسفی، شاعر اور دانشور اردو زبان میں پیدا ہوئے۔ یہ سب ادب عالیہ کے خالق ہیں اور موجودہ عہد میں بڑی شاعری کی طرف پیش قدمی ہوئی ہے۔ قاسمی، فیض، حفیظ، ماہر، فرند، مخدوم، جذبی، رضی اختر شوق، حمایت، سرور جعفری، کیفی اعظمی اور بہت سوں نے ادب کا رشتہ زندگی سے جوڑ رکھا ہے۔ ویسے اچھی بری شاعری ہر دور میں ہوتی ہے۔ لہٰذا ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔

نیاز گلبرگوی

عکسِ فن

نہ وہ کارواں نہ وہ رہ گذر نہ وہ آستاں نہ وہ سنگِ در
یہ پتہ نہیں کہاں آگئے کہاں جارہے ہیں خبر نہیں

دو شعر (۱۹۴۸ء)

وقفِ غم کائنات اب بھی ہے
نذرِ ماتم حیات اب بھی ہے
لوگ کہتے ہیں دن نکل آیا
لوگ دیکھیں تو رات اب بھی ہے

○

غم نہیں تھا کوئی ہم کو ترے غم سے پہلے
تیرا غم بھی تو بھٹکتا رہا ہم سے پہلے
وادیِ شوق میں ہم بن گئے منزل کا نشاں
نقشِ پا کوئی نہ تھا اپنے قدم سے پہلے

○

وہ سخن نخلِ بے ثمر ہے نیازؔ
جس کے پیچھے کوئی عقیدہ نہیں

○

ہمارے خون کے چھینٹے سنا ہے
تمہاری آستیں پر آگئے ہیں

○

سخنؔ اقرار کا تھا جن کے لب پر
وہ اب حرفِ "نہیں" پر آگئے ہیں

سید حسن جہانگیر ہمدم
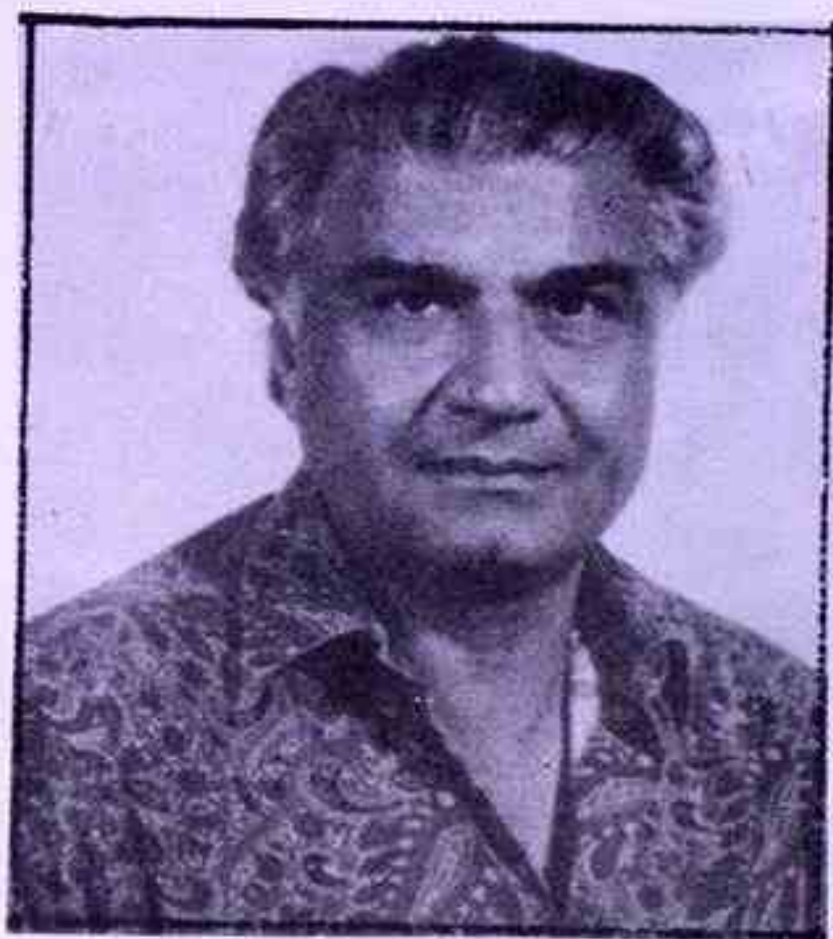
باتیں بہت تھیں کم ہوئیں ، شکوے گلے تھے ختم ہوئے
آنکھیں تو کتنی دن نم ہوئیں کچھ ان کی یہ روداد آپ کی

سیّد حسن جہانگیر ہمدانی
برکلے کیلیفورنیا

Syed Hasan Jahangir Hamdam
P.O.Box 7523
BERKLE LEG, CA 94707 , U.S.A.

جہانگیر ہمدانی ہمدم
(سان فرانسسکو' امریکہ)

امریکہ میں رہ کر جن شعراء نے اردو شاعری کو نکھار دیا ان میں ایک نام سید جہانگیر ہمدانی کا بھی ہے۔ گو ہمدانی صاحب درس وتدریس کے پیشے سے وابستہ ہیں اور امریکہ کے شب و روز میں ایک انسان اپنی بقاء کے لئے جس طرح نبرد آزما رہتا ہے اس میں علم وادب کی ترویج کے لئے وقت نکالنا آسان بات نہیں۔ لیکن جنہیں فن کی لگن بے چین کئے رہتی ہے وہ اپنے آرام' اپنی نیند و راحت کے وقت میں سے بھی کچھ لمحے نکال لے جاتے ہیں اور زبان وادب کی خدمت چپکے چپکے کرتے رہتے ہیں۔

جہانگیر ہمدانی بڑے دلنواز لہجے کے شاعر ہیں۔ تحت اللفظ پڑھتے ہیں لیکن مشاعرے میں چھا جاتے ہیں۔ ان کی شاعری ان کی ذات کا اظہار بھی اور اپنے عہد کی ترجمان بھی ہے۔ ان سے ادب کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو ہوئی۔ ایک سوال کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ "ادب اور زندگی کے درمیان گہرا رشتہ ہے۔ جدید ٹیکنالوجی نے زندگی کی رفتار کو تیز تر کر دیا ہے۔ آج کا انسان اشیاء کے حصول میں گم ہو کر رہ گیا ہے۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں ادب کی اقدار بھی بدلی ہیں۔ زبان وبیان میں بھی تیزی سے تبدیلی آئی ہے چونکہ ادب زندگی کا عکاس ہوتا ہے چنانچہ موجودہ ادب میں اسی کا اظہار ملتا ہے۔ ادب صرف نقالی کا نام نہیں۔ بڑا ادب ہمیشہ فکری بنیاد پر مختلف ہوتا ہے۔ اور اکا دکا لوگوں کو چھوڑ کر دیکھا جائے تو فکری بنیاد پر ادب سے لاتعلقی دکھائی دے گی۔ آج بیشتر لکھنے والوں کا مقصد شہرت کا حصول ہے یا پھر ادب کے سہارے خود کو سربلند کہلانے کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ ادب ذات کے حصار میں تخلیق نہیں کیا جاسکتا اس کے لئے

گہرے مشاہدہ کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ آج کے نقاد بھی سہل پسند بن گئے ہیں۔ گروپ بندیوں میں بٹے ہوئے نقاد شاعر اور ادیب کی رہنمائی ہرگز نہیں کر سکتے۔ من ترا حاجی بگویم والے ماحول میں فنی ترقی کے امکانات محدود ہو جاتے ہیں"۔

انہوں نے کہا کہ شمالی امریکہ میں اردو کی ترویج کے لئے جو مراکز کام کر رہے ہیں ان کی کارکردگی قابل تعریف ہے۔ یہاں مشاعرے' سیمینار اور افسانوی محفلیں منعقد کرنا جی کے زیاں سے کم نہیں۔ اور اسی بنیاد پر وہ اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں ہیں۔

اپنے بارے میں تفصیل سے بتاتے ہوئے انہوں نے کہا کہ "میرا نام سید حسن جہانگیر ہمدانی اور ہمدم تخلص ہے۔ میرا تعلق دہلی کے ایک انتہائی معزز اور ادبی خاندان سے ہے۔ والد مرحوم سید نذر حسن سلیم ہمدانی' اردو کے مشہور جریدے "صدائے عام" کے نائب مدیر تھے۔ یہ رسالہ اپنی زبان اور مضامین کی عظمت کی وجہ سے شہرت عظمیٰ کا مالک تھا۔ والد مرحوم اور خاندان کے دیگر افراد نواب سراج الدین خان سائل (شاگرد داغ دہلوی) کے شاگرد تھے' ان میں سید اصغر علی اصغر' سید افتخار علی فہیم' محمود الحسن محمود اور اعجاز حسین اعجاز کے نام مشہور ہیں"۔

تقسیم ہند کے بعد میرا خاندان لاہور میں آباد ہو گیا جہاں پر گورنمنٹ کالج سے میں نے بی۔اے آنرز اور ایم۔اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ زبان اور ادب کا شعور محض وراثت میں ملا ہے اگرچہ میں نے کسی بھی کلاس میں اردو مضمون کے طور پر نہیں پڑھی۔ یونیورسٹی آف کیلی فورنیا برکلے میں پی۔ایچ۔ڈی (لسانیات) تک تعلیم حاصل کی۔

گذشتہ پچیس برس میں شمالی امریکہ کی متعدد یونیورسٹیوں میں انہوں نے استاد کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے جن میں GILL
OHIO UNIVERSITY UNIVE OF CALIFORNIA MC
UNIVERSIRY MONTREAL وغیرہ شامل ہیں۔

ان کی چار تصانیف جو انہوں نے اپنے رفقاء کی معیت میں تحریر کی ہیں' وہ چھپ چکی ہیں۔ ان کی لسانیات پر ایک کتاب A COURSEIN URDU جو پندرہ سو صفحات اور تین جلدوں پر مشتمل ہے سارے شمالی امریکہ کی یونیورسٹی میں نصابی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا ترجمہ روسی زبان میں بھی ہو چکا ہے۔ شاعری کا مجموعہ "گرداب فکر" زیر طباعت ہے۔

اپنی ثقافت' تہذیب اور مذہب کی نمائندگی کرنے اکثر و بیشتر شمالی امریکہ کی درسگاہوں' ریڈیوں اور ٹیلیویژن پر جاتے ہیں۔

گذشتہ پچیس برس سے برکلے میں اپنی بیوی سحاب مقبول اور تین بچوں کے ساتھ مقیم ہیں۔

سید حسن جہانگیر ہمدانی ہمدم

عکسِ فن

پاکستان

سرزمین پاک و شاداب اے وطن
ذرہ ذرہ خاک کا تیری چمن
تو شکوہِ عظمت اسلام ہے
حسنِ ایمانی جہاں جلوہ فگن
اک مقدس خواب کی تعبیر تو
عصرِ نو میں جلوۂ نقشِ کہن
تو امینِ فیضِ ربِ اولیاء
تو زمینِ قائد و اقبال فن
وادیِ کشمیر سے بولان تک
خطۂ رشکِ جناں، باغِ عدن
غیرتِ پختون و بلوچوں کی آن
گومل و خیبر ترے ہیں جان و تن
سرفروشی فطرتِ پنجاب ہے
جو برائے دشمناں دنداں شکن
سندھ کی وادی حسیں تاریخ ساز
اجرکِ تہذیب میں لپٹی دلہن
جاں و دل ہے ہر مہاجر پر فدا
جس نے اپنے خون سے سینچا چمن
سارے وُرثے مل کے پاکستاں بنے
اس کا ہر شہری بنا یوں ہم وطن
دولتِ حبِ وطن سے مالا مال
ہمدم کم مایہ و شیریں سخن

آج کی شاعرات

اس عنوان سے ۱۹۷۳ء میں، میں نے کتاب شائع کی تھی جس میں ایک سو تین شاعرات کا تعارف تھا۔ یہ تعارف بھی میں نے شاعرات سے اس وقت لیا تھا جب میں روزنامہ جنگ میں ہر ہفتے ایک شاعر یا شاعرہ کا تعارف شائع کرتی تھی۔ ان شاعرات کے نام کی فہرست درج ذیل ہے۔

فہرست بوئے گل

راحیل اختر	عشرت جہاں آفریں	گلنار آفریں	انویا
اختر بیگانہ	خورشید اعظم پروانہ	پروین شاکر	آنسہ پنہاں
خلیق تبسم	ریحانہ رضوی	خاتون حجاب	حسنہ زیدی
ثریا حیا	سکندر حیا بریلوی	خورشید فاطمہ	رضیہ ابو جعفر
رئیس بانو نقوی	زہرہ اشتیاق	آل زہرہ نقوی	زیب گلشن مولوی
زیب النساء زیبی	سحر میمن	سردار بانو	سعدیہ روشن
حسینہ شفق	شفیق بانو بریلوی	بشریٰ شمس	شمسہ صدیقی
خورشید بانو شمع	نور شمع	شمیم اختر شمیم	شمیم رحمٰن شمیم
عسکری شہناز	شہناز وصی	صائمہ خیری	عابدہ بانو صبا
صنوبر مصور	ضمیر فاطمہ جعفری	عظمت عزمی	عزیز بدایونی
عظمیٰ ناہید	عشرت جہاں پشاوری	محترم جہاں عشرت	فائزہ صدیقی
شوکت فرخ	مہ جبین فاطمہ ماہ	مہرنگار تیموری	رحمت النساء ناز
شاہدہ سلطانہ ناز	عابدہ ناز	نوشابہ نرگس	فہمیدہ نسرین

نسیم قمر　　نسیم ہدیٰ نسیم　　نصیرہ ملک　　نعیم حسین نگار
نگار حفیظ نگار　　عذرا ہما　　فریدہ ہما　　محمودہ ہیر

نالہ دل

ادا جعفری　　سیدہ حنا　　ربیعہ فخری رزمی　　ثریا زیبا
شہاب قزلباش　　ڈاکٹر سرور سلطانہ　　محمودہ جبیں سوز　　رشیدہ سلیم سیمیں
شائستہ زیدی　　طلعت اشارت　　عرفانہ عزیز　　میمونہ غزل
پروین سید فنا　　فہمیدہ ریاض　　نوربانو محجوب　　سعیدہ عروج مظہر
معینہ انور معین　　منور سلطانہ لکھنوی　　کشور ناہید　　ثریا محمود ندرت
وحیدہ نسیم　　زہرہ نگاہ　　رابعہ نہاں

دود چراغ محفل

زاہدہ انجم　　رضیہ انور امروہوی　　بغدادی بیگم　　رابعہ پنہاں
بلقیس جمال بریلوی　　کنیز فاطمہ حیا　　بیگم خورشید آرا　　خیاب علوی
تراب النساء علوی　　سروری عرفان اللہ روحی　　صفیہ شمیم ملیح آبادی　　عذرا عزمی
رشیدہ بیگم عیاں　　میمونہ غزالہ بریلوی　　بیگم قمر القادری　　قمر جہاں چندوسوی
سیدہ نسیم فاطمہ بریلوی　　نورالصباح بیگم　　نورجہاں نور بدایونی

"سخن ور حصہ اول"

"سخن ور حصہ اول" میں ساٹھ پاکستانی شعراء کا تذکرہ ہے۔ اس کی فہرست درج ذیل ہے۔

ترتیب

سلطانہ مہر صاحبہ کہنہ مشق صحافی ہیں، شاعرہ بھی ہیں، افسانہ نگار بھی اور محقق بھی۔ اُن کا کمال یہ ہے کہ اردو اہلِ زبان کی طرح لکھتی ہیں، اگرچہ ان کا تعلق بمبئی کے میمن گھرانے سے ہے غیر اہلِ زبان کیلئے صحتِ زبان کے ساتھ ساتھ صاحبِ اسلوب ہونا بڑی بات ہے۔

نقلِ مکانی نے ان کی شاعری میں ایک نیا سوزِ غم کا رنگ شامل کردیا ہے جس سے تارکینِ وطن کی شعوری روایت میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔

"سخنور" کے نام سے انھوں نے کئی برس پہلے ساٹھ شعراء کے حالات اور انتخابِ کلام شائع کیا تھا۔ یہ تذکرہ کئی لحاظ سے معاصر شعراء کے حالاتِ زندگی کے لئے اہمیت رکھتا تھا۔ اسی کا دوسرا حصہ ان شعراء پر مشتمل ہے جو آب و دانہ کیلئے غیر ممالک میں پڑے ہوئے ہیں۔ ضرورت تھی کہ ان کے کلام و حالات کو بھی یکجا کیا جاتا۔ یہ کام صبر آزما بھی تھا اور مشکل بھی، لیکن سُلطانہ مہر نے جس محنت اور تندہی سے حالات جمع کئے ہیں اور جس ہنرمندی سے خوبصورت اسلوب میں لکھ ڈالے ہیں اس سے کتاب ایک اہم تاریخی، علمی اور ادبی دستاویز بن گئی ہے۔

ڈاکٹر وحید قریشی
۲۶۹ این سمن آباد لاہور